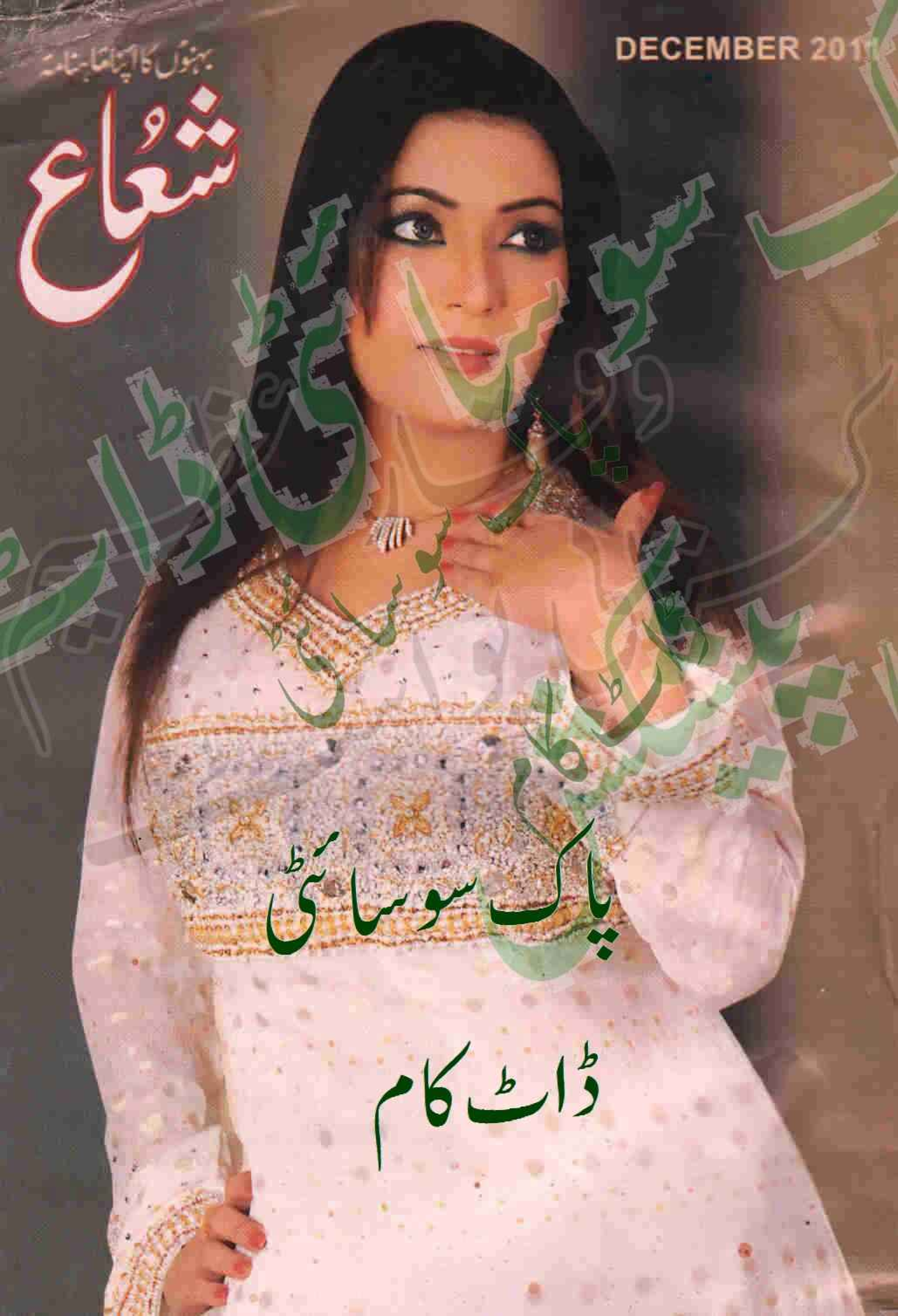

پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام

پہلی شعاع	رضیہ جمیل	10
حمد	خورشید بیگ	11
نعت	مولانا ظفر علی	11
نبی ﷺ کی باتیں	ادارہ	12

انٹرویو

بندھن	عامر سلیم	22
دستک	شاہین رشید	278
شاعری	کرن شبیر	272

ناول

دیوارِ شب	عالیہ بخاری	36

مکمل ناول

انجام بخیر	آسیہ رزاقی	72
مان جاؤ	فائزہ افتخار	208
وہ اک پل	رشا خالد	138

ناولٹ

صبح کا ستارہ	سائرہ عارف	118
زندگی تو پیاری ہے	عائشہ فیاض	180

افسانے

غیرت	دلشاد نسیم	256
چھید	صبا نور	60
پھر ہواؤں	صائمہ اکرم	232
کرچیاں	ثریا انجم	173
دل بیدار پیدا کر	نفیسہ بیگم	246
اپنا گھر	سدرہ سحر عمران	112
ابھی اک خواب	مونا سید	67

نظمیں، غزلیں

غزل	افتخار بخاری	270
غزل	تسنیم پرویز	270
نظم	نوشین اقبال	271
غزل	غلام شبیر آثم	271

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

مستقل سلسلے

خط آپ کے	رضیہ جمیل	27
مسکراہٹیں	سائرہ غلام نبی	263
آئینہ خانے میں	تبصیر نشاط	275
بالوں سے خوشبو آئے	شگفتہ جاہ	266
تاریخ کے جھروکے	امت الصبور	282
سیر دو جہاں	آمنہ زرین	17
موسم کے پکوان	خالدہ جیلانی	286
خوبصورت بنیے	ادارہ	289

دسمبر 2011

جلد 26 شمارہ 4

قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رخسانہ جلیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: [illegible] پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872

Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع کا دسمبر کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

نئے اسلامی سال کا آغاز ہو چکا ہے۔ محرم الحرام اسلامی تاریخ کا پہلا مہینہ جس کی بہت فضیلتیں ہیں۔ اسلام سے پہلے بھی ان مقدس مہینوں میں شمار کیا جاتا تھا جن میں جنگ و جدل بند کر دی جاتی تھی۔ اسلامی تاریخ میں جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنے اور ظلم کے سامنے ڈٹ جانے کا سنہرا ترین باب اسی ماہ میں رقم ہوا۔ نواسۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اہل بیت کے ساتھ شہادت حق و صداقت کے لیے قربانی کی ایک لازوال مثال ہے۔ حق یعنی سچ اور اسلام سے بڑی سچائی کیا ہو سکتی ہے۔

نواسۂ رسول امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی اور اپنے اہل خاندان کی جان کی قربانی اسلام کے عملی نفاذ کے لیے پیش کی۔ اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا نظام جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی اور عملی شکل میں پیش بھی کیا۔

امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ گنتی کے لوگ تھے جبکہ مقابل لاکھوں کا لشکر تھا لیکن آپ نے راہ حق سے ہٹنا گوارا نہ کیا اور اپنی جان کی قربانی پیش کر کے دنیا کے سامنے ایک مثال قائم کر دی۔ خواہ ساری دنیا باطل کو تسلیم کر لے اور اس کو ماننے والے دنیاوی اعتبار سے کتنے ہی کامیاب و کامران کیوں نہ سمجھے جائیں۔ حق و صداقت کا مفہوم نہیں بدل سکتا۔ سچائی ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں وہی لوگ کامیاب و کامران ہیں جو اس کی بتائی ہوئی راہ پر چلتے ہیں۔

ملوکیت کے خلاف جنگ میں امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اہل بیت کے ہمراہ اپنی جان کی قربانی پیش کی اور شہادت کا وہ مرتبہ پایا جس پر پوری انسانیت کو فخر ہے۔

سالِ نو نمبر

جنوری کا شمارہ سالِ نو نمبر ہوگا اور سالِ نو نمبر میں قارئین کی شمولیت کے لیے حسب روایت سروے بھی شامل ہوگا۔

سوالات یہ ہیں۔

1۔ اس سال نیوز چینل ۔ سیاست، کھیل، شوبز اور تحریر و تخلیق کے میدان میں مختلف شخصیات نمایاں رہیں۔ آپ کو کس شخصیت نے متاثر کیا یا اچھی لگی اور کیوں؟

2۔ گزرے سال کا کوئی اہم واقعہ یا خوشی؟ قومی سطح پر؟ ذاتی سطح پر؟

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 20 دسمبر تک موصول ہو جائیں۔

اس شمارے میں،

- انجام بخیر ۔ آسیہ رزاقی کا مکمل ناول،
- مان جاؤ ۔ فائزہ افتخار کے ناول کا تیسرا اور آخری حصہ،
- وہ اک پل ۔ دمشہ خالد خان کا مکمل ناول، ، سائرہ عارف اور عائشہ فیاض کے ناولٹ،
- عالیہ بخاری کا ناول "دیوار شب" تکمیل کے مراحل میں،
- دلشاد نسیم، صبا نور، صائمہ اکرم چودھری، ثریا انجم، نفیسہ بیگم، سدرہ سحر عمران اور مونا سید کے افسانے،
- عامر سلیم اور آسیہ سلیم کا "بندھن"، معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا ۔ میر امن دہلوی کی باغ و بہار پر تبصرہ،
- شاعری سچ بولتی ہے، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا یہ شمارہ کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔

نعت رسولِ مقبولؐ

مجھ پہ کر دیجیے کرم سائیں
لے کر آیا ہوں چشمِ نم سائیں

تیری حمد و ثنا ہی لکھتا ہوں
دم میں جب تک ہے میرے دم سائیں

تا دمِ مرگ تیری مدحت میں
سر بہ سجدہ رہے قلم سائیں

روح پرواز جب کرے میری
سامنے ہو تیرا حرم سائیں

ہے یقیں مجھ کو روزِ محشر بھی
تو رکھے گا میرا بھرم سائیں

میں تو تیری رضا پہ راضی ہوں
رنج کیا شے ہے، کیا الم سائیں

خورشید بیگ میلسوری

حمد باری تعالیٰ

دل جس سے زندہ ہے، وہ تمنا تم ہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں، وہ دنیا تم ہی تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اولیں کا اجالا تم ہی تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں غایتِ اولیٰ تم ہی تو ہو

دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر، وہ تنہا تم ہی تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا تم ہی تو ہو

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تم ہی تو ہو

مولانا ظفر علی خان

ادارہ

پیاری پیاری باتیں

فتنہ و آزمائش سے متعلق احکام و مسائل

کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے سے ہاتھ روک لینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کروں حتی کہ وہ لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیں۔ جب وہ یہ کلمہ پڑھ لیں تو انہوں نے اپنے خون اور مال مجھ سے محفوظ کرلیے، سوائے اس کے کہ اس (اقرار یعنی کلمے اور اسلام) کا کوئی حق ہو (تو پھر لوگوں کے جان و مال میں تصرف کرنا جائز ہوگا) اور (دل کے معاملات میں) ان کا حساب اللہ عزوجل کے ذمے ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ کلمہ توحید کا اقرار کرنے والے پر دنیا میں مسلمانوں کے احکام جاری ہوتے ہیں۔ اگر دل میں ایمان نہیں ہوگا تو اس کی سزا آخرت میں ملے گی۔ ○ خون اور مال محفوظ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان سے جنگ کرکے انہیں قتل نہیں کیا جائے گا، نہ ان کے مالوں پر بطور غنیمت — قبضہ کیا جائے گا۔ ○ جان میں حق کے ساتھ تصرف سے مراد اس سے سرزد ہونے والے جرم کی سزا دینا ہے، مثلاً "چوری کی صورت میں ہاتھ کاٹنا، پاک دامن پر بدکاری کا الزام لگائے تو کوڑے مارنا، قتل عمد کی صورت میں قصاص کے طور پر قتل کرنا وغیرہ اور مال میں جائز تصرف زکوۃ اور لازمی خرچ وصول کرنا، قتل عمد میں مقتول کے وارثوں کی رضا مندی سے اور قتل خطا میں وارثوں کے مطالبے پر قاتل یا اس کے قبیلے سے دیت (خون بہا) وصول کرنا وغیرہ۔ ○ اگر دنیا میں کسی وجہ سے گناہ کی سزا نہ ملے تو آخرت میں سزا ملے گی، البتہ کسی بڑے نیک کام کی وجہ سے معافی بھی مل سکتی ہے۔

مسلمان کا قتل

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے ہے۔ انہوں نے فرمایا نافع بن ازرق اور اس کے ساتھی آئے انہوں نے کہا۔

"عمران! آپ ہلاک ہوگئے!"

انہوں نے فرمایا۔ "میں ہلاک نہیں ہوا۔"

انہوں نے کہا۔ "کیوں نہیں! آپ ضرور تباہ ہو گئے ہیں۔"

عمران رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ "میں کیسے ہلاک ہو گیا؟"

ان لوگوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ان سے جنگ کرو حتی کہ فتنہ باقی نہ رہے اور مکمل طور پر اللہ کا دین غالب ہو جائے۔"

انہوں نے فرمایا۔ "ہم نے ان (کفار) سے جنگ کی حتی کہ انہیں ملک (عرب) سے نکال دیا اور اللہ کا دین مکمل طور پر غالب ہو گیا۔ اگر تم چاہو تو تمہیں ایک حدیث سناؤں جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔"

انہوں نے کہا "آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے؟"

فرمایا "ہاں، میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھا (جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے جنگ کرنے کے لیے مسلمانوں کا ایک لشکر روانہ فرمایا۔ جب ان (مسلمانوں) کا ان (مشرکوں) سے

سامنا ہوا تو ان سے شدید جنگ ہوئی۔ آخر وہ لوگ مسلمانوں سے مغلوب ہو گئے۔ میرے رشتے داروں میں سے ایک آدمی نے ایک مشرک پر نیزے سے حملہ کیا۔ جب وہ اس کے سر پر پہنچ گیا تو (دشمن فوج کے) اس شخص نے کہا۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میں مسلمان ہوں۔"

اس صحابی نے اس کلمہ شہادت پر یقین نہ کرتے ہوئے اسے نیزہ مار کر قتل کر دیا۔ پھر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا۔

"اللہ کے رسول! میں تباہ ہو گیا۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار یا دو بار فرمایا۔ "تو نے کیا کیا ہے؟"

اس نے جو کیا تھا بتا دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔

"تو نے اس کا پیٹ کیوں نہ چیر لیا کہ تجھے معلوم ہو جاتا کہ اس کے دل میں کیا ہے؟"

اس نے کہا۔ "اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اگر میں اس کا پیٹ چیرتا تو کیا مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس کے دل میں کیا ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "پھر تو نے نہ تو اس کی زبان کے الفاظ کو قبول کیا، نہ تو اس کے دل کی کیفیت سے واقف ہے۔"

راوی بیان کرتے ہیں : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔

اس کا عذر قبول نہیں فرمایا۔

کچھ عرصہ بعد وہ فوت ہو گیا ہم نے اسے دفن کیا۔ صبح ہوئی تو وہ زمین کی سطح پر تھا۔

لوگوں نے کہا۔ "شاید کسی دشمن نے اسے قبر سے کھود نکالا ہے۔"

پھر ہم نے اسے دفن کیا اور اپنے لڑکوں کو حکم دیا کہ اس کا پہرہ دیں۔ (اس کے باوجود) وہ (اس کی لاش) صبح کو (قبر سے باہر) زمین پر پڑی تھی، ہم نے کہا۔ "شاید لڑکوں کو اونگھ آگئی۔" (اور دشمن کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر کسی نے میت نکال لی۔)

ہم نے اسے (پھر) دفن کیا اور خود پہرہ دیا۔ (اس کے باوجود) صبح کو اس کی لاش (قبر سے باہر) زمین پر تھی، چنانچہ ہم نے اسے کسی گھاٹی میں پھینک دیا۔ (اور دفن نہ کیا)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"زمین اس کو بھی قبول کر لیتی ہے جو اس سے زیادہ برا ہوتا ہے لیکن اللہ نے تمہیں یہ دکھانا چاہا ہے کہ لا الہ الا اللہ کا احترام کتنا عظیم (اور اہمیت کا حامل) ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ خوارج وغیرہ بدعتی فرقے دین کو صحیح انداز سے نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ○ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فہم دین اور علم صحیح اور کامل تھا، اس لیے اختلافی مسائل میں، خاص طور پر عقائد میں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فہم کو اہمیت دینی چاہیے اور مسائل کو ان کے فرامین کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ ○ خوارج نے مسلمان خلفاء کے خلاف بغاوت کی۔ یہ غلط قدم تھا، اس سے فتنہ و فساد پیدا ہوا۔ ○ جو شخص مسلمان ہونے کا دعوا کرتا ہو اسے مسلمان سمجھنا چاہیے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کا سا سلوک کرنا چاہیے۔ اگر اس سے کوئی ایسی چیز ظاہر ہو جس سے اس کا کافر ہونا ثابت ہو جائے تو اسے مرتد قرار دے کر سزا دی جا سکتی ہے لیکن محض شک و شبہ کی بنا پر کسی کو کافر قرار دینا بہت بڑی غلطی ہے۔ ○ اللہ تعالیٰ کسی غلطی کی سزا دنیا میں بھی دے دیتا ہے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو۔

مومن کی جان و مال کی حرمت کا بیان

حضرت ابو سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجتہ الوداع میں فرمایا۔

"سنو! سب سے زیادہ احترام والا دن تمہارا یہ دن ہے۔ سنو! سب سے زیادہ احترام والا مہینہ تمہارا یہ

مہینہ ہے۔ سنو! سب سے زیادہ احترام والا تمہارا یہ شہر ہے۔ سنو! تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے لیے (ایک دوسرے کے لیے) اسی طرح قابل احترام ہیں جس طرح تمہارے اس شہر میں اس مہینے میں یہ دن۔ سنو! کیا میں نے (اللہ کا حکم کما حقہ) پہنچا دیا ہے؟"

حاضرین نے کہا۔ "جی ہاں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یا اللہ! گواہ رہ۔"

فوائد و مسائل : ○ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد 9 ذوالحجہ کو عرفات میں بھی فرمایا تھا اور 9 ذوالحجہ کو منیٰ میں جمعرات کے قریب کھڑے ہو کر بھی۔ ○ اس شہر سے مراد مکہ مکرمہ ہے جو سب سے زیادہ عظمت والا شہر ہے۔ ○ مسلمان کی جان و مال قابل احترام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے قتل کرنا، زخمی کرنا، اس کا مال چھیننا اور دھوکے سے اس کا مال لے لینا بہت بڑے جرائم ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ "میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ شریف کا طواف کرتے دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے۔

"تُو کتنا پاکیزہ ہے! اور تیری خوشبو کتنی پاکیزہ ہے! تُو کس قدر عظیم ہے! تیرا احترام کتنا عظیم ہے! قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جان ہے! اللہ کے ہاں مومن کی حرمت تیری حرمت سے بڑھ کر ہے، یعنی اس کے مال اور جان کی حرمت، اور یہ کہ اس کے بارے میں بدگمانی کرنا بھی حرام ہے۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہر مسلمان دوسرے کے لیے قابل احترام ہے، یعنی اس کی جان، اس کا مال اور اس کی آبرو۔"

فائدہ : کسی کو ذلیل کرنا، اس کی غیبت کرنا، اس پر کسی قسم کا جھوٹا الزام لگانا اور اس کی غلطیوں کی تشہیر کرنا، سب کبیرہ گناہ ہیں۔

حضرت فضالہ بن عبید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن وہ ہے جس سے لوگوں کو اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے بارے میں خطرہ نہ ہو، اور مہاجر وہ ہے جو غلطیاں اور گناہ ترک کر دے۔"

فوائد و مسائل : ○ ایمان امن سے ہے، اس لیے مومن کی شان یہ ہے کہ اس سے لوگوں کو امن ملے، کسی قسم کا خوف و خطرہ نہ ہو۔ مومن بددیانت نہیں ہوتا اور نہ کسی کے مال و جان کو نقصان پہنچاتا ہے۔ ○ ہجرت اللہ کی رضا کے لیے وطن چھوڑنے کو کہتے ہیں، اس لیے جو شخص اللہ کے لیے وطن چھوڑتا ہے اسے چاہیے کہ اسی اللہ کی رضا کے لیے گناہ بھی ترک کر دے تاکہ اللہ کے ہاں مہاجر والا بلند مقام حاصل کر سکے۔

زبردستی مال چھیننے (لوٹنے) کی ممانعت کا بیان

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس نے سرعام (کسی کا مال وغیرہ) چھینا، وہ ہم میں سے نہیں۔"

لوٹ مار کرنا

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص لوٹ مار کرتا ہے، وہ ہم میں سے نہیں۔"

حضرت ثعلبہ بن حکم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔ "دشمن کی کچھ بکریاں ہمارے ہاتھ لگیں، وہ ہم نے لوٹ لیں اور ہانڈیاں چڑھا دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہانڈیوں کے پاس سے گزرے تو انہیں الٹ دینے کا حکم دیا، چنانچہ وہ الٹا دی گئیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "لوٹ حلال نہیں۔"

مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مسلمان کو گالی دینا فسق اور اس سے لڑنا کفر ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ کفر سے مراد کبیرہ گناہ ہے، یعنی یہ ایسا کام ہے جو مسلمان کے لائق نہیں، یہ تو کسی کافر کے کرنے کا کام ہے۔ ○ جن کاموں کو کفر کے کام یا جاہلیت کے کام کہا جاتا ہے، ان سے انتہائی پرہیز کرنا چاہیے۔

(فرمان نبوی) "میرے بعد کفر کی طرف نہ لوٹ جانا کہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ" کا بیان

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حجتہ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "لوگوں کو خاموش کراؤ۔" (جب لوگ خاموش ہو گئے) تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میرے بعد دوبارہ کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔"

فوائد و مسائل : ○ بزرگ شخصیت کی بات سننے کے لیے خاموشی اختیار کرنا اور بات کہنے والوں کو خاموش کرانا احترام کا تقاضا بھی ہے اور اس کی نصیحت سے مستفید ہونے کے لیے شرط بھی۔ ○ مسلمانوں کو آپس کے اختلافات افہام و تفہیم سے طے کرنے چاہئیں، اسلحے کے زور پر نہیں۔ ○ مسلمانوں کا باہمی اتفاق اللہ کا عظیم احسان ہے جیسے کہ ارشاد ہے۔

"تم پر اللہ کی جو نعمت ہوئی اسے یاد کرو، جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، پھر اللہ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تم اس کے احسان سے بھائی (بھائی) بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے، پھر اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچا لیا۔ ○ مسلمانوں کو چاہیے کہ آپس میں محبت پیدا کرنے والی چیزوں کو اختیار کریں، "مثلاً" ایک دوسرے کو سلام کرنا، نماز باجماعت میں ایک دوسرے سے مل کر کھڑے ہونا اور صفیں سیدھی رکھنا وغیرہ اور ایسے کاموں سے پرہیز کریں جو اختلاف اور دشمنی پیدا کرنے والے ہیں "مثلاً" کسی کی بے عزتی کرنا، ظلم، زیادتی، گالی اور غیبت وغیرہ۔ ○ قتل و غارت بہت بڑا جرم ہے جو مسلمانوں کو زیب نہیں دیتا۔

مسلمان اللہ عزوجل کی پناہ میں ہیں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جس شخص نے صبح کی نماز پڑھی، وہ اللہ کی حفاظت میں ہے، چنانچہ تم اللہ کے (حفظ و امان کے) وعدے کو مت توڑو۔ جو شخص اس (نمازی مسلمان) کو قتل کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے (ایک مجرم کی طرح اپنے دربار میں) طلب فرمائے گا، پھر اسے جہنم میں منہ کے بل اوندھا کر کے پھینک دے گا۔"

فوائد و مسائل : ○ اگر سردار یا بادشاہ کسی کو پناہ دے تو اسے تکلیف دینا سردار یا بادشاہ کی توہین یا بغاوت سمجھا جاتا ہے۔ نمازی مسلمان اسی طرح اللہ کی پناہ میں ہے، لہٰذا اسے تکلیف دینا یا اسے قتل کرنا اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی اور بغاوت کے مترادف ہے جو ناقابل معافی جرم ہے۔ ○ بے نماز کو اللہ کی یہ پناہ حاصل نہیں۔ ○ مسلمان کے قاتل کی سزا جہنم ہے لیکن اگر مقتول کے وارث خون بہا لے کر یا احسان کرتے ہوئے قاتل کو معاف کر دیں تو ایسے مسلمان قاتل کی سزا معاف ہو جائے گی۔ ○ کبیرہ گناہوں کے مرتکب جہنم میں جائیں گے، پھر اپنے گناہوں کے مطابق سزا بھگتنے کے بعد انہیں رہائی مل جائے گی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کے ہاں مومن کی عزت بعض فرشتوں سے

بھی زیادہ ہے۔"

عصبیت کا بیان

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جو شخص گمراہی کے جھنڈے تلے جنگ کرتا ہے' (لوگوں کو) عصبیت کی دعوت دیتا ہے یا عصبیت کی بنیاد پر غصے میں آتا ہے تو اس کا قتل ہو جانا جاہلیت کی طرح ہے۔"

فوائد و مسائل : ○ گمراہی کے جھنڈے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تحقیق کیے بغیر ایک فریق کا ساتھ دیتا ہے کہ وہ حق پر ہے یا نہیں۔ اس صورت میں اگر وہ گروہ حق پر بھی ہوا تو اس شخص کی نیت حق کا ساتھ دینے کی نہیں بلکہ اپنے خاندان' قبیلے' قوم' جماعت' پارٹی یا تنظیم کا ساتھ دینے کی ہے' اس لیے یہ وہ جنگ نہیں جس میں حصہ لینے سے ثواب ہو اور قتل ہونے سے شہادت کا درجہ ملے۔ ○ حق و باطل کی پہچان کیے بغیر ہر دعوت اور ہر جنگ و جدل جاہلیت کے طریقے پر ہے۔

حضرت فسیلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد (واثلہ بن اسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے روایت کرتی ہیں' انہوں نے فرمایا میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا۔

"اے اللہ کے رسول! کیا یہ بھی عصبیت ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت رکھے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"نہیں' عصبیت تو یہ ہے کہ آدمی ظلم میں اپنی قوم کی مدد کرے۔"

مستقبل میں ظاہر ہونے والے فتنے

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی اور اسے بہت طویل فرمایا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو صحابہ کرام نے عرض کیا۔

"اللہ کے رسول! آج آپ نے بہت لمبی نماز ادا کی ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "میں نے طلب اور خوف والی نماز ادا کی ہے۔ میں نے اللہ سے اپنی امت کے لیے تین چیزوں کی درخواست کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے دو چیزیں عطا فرما دیں اور ایک سوال قبول نہیں فرمایا۔ میں نے یہ درخواست کی تھی کہ ان پر ان کے سوا دوسرے (غیر مسلم) دشمن مسلط نہ ہوں۔ اللہ نے مجھے یہ چیز عطا فرما دی۔ اور میں نے اللہ سے یہ درخواست کی کہ انہیں غرق کر کے ہلاک نہ کرے۔ اللہ نے مجھے یہ چیز بھی عطا فرما دی۔ اور میں نے اللہ سے یہ سوال کیا کہ ان کی جنگ آپس میں ایک دوسرے سے نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے میری یہ درخواست قبول نہیں فرمائی۔"

فوائد و مسائل : ○ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے لیے ہر قسم کی بھلائی کی خواہش رکھتے تھے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت رکھیں' کثرت سے درود پڑھیں' زیادہ سے زیادہ آپ کا اتباع کریں اور بدعات سے اجتناب کریں۔ ○ دشمنوں کے تسلط سے غیر مسلموں کا ایسا غلبہ مراد ہے کہ مسلمان دنیا سے ختم ہو جائیں۔ ○ اس دعا کی قبولیت اس طرح ظاہر ہے کہ دور نبوت سے آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں آیا جب دنیا میں کسی نہ کسی مقام پر مسلمانوں کی آزاد حکومت قائم نہ ہو' علاوہ ازیں جن غیر مسلموں نے مسلمانوں کے علاقوں پر قبضہ کیا' اللہ تعالیٰ نے انہی میں سے اسلام قبول کرنے والے اور اس کا دفاع کرنے والے پیدا فرما دیے۔ ○ غرق ہونے کے عذاب سے مراد ایسی قدرتی آفت ہے جس سے سب مسلمان تباہ ہو جائیں مثلاً" سیلاب' زلزلہ اور آندھی وغیرہ امت میں یہ عذاب اس طرح نہیں آئیں گے جس طرح گزشتہ امتوں پر یہ عذاب آئے کہ حق کے مخالفین کو مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ ○ مسلمانوں کا آپس میں جنگ و جدل اچھی بات نہیں۔

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرتا

باغ و بہار

مصنف : میر امن دہلوی

تبصرہ : آصنہ زرّین

حیرت ایک ایسا خوب صورت احساس ہے جس سے محرومی انسانی زندگی کو پھیکا' بے رنگ اور کچھ نئی دریافتوں سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تجربے سے گزرنے کے لیے ہم کون سا رستہ اختیار کرتے ہیں۔

کہانی روز ازل سے دنیا میں موجود ہے اور اس کے کہنے سننے کی روایت بھی۔۔۔۔ انداز بیاں کی دلکشی اور خیال کی ندرت نے کچھ کہانیوں کو ادب میں دائمی حیثیت بخشی ہے۔۔۔۔ جن میں فارسی ادب کا "قصہ چہار درویش" بھی شامل ہے۔ 1803ء میں' میر امن کے شاہکار قلم کی بدولت' اس داستان کا پہلی مرتبہ آسان زبان میں ترجمہ قلمبند ہوا' جو کہ عام بول چال کی زبان تھی۔ "باغ و بہار" کے نام سے شائع ہونے والا یہ قصہ اردو زبان کی اولین داستان نگاری میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

صدیوں پہلے کے اس قصے کو چار درویش اپنی اپنی سرگزشت کے طور پر بیان کرتے ہیں اور انہی کے ذریعے آپ دہلی کے خوب صورت لب و لہجے سے بھی آگاہ ہوتے ہیں' جو مصنف نے تہذیبی ورثے کی مانند' قلم کے ذریعے محفوظ کر دیا ہے۔

چلیے! چلتے ہیں داستان کی طرف کہ جس کی خوبی اس کی تفصیل' تسلسل اور واقعاتی ظہور میں ہے۔

یہ قصہ ایک بادشاہ کو پیش آنے والے ایک چھوٹے سے واقعے سے شروع ہوتا ہے کہ نام جس کا آزاد بخت تھا۔ وہ ایک وسیع سلطنت کا مالک تھا۔ ایک دن بیٹھے بٹھائے دنیا سے دل اچاٹ ہو گیا اور گوشہ نشینی اختیار کر کے امور سلطنت سے بے نیاز ہو گیا۔ جیسے تیسے وزیر باتدبیر نے قائل کیا کہ "آدمی کا دل خدا کا گھر ہے اور بادشاہ فقط عدل کے واسطے پوچھے جائیں گے۔" غرض وزیر کی نصیحت سے بادشاہ کی خاطر جمع ہوئی اور دوبارہ سے دربار لگانے پر راضی ہوا۔ البتہ معمولات میں مطالعہ' ورد' عبادت اور دعا کو بھی شامل رکھا۔

"ایک روز کتاب میں لکھا دیکھا کہ اگر کسی شخص کو غم یا فکر ایسی لاحق ہو کہ اس کا علاج تدبیر سے نہ ہو سکے تو چاہیے کہ تقدیر کے حوالے کر دے اور آپ گورستان کی طرف رجوع کرے' درود بطفیل پیغمبر کی روح کے' ان کو بخشے اور اپنے تئیں نیست و نابود سمجھ کر' دل کو اس غفلت دنیوی سے ہوشیار رکھے اور عبرت سے رو دے اور خدا کی قدرت کو دیکھے کہ مجھ سے آگے کیسے کیسے صاحب ملک و خزانہ اس زمین پر پیدا ہوئے لیکن آسمان نے سب کو اپنی گردش میں لا کر خاک میں ملا دیا۔ یہ کہاوت ہے۔

چلتی چکی دیکھ کر' دیا کبیرا رو
دو پاٹن کے بیچ آ' ثابت گیا نہ کو

پس! بادشاہ سلامت نے جب اس نصیحت پر عمل کرنے کی ٹھانی' تب اسی رات ان کی چار درویشوں سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔۔۔۔ اور یہاں سے چار درویشوں کی کہانی شروع ہوئی' جنہوں نے رات بسر کرنے کی خاطر باری باری اپنی اپنی سرگزشت سنانا شروع کی۔

پہلے درویش کے بیان کے مطابق' ان کا وطن یمن تھا اور والد صاحب وہاں کے سب سے رئیس تاجر تھے۔ بے پناہ دولت کے یہی ایک وارث تھے۔ ایک

بہن تھی، جس کی شادی ہو چکی تھی۔

"مجھ فقیر نے بڑے چوز سے ماں باپ کے سائے میں پرورش پائی۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بےفکری میں گزرے۔ یک بہ یک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے۔ دن رات رویا کیے، کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چہلم کے بعد سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا۔

"اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے، کاروبار لین دین سے ہشیار رہو۔"

وہ سب تسلی دے کر رخصت ہوئے اور تمام ملازم حاضر ہوئے اور بولے "ایک نظر نقد و جنس کو دیکھ لیں۔" بے انتہا دولت دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ یہ غافل ہوئے اور جھوٹے خوشامدی لوگوں نے ڈیرے جمائے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب، ناچ اور جوئے کا چرچا ہوا۔ نوکروں نے جب یہ غفلت دیکھی، جو جس کے ہاتھ پڑا، الگ کیا۔ مال مفت دل بے رحم۔ اس درخرچی کے آگے اگر گنج قارون کا ہوتا تو وفا نہ کرتا۔ نوبت یہ آگئی، دوست آشنا جو دانت کاٹی روٹی کھاتے تھے اور چمچہ بھر خون اپنا، ہر بات میں نثار کرتے تھے، کافور ہو گئے۔ اب دمڑی کی ٹھڈیاں میسر نہیں، جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑا کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لا سکا۔"

غرض باپ کی دولت کا خاتمہ کر کے ان کو بہن کی یاد آئی اور بدحالی کے سبب اس کے ہاں جا پہنچے۔

"وہ ماں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لی اور گلے مل کر بہت روئی۔ بہن نے خوب خاطر خدمت کی اور نہایت آرام سے رکھا۔ ایک دن بہن کہنے لگی کہ

"تمہارے دیکھنے سے مجھ کو راحت ملتی ہے۔ میرے ماں باپ کی نشانی ہو، لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لیے بنایا ہے۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹھتا ہے، اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں۔"

بہن نے سمجھا بجھا کر پھر سے کاروبار کرنے کی ہمت دلائی۔ یہ بھی آمادہ ہوئے۔ بہن نے کثیر رقم دی، جس سے مال خرید کر دمشق جانے والے سوداگروں کے قافلے کے ساتھ ہوئے اور بہن سے رخصت ہوئے۔

دمشق پہنچنے پر، رات ہو جانے کے سبب شہر کے دروازے بند ملے اور باوجود منت سماجت کے دربانوں نے کھول کر نہیں دیے اور یوں رات فصیل شہر کی دیوار تلے گزارنا پڑ گئی ..... اور یہیں ان کی زندگی کا ناقابل فراموش واقعہ پیش آیا.....!

"آدھی رات اِدھر اور آدھی رات اُدھر ہوئی۔ سنسان ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا، ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ اس صندوق میں ایک خوب صورت، کامنی سی عورت تھی، گھائل، لہو میں تربتر، پڑی کلبلاتی ہے اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے۔

"اے کم بخت بے وفا! اے ظالم پُر جفا! بدلہ اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا؟ بھلا ایک زخم اور بھی لگا۔" یہ کہہ کر پھر بے ہوش ہو گئی۔

اب ان صاحب کو جو ان کے حسن سے گھائل ہو چکے تھے، ان کی مرہم پٹی کی فکر ہوئی۔ صبح ہوتے ہی شہر میں مکان کرائے پر لیا۔ زخمی دوشیزہ کو وہاں چھوڑا اور شہر بھر میں جراح کاریگر کی تلاش کی۔ عیسیٰ نام کے اپنے فن میں یکتا جراح کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوئے۔ اس نے خدا ترسی کی اور ساتھ چل کر گھر تک آیا۔

"زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی۔ "خدا کے کرم سے اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے۔ غسل شفا کا کروا دوں گا۔"

غرض اس نے زخم دھوئے، کچھ کو ٹانکے لگائے، کچھ کو مرہم لگائی اور غذا تجویز کر کے احتیاط ملنے جلنے کی جتائی۔ ان صاحب نے دن رات ایک کر کے خدمت کی۔ سوداگری بھول بھال بس ایک ہی کام کرتے

رہے۔

"دوشیزہ کے غسل شفا کے بعد خوب خیر خیرات کی اور اس پری کا شفا پانے سے رنگ ایسا نکھرا کہ مکھڑا سورج کی مانند چمکنے اور کندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی جو اس کے جمال پر ٹھہرے، فقیر، یہ سرو چشم اس کے حکم میں حاضر رہتا۔ جو فرماتی سو بجا لاتا۔

ایک مدت اس کی خاطرداری اور فرمانبرداری میں گزری کہ طبیعت میں سرداری تھی۔ رفتہ رفتہ جمع خرچ ختم ہونے لگا اور فکر سے دبلا ہوتا چلا، چہرے کا رنگ ۔ دھواں ہو گیا۔ ایک دن اس پری رُو نے خود ہی اندازہ لگا لیا کہ خرچ کی پریشانی ہے۔ اس نے کاغذ قلم حاضر کرنے کو کہا اور کچھ لکھ کر ایک پتے پر روانہ کیا۔ جہاں سے گیارہ کشتیاں، سربہ مہر زربفت کی تورہ پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا..... دینے والے نے نہ کچھ پوچھا، نہ کچھ کہا۔

آکر مہ وش جمال کے حوالے کیں۔ کچھ دن بعد اس نے ایک اور دوکان کا نام پتا سمجھا کر جواہرات اور خلعتیں لانے کو بھیجا۔ دوکاندار نے گرم جوشی اور حسن اخلاق کی بدولت دوستی گانٹھ لی اور دعوت ایک محفل کی دی۔ واپسی پر پوچھ کچھ ہوئی تو اس حسینہ نے کمال مہربانی سے اجازت دی اور کہا کہ۔

"آدمی کو اپنا قول و قرار پورا کرنا واجب ہے۔"

غرض شہزادی کے کہنے پر واپس جوہری کی دوکان پر گیا۔ جہاں سے وہ محفل آرائی کی خاطر باغ میں لے گیا۔

وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے۔ میوے طرح بہ طرح کے پھل رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہا تھا۔ پوشاکیں بدل کر ضیافت کا اہتمام ہوا۔ گانے بجانے کی محفل عروج پر آئی تو سوداگر نے اپنی معشوقہ کے بغیر دل کے اداس ہونے کا سبب بیان کیا اور اجازت چاہی کہ اس کو بلوا لیا جائے۔ یہ بھی بغیر دیکھے مشتاق ہوئے اور راضی ہوئے۔

اس جوان نے چلمن کی طرف اشارت کی، وہ نہیں ایک کالی کلوٹی، بھتنی سی، جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جاوے، جوان کے پاس آن بیٹھی۔ فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔

دل میں کہا "یہی محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا۔ میں لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔"

دو تین دن ضیافت جاری رہی اور واپسی پر سارا احوال جاننے کے بعد شہزادی نے حکم صادر کیا کہ "مفت کی مہمانی اچھی نہیں۔ سوداگر بچے کو ساتھ لاؤ اور دو چند ضیافت کرو۔"

سوداگر نے بہت حیلے بہانے کیے، آخر راضی ہوا۔

"ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ لیکن راہ میں یہی فکر کرتا تھا کہ آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا۔ اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے۔ گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے۔ میں حیران ہوا، لیکن اپنا گھر جان کر اندر قدم رکھا۔ دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف، لائق پر مکان کے، جابجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں۔ پان دان، گلاب پوش، عطردان، پیک دان، چنگیریں، نرگس دان قرینے سے دھرے ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنوے، نارنگیاں اور گلابیاں، رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف جھاڑ اور سرو، کنول کے، روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمع دانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوس اوپر دھری ہیں....."

غرض سب اسباب شاہانہ موجود تھا اور یہ حیران ..... پوچھے بنا رہ نہ سکے اور جواب میں جھاڑ ہی پلائی گئی اور حکم ہوا کہ چل کر مہمان کے پاس بیٹھو۔

یہاں تک پہنچ کر تجسس اور دلچسپی اپنے عروج کو پہنچتی ہے کہ آخر بات کیا ہے؟ اور کھٹکا بھی ..... کہ

شہزادی نے یہ سب کیسے کیا اور چاہتی کیا ہے۔ اب آپ آگے کی سنیے۔

"میزبان کے کہنے پر مہمان نے پھر سے اپنی معشوقہ کو بلوالیا۔

جب آدھی رات گئی' وہ چڑیل خاصی' چوڈھل پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔ جوان اس کے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا کہ جیسے دنیا کی نعمت ملی۔ وہ بھتنی بھی اس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سب نے منہ میں انگلیاں داب لیں کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی۔"

رات بھر محفل بپا رہی۔ دن آدھا چڑھ چکا' یہ صاحب اٹھے تو دیکھا کہ رات کی محفل کا کوئی نشان باقی نہ ہے' حویلی خالی پڑی ہے۔ مگر ایک کونے میں کمبل لپٹا ہوا دھرا ہے' جو اس کو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں کٹ کر پڑے ہیں۔

ارے..... حیرانی و پریشانی کا عالم ہے تجسس بے پناہ!

اب ان کو اس پری رُو کی تلاش لاحق ہوئی اور جیسا کہ داستان کا مزا ہے..... پل پل کی تفصیل لفظوں کو تصویر بنا ڈالتی ہے..... بالکل اسی طرح یہ صاحب' تلاش بسیار میں ہوش و خرد سے بیگانے ہوگئے رہے' آخر کار ملی۔ "باقی خدا نے اس کے دل کو مہربان کیا۔ ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے' جیسے چودھویں رات کا چاند' بناؤ کیے' گلے میں پشواز' بادلے کی سنجاف کی' موتیوں کا دردامن ٹکا ہوا اور سر پر اوڑھنی' جس پر آنچل' پلو پر گوکھرو لگا ہوا' سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی' روش پر آکر کھڑی ہوئی۔"

لیکن ملنے پر اس نے خفگی ظاہر کی اور کہا کہ "سو توڑے اشرفی کے لو اور چلتے بنو۔" اب ان کی جان پہ بن آئی۔ حتیٰ کہ سوکھ کر کانٹا ہوئے۔ کسی نے پہچان کر ترس کھا کر پھر خدمت میں حاضر کیا۔ لاکھ کہنے سننے پر وہ پری پہچاننے پر آمادہ ہوئی..... اور حکیم کو مرض تشخیص کرنے کا حکم دیا۔

"طبیب نے عشق کا مرض تشخیص کرتے ہوئے تجویز کیا کہ اگر یہ اپنی مراد کو پہنچے تو زندگی بچ جانے کا امکان ہے۔"

سو' شہزادی نرم پڑی اور علاج معالجہ کروانے لگی۔ رو بہ صحت ہو کر آنجناب نے ان سے نکاح کیا اور من کی مراد پائی' مگر طبیعت میں شہزادی کی خفگی کا ڈر موجود تھا اور وہ راز جاننے کی خواہش بھی..... آخر کار سوال کر ہی ڈالا۔

جواب میں شہزادی کے پاس بھی ایک لمبی اور مرقع داستان تھی' جو انہوں نے کہہ ڈالی۔

"میں بدبخت' ملک دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے۔ ناز و نعم میں پلی' آسائشوں میں گھری کہ یکایک سودائی سا مزاج ہوگیا۔ دل اداس اور حیران' نہ کسو کی صورت اچھی لگے' نہ بات کہنے کو جی چاہے۔ خادم خاص نے فرحت بخش شربت تجویز کیا کہ طبیعت بحال ہو۔

محلی باہر گیا اور ایک صراحی' اس شربت کی تکلف سے بنا کر' برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ لوا کر آیا۔ فائدہ ہونے پر اسی وقت انعام ملا اور حکم بھی کہ ہر روز اسی وقت یہی بھجوا کر خدمت میں صراحی حاضر کیا کرے۔

وہ لڑکا ہر روز حاضری دینے لگا اور دل بہلانے کی حرکتیں بھی۔ غرض شہزادی شربت کے ساتھ محفل آرائی کی بھی عادی ہوتی چلی گئی۔ اس کو مصاحبت میں داخل کیا' زر و جواہر' بھاری خلعتیں عطا کیں۔ کئی برس بعد جب وہ بالغ ہوا' تو درباری اس کو محل کے اندر آنے جانے سے روکنے لگے۔ آخر اس کا آنا جانا موقوف ہوا۔ شہزادی نے کثیر رقم خرچ کر کے اس کو مکان' دوکان' سامان تجارت کا کر کے دیا اور خود اپنی بے کلی کا علاج یہ کیا کہ اس کے مکان کے قریب سرنگ بنوائی اور سر شام اس کو بلوا کر محفل آرائی شروع کی اور فجر دم وہ لڑکا وہاں سے رخصت لیتا۔ اس بات کے گواہ بس مقرب خاص تھے۔

ایک دن لڑکے نے بلانے پر بھی آنے میں ناز نخرہ دکھایا اور شہزادی کے اشتیاق کو ہوا دی۔ بہت پوچھنے پر کھلا' وہ ایک باغ خریدنے کا خواہش مند ہے۔ جس کی قیمت پانچ ہزار اور ساتھ میں ایک لونڈی بھی گائن کہ علم موسیقی میں سلیقہ رکھتی ہے..... لونڈی پانچ لاکھ کی..... اور یہ دونوں باہم بکتے ہیں' نہ اکیلا باغ جیسے اونٹ کے گلے میں بلی۔ اس کی اداس شکل دیکھ کر شہزادی نے فوراً "دام چکا دیے۔ جوان فوراً" آداب بجالایا اور منہ پر رونق آئی۔"

شہزادی کے مطابق "ایک روز بہار کے موسم میں مکان بھی دلچسپ تھا' بدلی گھمنڈ رہی تھی' پھوئیاں پڑ رہی تھیں' بجلی بھی کوند رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی۔ غرض عجب کیفیت اس دم تھی۔ بیٹھے بٹھائے اس باغ کی سیر کو دل چاہا "کم بختی جو آوے' اونٹ چڑھے کتا کاٹے" اس جوان کے مکان کو چلی۔ دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار' بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سرسبز پتوں پر' جو پڑے ہیں گویا زمرد کی پتریوں پر موتی جڑے ہیں۔

دن ہو چکا..... سیاہی شام کی نمود ہوئی۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا۔ جابجا قمقمے' ایک طرف آتش بازی' پھلجھڑی' انار داؤدی' مروارید' مہتابی' ہوائی' چرخی' پچھ پھول' جاہی' جوہی' پٹاخے' ستارے چمکتے تھے..... میں خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی۔ اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی صورت نہ شکل' چولہے میں سے نکل' شراب کا شیشہ ہاتھ میں لیے ہوئے' آ پہنچی اور اس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہول اٹھی۔ پتا چلا یہی وہ لونڈی ہے' جو باغ کے ساتھ حضور کی عنایت کے ساتھ خرید ہوئی۔

اس وقت اپنا لہو پیتی تھی' نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا۔ قصہ مختصر شراب پی کر وہ دونوں بدمست ہوئے اور نامعقول حرکتیں کرنے لگے..... آخر کار شہزادی نے مارے خفگی اور غصے کے جانے کا قصد کیا' تو بدمست کو جی میں صبح کی فکر لاحق ہوئی۔ بہلا پھسلا کر شہزادی کو بھی شراب پلا کر بے ہوش کر دیا اور اسی حالت میں تلوار کے وار کر کے گھائل کر دیا اور اپنی طرف سے قصہ پاک کر کے صندوق میں ڈال فارغ ہو بیٹھا۔"

جی..... بے وفائی بھی قدیم زمانے سے رائج ہے! نیا تو کچھ بھی نہیں..... بس نیا ہونے کا گمان رہتا ہے شاید!

ورنہ دو سو سال سے زائد عرصہ پہلے لکھی جانے والی داستان رقم کرتے وقت لکھنے والوں کو بھی گمان ہوگا کہ وہ قدیم اور ہم جدید ہو جائیں گے؟ یا کبھی ہمیں یہ گمان گزرا ہے کہ ہم بھی..... اک دن قدیم ہو جائیں گے؟

ہے نا مزے کی بات؟

شہزادی کا مزاج بادشاہی ٹھہرا..... رو بہ صحت ہوتے ہی بدلہ لینے کی ٹھانی..... اور درویش کے ذریعے ان دونوں کو بلوا کر قتل کروا دیا اور دعوت کا وہ شاہی انتظام انہوں نے اپنی ماں کے حضور حاضر ہو کر' معافی مانگ کر اور اپنا ارادہ بتلا کر کیا۔

یہ تو ہوا پہلے قصے کا خلاصہ..... اور خلاصے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل قصہ بے حد مفصل' مرقع اور رنگینی سے بھرپور ہے۔ (ازراہ کرم! رنگینی سے مراد محض شوخی قلم ہی لیجیے)

قصہ مختصر' چار درویش اور بادشاہ آزاد بخت ایک خاص وقت اور مقام پر اکٹھے ہوئے اور ان کی داستانیں ایک خاص ڈھب پر منتج ہوتی گئیں۔ اپنا قصہ کہنے کے بعد شہزادی نے شہر چھوڑنے کا قصد کیا اور سفر کے دوران ایک جگہ پڑاؤ کیا اور پلک جھپکنے میں شہزادی غائب اور درویش دیوانہ..... قریب تھا کہ مارے وحشت کے اپنی جان لے لیتا کہ ایک خضر نما نے روک لیا اور خوش خبری دی کہ جلد ہی تمہاری ملاقات آزاد بخت سے ہوگی اور تمہیں اپنے مقصد میں بار آوری ملے گی۔ سو' تینوں درویشوں کے قصے بھی اسی قدر مشترک سے انجام پذیر ہوئے اور آخر قصے میں ان چاروں نے بادشاہ آزاد بخت سمیت اپنی اپنی مراد پائی۔

واقعات کا ظہور' تسلسل' ٹھہراؤ' لب و لہجہ' منظر نگاری اور کردار نگاری میں اپنی مثال آپ یہ کتاب خیال کی ایسی انجمن آرائی ہے' جو اپنی رعنائی کی بدولت آج بھی توانا اور تر و تازہ ہے!

بندھن

عامر سلیم اور آسیہ سلیم

شاہین رشید

انسان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور شادی بیاہ کے معاملات تو خالصتاً" اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ جب نصیب کھلنا ہوتا ہے تو لڑکی بھی پسند آجاتی ہے اور لڑکا بھی اور جھٹ پٹ ہی تمام معاملات طے ہوجاتے ہیں۔

معروف گلوکار عامر سلیم سے جب ہم نے انٹرویو کیا تو بہت اچھا لگا، لیکن جب بھی ان سے شادی کا سوال کرتے تھے، ان کے لہجے میں تھوڑی سی ناگواری آجاتی تھی۔

گزشتہ دنوں معلوم ہوا کہ نہ صرف عامر سلیم صاحب کی شادی ہوگئی ہے بلکہ خیر سے وہ ایک بیٹے کے باپ بھی بن گئے ہیں۔

عامر سلیم کا تعلق ملتان سے ہے تقریباً" 25، 26 سال قبل یہ کراچی آگئے تھے اور تب سے اب تک کراچی میں ہی ہیں۔ پنجابی ادب میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی، اکنامکس میں بھی ایم اے کرنا چاہتے تھے مگر مصروفیات نے اس کی اجازت نہ دی۔ گلوکاری کا بے انتہا شوق تھا اور اپنے آپ کو اس فیلڈ میں منوانا ان کی اولین ترجیح تھی تاہم بہت جدوجہد کے بعد انہیں یہ مقام حاصل ہوگیا ہے۔ ایک بہن اور تین بھائی ہیں۔ بہن ان سے چھوٹی ہیں، والد صاحب پاکستان آرمی میں اکاؤنٹ سیکشن کے ہیڈ تھے۔ ان کا انتقال ہوچکا ہے جبکہ والدہ حیات ہیں۔

★ "جناب عامر سلیم صاحب! کیسے ہیں۔ بہت مبارک ہو آپ کو شادی۔"

✻ "جی الحمدللہ میں ٹھیک ٹھاک ہوں اور مبارک باد کا بہت شکریہ۔ 28 اکتوبر 2011ء کو میری شادی کو پورے پانچ سال ہوگئے ہیں اور میرا ڈھائی سال کا بیٹا ہے۔"

★ "پانچ سال ہوگئے شادی کو اور شاہین رشید کو خبر ہی نہ ہوئی۔۔۔ حیرت ہے نا؟"

✻ (قہقہہ) "بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے جان بوجھ کر اپنی شادی کی پبلسٹی نہیں کی کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ انسان کا پرسنل معاملہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ میڈیا میں رہنے کے لیے اس بات کو کیش کرواتے ہیں مگر میں ان چیزوں سے ذرا دور بھاگتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سارے فنکار ایسے ہیں جنہوں نے اپنے پروفیشن کو اور اپنی فیملی لائف کو الگ الگ رکھا ہوا ہے۔"

★ "آپ کا کہنا ٹھیک ہے مگر میں نے تو نئے نئے جوڑوں کے انٹرویو کیے ہیں۔ شاید آپ واحد ہیں جن کے لیے میں لیٹ ہوگئی۔"

✻ "جی، تو اس طرح آپ بھی وہ واحد شخصیت ہیں جن کو میں پہلی بار انٹرویو دے رہا ہوں اور آپ کا ڈائجسٹ واحد ڈائجسٹ ہوگا، جس میں میری فیملی کے ساتھ میری تصویر شائع ہوگی۔ میں نے آج تک کسی میگزین یا کسی اخبار میں اپنی فیملی کے ساتھ انٹرویو نہیں دیا۔ مجھ سے جس نے بھی انٹرویو مانگا، میں نے انکار کیا۔"

★ "اچھا؟ پھر تو خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ڈائجسٹ میں آپ کا انٹرویو شائع ہو رہا ہے؟"

✻ "میرے لیے بھی یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میرا انٹرویو آپ کے ڈائجسٹ میں شائع ہو رہا ہے اور مجھے یاد ہے کہ جب میں جدوجہد کے دور میں تھا اور بہت محنت کر رہا تھا تو آپ نے اور آپ کے ادارے نے مجھے سپورٹ کیا اور اس بات کو میں آج بھی یاد رکھے ہوئے ہوں اور شاید یہی وجہ ہے کہ آپ کو انٹرویو دینے سے میں نے انکار نہیں کیا۔"

★ "بہت شکریہ آپ نے یاد رکھا۔۔۔ تو اب بتائیں کہ آپ کی شادی کیسے ہوئی؟ دھوم دھام سے ہوئی یا سادگی سے؟"

✻ "میری بیگم کا نام آسیہ ہے اور میری امی نے ہی اسے پسند کیا تھا۔ چھ سال پہلے بات چیت چلی مگر کسی نتیجے پہ نہ پہنچ سکی۔ چھ سال بعد پھر میری امی نے کہا کہ اس سے مل لو اور دیکھ لو۔۔۔ جب بہت اصرار کیا تو میں نے کہا کہ اچھا ملوائیں، تو کہنے لگیں کہ تم اس کی تصویر دیکھ لو۔ پھر میں نے کمپیوٹر پہ اس کی تصویر دیکھی اور ایک ہفتہ فون پہ بات کی اور پھر جو ملاقات ہوئی تو وہ شادی کے دن۔۔۔ شادی کے دن ہی میں نے آسیہ کو دیکھا۔"

★ "اچھا۔۔۔ ایسا تو لڑکیوں کو کہتے سنا تھا کہ ہم نے شادی کے بعد اپنے دولہا کو دیکھا تھا؟"

✻ (قہقہہ) "جی ہم کوئی بھی اس بات پر یقین نہیں کرتا کہ میں نے شادی کے دن ہی بیگم کو دیکھا تھا۔ کوئی یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں کہ میرے جیسا بندہ بھی ایسا کر سکتا ہے اور شادی بھی دھوم دھام سے نہیں ہوئی بلکہ بہت خاموشی کے ساتھ لاہور میں ہوئی۔"

★ "کمپیوٹر پر تصویر دیکھی اور ایک ہفتہ بات کی۔۔۔ کیسا لگا بات چیت کرکے؟"

✻ "مجھے لگا یہ بہت نرم گفتگو کرنے والی اور رحم دل ہیں جبکہ میں تھوڑا غصے کا تیز ہوں اور میں اکثر اللہ سے دعا کرتا تھا کہ میری بیوی بااخلاق، نرم گفتگو والی اور غصے کی تیز نہ ہو۔ اللہ نے میری دعا قبول کی۔۔۔ میں نے کمپیوٹر میں تصویر دیکھ کر امی سے کہا کہ "ہاں بس ٹھیک ہے" میرا اتنا کہنا تھا کہ انہوں نے بات پکی کرکے مٹھائیاں بانٹ دیں اور ڈیٹ بھی فکس کردی۔ حالانکہ جب ہم نے بات کی تھی تو یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم دونوں پہلے ایک دوسرے سے ملیں گے اور پھر شادی کا فیصلہ کریں گے۔۔۔ مگر میں نے ایک فرمانبردار بیٹے کی

طرح ماں کے آگے گردن جھکا دی۔"

★ "پھر مایوسی تو نہیں ہوئی نا؟"

✻ "نہیں جی.... بالکل نہیں.... الحمدللہ میں بہت خوش ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے صاحب اولاد کیا ہے۔ میرے بیٹے کا نام عمار ہے' میری شادی میں علی سلمان کی فیملی اور میرے بہت قریبی دوست شریک ہوئے تھے۔"

★ "آپ نے لیٹ شادی کی' اس کا کچھ پچھتاوا ہے آپ کو؟"

✻ "جی.... وہ لوگ جنہوں نے شادی دیر سے کی یا دیر سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں' میں ان سے کہوں گا کہ وہ میری غلطی کو نہ دہرائیں' مجھے خود بھی دیر سے شادی کرنے کا افسوس ہے۔ جلدی شادی کریں گے تو آپ کے بچے آپ کی ینگ ایج میں آپ کے برابر کھڑے ہوں گے تو آپ کو بہت اچھا لگے گا اور میں سمجھتا ہوں کہ جب آپ کے بچے ہو جائیں تو سمجھیے آپ کی زندگی مکمل ہو گئی ہے۔ شادی کے بعد بندہ اپنی فیملی لائف میں فوکس ہو جاتا ہے اور اِدھر اُدھر بھٹکتا نہیں ہے۔ مجھے دیر سے شادی کرنے کا پچھتاوا ایک سو ایک فیصد ہے۔ پہلے میں اِدھر اُدھر وقت گزارتا تھا مگر اب کام سے فارغ ہوتا ہوں تو گھر کی کشش' بیٹے کی کشش مجھے کہیں اور جانے ہی نہیں دیتی۔"

★ "اپنی بیگم آسیہ کے بارے میں کچھ بتائیے؟"

✻ "آسیہ ہر لحاظ سے ایک پرفیکٹ بیوی ہے' پیار محبت' خیال رکھنا' احساس کرنا' گھر کو سنبھالنا سب کچھ آتا ہے اسے اور جب میرے قریبی دوستوں کی فیملی سے میری بیگم کی ملاقات ہوئی تو مجھے ایسا لگا کہ جیسے میں پیچھے چلا گیا ہوں اور وہ آگے آ گئی ہے۔ یعنی سب نے ہی آسیہ کے اخلاق کی تعریف کی.... انسان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور ہوتی ہے کہ جس سے سب متاثر ہوتے ہیں۔ آسیہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس نے کبھی میرے کام میں مداخلت نہیں کی' کبھی شک نہیں کیا۔ میں کسی سے بات کروں' فون کروں' میسجز کروں' وہ کبھی کچھ نہیں کہتی۔"

★ "آپ نے کہا کہ بیگم بہت نرم خو ہیں' مگر پھر بھی انسان کے مزاج میں تھوڑا بہت غصہ ضرور ہوتا ہے.... تو آسیہ میں غصہ ہے....؟ اور امور خانہ داری سے کتنا لگاؤ ہے؟"

✻ "آسیہ کے مزاج میں غصہ نہیں ہے بلکہ میرے مزاج میں غصہ زیادہ ہے اور میرا غصہ دیکھ کر اس کا رہا سہا غصہ بھی ختم ہو گیا ہے.... وہ چپ ہو جاتی ہے اور میرا غصہ ٹھنڈا ہونے تک خاموش رہتی ہے۔ جہاں تک امور خانہ داری کی بات ہے.... تو اسے امور خانہ داری سے کوئی لگاؤ نہیں ہے.... اور جب اس نے پہلی مرتبہ میرے لیے انڈا پراٹھا بنایا تو میں نے یہی سوچا کہ اس کا ذکر تو "گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ" میں آنا چاہیے۔" اصل میں یہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی ہے' سب کی لاڈلی۔ اس لیے کبھی کچھ سیکھنے کا شوق پیدا نہیں ہوا.... خیر اب تو کافی کچھ سیکھ گئی ہے اور کافی حد تک میں نے بھی سکھا دیا ہے' کیونکہ میں کافی عرصہ اکیلا رہا ہوں اور خود ہی پکایا کرتا تھا۔"

★ "فضول خرچ ہیں یا کفایت شعار؟"

✻ "نہیں نہیں.... بالکل بھی فضول خرچ نہیں ہے' لیکن ونڈو شاپنگ کا بے انتہا شوق ہے.... ہر وقت تیار رہتی ہیں شاپنگ پر جانے کے لیے.... گھومنے پھرنے کا بہت شوق ہے۔"

★ "اچھا.... تو پھر ہنی مون منانے کے لیے کہاں گئے تھے؟"

✻ "کہیں نہیں.... ہنی مون کے نام سے کہیں اسپیشل گھومنے پھرنے نہیں گئے' ویسے خوب گھومے پھرے' کبھی لاہور' کبھی اسلام آباد' کبھی کسی شہر تو کبھی کسی شہر۔"

★ "آسیہ کی اچھی اور بری عادتیں بتائیں؟"

✻ "اچھی عادتیں تو میں نے بہت ساری بتا دی ہیں اور بری کوئی بھی نہیں ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں تو قابل معافی ہوتی ہیں۔ ویسے بھی انسان کو اچھی باتیں ہی یاد رکھنی چاہئیں' بری نہیں مگر سب سے اچھی بات اس کی یہ ہے کہ مجھ پر شک نہیں کرتی۔ کبھی میرا موبائل چیک نہیں کرتی۔"

★ "شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے؟"

✻ "میرے نزدیک اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو خوب صورت بنایا ہے اندرونی طور پر بھی اور بیرونی طور پر بس کبھی سیرت نمبر لے جاتی ہے تو کبھی صورت اور یہ بھی انسان پر منحصر ہے کہ وہ وقت کے حساب سے اپنے آپ کو کتنا اچھا بناتا ہے۔"

★ "یہ بتائیں کہ اچھی زندگی گزارنے کے لیے پیسہ کتنا ضروری ہے۔"

✻ "اچھی زندگی گزارنے کے لیے جہاں آپ کے لیے پیسہ ضروری ہے' وہاں آپ کے لائف پارٹنر کا اچھا ہونا بھی بہت ضروری ہے۔ اچھا دل' میانہ روی' شکر گزاری کا ہونا بہت ضروری ہے۔ بہت سے لوگ دیکھے ہیں جن کے پاس پیسہ ہوتا ہے مگر بیوی بچوں کے لیے ٹائم ہی نہیں ہوتا۔ سکون اور پیار سب سے بڑی دولت ہے۔ پیسہ اتنا ہو کہ اپنے سے نیچے والوں کو دیکھ کر خوش ہوں کہ تو نے کتنا نوازا ہے۔"

آسیہ عامر سلیم

★ "آسیہ! کیسی ہو؟"

✻ "جی بالکل ٹھیک ٹھاک.... آپ سنائیں.... عامر نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ بہت خوشی ہو رہی ہے آپ سے بات کر کے۔"

★ "عامر نے تو تعارف کرا دیا.... آپ نے بھی مجھے کبھی پڑھا؟"

✻ "بہت پڑھا ہے' ہمارے ہاں زیادہ تر لڑکیوں کا مشغلہ میگزین' ڈائجسٹ' رسالے ہی پڑھنا ہوتا ہے۔ تو پھر بتائیے کون نہیں جانتا ہو گا آپ کو۔"

★ "افسانے' ناولز پڑھ پڑھ کر لڑکیاں اپنے شریک سفر کے لیے ایک آئیڈیل بنا لیتی ہیں۔ خوابوں کا شہزادہ وغیرہ.... آپ بتائیں آپ کو ہیرو ملا کہ نہیں۔"

✻ ہنستے ہوئے "جی.... جی مل گیا ہے۔ شکر ہے خدا کا' ماشاءاللہ یہ بہت اچھے ہیں۔"

★ "مشہور بندے سے شادی کر کے کیسا لگ رہا ہے۔"

✻ "میں خوابوں میں رہنے والی خاتون نہیں ہوں۔ عامر شہرت تو رکھتے ہی ہیں لیکن ویسے بھی بہت اچھے سچے اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ بلکہ میں تو کہوں گی کہ ہر لحاظ سے بہت اچھے ہیں۔"

★ "کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

✻ "میرے والد اردو اسپیکنگ ہیں جبکہ والدہ پنجابی۔ والد صاحب چونکہ فورس میں تھے تو ہمارا ایک شہر سے دوسرے شہر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ... لیکن پھر بھی زیادہ وقت ہمارا لاہور اور ملتان میں گزرا.... میں نے ماسٹرز کا ایک ہی سال مکمل کیا کیونکہ بیٹے کی پیدائش ہو گئی۔ ورنہ میں نے اسلامک ہسٹری میں ماسٹرز کرنا تھا۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ تین بہنیں اور دو بھائی' میں آخری ہوں۔"

★ "جب عامر سلیم کا رشتہ آیا اور آپ کو معلوم ہوا کہ یہ تو بہت مشہور شخصیت ہیں تو آپ کے کیا تاثرات تھے؟ ایکسائٹمنٹ تھی؟"

✻ "جب ان کا رشتہ آیا تو اردگرد کے لوگ زیادہ ایکسائٹڈ ہو رہے تھے۔ میں نے بھی عامر کو دیکھا ہوا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ عامر کی فیملی اور خود عامر بھی بہت اچھے ہیں۔ ماشاءاللہ ان کی والدہ بہت اچھی ہیں۔ اور ماں کا عکس بچوں پر بھی آتا ہے تو میں نے سوچا کہ انہوں نے اپنی ماں سے کچھ تو لیا ہو گا۔"

★ "شادی سے پہلے تو عامر کی والدہ بہت اچھی لگیں' شادی کے بعد آپ نے ان کو کیسا پایا؟"

✻ "اللہ کا شکر ہے۔ میری ساس بہت ہی اچھی ہیں۔ ہم کراچی میں رہتے ہیں اور پانچ' چھ سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو' لیکن میں جب بھی سسرال جاتی ہوں میری چاہت اسی طرح کی جاتی ہے' جس طرح پہلے دن کی تھی۔ میری چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کا بھی خیال رکھتی ہیں۔ جب میں سسرال جاتی ہوں تو میرا کمرا

صاف ستھرا اور سجا ہوا ہوتا ہے۔ تو جب کوئی اتنا خیال رکھے تو بندہ کیوں نہ ان کی قدر کرے۔"

★ "شادی کی رسمیں انجوائے کیں؟"

✻ "شادی میں بہت زیادہ رسمیں نہیں ہوئیں۔ پندرہ بیس دنوں میں ہماری شادی کی بات بھی پکی ہوئی اور پھر شادی بھی ہوگئی۔ یعنی چٹ منگنی پٹ بیاہ والی بات ہوئی۔"

★ "ایک سوال میں شادی شدہ لڑکیوں سے ضرور کرتی ہوں کہ اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے مردوں کو۔ اگر عامر سلیم نے دوسری شادی کرلی تو؟"

✻ "میں تو کہوں گی کہ انجوائے کریں۔ (قہقہہ) اگر برداشت کرسکتے ہیں کیونکہ عامر کے لیے برداشت کرنا مشکل ہوگا میرے لیے تو آسان ہوگا۔"

★ "ایک دوسرے کو کس نام سے پکارتے ہیں اور عامر مزاج کے کیسے ہیں؟"

✻ "ہم ایک دوسرے کو نام سے ہی بلاتے ہیں اور مزاج کا حال یہ ہے کہ کبھی تو ان کا مزاج بہت ٹھنڈا، بہت اچھا ہوتا ہے اور کبھی کبھی تو بہت ہی زیادہ ہائپر ہو جاتے ہیں اور یہ منحصر ہوتا ہے اس بات پر کہ سچویشن کیا ہے۔ ویسے عامر میں یہ خوبی ہے کہ میری ضرورت بتانے سے پہلے ہی جان جاتے ہیں مطلب یہ کہ کچھ بولنا نہیں پڑتا۔"

★ "یہ بتائیں کہ شادی کا جوڑا سسرال کا تھا یا میکے کا؟ اور بہت بھاری اور مہنگا تھا کیا؟"

✻ "پہلے دن کا جوڑا امی کی طرف سے تھا اور چونکہ ٹائم کم تھا تو ریڈی میڈ ہی لے لیا تھا اور جو عامر کی طرف سے تھا وہ میں نے ولیمہ میں پہنا تھا اور جہاں تک بھاری اور مہنگے جوڑے کی بات ہے تو مائیں ایسے موقع پر بہت جذباتی ہو رہی ہوتی ہیں اور پھر وہ خرچ کو نہیں دیکھتیں۔"

★ "نکاح اور رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے۔ میکہ چھوڑنا کیسا لگ رہا تھا؟"

✻ "ایک عمر گزاری ہوتی ہے اپنے والدین کے ساتھ۔ بھائی بہنوں کے ساتھ تو احساسات تو بہت جذباتی ہو رہے ہوتے ہیں۔ میکہ چھوڑنے کا غم اور آگے کی زندگی کی فکر بھی سب کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ رخصتی کے وقت ابو کے گلے لگ کر روئی تھی۔"

★ "منہ دکھائی میں کیا ملا تھا، تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے؟"

✻ "ایک انگوٹھی اور ایک بریسلٹ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور مجھے پکا یقین ہے کہ عامر کو تو یاد بھی نہیں ہوگا.... اس معاملے میں بہت لاپروا ہیں انہیں یاد ہی نہیں رہتا کہ کیا شاپنگ کرائی، کیا تحفہ دیا۔ تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہے اگر خاص موقع پر بھول جائیں تو آگے پیچھے تو دیتے ہی رہتے ہیں۔"

★ "آسیہ! یہ بتائیں کہ آپ عامر کو کس روپ میں اچھی لگتی ہیں۔ سادگی میں یا بنی ٹھنی۔"

✻ "بس نارمل، صاف ستھری۔ اوور ہونا تو انہیں کسی بات میں بھی پسند نہیں ہے۔ بال اچھی طرح بنے ہوئے ہوں، اچھے کلر کے لباس ہوں۔"

★ "چھٹی کا دن کیسے گزارتے ہیں آپ دونوں؟"

✻ "چھٹی کے دن دل کرتا ہے کہیں آؤٹنگ کے لیے جائیں اور ہم جاتے بھی ہیں۔ ہمارا بیٹا بھی بہت خوش ہوتا ہے گھوم پھر کر مگر میں کبھی کبھی تنگ ہو جاتی ہوں۔"

★ "اور اب آخری سوال.... اگرچہ گھونگھٹ کا رواج اب نہیں رہا ہے مگر پھر بھی کمرے میں آکر عامر سلیم نے پہلی بات کیا کی تھی؟"

✻ "کچھ خاص نہیں.... بس میرا خیال ہے کہ "السلام علیکم" کہا تھا انہوں نے۔"

اس کے ساتھ ہی ہم نے آسیہ اور عامر سلیم سے اجازت چاہی۔ آسیہ صاحبہ سے بات کرکے اندازہ ہوا کہ خاصی سلجھی ہوئی خاتون ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی آواز اور ان کے بولنے کا انداز ہمیں بہت پسند آیا۔

✡

رضیہ جمیل

خطوط

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے ساتھ حاضر ہیں۔ آپ کی عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اللہ تعالیٰ ہم کو، ہمارے پیارے ملک کو اور پوری مسلم امہ کو دہشت گردوں، بھتہ خوروں اور ظالموں سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

پہلا خط کراچی سے مسرت الطاف احمد کا ہے لکھتی ہیں۔

اس بار بھی نبیلہ عزیز اور نبیلہ ابرار راجہ کی کمی شدت محسوس ہوئی۔ "دیوار شب" سبک روی سے اپنے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ عالیہ جی بڑی تسلی سے تمام کرداروں کو سمیٹ رہی ہیں معاذ کی جویا کے لیے بے چینی بہت پسند آئی۔ جویا اس پورے ناول کی جان ہے "ستارہ شام" میں ثمینہ کی ماوی کے لیے خود غرضی دیکھ کر عجیب سا لگا۔ ثمینہ ماوی کے احساسات کی پروا کیے بغیر ماوی کے ذریعے جنت سے اپنا انتقام لینا چاہتی ہے اور ہاں آمنہ جی! لگا تار دو، تین اقساط سے آپ نے تنوی کا ذکر ہی نہیں کیا پلیز تنوی اور شبیہ کو زیادہ تر ایک ساتھ دکھایا کریں۔ اس بار بھی تنوی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ فائزہ افتخار کا ناول "مان جاؤ" کی اس قسط نے جہاں مجھے بے تحاشا ہنسنے پر مجبور کیا وہاں فائزہ جی نے جوڈی کے کمرے کی جس طرح منظر نگاری کی ہے، وہ قابل تعریف ہے مٹی کے تیل کی بو، اس پر ماوی فنائل کی گولیوں کی بو اور سب سے بڑھ کر چربی کی بو کو میں نے اتنا محسوس کیا کہ کیا بتاؤں۔ ان کی تحریروں میں زندگی جھلکتی ہے۔ سلوی علی بٹ کا ناول "کاشی اور کایا" پڑھ کر اچھا لگا۔ کایا، کاشی اور سارے ہی کردار قابل تعریف تھے۔ اس بار شیریں ملک کا ناولٹ "میری زندگی ہے تو" بیسٹ رہا۔ تحریر نے شروع سے آخر تک اپنے سحر میں گرفتار کیا۔ نزہت شبانہ حیدر کا ناولٹ انداز تحریر زبردست تھا۔ "ویل ڈن" اس بار افسانے بھی سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ افسانوں میں ثمینہ عظمت کے افسانے نے بہت متاثر کیا حقیقت کے قریب تر محسوس ہوئی "سبز رتوں کا موسم" ہلکی پھلکی تحریر تھی دل کو چھو لینے والی۔

نو ماہ پہلے میں نے آپ کو ایک افسانہ "قسمت کا کھیل" کے نام سے بھیجا تھا۔ پلیز بتائیں ناں قابل اشاعت ہے کہ.... ؟ آپی میری ریکویسٹ ہے کہ جیو نیوز کے اینکر "مسعود رضا" کا انٹرویو لے لیں پلیز پلیز۔

مسرت! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ افسانہ کے لیے آپ فون کرکے معلوم کرلیں ابھی پڑھا نہیں گیا انٹرویو کی فرمائش ان سطور کے ذریعے شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ نبیلہ عزیز کی کمی تو ہمیں بھی محسوس ہوئی۔ ان شاء اللہ جنوری کے شمارے میں ان کی تحریر ضرور شامل ہوگی۔ نبیلہ ابر راجہ کا طویل ناول موصول ہوچکا ہے آپ جلد پڑھ سکیں گی۔

نروان علی نے لاہور سے ای میل کی ہے

نومبر کا "عید نمبر" ہمیشہ کی طرح عمدہ اور بہترین۔ آغاز سے ہی اپنی توجہ کھینچ لی بہترین حمد و نعت کے لیے شعاع کو مبارک باد۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں عید الاضحیٰ کے

حوالے سے بہت معلوماتی تھیں، پڑھا اور فیض اٹھایا۔ "نمکین عید اور میٹھے لمحات" سے چپلی کباب بنانے کی ترکیب پڑھی، طبع آزمائی کی اور گھر والوں سے خوب داد پائی۔ کہانیوں کی طرف آتے ہیں..... آمنہ ریاض بڑی عمدگی اور روانی سے لمحہ بہ لمحہ ناول پر اپنی گرفت مضبوط کر رہی ہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ فائزہ افتخار "مان جاؤ" میں اپنے مخصوص انداز میں نظر آرہی ہیں۔ ان کا انداز بیاں شگفتہ اور بے حد عمدہ ہے۔ ناولٹ سب ہی ٹھیک ٹھاک تھے البتہ افسانوں کا کیا کہنا..... مزا آگیا۔ "مستقل سلسلے" میں سب ہی کچھ اچھا تھا۔ پچھلے مہینے ایک کہانی میل کی تھی، ایسی امید تو خیر نہیں تھی کہ پہلے ہی صفحے پر شائع ہو کر ہمارا سیروں خون بڑھا دے گی مگر اتنی امید ضرور تھی کہ خط میں شاید اس کے متعلق کچھ ہدایات مل جائیں گی مگر.....

ہم تو شعاع کو اپنا سمجھتے تھے۔ یہیں سے لکھنا لکھانا سیکھا، یہیں سے مطالعہ کے شوق چرایا مگر پلیز یہ بے رخی چھوڑیے اور ہماری غلطیوں کی نشاندہی کر دیجیے تاکہ آئندہ بہترین کہانیاں لکھ سکیں۔

پیاری نروان! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ نے لکھا کہ ہم تو شعاع کو اپنا پرچا سمجھتے تھے، اچھی بہن! شعاع آپ کا ہی پرچا ہے بس آپ سے ایک غلطی ہوئی کہ آپ نے کہانی میل کی۔ کہانیاں اور دوسرے سلسلوں کے لیے انتخاب آپ بذریعہ ڈاک بھیجیں، صرف خطوط اور شعاع پر تبصرہ ای میل کیا جا سکتا ہے۔ آپ کہانی بذریعہ ڈاک بھجوا دیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہو گی ورنہ ہم اس کی خامیوں کی نشان دہی کر کے آپ کو تحریر بہتر بنانے میں مدد دیں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

لاہور سے بانو ماہی قادری شریک محفل ہیں

ہم بہت سے میگزین پڑھتے ہیں، باقی سب تو جہاں سے ملے پڑھ لیتے ہیں مگر شعاع اور خواتین تو ہر ماہ باقاعدہ خرید کر پڑھتے ہیں، صرف شعاع ہی ہے جس نے مجھے اتنا حوصلہ دیا کہ میں اس میں خط بھی لکھوں اور اس کے کسی سلسلے میں شرکت بھی کروں ایک اچھا دوست ہمت، حوصلہ، سکون سب ہی کچھ تو دیتا ہے اور شعاع میرا بہترین دوست ہے۔ اس نے ہر موسم میں میرا ساتھ دیا ہے۔ چاہے میں دکھی ہوں، خوش ہوں، مایوس ہوں یا بے حد پریشان تو جناب شعاع کے کسی بھی سلسلے کی طرف یہ پہلا قدم اٹھا تو لیا ہے مگر دوسرا قدم اٹھانے کی ہمت بے شک شعاع ہی دے گا میرا انتخاب اور خط شائع کر کے۔

پیاری بانو! آپ پندرہ سولہ سال سے ہماری خاموش قاری ہیں اور اتنے طویل عرصہ کے بعد ہمیں خط لکھا ہے۔ ہم آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں لیکن اچھا ہوتا کہ آپ شعاع کی تحریروں کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کرتیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی اور ہماری حوصلہ افزائی کے لیے شکریہ! ثمینہ سے بھی کہیں کہ وہ ہمیں خط لکھ کر شعاع کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرے۔

سحرش خان میرپور بھٹولاڑ کانہ سے لکھتی ہیں

اکتوبر کا شعاع ہاتھوں میں ہے مریم عزیز کا ناولٹ "صحرا کی خوشبو" بھی اچھا تھا مگر شہناز صدیق کی تحریر متاثر کر گئی اس میں ڈاکٹر عائش ملک کا کردار بہت امپریسو تھا۔ اس بار سورٹھ سانده کے انتخاب نے شاعری سچ بولتی ہے میں چار چاند لگا دیے تھے میں نے بھی اپنا ایک افسانہ بھوک نگر کے سارے بچے بھی بھیجا تھا کیا آپ نے پڑھ لیا ہے۔

پیاری سحرش! آپ کا افسانہ موصول ہو گیا ہے، ابھی پڑھا نہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رضوانہ شکیل راؤ نے لودھراں سے لکھا ہے

جہاں آج کل ہر شخص صرف اپنے نفع نقصان کا ترازو تھامے بیٹھا ہے اور حق ناحق، جائز و ناجائز کی تمیز اٹھ گئی ہے۔ اس نفسا نفسی کے دور میں بھی شعاع اپنا کردار بہت خوش اسلوبی سے ادا کر رہا ہے اس میں شائع ہونے والی تحریریں ہر طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

زرنین آرزو اور ہما کوکب بخاری دنیا کے جھمیلوں میں جانے کہاں گم ہو گئی ہیں ان کی خدمت میں اتنا کہنا چاہوں گی کہ ہم انہیں نہیں بھولے۔

صائمہ نے لودھراں سے پوچھا ہے کہ میں شعاع میں شرکت اتنی باقاعدگی سے کیسے کر لیتی ہوں۔ تو سسٹر، پنجابی محاورہ ہے ناں کہ (شوق دا کوئی مول نئیں) تو گھریلو مصروفیت اور اپنے بیٹے اسد اللہ کی نٹ کھٹ شرارتوں سے فراغت کے بعد میں شعاع اور خواتین کے لیے ٹائم نکال ہی لیتی ہوں۔ آخر میں فائزہ افتخار کو تھینکس کہنا چاہوں گی کہ انہوں نے ٹی وی سے ٹائم نکال کر اتنا خوب صورت ناول لکھا۔ ان کی تحریروں میں زندگی پوری وسعت اور رنگا رنگی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ کنیز نبوی کو شفا نبوی کی آمد بہت بہت مبارک ہو۔

رضوانہ! زرنین آرزو کا طویل ناول موصول ہو چکا ہے۔ جلد شائع کریں گے۔ ہما کوکب بخاری تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔ آپ نے صحیح لکھا جہاں چاہ وہاں راہ، اگر انسان میں سچی لگن ہو تو وہ کسی نہ کسی طرح وقت نکال ہی لیتا ہے۔ یہ تو شعاع سے آپ کی محبت ہے کہ آپ وقت نکال کر خط لکھتی ہیں۔

قرۃ العین انور خان نے لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت زبردست ہے۔ خاص طور پر ماڈل ثناء کے ہاتھوں پر مہندی تو بہت ہی زبردست لگی۔ شعاع عید کے دوسرے روز ملا۔ کھانے کی تراکیب سے میں نے پورا فائدہ اٹھایا۔ ترکیبیں بہت مزے کی تھیں۔ اب چلتے ہیں ناولز کی طرف فائزہ افتخار کا "مان جاؤ" پڑھ کر ہنس ہنس کر میرا پیٹ درد ہو گیا۔ بہت مزے کا ناول تھا۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔ شیریں ملک کا "میری زندگی ہے تو" بھی بہت اچھا لگا۔ ویری نائس اسٹوری اس کے بعد "کاشی اینڈ کایا" سلویٰ علی بٹ نے بھی بہت اچھا لکھا۔ بہت کیوٹ اسٹوری تھی اور باقی سب ناولز بھی بہت اچھے تھے۔ افسانوں میں "عید ہو گئی ہماری بھی" صباحت کرن کا سب سے چنگا لگا۔ "تاریخ کے جھروکے" ایک بہت زبردست سلسلہ ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب سلسلے بھی بہت زبردست تھے اور پکوان کے لیے ریکویسٹ ہے کہ پلیز اوون کے بغیر بھی پزا اور کیک بنانے کی تراکیب بتائیں۔ تاکہ جن کے پاس اوون کی سہولت نہیں مجھ جیسے غریب بھی اپنا شوق پورا کر سکیں۔ ارے ایک بات تو بتائیں۔ یہ جو ناولز کے ساتھ تصاویر ہوتی ہیں خیالی ہوتی ہیں یا حقیقی؟ ویسے صفحہ نمبر 9 اور 241 کی تصاویر بہت پیاری تھیں۔

قرۃ العین! آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔ آئندہ ماہ ان شاء اللہ کیک اور پزا اوون کے بغیر بنانے کی ترکیب ضرور دیں گے۔ تصاویر زیادہ تر ماڈلز اور اداکاراؤں کی ہی ہوتی ہیں۔ خیالی تصاویر بہت کم ہوتی ہیں۔

سویدہ سحرش گڑھی شاہو سے ای میل کرتی ہیں

ٹائٹل پر بنی دلہن بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ "مان جاؤ" فائزہ افتخار کی بہت مزاحیہ تحریر ہے۔ چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔ "دیوار شب" میرا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ اس کی اسپیڈ بڑھا دیں اور پلیز 60 قسطوں تک مت لے جائیے گا۔ "ستارہ شب" دوسرے نمبر پر پسندیدہ ناول ہے۔ اس دفعہ بھی ایسا لگا کہ جلدی ختم ہو گیا۔ سلویٰ بٹ کا "کاشی اینڈ کایا" پسند آیا۔ "آپ جیسی لڑکی" تھوڑا عجیب لگا۔ مرتضیٰ کا ڈرامائی انداز میں اریج کو پسند کرنا کچھ ہضم نہیں ہوا کیونکہ میں نے خود دیکھا ہے کہ باہر ملک سے آنے والوں کے مزاج کافی چڑھے ہوئے ہوتے ہیں اور کسی غریب کو تو ہرگز منہ نہیں لگاتے.....

"باتوں سے خوشبو آئے" بہترین معلوماتی سلسلہ ہے "شاعری" ہمیشہ اچھی لگتی ہے "انٹرویو" بھی سب اچھے تھے۔ "پکوان" اور "خوب صورت بنیے" بھی اچھا تھا۔ افسانے اور ناولٹ ابھی پڑھے نہیں ہیں۔

سویدہ! شعاع پر تبصرے کا شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

سرگودھا سے ایمن تحریم لکھتی ہیں

ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ سب سے پہلے "ستارہ شام" پڑھی کہانی کی رفتار کچھ بڑھی ہے تو دلچسپی بھی کچھ بڑھ ہی گئی ہے "میری زندگی ہے تو" بھی بہت زبردست کہانی تھی حرا کا کردار بہت معصوم، سادہ سا بہت اچھا لگا "کاشی اینڈ کایا" تو..... بہترین تھا، کایا نے اپنی پڑھائی کی قربانی دے کر صرف کاشی کو پڑھایا۔ اپنی نوکری کی تمام رقم سے اس کی ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کی اور جو کاشی نے اس کے ساتھ کیا تو۔ لیکن آخر بہت بہت اچھا تھا "آپ جیسی لڑکی" بھی اچھی کہانی تھی۔ مرتضیٰ کا اریج کو منتخب کرنا بہت اچھا فیصلہ تھا "گرد گرد مسافتیں" افسانوں میں ٹاپ پر تھا رائمہ نے مصعب سے ڈائیورس لے کر یہ راہ خود اپنائی تھی مگر پھر بھی تھی تو وہ بھی ایک لڑکی نا آخر۔

ایمن! ہمیں افسوس ہے پچھلے ماہ آپ کا خط شائع ہوا لیکن اس کا جواب نہ لگ سکا۔ آپ کو جو کوفت ہوئی اس کے لیے معذرت۔

شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

سحر خان کوئٹہ سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

ہمیں خوش فہمی نہیں بلکہ بڑا پکا یقین تھا کہ خواہ وہ "شعاع" ہو یا "خواتین" ہمارا بھی اتنا ہی ہے جتنا کہ باقی قارئین کا لیکن یقین کے ساتھ ساتھ خوش فہمی اور یقینی غلط فہمی بھی اختتام پذیر ہوئی 'وجہ یقیناً' یہ نہیں کہ میرا خط شائع نہیں ہوا، اگرچہ خط میں تنقید تھی بھی تو مثبت ہی تنقید تھی لیکن ہاں اس بات کا ضرور افسوس ہوا کہ آپ لوگوں نے معیاری اشعار کو بھی نظر انداز کر دیا۔

دراصل رضیہ جمیل صاحبہ مانا کہ ہم چھوٹے شہر کے لوگ سہی مگر دلوں کے چھوٹے ہرگز نہیں خط بے شک آپ کی بزم میں آپ کے معیار کے نہ سہی مگر اشعار کو کسی بھی طور غیر معیاری نہیں کہا جا سکتا پھر نجانے کیا وجہ ہے کہ سحر خان اور سنیہ زاہد کوئٹہ کے اشعار تک آپ لوگوں کے معیار پر پورے نہیں اترتے۔ بہر حال گزشتہ گیارہ برسوں کے ساتھ نے دل شکنی کے ساتھ ساتھ دل برداشتہ بھی کیا، مگر کوئی بھی لفظ (اور یقیناً" ہر لفظ) ناگوار خاطر گزرنے کے لیے تہہ دل سے معذرت خواہ۔

پیاری سحر! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کا خط اور اشعار شائع نہ ہو سکے جہاں تک ہمیں یاد پڑتا ہے کہ آپ کے نام مختلف سلسلوں میں شائع ہوتا رہا ہے۔ اتنی پختہ اور خوب صورت تحریر ہماری بہت کم قارئین کی ہے، اس لیے ہمیں یاد ہے۔ ممکن ہے کہ وہ کوئی اور سحر خان ہو بہر حال آئندہ خیال رکھیں گے کہ آپ کی تحریریں شعاع میں شامل ہوں۔ یہ خوش فہمی یا غلط فہمی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ شعاع آپ کا اپنا پرچا ہے۔ تنقید اور تعریف سے فرق نہیں پڑتا آپ بے لاگ تبصرہ کریں۔ تنقید سے ہمیں پرچا بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے۔

طیبہ سعدیہ، سعدی نے سیالکوٹ سے شرکت کی ہے

سب سے پہلے پہلی شعاع پڑھا پھر حمد و نعت سے فیض یاب ہوئے پیارے نبی کی پیاری باتیں پڑھیں۔ پھر بندھن میں عدنان شاہ ٹیپو اور حاجرہ عدنان کا انٹرویو پڑھا زبردست تھا۔ سرورق بڑا زبردست تھا میری امی کو بھی بہت پسند آیا۔ خاص کر ڈریس، مہندی، میک اپ سب کچھ ہی اچھا تھا۔ نمکین عید کے میٹھے لمحات..... واہ جی واہ ..... کیا خوب تھا۔ پھر دستک پڑھا ثمینہ ہمایوں سعید، اسد ملک سید فصیح الدین سہروردی کے بھی مختصر انٹرویو اچھے تھے۔ شاعری سچ بولتی ہے۔ یہ تو ہمیشہ ہی زبردست ہوتا ہے۔ تمام افسانے بھی اچھے تھے۔ صاحب بکرا، کچھ رشتے بس، قربانی ہو گئی عید ہماری بھی، گرد گرد مسافتیں، سبز رتوں کا موسم سبھی کے سبھی زبردست تھے۔ ناولٹ فصیح کا ستارہ زبردست چل رہا ہے۔ کاشف کو اچھی سزا ملنی چاہیے اور یہ رانی کیوں بھاگ گئی؟ اس کو تو زیادہ سزا ملے۔ آپ جیسی لڑکی میں اریج کا کردار اچھا تھا اور اریزا کیا بنا؟ اس کا انجام تو آپ نے دکھایا ہی نہیں ..... کیوں؟ کاشی اینڈ کایا بھی زبردست تھی۔ مکمل ناول مان جاؤ کی دوسری قسط فائزہ افتخار ویل ڈن آپ نے تو ہنسا ہنسا کے مار دیا بڑا ہی مزا آیا۔ جوڈی کی گالیاں ہاہاہا..... کیا بتاؤں؟ "میری زندگی ہے تو" شیریں ملک نے بھی بہت اچھا لکھا۔ مبارکباد شیریں ناول اچھا لکھنے کی صورت میں۔

پیاری طیبہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

صبا عارف کہلون ای میل کرتی ہیں

ماہ ستمبر کے شعاع میں سندس جبیں کا "قافلے راہ بھول جاتے ہیں" پڑھا۔ اس میں ایک چھوٹی سی نظم تھی۔

میری گواہی آدھی ہے تو
میرا جرم بھی آدھا ہو گا
میرا حصہ آدھا ہے تو
میری سزا بھی آدھی ہو گی

کہانی سے مطابقت نہ رکھتے ہوئے بالکل غیر ضروری شاعری تھی مگر مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں۔ مگر اس چھوٹی سی نظم میں مصنفہ اللہ تعالیٰ سے یہ کہنا چاہ رہی ہیں کہ "ہمارا حصہ آدھا کیوں رکھا ہے.....؟" میں سمجھتی ہوں کہ آپ مجھ سے زیادہ جانتی ہوں گی کہ "آدھا حصہ" اور "آدھی گواہی" کا یہ سبب نہیں ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ آپ کے ڈائجسٹ میں ایسی شاعری چھپ سکتی ہے۔ میں پتا نہیں کب سے آپ کا ڈائجسٹ پڑھ رہی ہوں مگر ان چار لائنوں نے تو میرا دل ہی توڑ کر رکھ دیا۔ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں، سو مجھے وضاحت دیں پلیز۔

صبا عارف! آپ نے ہماری غلطی کی نشان دہی کی، بہت شکریہ ہم اپنے قارئین اور اللہ تعالیٰ سے اس سہو کے لیے معافی کے خواست گار ہیں۔ شعراء حضرات اکثر حد سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ مصنفہ یا ہمارے ذہن میں کہیں دور دور تک اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے انحراف کیا جائے۔ اگر ہمارے مذہب میں عورت کی گواہی آدھی ہے تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں، جو بالکل درست ہے۔ اللہ تعالیٰ بہتر جاننے والا ہے اور وہ اپنی مصلحتیں خود جانتا ہے۔ ہم ناقص علم رکھنے والے ایسا سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس سہو کے لیے ایک بار پھر معذرت۔

صالحہ، اقصیٰ نے میرپور آزاد کشمیر سے لکھا ہے

ٹائٹل اچھا تھا۔ پورے شمارے پر مختصر نظر ڈال کر اپنے سلسلہ وار ناول ستارہ شام کی طرف دوڑ لگائی۔ آمنہ جی آپ نے تو سارے ہی رازوں سے پردہ اٹھا دیا ہے۔

دیوار شب میں عالیہ جی! اب معاذ اور جویا کے ساتھ مزید زیادتی مت کیجیے گا۔ ان دونوں کو اب جلدی سے ملا دیں۔

فائزہ جی! آپ کا تو نام ہی کافی ہے۔ آپ جب بھی آتی ہیں چھا جاتی ہیں۔ آپ کی کردار نگاری اور منظر نگاری پر مضبوط گرفت دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ دادی اور جوڈی کے قصوں نے تو ہمیں ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا اب دیکھتے ہیں کہ جوڈی کے بچے کیا گل کھلاتے ہیں۔ نزہت شبانہ کے ناولٹ میں اریزہ کو اتنا سنگدل بھی نہیں ہونا چاہیے تھا اریج کا کردار ہمیں پسند آیا۔ کاشی اینڈ کایا بھی اچھا تھا۔ افسانوں میں ثمینہ عظمت کا کچھ رشتے بس، سب سے اچھا رہا باقی افسانے بھی اچھے تھے رخسانہ جی! کہاں غائب ہیں جلد آجائیں۔

صالحہ اور اقصیٰ! رخسانہ نگار کی تحریر آپ جلد ہی پڑھ سکیں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اقراء تبسم اوکاڑہ سے شریک محفل ہیں

مجھے بھی شعاع کے افسانے اور ناولٹ بہت اچھے لگے۔ اگر میں کوئی افسانہ بھیجوں تو کیا وہ شائع ہو جائے گا؟ شعاع میں عاطف اسلم (سنگر) کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

اقراء! شعاع کی بزم میں خوش آمدید افسانہ بھجوا دیں قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہو گا۔ شعاع میں شائع ہونے والی تحریروں کا اعزازیہ دیا جاتا ہے۔

سمیہ ناز نے چنیوٹ سے لکھا ہے

میں چودہ سال سے شعاع کی خاموش قاری ہوں۔ یہ تو بھلا ہوا راحت جبیں صاحبہ کا جنہوں نے درد کا موسم لکھ کر ہمارا دل لوٹ لیا اور ہمیں خط لکھنے پر مجبور کیا ایمن سے بہت بہت ہمدردی محسوس ہوئی طلاق والی قسط پڑھ کر میں خوب روئی کیا تھا اگر جو طارق ایمن کو معاف کر دیتا مگر ہماری رائٹر طارق کا ظرف سمندر جیسا کہاں سے لاتی؟ خط پہلی بار لکھ رہی ہوں سو پرانی بات کہہ دی۔

میں بیان نہیں کر سکتی کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں میں سے رات کی نعمت کتنے نمبر پر ہے اس لیے تو اللہ فرماتا ہے "تو تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے" جب تمام دنیاوی گورکھ دھندوں سے جان چھوٹتی ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتی اس وقت شعاع پڑھنے میں کتنا مزا آتا ہے خاص کر شادی شدہ زندگی میں فرصت کے لمحات شاذ و نادر ہی ملتے ہیں اور ہم مابدولت نہ صرف شادی شدہ

مبارک باد

آپ کی پسندیدہ مصنفہ آمنہ ریاض کے آنگن میں خوشیوں نے دستک دی ہے۔ وہ 19 نومبر 2011ء کو بابل کے انگنا سے پیا سنگ وداع ہو رہی ہیں۔

اس پُر مسرت موقع پر ادارہ خواتین ڈائجسٹ آمنہ ریاض اور ان کے اہل خانہ کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہے ہماری دعا ہے کہ زندگی کا یہ خوش گوار موڑ ان کے لیے دائمی خوشیاں لے کر آئے۔ آمین

آمنہ ریاض اپنی خوش گوار مصروفیات کے باعث اس ماہ ناول "ستارہ شام" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ ان شاءاللہ آئندہ ماہ "ستارہ شام" کی قسط شامل اشاعت ہو گی۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

ہیں بلکہ تین بچوں کی اماں جان ہیں سب سے بڑی بیٹی میری مریم ہے جو کہ نو سال کی ہے پھر مائرہ ہے اور پھر ماہ نور ہے اور آخر میں میں اپنے شہر کا تعارف کرانا چاہوں گی۔

میں ضلع شہر چنیوٹ کی رہنے والی ہوں میرا ضلع صاف ستھرا شہر ہے یہاں کا فرنیچر بہت مشہور ہے چنیوٹ میں ہر سہولت میسر ہی سوائے بجلی کے (لوڈ شیڈنگ کی زیادتی، جو کہ اب ملک بھر کا مسئلہ ہے چنیوٹ کا پانی میٹھا ہے یہاں کے لوگ محبت کرنے والے اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونیوالے ہیں چنیوٹ کے لوگوں میں تعلیم حاصل کرنے کا شعور بڑی تیزی سے فروغ پا رہا ہے یہاں پر بہت اعلیٰ اسکول قائم ہو چکے ہیں جو کہ بچوں میں تعلیم پھیلانے میں سرگرم ہیں۔

سمیہ! بات ظرف کی نہیں حالات کی ہوتی ہے۔ کچھ فیصلے ناگزیر ہوتے ہیں۔ اس نے ایمن پر اندھا اعتماد کیا تھا۔ ایمن نے نہ صرف اس کے اعتماد کو توڑا بلکہ اس کی اولاد کو بھی قتل کیا۔ طارق ایمن کو معاف کر دیتا لیکن اولاد سے محرومی کا دکھ اسے ہر قدم پر ایمن کی بے وفائی یاد دلاتا۔ کیونکہ ایمن ماں نہیں بن سکتی تھی ان حالات میں اس کے اور ایمن کے حق میں بھی یہی بہتر تھا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ چودہ سال بعد آپ نے قلم اٹھایا بہت خوشی ہوئی اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

زوباریہ خالد لاہور سے تشریف لائی ہیں، لکھتی ہیں

ٹائٹل بہت ہی زیادہ اچھا لگا' ماڈل کی جیولری' مہندی' میک اپ واہ واہ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ثمینہ بیگم کے انکشافات نے ماوی کو کیا ہمیں بھی حیران کر دیا۔ "صبح کا ستارہ" میں مجھے ایک بات کی سمجھ نہیں آئی ایک ماں (سارا علوی) اپنی بیٹی (ماہین) کے ساتھ کیسے اتنا برا سلوک کر سکتی ہے صرف اس بات پہ کہ وہ بد صورت ہے۔ شیریں ملک کا ناول "میری زندگی ہے تو" بھی پسند آیا۔ تمام افسانے اور ناولٹ پسند آئے۔ مجموعی طور پر شعاع بہترین تھا۔ آپ نے مستقل سلسلہ "شعاع کے ساتھ ساتھ" کیوں ختم کر دیا ہے۔ پلیز اس کو دوبارہ شروع کریں اور میری آپ سے درخواست ہے کہ مجھ سے ملیے میں FM-103 کے RJ ڈاکٹر اعجاز وارث کا انٹرویو ضرور شائع کریں۔

پلوشہ گل نے کوٹ ادو سے لکھا ہے

نومبر کا شمارہ بے حد پسند آیا' ٹائٹل کی تو جتنی تعریف کروں اتنی ہی کم ہے۔ سب ہی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں' آپ سے ایک گزارش ہے کہ پلیز آپ ARY کے نیوز کاسٹر عادل عباسی اور GEO کی نیوز کاسٹر عائشہ بخش کا انٹرویو ضرور کریں۔

پیاری پلوشہ! ہمیں بے حد افسوس ہے آپ کا پچھلا خط شائع نہ ہو سکا۔ انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فرخ فاطمہ نے حویلی لکھا سے لکھا ہے

سب سے پہلے فائزہ افتخار کو شرف ملاقات بخشا۔ "مان جاؤ" بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ مکمل ناول پڑھنے کے دوران قہقہے (میرے) چھت پھاڑتے رہے اور گھر والے یوں دیکھتے رہے جیسے انہیں میری خرابی دماغ کا یقین آ چکا ہو۔ ویل ڈن فائزہ افتخار شیریں ملک کا مکمل ناول کچھ خاص نہیں لگا۔ ناول کا تھیم اچھا تھا لیکن کردار نگاری کمزور تھی۔ نصرت بیگم کو شروع میں بہت حاسد دکھایا گیا لیکن آخر میں اتنی اچھا۔ یہ کہانی کا ویک پوائنٹ تھا جس کو دل نے تسلیم نہ کیا۔ یکدم سرمد اعوان سے معافی مانگنا سمجھ میں نہیں آیا۔ سرمد کی بات کے ردعمل کے طور پر حرا کا بے ہوش ہو کر گرنا بھی عجیب لگا کیونکہ اس نے کوئی قابل گرفت بات نہیں کی تھی۔

نزہت شانہ حیدر کا "آپ جیسی لڑکی" وہی گھسی پٹی فارمولا کہانی تھی۔ تمام رائٹرز سے استدعا ہے کہ نئے آئیڈیاز پر طبع آزمائی کریں۔ سلوی علی بٹ کا "کاشی اینڈ کلیا" بھی بس ٹھیک تھا۔ کہانی میں کہیں کہیں غیر حقیقی پن تھا۔ اب اس شمارے کی جان یعنی افسانوں کی طرف آتے ہیں۔ ثمینہ عظمت صاحبہ کا افسانہ قابل تعریف ہے۔ بہت اچھوتے ٹاپک پر لکھا گیا افسانہ جھنجھوڑ کر رکھ گیا۔

دوسرے نمبر پر عائشہ خان کا "گرد گرد مسافتیں" ام ثمامہ اور حوا بی کے افسانے بھی اچھے تھے۔ جبکہ صباحت کرن کا افسانہ سو سو تھا۔

آمنہ ریاض صاحبہ کا "ستارہ شام" خوب جگمگاتا رہا

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

ہے۔ بہت زبردست ناول ہے اور بہت خوب صورتی سے نئے موڑ لے رہا ہے۔

"آئینہ خانے میں" کو کیا ہو گیا ہے؟ اس سلسلے میں پرانے سٹارز کی بجائے حاضر سروس اداکاروں یا گلوکاروں کے متعلق دیا کریں۔ اس ماہ کی مسکراہٹ واقعی ہی مسکراہٹیں تھیں۔ "تاریخ کے جھروکے" میں اصحاب کہف کے متعلق پڑھ کر مزا آیا۔ "سیر دو جہاں" میں آمنہ زرین صاحبہ کا تبصرہ حسب معمول دلچسپ تھا۔

انٹرویوز میں "دستک" سلسلے کو بند کر کے کوئی اور شروع کریں۔

پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح پیاری تھیں۔

پیاری فرخ! پچھلے ماہ آپ کا خط شامل اشاعت نہ ہو سکا۔ اس کے لیے معذرت۔ آپ کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

سیما انصار نے مظفر گڑھ سے لکھا ہے

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" ہمیشہ کی طرح مشعل راہ ثابت ہوئیں۔

انٹرویو بھی اچھے تھے لیکن فصیح الدین سہروردی کا انٹرویو پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا کیونکہ یہ میرے پسندیدہ نعت خوان ہیں۔

"نمکین عید کے پکوان" بھی لذیذ تھے۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں سدرہ حنیف کا انتخاب لاجواب تھا۔ سارا انتخاب ہی میرے فیورٹ شعرا کا تھا۔

اس کے بعد "ستارہ شام" کی باری آئی۔ جس نے نیا ٹرن لیا ہے جو کہ بہت دلچسپ ہے۔ "صاحب بکرا" میں "حوالی بی" نے اور "قربانی ڈبہ" میں "ام ثمامہ" نے "ایثار اور سچی قربانی" کی بہت ہی جامع منظر کشی کی۔

"ہو گئی عید ہماری بھی" میں صباحت کرن نے خوب صورت پائیداری کی خوب صورت منظر کشی کی۔ "کچھ رشتے بس" میں نیٹ کے ذریعے ـــ رشتوں کے بھرم کھلے جو کہ حقیقت پر مبنی تھے۔ "میری زندگی ہے تو" میں شیریں ملک نے "اعتبار" کو بہت اچھے انداز میں پیش کیا۔

"کاشی اینڈ کایا" آج کے دور میں لڑکا 'بڑی عمر کی لڑکی سے شادی کے لیے رضامند ہو جائے' کچھ یقین نہیں آیا۔ لیکن مقدر پر یقین ہے۔ "آپ جیسی لڑکی" متضاد خیالات رکھنے والی بہنوں کی ایک اچھی تحریر تھی۔

"گرد گرد مسافتیں" عائشہ خان کی ایک خوب صورت سبق آموز تحریر تھی۔

اور اب ..... وہ شاہکار جس کا سارے ماہ انتظار کیا' ارے واہ! آپ نے صحیح پہچانا 'فائزہ جی کا "مان جاؤ" ایک سے بڑھ کر ایک لفظ' ایک سے بڑھ کر ایک لائن کمال کیا..... کتنا کتنا کہے بندہ۔ ان خوب صورت چمکتے الفاظ کے بارے میں 'ایسے ناول ضرور شامل ہونے چاہئیں تاکہ انسان تھوڑی دیر کے لیے ذہنی طور پر ریلیکس ہو سکے' مکمل تبصرہ پورے ناول کے بعد۔

"اصحاب کہف" کے بارے میں 'میں پہلے بھی پڑھ چکی ہوں لیکن جو معلومات مجھے "شعاع" کے توسط سے ان کے متعلق ملیں' اس سے پہلے میں اتنا کچھ ان کے بارے میں نہیں جانتی تھی۔ "بیگمات کے آنسو" پڑھ کر واقعی ـــ میرے آنسو نکل آئے۔

اور اب بہت آخر میں ایک پیار بھرا شکوہ! میں نے آپ کو اپنی ایک تحریر بھجوائی تھی' اس کے متعلق آپ نے کچھ نہیں بتایا۔

پیاری سیما! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ آپ کا افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔ پڑھ کر ہی بتا سکتے ہیں قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

☼

ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ اور ادارہ خواتین ڈائجسٹ کے تحت شائع ہونے والے پرچوں ماہنامہ شعاع اور ماہنامہ کرن میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی ٹی وی چینل پہ ڈراما' ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے پبلشر سے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

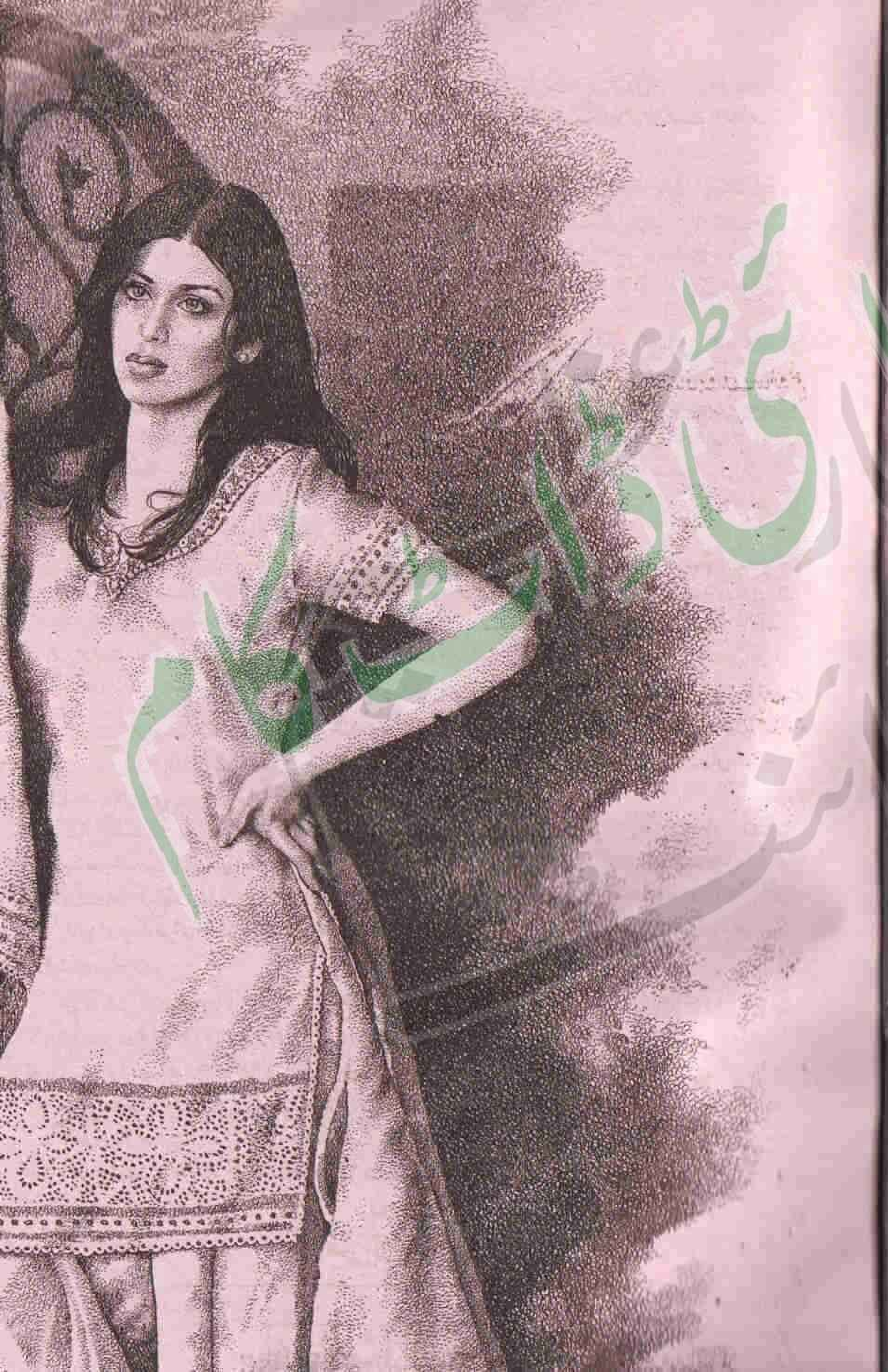

عالیہ بخاری

الوداع عشق

خیام کا تعلق اس دُنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اُٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آ کر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آڑکی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دُکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو رفاہی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دُعا گو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دُھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال دی ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصۂ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی امارت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کر پاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زویلہ کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جا رہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاما ہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کر لیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہو جاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود غرضی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سیکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری نبیل ہے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ڈرائیور راجو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کر رہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جزبز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہو جاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوا دیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔ سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہو چکا ہے اور شاذ و نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آناً فاناً طے ہو جاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی کوششیں شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ اور جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ گم صم سا ہو جاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کر دیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو آگسانی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کر سکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کر دیتی ہے۔

صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۴۶

چھیالیسویں قسط

گیتی کی جواب طلب نگاہ، سالار کے چہرے پر جمی تھی۔

"یقین مانیے مجھے بالکل بھی برا نہیں لگے گا اگر آپ....." ارد گرد بڑھتے ہجوم کی پروا کیے بغیر، سالار نے بڑی نرمی سے گیتی کے لبوں پر ہاتھ رکھا اور مسکرا دیا۔

"کیا کرتے ہیں؟" وہ جھینپ کر پیچھے ہٹی۔

"تم بھی تو بے وقوفی کی باتیں کرتی ہو! اب کیا ہر بات، بچوں کی طرح مجھ سے پوچھ پوچھ کر کرو گی، اور نانی ستارہ کا حوالہ میرے لیے باعث شرم نہیں ہے، یہ بات دس بار کہہ چکا ہوں تم سے اور اب سارے زمانے سے بھی کہوں گا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اب جہاں ہم جا رہے ہیں، وہاں موجود لوگوں کو صرف اس بات سے فرق پڑتا ہے کہ تم میری بیوی ہو، سمجھیں!"

وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا اور اس سے بڑھ کر کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ راجو ٹیکسی کا دروازہ کھولے منتظر تھا۔

راستہ خاموشی سے کٹا، وہ پوری محویت سے باہر تیزی سے بھاگتے مناظر کو دیکھے گئی اور سالار اسے۔

"کراچی بہت بڑا شہر ہے، میرے اندازوں سے بھی کہیں زیادہ، یہاں تو اگر کوئی کھو جائے تو اس کا ملنا بھی مشکل ہے۔"

جب وہ گھر سے کچھ ہی دور رہ گئے تھے، گیتی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

اس کے انداز میں بچوں کا سا اشتیاق اور حیرت تھی، مگر وہ کچھ بجھ سا گیا۔

"شاید وہ خیام کے بارے میں سوچ رہی ہے۔" دل میں بڑا بے ساختہ سا خیال آیا تھا۔

گیتی اپنی بات کہہ کر پھر سے باہر متوجہ تھی۔ اس کے چہرے پر پھیلا اطمینان سالار کو شرمندگی میں مبتلا کرنے لگا مگر اندر کہیں اندر چبھن سی باقی رہتی ہی تھی۔

گیٹ پر کھڑا گارڈ نیا تھا، مگر سالار کے تحکم بھرے انداز پر گیٹ فوراً کھلا تھا، ٹیکسی گھر کے بڑے سارے کھلے ہوئے گیٹ میں داخل ہوتی چلی گئی۔

رات گہری ہو رہی تھی اور لان اور پورچ وغیرہ کی ساری لائٹیں روشن تھیں۔

گیتی نے اترتے ہوئے ایک سادہ سی نگاہ اطراف میں ڈالی، یہاں آنے سے پہلے مکینوں کا جو تعارف اسے سالار کی زبانی حاصل ہوا تھا۔ وہ دل پر ہلکا سا سہم طاری کر رہا تھا۔ ملازمین میں ایک دم ہی سرگرمی سی جاگ اٹھی تھی۔

زیادہ تر لوگ ان تھوڑے دنوں میں ہی پھر سے بدلے گئے تھے، مگران میں جو اکا دکا پرانا باقی تھا، وہ یہاں سالار کا تعارف دے چکا تھا۔

راجو سامان لے کر اندر جا چکا تھا۔

زرتاج کا بی پی تھوڑی دیر پہلے ختم ہونے والی نبیل کے دوستوں کی پارٹی کے صدقے، تیزی سے ہائی ہوا تھا، دل بھر کر چیخنے چلانے کے بعد وہ ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اپنی دوا لے کر لیٹی تھیں کہ لاؤنج میں سے لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازوں نے دخل اندازی شروع کی۔

"کیا دماغ خراب ہو گیا ہے ان لوگوں کا، کون ہے اس وقت۔" بڑے ہی کرخت لہجے میں کہتے ہوئے وہ اٹھ کر بیٹھیں۔ نبیل پھرتی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔

"میں دیکھتا ہوں، تم آرام کرو، شاید ملازم ہیں۔"

"ہاں، اب میرے گھر کی یہی اوقات رہ گئی ہے کہ تمہارے سڑک چھاپ دوست اور نوکر چاکر ہی بے تکلفی سے گھومیں یہاں۔"

ان کی جھنجھلاہٹ اور بھی بڑھی۔ نبیل کو عافیت اسی میں محسوس ہوئی کہ وہ بغیر کچھ کہے کمرے سے نکل جائے۔

لاؤنج سے اوپر جاتی سیڑھیوں پر سے راجو سامان اٹھائے جا رہا تھا اور باہر کے داخلی دروازے سے مزید دو ملازم بھاری بیگ سنبھالتے ہوئے اندر آ رہے تھے۔

"کیا ہے یہ سب؟ کس کا سامان ہے؟ بغیر پوچھے اندر کیسے لائے ہو تم لوگ؟" گھر پر اس کا مالکانہ احساس زرتاج سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکا تھا، سو وہ بہت تلملا کر آگے بڑھا۔

دونوں ملازم سہم کر رکے تھے، تب ہی سیڑھیوں پر کھڑے راجو نے انہیں آواز دی۔

"رک کیوں گئے ہو، اوپر آؤ سامان لے کر!" نبیل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا مگر وہ اس کے بجائے ملازموں کی طرف دیکھ رہا تھا، جو اس کے حکم پر "فوراً" ہی آگے بڑھ چکے تھے۔ نبیل کا حکم راجو کے آگے رد ہوا تھا۔

"تمہارا دماغ کیا بالکل ہی خراب ہو گیا ہے راجو! تمہیں اندر آنے کی اجازت کس نے دی، دفع ہو جاؤ پاگل آدمی!"

اس بار وہ اتنی زور سے چلایا کہ اندر کمرے میں بے چینی سے کروٹیں بدلتی ہوئی زرتاج کو اٹھ کر پھر سے بیٹھنا پڑا۔

"بدبخت، جاہل!" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائیں۔ باہر سیڑھیوں کی ریلنگ پر جھکا کھڑا راجو برستے ہوئے نبیل پر اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

"کوئی ہے، جو اس پاگل آدمی کو یہاں سے نکالے۔ اتنے دن سے دفع تھا" آج کہاں سے پھر۔"

حلق کے بل چلاتے ہوئے نبیل کو اپنے پیچھے کسی کی موجودگی کے احساس نے بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ "تم!"

ایک چھوٹے سے لفظ میں بھاری بھرکم خوف اور مایوسی تھی اور اس سے بھی زیادہ حیرت۔

"کیوں، ابھی اتنے دن تو نہیں گزرے تھے کہ تم میری واپسی پر اس طرح حیرت زدہ ہو!"

سالار کے چہرے پر دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔

"ایسی کوئی بات نہیں، تمہارا گھر ہے!" وہ بمشکل ہی کہہ پایا۔

سالار ہلکے سے ہنس پڑا۔

"ٹھیک کہا تم نے گھر تو میرا ہی ہے، یہ الگ بات کہ آج کل وقتی طور پر اس میں تم رہ رہے ہو۔ پتا نہیں کب تک کے لیے۔"

اس بار نبیل نے جواب دینے سے گریز کیا تھا۔ توجہ بار بار سالار سے ذرا پیچھے کھڑی گیتی پر جا رہی تھی۔

"کیا لڑکی ہے؟" اپنی اتنی نامعقول حیثیت میں بھی اس کی آوارہ ذہنیت نے اپنا رنگ دکھایا۔

"میری بیوی کو اس طرح نظر جما کر مت دیکھو نبیل! ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔"

سرد لہجے میں دی ہوئی وارننگ نے ماحول پر سناٹا سا طاری کیا۔

زرتاج چند قدم پیچھے ہی رکی تھیں۔ آج کا دن ہی اچھا نہیں تھا۔

پہلے نبیل کے دوستوں کے ہاتھوں انتہائی ذلت اور اب "اب یہ سالار۔

اور اس بار اکیلا بھی نہیں! زرتاج کی کڑی تنقیدی نگاہ نے گیتی کا جائزہ لیا۔

"سلام کرو گیتی! یہ میرے والد کی دوسری بیوی ہیں۔"

وہ تعارف کی رسم نمٹا رہا تھا "تم انہیں اپنی ساس کہہ سکتی ہو، مگر یہ صاحب، بہر حال تمہارے سسر نہیں ہیں۔"

اس کا مذاق اڑاتا انداز توہین آمیز تھا، مگر وہ دونوں ہی اسے برداشت کرنے پر مجبور۔

"تو شادی کر ہی لی تم نے!"

گیتی کے سلام کو نظر انداز کرتے ہوئے زرتاج نے جیسے یقین دہانی چاہی۔

"بیوی کہا ہے تو شادی بھی کی ہو گی اتنی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آ رہی، کمال ہے!"

"شاید اس لیے کہ میں اس شادی میں شریک نہیں تھی، مانا ہمارے آپس کے تعلقات اچھے نہیں ہیں، لیکن مجھے اطلاع دینا تمہارا فرض بنتا تھا سالار! بڑے بیٹے ہو اس گھر کے، یہی سوچ لیتے کہ تمہارے باپ کی روح کو کتنی تکلیف پہنچی ہو گی تمہاری اس خفیہ شادی سے۔" وہ بالکل سالار کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئیں۔

"میرے باپ کی روح کو میری نہیں آپ کی خفیہ شادیوں سے جتنی تکلیف پہنچنی تھی، پہنچ چکی۔ اب تو ان کی روح بھی عادی ہو گئی ہو گی، یا پھر......"

"تم کبھی نہیں سدھرو گے سالار! میں اس لڑکی کے سامنے کوئی تماشا نہیں کھڑا کرنا چاہ رہی ہوں بہتر ہو گا کہ ہم کسی اور وقت بات کریں۔"

تیزی سے بات کاٹ کر، وہ کہتے ہوئے مڑنے لگیں۔

"لیکن ہم جب بھی بات کریں گے، ہمارے درمیان یہی باتیں ہوں گی، یہ آپ بھی جانتی ہیں۔"

زرتاج نے اسے اپنے پیچھے کہتے ہوئے سنا، مگر اس بار اس کی حکمت عملی مختلف تھی۔

"نبیل! اپنے کمرے میں چلو۔" بہت سکون بھرے انداز میں کہتے ہوئے، وہ اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھیں اور ان کے پیچھے نبیل بھی۔

اتنی دیر سے خاموش کھڑی گیتی نے دھیرے سے سالار کے بازو کو چھوا۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو، آتے ہی لڑنا شروع کر دیا، حالانکہ ان کی شکایت تو ٹھیک ہی تھی نا، جیسی بھی ہیں، آپ پر ان کا حق ہے۔"

سالار کے ماتھے پر ہلکی سی شکن آئی۔

"حقوق و فرائض کا قصہ، اس گھر میں مدتوں پہلے نمٹایا جا چکا ہے گیتی! اب تو ہم سب صرف حالت جنگ میں ہیں، مجھے کچھ بھی یاد دلانے سے پہلے، یہ بات ضرور خود یاد رکھنا۔"

وہ بہت سنجیدہ تھا... اور بہت زیادہ دکھی بھی....

گیتی نے شرمندگی سے نگاہ جھکائی۔

اس بڑے سے وسیع لاؤنج میں اب صرف وہی دونوں کھڑے تھے، سالار نے نرمی سے اس کے بالوں کو چھوا۔

"میں نے بہت لمبی تنہائی کاٹی ہے گیتی! اس اتنی بڑی دنیا میں، اتنے ہجوم میں کوئی بھی نہیں تھا میرا، اکیلا پن کتنا بڑا عذاب ہے، یہ میں جانتا ہوں، مگر اب تم ہو میرے ساتھ تو مجھے اپنی خوش نصیبی پر خود رشک آتا ہے، زندگی میں پہلی بار میں اتنا خوش ہوں، اتنا خوش ہوں کہ......"

حلق میں اٹکے نمکین پانی نے اس کے بات ادھوری چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔

گیتی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے کتنے ہی قطرے روانی کے ساتھ ٹپکے۔

سالار کے دکھ پر بھی اور اپنی خوش نصیبی پر بھی، بے ساختہ ہی سالار نے اسے خود سے قریب کیا تھا۔

"اور یہ لڑکی!" اندر اپنے کمرے میں بیٹھی زرتاج نے اضطراب سے پہلو بدلا "معلوم نہیں کیا عزائم لے کر آئی ہے سالار کی زندگی میں اس طرح چپ چپاتے۔ کوئی خاندانی گھرانہ تو اپنی لڑکی نہیں تھما سکتا اور ویسے بھی سالار تو شروع سے ہی آوارگی کی لسٹ میں پڑا ہے، اچھے شریف لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا کب ہے اس کا، مجھے تو یوں ہی چالو بھولی سی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔"

زرتاج کے لیے آج بھی کسی دوسری عورت کے حسن کو تسلیم کرنا، تکلیف دہ امر تھا۔

نبیل نے کوئی تبصرہ نہیں کیا' زرتاج کے لیے اس کی خاموشی بھی ناقابل برداشت تھی۔
"تمہیں کیسی لگی یہ لڑکی؟"
"ٹھیک ہے۔ بس!"
"ٹھیک بھی کہاں' معمولی سی شکل و صورت ہے' چالاک ضرور ہوگی' جو سالار جیسے پیسے والے کو پھانس لیا۔"
"ہوں!" ایک ٹھنڈی سانس نبیل کے لبوں سے آزاد ہوئی۔
گیتی کا پرکشش چہرہ اب تک نگاہ کے سامنے تھا۔
"مجھے نیند آرہی ہے۔" اس نے دوسری طرف کروٹ لیتے ہوئے لائٹ آف کی تھی۔

☼ ☼ ☼

خیام نے ایک جھجکتی ہوئی نگاہ معاذ پر ڈالی' وہ اب بھی کسی گہری سوچ میں تھا۔
سامنے کھلی کاپی کب سے چیک ہونے کی منتظر تھی۔
"چائے پی لیں معاذ بھائی!"
کپ سامنے رکھتے ہوئے اس نے دانستہ معاذ کو مخاطب کیا تھا۔
"کیا؟" اس نے چونک کر خیام اور پھر آگے رکھے چائے کے کپ کو دیکھا اور ہلکے سے مسکرا دیا۔
مگر یہ مسکراہٹ بھی اس کے چہرے پر نمایاں ہوتی فکرمندی کو کم کرنے میں ناکام تھی۔
"پہلے ہی میں کوئی بہت کار آمد شخص نہیں ہوں تم اور بھی کاہل بنا رہے ہو مجھے۔"
انداز میں وہی اپنائیت بھری بے تکلفی' مگر اس کی مخصوص شگفتگی کئی دن سے کھوئی ہوئی تھی۔
خیام نے بہت فکرمندی سے اس کے چہرے کو دیکھا۔
"کیا ہوا' ایسے کیوں دیکھ رہے ہو' کچھ تبدیلی آگئی ہے کیا مجھ میں؟" خود پر جمی خیام کی نگاہ کو نوٹ کرکے وہ ہلکے سے ہنسا بھی' مگر خیام اس بار بھی سنجیدہ تھا۔
"ایک بات پوچھوں؟" چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے معاذ نے اشارہ دیا۔
"پریشان کیوں ہیں اتنے دنوں سے؟" اتنے دنوں سے ساتھ رہنے کے بعد اب وہ کچھ کھل کر بات کرنے لگا تھا' مگر اتنا ذاتی سوال.....!
معاذ کو حیرت سی ہوئی۔
"کیوں پوچھ رہے ہو؟"
"پہلے بتائیں۔ اپنی پریشانی کی وجہ ٹھیک ٹھیک!" خیام کا اصرار بڑھنے لگا۔
"ارے کچھ بھی نہیں' یوں ہی وہم ہے تمہارا۔" پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسے ٹال گیا' جو کچھ بھی پریشانی کا سبب تھا' وہ اتنا ذاتی تھا کہ خیام یا کسی اور کو بھی بتانے لائق نہیں تھا۔
"تو یہ کہیں کہ بتانا ہی نہیں چاہتے ہیں' شاید میں اپنی اوقات سے زیادہ بڑی بات پوچھ رہا ہوں۔"
خیام کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔
"اف!" "اب یہ ایموشنل بلیک میلنگ!"
معاذ نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔
خیام رخ موڑ کر دوسری طرف دیکھ رہا تھا' اسی طرح دیکھے گیا۔
اتنے دنوں میں پہلی بار وہ کچھ خفا سا محسوس ہوا اور اپنا اپنا سا بھی۔

معاذ نے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"اچھا یہ بتاؤ' جب پہلی بار تم یہاں آئے تھے تو تم نے مجھ سے کیا کہا تھا!"
اس نے ذرا مڑ کر معاذ کی طرف دیکھا' مگر شاید اسے اپنی کہی بہت ساری باتوں میں سے وہ ایک بات یاد نہیں آئی تھی۔
"یہی کہ تم سے کوئی ذاتی سوال نہ پوچھا جائے اور نہ ہی کسی بھی ذریعے سے تمہارے بارے میں کچھ جانا جائے سو میں نے مانا نا۔"
بنا اس کی طرف دیکھے خیام نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا' "مگر مجھ میں اور آپ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" آپ کے پاس اپنے تعارف کے لیے بہت کچھ ہے معاذ بھائی!"
اس کی نظر جھکی تھی اور برسوں پرانا کمپلکس آج بھی فارغ نہیں کرتا تھا۔
معاذ کی فطری سادہ دلی اور حساسیت خود ہی شرمندگی میں مبتلا کرنے لگتی تھی۔
"اچھا چلو چھوڑو' کچھ اور بات کرتے ہیں!" پوری خوش دلی سے اس نے خیام کو واپس موڈ میں لانا چاہا۔ "یہ بتاؤ کبھی کسی سے محبت کی ہے..... یہ تو پوچھ سکتا ہوں نا۔"
ماحول کی سنجیدگی کو کم کرنے کے لیے اپنی بات کہہ کر وہ جس طرح مسکرایا تھا' خیام کو بھی سب الٹو فالتو' چند لمحوں کے لیے جھٹکنا پڑا۔
"مجھے دیکھ کر لگتا ہے آپ کو کہ میرے حالات نے مجھے محبت کرنے کی اجازت دی ہوگی۔"
"محبت حالات کو کب دیکھتی ہے یار! بلکہ خراب حالات میں تو اور بھی وائرس کی طرح پھیلتی ہے۔"
"لگتا ہے ذاتی تجربہ ہے آپ کا!" وہ ایک بار پھر معاذ کی شخصیت میں دلچسپی لینے سے خود کو نہ روک سکا۔
"اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ لڑکی بہت خوش قسمت ہوگی' جس سے آپ محبت کرتے ہیں۔"
وہ اتنا پر یقین تھا کہ معاذ کے لیے تردید بھی ناممکن ہوئی۔
"محبت ہمیشہ خوش قسمتی کا سبب نہیں بنتی خیام! بہت سے لوگوں کو بڑی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے اس کی۔"
چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس نے دانستہ کاپی پر نگاہ جمائی۔ "ویسے چائے بہت اچھی بناتے ہو تم۔"
"اور آپ بات بہت خوبی سے بدلتے ہیں!" معاذ کا موبائل بجنے لگا تھا۔
ذیشان کا فون تھا اور اس کی بات تھوڑی سی لمبی ہو ہی جاتی تھی' معاذ اٹھ کر باہر برآمدے میں چلا گیا۔ خیام الجھا الجھا سا وہیں بیٹھا رہا۔
"سو کوئی تو دکھ ہے معاذ بھائی کے ساتھ بھی!" سامنے میز پر ادھ کھلی کاپی رکھی تھی۔
وہ یوں ہی بے دھیانی میں صفحے پلٹنے لگا۔
ابتدائی حساب' انگلش اور اردو۔
بچے بہت اچھا کام کر رہے تھے' مگر درستی کی ضرورت بہرحال باقی تھی۔
میز پر سے معاذ کا چھوڑا ہوا پین اٹھا کر وہ پوری طرح سے اس طرف متوجہ ہوا۔
پتا نہیں کتنی مدت بعد ہاتھ اور نگاہ اس بے حد مانوس مصروفیت میں گھرے' جو کبھی اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ تھی۔ ایک کے بعد ایک کاپی۔
خیام کا قلم تیزی سے چلتا رہا۔
معاذ واپس آیا تو وہ آخری کاپی چیک کر رہا تھا۔
دروازے کی طرف اس کی پشت تھی اور وہ اتنا محو تھا کہ اسے اپنے پیچھے کھڑے معاذ کی موجودگی کا احساس تک

نہیں تھا۔
''کہاں تک پڑھے ہوئے ہو؟''
جب وہ آخری کاپی میز پر رکھ رہا تھا' معاذ نے ہاتھ بڑھا کر کاپی اس کے ہاتھ سے لی۔
خیام کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل پایا۔
''میں پوچھ رہا ہوں' کہاں تک پڑھا ہے تم نے خیام؟'' معاذ اچانک ہی بے حد سنجیدہ ہوا تھا اور لہجے میں دبی دبی سی سختی نمایاں ہو لی تھی۔
''وہ میں.....''
الفاظ خیام کے حلق میں اٹکے۔ مگر معاذ کے پاس فی الوقت کوئی رعایت نہیں تھی۔
''بی کام!'' سر جھکاتے ہوئے خیام نے جیسے اعتراف جرم کیا۔
معاذ چند لمحے خاموشی سے اس کے جھکے ہوئے سر کو دیکھے گیا۔
''چھپایا کیوں تھا مجھ سے؟ کتنی بار پوچھا میں نے تم سے؟''
''میں بس ایسے ہی۔''
''پھر جھوٹ!'' وہ کرسی کھینچ کر بالکل اس کے قریب سامنے بیٹھ چکا تھا۔ ''یہ کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب حقیقت سے فرار کا ہی حصہ ہے' مخالف سمت میں اس طرح سرپٹ دوڑ رہے ہو کہ تمہیں اپنے کسی نقصان کا احساس تک نہیں رہا ہے۔''
وہ بڑی مشکل سے اپنے غصے کو کنٹرول کر رہا تھا' ورنہ دل تو یہی چاہا تھا کہ خیام کو ایک آدھ تو ضرور ہی کس کر لگا دے۔
''میرے لیے نفع نقصان برابر ہے' کوئی فرق نہیں پڑتا ہے مجھے' مگر آپ نہیں سمجھیں گے' اس لیے رہنے دیں۔''
معاذ کے غصے نے ہی اسے صفائی دینے پر مجبور کیا تھا مگر اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی' ٹوٹتا ہوا لہجہ' کچھ بھی ایسا نہیں تھا' جو معاذ کے لیے قابل قبول ہوتا۔
''میں تمہاری ایک نہیں سنوں گا' تمہارے ساتھ جو بھی حالات رہے' چاہے وہ کتنے ہی تکلیف دہ ہوں' لیکن ایسے ضرور تھے' جن میں تم نے گریجویشن کر لیا' آگے بھی پڑھ سکتے تھے اگر گھر سے نہ بھاگتے۔''
اپنی بات کہتے ہوئے اس نے ذرا رک کر خیام کے چہرے کو غور سے دیکھا۔
خیام نے بے ساختہ ہی رخ دوسری طرف موڑا۔
''اتنا درست اندازہ!''
معاذ کی ذہانت پر اسے ویسے بھی کوئی شبہ نہیں تھا اور اب یقیناً' اگلی بات اس کے آبائی حوالے سے ہی متعلق ہو گی۔ جو اسے ویسے بھی ہمیشہ ہی اپنے ماتھے پر لکھا محسوس ہوتا تھا۔ خیام نے اپنی ہتھیلیاں پسینے میں بھیگتی ہوئی محسوس کیں۔
''کسی لڑکی کا چکر تھا کیا' جو گھر چھوڑا ہے۔'' معاذ کا ہوا میں چھوڑا ہوا تیر' اس بار خطا ہوا تھا' خیام نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔
''میں آپ سے کہہ چکا ہوں' میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ آپ کو یقین نہیں آ رہا تو آپ کی مرضی' آپ کو برا لگا ہے تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا' آپ ٹینشن مت لیں۔'' وہ خود پر قابو پا چکا تھا۔
''سچائی تک پہنچنے کے لیے شاید کچھ اور انتظار!''
معاذ نے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھا۔

اپنی باری آنے پر وہ اسی طرح بے مروتی کا مظاہرہ کرتا تھا اور کچھ بعید نہیں تھا کہ اب مزید کچھ کہنے پر وہ واقعی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر رخصت بھی ہو جاتا۔
''اچھا اب بے کار کی جذباتیت مت پھیلاؤ' لیکن یہ بی کام کی ڈگری اگر تمہارے کسی کام کی نہیں ہے تو نہ سہی' دوسروں کو ہی اس سے فائدہ اٹھانے دو۔ سمجھے!''
''مطلب!'' خیام واقعی کچھ نہیں سمجھا تھا۔
''مطلب یہ کہ آج سے تم بچوں کو پڑھاؤ گے' ان کی آدھی سے زیادہ ذمہ داری تمہاری ہے' تاکہ تھوڑی سی فرصت مجھے بھی مل جائے!'' اپنی بات کہتے ہوئے' وہ اٹھ کر کھڑا ہوا ''سمجھ لو' مجھ پر ذاتی احسان ہو گا تمہارا۔'' اس نے کمرے میں سے نکلتے ہوئے بات ختم کی۔
''کیسی باتیں کرتے ہیں معاذ بھائی!'' خیام کی ساری لاتعلقی رخصت ہوئی' معاذ سے ملی ساری محبت کے جواب میں' ایک دراڑ اس کی سرد مہری میں بھی پڑ ہی گئی تھی۔
وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا باہر برآمدے میں آیا۔ سامنے ساجد کا خوانچہ ابھی بھی رکھا تھا۔
''اور یہ خوانچہ اب تم نہیں لے کر جاؤ گے۔ سمجھے! ساجد آ کیوں نہیں رہا آخر اسے لینے۔''
معاذ مڑ کر پوچھنے لگا۔
''وہ ٹھیک نہیں ہے معاذ بھائی! اب تو تین دن سے پیسے بھی لینے نہیں آیا ہے' بخار اتر ہی نہیں رہا ہے۔ کل اس کے محلے کا لڑکا پیسے لینے آیا تھا' اس نے بتایا تھا۔''
''کب سے بیمار ہے یہ لڑکا' مگر ماں باپ کو ذرا ہوش نہیں ہے۔'' وہ فکر مند ہوا ''بہر حال تم نہیں جاؤ گے اب یہ لے کر' ساجد کو جتنے پیسے دیتے ہو روزانہ وہ مجھ سے لے کر دے دیا کرو۔''
''وہ نہیں مانے گا معاذ بھائی! اور اس کے باپ کو پتا چلا تو اور بھی ہنگامہ کرے گا' وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔''
''مجھے پتا ہے!'' معاذ ہلکے سے مسکرایا۔
سر کے پچھلے حصے میں لگی پرانی چوٹ' ساجد کے باپ کی خطرناکی کی گواہ تھی' مگر وہ تفصیل بتانے سے گریز ہی کر گیا۔
''کل ہم ساجد کو دیکھنے چلیں گے' آج سے تم اپنی نئی جاب شروع کرو بس!'' اس بار وہ خیام کی کوئی بات سننے کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔

☼ ☼ ☼

دادی کا تامل بڑھتا ہی جا رہا تھا۔
''اصل میں تو آپ خود نہیں چاہتیں اماں! ورنہ معاذ کو راضی کرنا آپ کے لیے مشکل نہیں ہے' سب سے زیادہ وہ آپ کی سنتا ہے۔''
شائستہ اٹھتے بیٹھتے گلہ کرنے لگی تھیں' مگر دادی کے نزدیک سب ان کی غلط فہمی تھی۔
''میں صرف زبردستی کے سودے کی مخالف ہوں' ورنہ کب کا اس سے کہہ چکی ہوتی' لیکن کیا کروں دل نہیں مانتا اپنے بچے پر اس طرح کا ظلم توڑنے کے لیے۔''
لفظوں کے الٹ پھیر کے ساتھ' وہ اس طرح کے کئی بیان دے چکی تھیں۔
امی کو اور بھی برا لگ جاتا۔
''خود ہی بہت محبت ہمیں بھی ہے معاذ سے' مگر اماں سمجھتی ہیں کہ میں اس کا بھلا نہیں چاہتی' دشمن ہوں اس

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

کی۔"

ربیعہ کچن میں کچھ پکا رہی تھی' تب وہ سلیب کے پاس اسٹول پر بیٹھی اپنا دل ہلکا کر رہی تھیں۔

"بھلا بتاؤ' کوئی ماں اپنی اولاد کا برا کیسے چاہ سکتی ہے۔" ان کی پیشانی پر بل تھا۔ "میں بھی تو یہی چاہتی ہوں کہ اب وہ اپنی زندگی میں سیٹل ہو جائے۔"

"دادی کا ایسا کوئی مطلب نہیں امی! وہ بھی صرف یہ چاہتی ہیں کہ جو بھی ہو' معاذ کی مرضی سے ہو' اور یہ بھی ٹھیک بات۔" ربیعہ کی توجہ سالن پر تھی لیکن امی کو تسلی دے گئی۔

"اصل میں تو تم' معاذ اور اماں تینوں ہی کی ایک متفقہ رائے بن جاتی ہے کسی بھی معاملے میں' دوسرا چاہے پھر سر پٹخ کر مر جائے' مگر مجال ہے جو....."

زری اندر آ رہی تھی' امی نے اپنے خراب موڈ میں بھی اس بات کا خیال رکھا کہ وہ کچھ سن نہ لے۔

"کیا بات ہے؟" زری کے ساتھ وہ زیادہ تر اسی طرح اکھڑ لہجے میں بات کرتی تھیں' مگر وہ دن بہ دن اتنی ڈھیٹ ہوتی جا رہی تھی۔ کہ کچھ بھی کہہ لو کوئی فرق نہیں۔

"ربیعہ باجی کی مدد کرنے آئی تھی' میں نے سوچا ان کی پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے۔"

امی کو اس کا احساس ذمہ داری بھی کھلا۔

"پڑھ لے گی' اسے خود بھی خیال ہے' اور یہ باجی کب سے ہو گئی وہ تمہاری' عمر میں دو چار سال چھوٹی ہی ہے تم سے ربیعہ!"

"اچھا لگتی نہیں ہے' اسی لیے سوچا کہ....." ربیعہ بے ساختہ ہی ہنس پڑی۔

"کوئی بات نہیں زری! تمہارا جو دل چاہے کہہ لیا کرو' دو چار سال تم بڑی ہو یا میں' کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اتنے مہینوں سے یہاں رہ رہی ہے' اب اس پر اپنی کم عمری کا انکشاف ہوا ہے۔"

امی بڑبڑاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

کچن میں زری کے کرنے لائق کافی کام تھا' آج کل ان کی اپنی طبیعت تھوڑی خراب تھی' سو مصلحت پسندی سے بھی کام لینا پڑ رہا تھا۔

"برتن دھو کر روٹی پکا لینا!"

"جی اچھا امی۔"

وہ اس طرح خوش ہوئی' جیسے کوئی دلی مراد پوری ہوئی ہو۔

"اور تم....." انہوں نے مڑ کر ربیعہ کی طرف دیکھا۔

"جو میں نے کہا ہے' ذرا دیکھ لینا۔" زری کے سامنے گھر کی اہم باتیں ڈسکس کرنے پر وہ باقاعدہ پابندی لگا چکی تھیں' اور سب سے زیادہ خود ہی اس پر عمل کر رہی تھیں۔

زری نے الجھن بھرے انداز میں' ربیعہ کی طرف دیکھا' اس کے چہرے پر سوچ کا تاثر تھا' اور فکر کا بھی۔ وہ ابھی کچھ پوچھنے ہی والی تھی کہ ربیعہ چولہا ہلکا کر کے باہر نکل گئی۔

"سب لوگ کچھ زیادہ ہی پُراسرار ہو گئے ہیں۔" زری نے برتن دھوتے ہوئے' خود سے قیاس آرائی کی۔ اگر شائستہ امی سے ٹکراؤ کا خطرہ نہ ہوتا تو وہ یقیناً" ربیعہ کے پیچھے ہی جاتی۔

"معاذ!" اندر ہال میں سے ربیعہ کی آواز یہاں تک آ رہی تھی۔

"معاذ! دادی کے کمرے میں آنا!"

آج معاذ گھر پر تھا' اور اصل میں تو وہ صبح سے اسی پر اپنی کارکردگی ثابت کرنے کے لیے سرگرداں تھی۔

"مگر اب جب وہ دادی کے کمرے میں ہوگا تو برتنوں کا یہ اتنا بڑا چمکتا ہوا ڈھیر کون دیکھے گا۔"
زری کا دل اس ساری محنت پر برا ہوا۔
باقی بچے ہوئے سارے برتنوں پر اب صرف جھاگ میں ڈوبی ہوئی جالی ہی رسمی طور پر پھیرنی تھی۔
"پتا نہیں کیوں دادی کے کمرے میں لے کر گئی ہے ربیعہ؟"
فطری تجسس بے قرار کیے دے رہا تھا' سو وہ نلکا بند کر کے چند منٹ کے لیے کچن سے باہر نکل ہی آئی ہال اور کوریڈور خوش قسمتی سے خالی تھے۔
زری اطمینان سے چلتے ہوئے دادی کے کمرے کی طرف مڑ گئی۔
گھر میں کوئی بھی عادتاً "دھیمے انداز میں بات نہیں کرتا تھا' نارمل سی ٹون تھی بہت کچھ بنا کسی کوشش کے یوں ہی سن لیا جاتا' سو اسے امید بھی نہیں تھی کہ معاذ کو دادی کے کمرے میں لے جا کر جو باتیں ہو رہی ہیں' وہ سننے سے محروم رہ پائے گی' مگر اس وقت دادی کے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔
"میں نے بھلا کون سے راز اڑا لینے تھے۔"
وہ سخت بدمزہ ہوتی وہاں سے واپس ہوئی' شکر ہے' جو امی سے سامنا نہ ہوا۔
اندر دادی کے کمرے میں وہ تینوں ایک دوسرے سے بے حد محبت کرنے کے باوجود اس وقت مخالف کیمپوں میں تھے۔
"بہت سی باتوں کو ہمارا دل نہیں چاہتا' مگر برداشت کر ہی لیتے ہیں' تم بھی تھوڑی سی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کرو بیٹا! تو شاید بہتری کی کوئی صورت پیدا ہو ہی جائے۔" دادی کو تھوڑا سا اصرار کرنا ہی پڑ رہا تھا' مگر انداز اب بھی ڈھیلا ڈھالا ہی سا تھا۔
معاذ ہلکے سے مسکرا دیا۔
"آپ جو کہہ رہی ہیں' اس پر خود بھی پُریقین نہیں ہیں دادی! ورنہ بتا دیں بہتری کی کوئی ایک بھی صورت۔"
"گھر بس جائے گا' تمہاری ماں خوش ہو جائے گی' اور کیا چاہیے۔"
دادی نے دانستہ اس سے نگاہ چرائی۔
"گھر تو خیر نہیں بستا اور جب گھر نہیں بسے گا تو امی کی خوشی بھی بس چند روزہ ہی ہوگی۔"
وہ اتنا پُریقین تھا کہ ربیعہ نے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
"خدا نہ کرے' کیوں اتنی بری بات منہ سے نکالتے ہو' ماں سنے گی تو کتنا دل برا ہوگا اس کا۔"
"اس لیے ان سے نہیں' آپ سے کہہ رہا ہوں' مناسب لفظوں میں آپ سمجھا دیں انہیں' سمجھ گئیں تو سب کا بھلا ہوگا۔" سرسری سے انداز میں کہتے ہوئے' وہ اب بھی مسکرایا تھا' پر عرصہ ہوا' اس کی آنکھیں ساتھ دینا بھول چکی تھیں۔
ربیعہ نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔
ایک اچھے کیریر کی شروعات' اب اس کے حلیے سے ظاہر ہوتی تھی۔
اچھے کپڑے' معاشی تحفظ کی بے فکری۔
مگر وہ بے ساختہ مسکراہٹ' روشن چمکتی خواب دیکھنے والی آنکھیں' اسی پرانی جینز اور گھسی ہوئی شرٹ پہننے والے معاذ کی شخصیت کا حصہ تھیں۔
یہ تو کوئی اور ہی تھا۔
جس کی آنکھوں میں کہر جمی ہوئی تھی اور مسکراہٹ پر بس مسکرانے کا شائبہ سا پڑتا تھا۔

پتا نہیں کیوں' مگر شدت سے اس کا دل سامنے بیٹھے' معاذ کے گلے لگ کر رونے کو چاہا۔ خود کو بمشکل سنبھالتے ہوئے' ربیعہ نے نگاہ جھکا لی تھی' دادی اور معاذ کی بات چیت کہیں سے کہیں جا رہی تھی۔
"مجھے تو' تم سب معاف ہی رکھو' جو کہنا سننا ہے' آپس میں خود بیٹھ کر کیا کرو' تمہاری ماں کو ویسے ہی یقین ہے کہ میں تمہیں شادی کرنے سے منع کر رہی ہوں' پتا نہیں کیوں اس کے دل میں یہ وہم بیٹھ گیا ہے' ورنہ میں نے تو جویا کا نام لینا بھی۔۔۔"
روانی میں وہ اسی طرف آئیں' جو ممنوعہ راستہ تھا۔
"یوں ہی منہ سے نکل گیا' خیال مت کرنا۔" ذرا رک کر وہ دھیمی آواز میں بولیں۔
معاذ نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔
"آپ کیوں شرمندہ ہوتی ہیں دادی! ڈوب مرنے کا مقام تو اب میرے لیے ہے۔ لیکن یہ آسانی بھی میسر نہیں آ رہی فی الوقت!"
وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر باہر بھی نکل گیا۔
"یہ کیا کہہ کر گیا ہے ربیعہ؟" دادی نے حیرت سے اتنی دیر سے بالکل خاموش بیٹھی ربیعہ سے پوچھا تھا۔

☼ ☼ ☼

لاؤنج کی گلاس وال کے دوسری طرف وسیع سبزہ زار نظر آ رہا تھا۔
موسم سرما کے خوش رنگ پھولوں سے لدی قطار در قطار کیاریاں۔
مگر کچھ بھی کارگر نہیں۔
وہ آج بھی بہت دیر گیٹ پر آ کر بیٹھا رہا' گارڈز نے اسے دھکے دے کر نکالنا چاہا' مگر وہ پھر بھی جانے کے لیے تیار نہیں تھا۔
"بڑی مشکل سے ہٹایا ہے اسے تب کہیں جا کر میں گھر سے نکل سکی۔"
صوفے پر پاؤں اوپر کر کے بیٹھی زوبیہ نے پریشانی سے سامنے بیٹھی ماں کی طرف دیکھا۔
وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں آئی تھی' اور وہی روز کا رونا تھا۔
"مجھے تو اس بات کی فکر کھا رہی ہے کہ آس پاس کے گھروں پر کیا اثر پڑتا ہوگا' اس روز کے تماشے کو دیکھ کر' ایک زمانہ تمہارے باپ کو جانتا ہے' اور یہ سلمان نہ اس کی خود کوئی عزت اور نہ ہی اس کے خاندان کی' ہمیں تو لوگوں کا سامنا کرنا مشکل ہو گیا ہے' تمہاری اس شادی کے بعد' یوسف نام نہیں سننا چاہتے ہیں سلمان کا اب۔"
ان کے پاس زوبیہ کے لیے ہمدردی کا ایک لفظ نہیں تھا' صرف اپنے تحفظات تھے۔ "ہم سب مخالف تھے' مگر تم نے جو کرنا تھا' سو کیا۔ اب بھگتو۔" بہت دن زوبیہ سے ہمدردی کرنے کے بعد' اب وہ قطعی بیزار تھیں۔ زوبیہ نے اضطراب سے پہلو بدلا۔
"خالی میں کیوں بھگتوں' آپ لوگ کس لیے ہیں؟ میرے مسائل میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی ہیں آپ مجھے' اکلوتی اولاد ہوں آپ کی میں۔"
یوسف کمالی نے اندر آتے ہوئے اسے کہتے سنا۔
"کیا چاہتی ہو اب تم ہم سے زوبیہ۔" اپنے کمرے میں جانے کے بجائے وہ سیدھے اس کی طرف [illegible] سلمان کے ساتھ رہنا چاہو' یا پھر اس سے علیحدگی ہو' ہم کسی فیصلے میں آڑے نہیں آ رہے' پھر کس بات کا [illegible]"

ان کا لہجہ بے تاثر تھا شفقت یا فکر مندی کا کوئی شائبہ تک نہیں۔ زوبیہ کے دل کو دھکا سا لگا۔
"بس اتنا ہی تعلق ہے آپ کا میرے معاملات سے، کوئی تسلی تک نہیں ہے میرے لیے آپ کے پاس۔"
"تمہیں تسلی کی ضرورت تب ہوتی، جب تم نے ہمارے مشورے کو اہمیت دی ہوتی۔"
"میری شادی آپ کی مرضی سے ہی ہوئی تھی ڈیڈی!"
"غلط بات!" انہوں نے انگلی کے اشارے سے اسے تنبیہہ کی۔ "مرضی سے نہیں بلکہ ہماری رائے لینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی تھی تم نے، تم نے فیصلہ کرکے سنایا تھا اور تمہاری ماں ہمیشہ کی طرح تمہاری حمایت پر تھی، میرے لیے اس شادی کو ارینج کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا، سو میں نے وہ کردی تھی۔"
زوبیہ نے لاجواب سا ہو کر ماں کی طرف دیکھا۔
"ٹھیک کہہ رہے ہیں تمہارے ڈیڈی۔"
زوبیہ کی دیرینہ حمایت سے اب وہ بھی دستبردار تھیں۔
"اگر میں سلمان سے خلع لے لوں تو پھر آگے میرے لیے کیا راستہ رہ جاتا ہے۔ اس بارے میں ہی بتادیں کچھ۔" ماں باپ کی لاتعلقی اسے طنزیہ موڈ میں لے آئی۔
"وہ بھی تمہیں خود ہی سوچنا ہوگا، اب اس عمر میں کوئی اچھا رشتہ ملنا مشکل ہے، یہ بات ذہن میں رکھنا۔" ان کی سرد مہری برقرار تھی، زوبیہ کی شکایتی نگاہیں اب دونوں پر باری باری پڑی تھیں۔
"اب ایسے بھی نہ کہیں، زوبیہ اتنی بڑی جائیداد کی اکلوتی وارث ہے، کوئی بھی اچھا شخص مل سکتا ہے اسے، بلکہ سرکل میں ہیں دو ایک اگر آپ واقعی کوشش کریں۔" وہ ماں تھیں اس لیے رہ نہ سکیں۔
"جس اچھے لڑکے کی طرف تمہارا اشارہ ہے، وہ شادی کرچکا ہے اور ہفتے کو میں نے اسے کھانے پر بلایا ہے۔" انہوں نے تازہ خبر بریک کی۔

✵ ✵ ✵

گھر میں پھیلے غیر معمولی سناٹے کو اس نے سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہی محسوس کرلیا تھا۔
ہر وقت برپا رہنے والا وہ شور جس سے سب سے زیادہ مالک مکان نالاں رہتے تھے، آج سرے سے مفقود تھا۔
نہ ہر وقت اونچی آواز میں چلتا ہوا ٹی وی کھلا تھا اور نہ ہی سلمان، شاکرہ امی یا اظہار صاحب کے اونچی آواز میں ہوتے شکوے، جھگڑوں کا ہی تسلسل تھا جویا کو لگا جیسے وہ سب یا ان میں سے ایک دو لوگ ضرور خوش گوار اور پرسکون موڈ میں ہیں مگر اس کے لگائے ہوئے بیشتر غلط اندازوں کی طرح یہ بھی ایک غلط اندازہ ہی تھا۔
"ابو کی ضمانت منسوخ ہوگئی ہے، پولیس نے انہیں عدالت سے ہی دوبارہ حراست میں لے لیا ہے۔"
زویا آج گھر پر تھی اور جویا کو یہ خبر اس نے اس کے اوپر پہنچتے ہی سنادی تھی۔
جواباً وہ بنا کوئی لفظ کہے اسے خالی خالی نگاہوں سے دیکھے گئی۔
جو کچھ ابھی سنا وہ غیر متوقع بھی نہیں تھا، پھر بھی وہ سب ہی سر پر لٹکی اس تلوار سے نگاہ چرائے ہوئے تھے۔
"ابو کے وکیل کا فون آیا تھا، انہوں نے ہی گھر پر اطلاع دی، خود تو شاید ابو بات کرنے کے بھی قابل نہیں تھے، ہمت تو وہ بہت پہلے ہی کھو چکے ہیں۔" زویا کے لہجے میں گہری افسردگی تھی۔
صحن میں دیوار کے ساتھ لگی کرسی پر جویا تھکے تھکے انداز میں بیٹھی۔ قدموں میں کھڑے رہنے کی سکت ذرا دیر کے لیے تو زائل ہی ہوئی تھی۔
"سلمان بھائی کیوں نہیں گئے تھے ان کے ساتھ، جب پتا بھی تھا کہ آج ضمانت کی درخواست کا فیصلہ ہے۔"

"سلمان بھائی!" زویا ہلکے سے سر جھٹک کر لمحے بھر کے لیے خاموش ہوئی۔
"سلمان بھائی نے تو اس اطلاع کے بعد بھی جانے کی تکلیف نہیں گوارا کی، ابو کا ضروری سامان بھی وکیل صاحب نے کسی لڑکے کو بھیج کر منگوایا تھا۔ ورنہ میں خود جا کر دے کر آتی۔"
محض چند جملوں میں بے حسی کی داستان رقم تھی۔
زویا کے چہرے پر گہری اداسی تھی اور وہ جس طرح خود کو سنبھالنے کی کوشش میں تھی، جویا کی سمجھ میں آرہا تھا۔ یہ اعصاب شکن آزمائش ان ہی دونوں کے حصوں میں کیوں آئی تھی؟ فی الحال یہ بھی سمجھنا دشوار تھا۔
"تم نے مجھے فون کیوں نہیں کردیا اسکول میں، میں جلد ہی واپس آجاتی، سب کچھ اکیلے ہی...."
"کیا فائدہ، کون سی خوش خبری تھی جو سنائی جاتی اور یہ فیصلہ تو صبح ہی آگیا تھا، میرا خیال تھا کہ سلمان بھائی اور آپا گل تھوڑا بہت تو سنبھال ہی لیں گے۔"
"آپا گل آگئی تھیں۔"
جویا نے بے ساختہ پوچھا تھا۔
زویا نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔
کوئی بھلائی، کوئی امید نہیں، پھر بھی رشتوں سے بندھی فضول توقعات کے بار بار ٹوٹنے کا درد بھرا سلسلہ! وہ دونوں ابھی تک اسی دھوپ بھرے صحن میں تھیں۔
"میں امی کو دیکھتی ہوں، ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" وہ اٹھ کر کمرے کی طرف بڑھی تھی۔
"پتا نہیں، ٹھیک ہے بھی اور نہیں بھی۔"
"کیا مطلب؟" وہ جاتے جاتے رکی، مگر زویا مزید کچھ کہنے کے بجائے اس کا ہاتھ تھام کر اندر کمرے میں چلی آئی۔
باہر کی تیز دھوپ کے مقابلے میں کمرے میں اس وقت بھی نیم تاریکی سی تھی۔ بند دروازے، کھڑکیاں اور ان پر گرے بھاری پردے۔ جویا کو فوری طور پر کچھ دکھائی نہیں دیا۔
"امی!" وہ اندازے سے ان کے بیڈ کی طرف بڑھی تھی۔ شاکرہ امی کی سسکیاں سنائی دیں۔
زویا نے لائٹ آن کردی تھی۔
وہ لیٹے لیٹے انداز میں بیڈ پر نیم دراز تھیں اور آنکھوں پر آئی سوجن ان کے مستقل روتے رہنے کی گواہی دے رہی تھی، جویا کو دیکھ کر وہ جس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع ہوئی تھیں، ان دونوں کے لیے انہیں سنبھالنا مشکل ہوا تھا۔
"ہم کہیں کے نہ رہے جویا! برباد ہوگئے، جیل ہوگئی، پھر تمہارے ابو کو پولیس ہتھکڑی ڈال کر لے گئی کورٹ سے۔ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں ہیں، اب ہم لوگ۔"
آہوں، سسکیوں کے درمیان ان کا تفصیلی بیان خاصی بلند آواز میں تھا۔
سلمان برابر والے کمرے میں سے سخت جھنجلایا ہوا اندر آیا۔
"اور زور سے چلائیے، تاکہ جو دو چار لوگ ہمارے گھرانے کی بدنامی سے اب تک ناواقف ہیں انہیں بھی اطلاع مل جائے کہ ہمارے باپ کرپشن کے الزام میں جیل کی ہوا کھا رہے ہیں، جہالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔"
اس کا غصہ، تنبیہہ کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔
شاکرہ امی اور بھی زیادہ بے قراری سے رونے لگیں، اس بار صرف اظہار صاحب کا دکھ ہی وجہ نہیں بنا تھا۔
"آپ کو ابو کی تکلیف کا خیال نہیں آرہا سلمان بھائی، صرف لوگوں کی فکر ہے۔" زویا نے افسردگی سے اس کی

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors.
for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

طرف دیکھا۔

"ہاں تو اور کیا۔" اس کی بے حسی اب حیرت میں مبتلا نہیں کرتی تھی۔ "ابو تو پہلے بھی کتنے دن رہ چکے ہیں جیل میں، عادی ہیں وہاں کے ماحول کے۔ اس بار انہیں تکلیف نہیں ہوگی وہاں، البتہ لوگ دوبارہ اس سارے قصے کو تازہ کریں گے، کل کے اخبار میں چھوٹی سی خبر ضرور لگے گی اور مجال ہے جو سارے خاندان میں کوئی ایک بھی چوک جائے اسے پڑھنے سے۔ ذلیل کروا کر رکھ دیا انہوں نے تو، ساری دنیا پیسہ بنا رہی ہے، مگر کوئی پکڑا نہیں جاتا، سب اپنے ہاتھ صاف رکھتے ہیں، انہیں اتنی بھی عقل نہیں آئی رشوت کھاتے ہوئے۔"

حرام کی کمائی سے پوری طرح فیض یاب ہونے کے بعد وہ پوری ڈھٹائی سے بے لاگ تبصرہ کر رہا تھا۔

جویا نے نچلا لب سختی سے دانتوں تلے دبایا تھا۔

"دفع ہو جا سلمان! چلا جا میرے سامنے سے۔ کچھ کر نہیں سکتا تو زخموں پر نمک بھی نہ چھڑک۔"

شاکرہ امی نے بے ساختہ ہی اس کے آگے ہاتھ جوڑے تو وہ پیر پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔

"مجھ سے کوئی امید مت رکھیں، اور ویسے بھی ضمانت منسوخ ہوئی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اب اگلی پیشی پر سزا بھی سنائی جا سکتی ہے۔"

ایک اعلانیہ وارننگ اس نے جانے سے پہلے دینا ضروری سمجھی۔

"کیا کہہ رہا تھا یہ؟" شاکرہ امی نے ہراساں ہو کر جویا اور زویا کو دیکھا۔

"کچھ نہیں امی! میں آج شام میں وکیل صاحب سے ملوں گی جا کر۔ آپ فکر مت کریں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

گو اسے اپنے کہے آخری جملے پر خود بھی ذرا بھر یقین نہیں تھا۔ مگر شاکرہ امی کی تسلی کے لیے کہنا پڑا تھا۔

"مگر شام میں تو ٹیوشن سینٹر۔۔۔"

"چھٹی کر لوں گی وہاں سے، یہ کام زیادہ ضروری ہے۔"

"پھر ابھی فون کر دو، تمہاری ہیڈ کوئی اتنی مہربان خاتون بھی نہیں ہیں، اچھی خاصی سنائیں گی تمہیں۔" زویا نے یاد دلایا۔

سلمان پھر سے دروازے میں آ کھڑا ہوا تھا۔

"آج صبح سے رونا پیٹنا مچا ہوا ہے، کچھ بھی نہیں پکا ہے، پیسے دو میں کچھ کھانے کے لیے لے کر آتا ہوں، بھوک سے دم نکلا جا رہا ہے۔"

بنا ایک لفظ بھی کہے جویا نے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھمائے اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"بس اتنے ہی۔" اس نے اپنے پیچھے سلمان کو مایوسی سے کہتے سنا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔" زویا اس کے ساتھ ہی اندر آئی تھی۔

"کیا فائدہ، بات ہی تو کرنی ہے وہاں جا کر۔"

"پھر بھی کم از کم تم اکیلی تو نہیں ہو گی نا، وہاں اتنے رش میں۔"

کپڑے نکال کر واش روم کا رخ کرتی ہوئی جویا نے کچھ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"اکیلی!"

اندر اترے سناٹے میں اسی ایک لفظ کی گونج پھیلی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھلی کھڑکیوں سے نرم گرم سی دھوپ کمرے میں اتری تھی۔ زری نے بڑی سعادت مندی سے دادی کے پیر

دباتے ہوئے ایک بار پھر ان کی طرف دیکھا۔
"کیا کہنا چاہ رہی ہے۔ آخر کہہ بھی دے۔" وہ اخبار کھولے بیٹھی تھیں، مگر خود پر بار بار اٹھتی نگاہ سے بے خبر نہیں تھیں۔
"پیسے چاہئیں یا پھو پھا دوبارہ یاد آرہی ہے! معاذ سے کہہ کر بھجوا دیتی ہوں سکھر۔"
"ارے توبہ کریں!" ہلکی سی جھرجھری لے کر اس نے بے ساختہ کان کی لو کو چھوا۔
سعیدہ کے پاس بھیجے جانے کی دھمکی خون خشک کرتی تھی۔ دل کو لگی معاذ نام کی لگن کے ساتھ اب اس بڑے سے کھلے کھلے پرسکون گھر میں گزرنے والی زندگی سے دست بردار ہونا بھی آسان نہیں رہا تھا۔
"میری کیا شامت آئی ہے جو میں سکھر کی ٹرین پکڑوں، آپ اگر مجھ سے تنگ آجائیں تو بے شک دارالامان ہی بھیج دیجیے گا دادی! میں اف نہیں کروں گی۔" اس نے سوچی سمجھی سی مظلومیت خود پر طاری کی۔ سو دادی کا رد عمل فوراً ہی سامنے آیا۔
"خدا نہ کرے، جو ہم تجھے دارالامان بھیج دیں، ایسے ظالم بھی نہیں ہیں، بس ذرا اپنی زبان اور عادتوں کو کنٹرول میں رکھ، اللہ نے چاہا تو کوئی مناسب لڑکا دیکھ کر تیری شادی ہی کر کے رخصت کریں گے۔"
زری کی جلد از جلد شادی کا تذکرہ اب وہ اکثر چھیڑے رکھتی تھیں، سو وہ اور بھی جلتی۔
"اتنا مناسب لڑکا گھر میں موجود ہے اور مجھ میں بھی سوائے تعلیم کی کمی اور غریبی کے کیا نقص ہے۔"
دادی کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کی ناگواری کا اندازہ ہو رہا تھا۔
"اب کیا ہو گیا، لڑکیاں اپنی شادی کی بات سن کر خوش ہوتی ہیں، تو کیوں منہ بنا کر بیٹھ جاتی ہے۔"
"مجھے نہیں جانا یہاں سے کہیں اور۔" مارے کوفت کے چند لمحے تو اس سے اور کچھ کہا بھی نہیں گیا۔ دادی کی توجہ پھر سے اخبار کی طرف ہونے لگی تھی۔
جو بات وہ اتنی دیر سے پوچھنا چاہ رہی تھی غیر متعلقہ باتوں میں الجھ کر کہیں پیچھے ہی رہ گئی تھی۔
"دادی۔"
"ہوں۔"
"وہ معاذ کے لیے جو لڑکی امی کو پسند آگئی ہے، اس کا کیا ہوا؟ آپ تو اب تک بھی نہیں گئی ہیں اسے دیکھنے۔"
"میرا کیا دیکھنا، شائستہ کو پسند آگئی ہے تو ٹھیک ہی ہو گئی، آگے معاذ کی مرضی ہے۔"
دادی کا انداز لاتعلقی لیے ہوئے تھا۔
زری کو یہ ہی بات اچھی لگتی تھی کہ دادی کو معاذ کے لیے پسند کی جانے والی لڑکیوں میں ذرا بھر بھی دلچسپی نہیں تھی۔
"آپ کی کتنی اچھی عادت ہے، کسی بھی بات میں دخل نہیں دیتیں، ورنہ چاہیں تو خود اپنی پسند کی لڑکی سے شادی کر دیں معاذ کی۔" ایک شرمیلی سی مسکراہٹ خود بخود اس کے چہرے پر آئی اور دادی کی ٹانگیں دباتے ہوئے ہاتھوں کی رفتار اور بھی تیز۔
"میری پسند کی لڑکی....." افسردگی سے کچھ کہتے کہتے انہیں کچھ اور یاد آیا "اور یہ معاذ، معاذ کیا لگا رکھی ہے، دس بار کہا ہے کہ معاذ بھائی کہا کرو۔"
"جی اچھا!" اس نے ہر بار کی طرح فوراً" سر بھی ہلا دیا۔
"تو کیا کہہ رہی تھیں آپ پسند کی لڑکی کے متعلق میری مانیں تو سیدھی سادی خدمت گزار دیکھیے گا۔" گھر کو جنت بنا دے گی۔" زری کا دل اتنی سی بات کرتے ہوئے بھی امید بھرے انداز میں دھڑکا تھا۔

"ہاں۔" دادی نے ایک لمبی سی سانس لی۔ "میری جویا ایسی ہی تھی، صابر، محبت کرنے والی، خدمت گزار، اس سے اچھی لڑکی معاذ کو نہ مل سکتی ہے اور نہ ملے گی۔ چاہے شائستہ کتنا ہی ڈھونڈے۔"
"مگر وہ بات تو کب کی ختم ہو چکی دادی! اس کا کیا ذکر۔ اب امی تو نام بھی سننا گوارا نہیں کرتی ہیں اس لڑکی کا۔"
اس کا بنا بنایا موڈ غارت ہوا۔
دادی نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا۔
"اور معاذ، جویا کے علاوہ کسی اور کا نام سننے کو تیار نہیں، یہ بھی سچ ہے۔"
زری نے اپنے خشک ہوتے لبوں پر زبان پھیری۔
"کیا، وہ بہت خوب صورت ہے دادی؟"
"میں نے کہا نا کہ معاذ کے لیے اس جیسی کوئی اور....." ان کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔
"اماں۔" اسلام صاحب تیزی سے کمرے میں آئے تھے۔
"آپ نے آج کا اخبار پڑھ لیا۔" وہ پریشان تھے۔
"نہیں، ایسے ہی دیکھا ہے سرسری، یہ لڑکی بار بار باتوں میں لگا لیتی ہے۔ خیر تو ہے نا۔"
"خبر تو اچھی نہیں ہے اماں، اظہار دوبارہ پکڑے گئے ہیں۔ ضمانت منسوخ ہو گئی ہے، بہت ہی افسوس ہوا ہے، پتا نہیں شاکرہ اور بچیوں پر کیا گزر رہی ہو گی۔" بات کرتے ہوئے وہ قریب پڑی کرسی پر بیٹھے۔
زری دانستہ پیچھے کو سرکی۔
خبر تازہ تھی اور اس کی باخبر رہنے کی عادت، اسے ان سب سے بھی متعارف کرا چکی تھی، جن کو اس نے اب تک دیکھا بھی نہیں تھا۔
"الہیٰ خیر! رحم کر دے اظہار اور اس کے بیوی، بچوں پر، سارا پیسہ بھر دیا تھا اس نے، پھر بھی سزا ختم نہیں ہوئی تھی کیا۔" دادی کے چہرے کا رنگ اڑا تھا۔
"جرمانہ بھرا تھا اظہار نے اماں! اتنا کمایا نہیں ہو گا ان چکروں میں، جتنا ادا کرنا پڑا ہے، خدا کرے کہ سزا کم سے کم ہو، کوئی اچھا وکیل کرنا پڑے گا، فیس، مقدمے کے اخراجات....." وہ آہستہ آہستہ تفصیل بتا رہے تھے۔
ایک ایک کر کے سب ہی دادی کے کمرے میں جمع ہونے لگے۔
ربیعہ، امی..... اور معاذ۔
دروازے کے بالکل ساتھ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر وہ بالکل خاموش کھڑا تھا، کمرے میں ہوتے ہوئے بھی کسی تبصرے میں اس نے اب تک حصہ نہیں لیا تھا اور جب سے وہ یہاں آکر کھڑا ہوا تھا۔ زری کو اس پر سے اپنی نگاہ ہٹانے کی بڑی شعوری سی کوشش کرنی پڑ رہی تھی۔
امی نے حسب عادت زری کو وہاں سے رخصت کیا۔
"ہمیں اس وقت شاکرہ اور بچوں کی خبر گیری کرنی چاہیے، سارا خاندان جانتا ہے کہ وہ اس وقت کتنی بڑی مالی پریشانی سے گزر رہے ہیں، ہم سے کم اتنا تو کر سکتے ہیں نا کم....."
اسلام صاحب کی نیک نیتی سے کی گئی بات میں بھی اختلاف کا پہلو ڈھونڈا جا رہا تھا۔ شائستہ امی کا خیال بلکہ یقین تھا کہ اظہار چچا کا خاندان آج بھی ان کا دشمن نمبر ایک ہے اور جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اس پر ہمدردی کا ذرا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور اپنی رائے کے اظہار میں انہوں نے نہ تو دادی کی پروا کی تھی اور نہ ہی خاموش کھڑے معاذ کی۔
"اب ہمارا ہر تعلق ختم ہوئے مدت بیت گئی، پھر بار بار یہ ذکر ہی ہمارے گھر میں کیوں ہوتا ہے، ان کے ساتھ جو

کچھ بھی ہو رہا ہے اس سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہمارے اپنے مسئلے اپنے کام ہیں جو کسی بھی دوسری بات سے زیادہ اہم ہیں۔"

اب وہ ٹھونک بجا کر بات کرنے لگی تھیں اور کسی کی بھی مخالفت کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔

گھر اور خاندان کے لیے ساری عمر اتنا کچھ کرنے کے بعد وہ بجا طور پر اس کا حق بھی رکھتی تھیں۔ مگر کبھی کبھی یہ لب و لہجہ سخت وقت میں بھی مبتلا کرتا تھا۔

"کون سا مسئلہ؟ وہی معاذ کی شادی نا یہ ہی ایک بات تمہارے سر پر سوار ہے شائستہ! جب وہ کہہ چکا ہے کہ فی الحال وہ نہیں کرے گا پھر کیوں پیچھے پڑی ہو آخر۔"

ابا اظہار چچا کے معاملے کو لے کر از حد پریشان تھے سو اس بے وقت کی راگنی پر ان کی برہمی فطری سی تھی۔

امی کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ آئی۔

"نہیں پیچھے بڑوں کی اگر یہ اپنے منہ سے کہہ دے کہ یہ میری پسند کی ہوئی لڑکی سے شادی کرے گا چاہے دس سال بعد ہی سہی مگر اظہار اور شاکرہ کی بیٹی کا نام بھی نہیں لے گا۔"

بات ختم کرتے ہوئے انہوں نے مڑ کر پیچھے کھڑے معاذ کی طرف دیکھا تو سب ہی کی نگاہ اس کی طرف اٹھی۔

وہ بالکل خاموش تھا لیکن اس کے چہرے کی رنگت اڑی تھی۔

ان سب نے ہی دکھ کی کسی انتہا کو چھوا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے شائستہ! اولاد سے شرطیں رکھو گی اتنی سخت دل..." ابا نے ماحول کی سنگینی کو شاید کم کرنا چاہا مگر تب ہی معاذ نے پہلی بار ان کی بات کاٹی۔

"مجھے آپ کی بات منظور ہے امی! جو آپ چاہیں گی وہی ہو گا مگر وقت کا اصرار نہیں ہو گا اب آپ کے پاس بھی۔"

دادی نے بے ساختہ ہی دل پر ہاتھ رکھا تھا۔

"تم بھی کس بات کو لے کر سیریس ہو رہے معاذ! یہ تو یوں ہی جذباتی ہو رہی ہیں بات کیا ہو رہی تھی اور کہاں پہنچ گئی ہے۔"

ابا نے بھاری پڑتے ان لمحات میں اس کا ساتھ نبھانے کی ایک اور کوشش کی۔

"نہیں ابا! اب اس بات کو طے ہو جانے ہی دیں نہیں نام لوں گا میں جویا کا۔"

وہ بات کرتے ہوئے ذرار کا اس اذیت کو کم کرنے کے لیے جو وہ یہ سب کہتے ہوئے سہ رہا تھا۔ "لیکن تھوڑی سی انسانی ہمدردی کرنے دیں امی کچھ اور برا ہو گیا تو ہم میں سے کوئی بھی خود کو معاف نہیں کر پائے گا۔"

شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا کمرے میں بڑا اعصاب شکن سناٹا چھایا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح سے ہوتی بھاگ دوڑ کے اختتام پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام مکمل تھا۔

مسز کمالی نے ایک گہری نگاہ اس سارے اہتمام پر ڈالی جو سارا دن رکھی تھی جو یوسف کمالی نے خاص طور پر اپنی زیر نگرانی کروایا تھا۔

ڈائننگ ٹیبل اور ڈرائنگ روم میں تازہ پھولوں کی آرائش ابھی کچھ دیر پہلے ہی ختم ہوئی تھی اور ایک دلفریب سی مہک اب سارے میں اڑ رہی تھی۔

"بہت زیادہ پروٹوکول نہیں دیا جا رہا ہے ہمارے گھر سالار کی بیوی کو۔"

زوبیہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں تبصرہ کیا تھا۔

وہ اب یہیں رہ رہی تھی وہاں گھر پر بار بار سلمان کی آمد سے بچنے کے لیے اس نے یہ ہی مناسب سمجھا تھا۔

"یوسف کا بہت اچھا تعلق ہے سالار سے اس لیے وہ کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتے اس دعوت میں۔"

ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے مسز کمالی نے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"پہلے تو کبھی انہیں سالار نظر نہیں آیا اور نہ اس کی اچھائی بس زرتاج آنٹی کی محبت میں ہی ڈوبے رہتے تھے کتنی زیادتی کرتی تھیں وہ اس بے چارے پر مگر کسی کو بھی اس پر رحم نہیں آتا تھا۔ حالانکہ پتا بھی تھا کہ آدھی سے زیادہ جائیداد کا وارث وہ ہی ہے۔"

ذاتی زندگی میں ناکامی اٹھانے کے بعد زمانے بھر پر تنقید کا حق زوبیہ کو خود بخود حاصل ہو گیا تھا۔

مسز کمالی اس کی کیفیت کو سمجھ کر بھی انجان بنے رہنے میں ہی عافیت محسوس کر رہی تھیں۔

"وقت وقت کی بات ہے زوبی! یوسف دل کے اچھے ہیں پہلے تو طبیعت بھی نرم تھی بعد میں حالات ہی کچھ ایسے ہوتے چلے گئے کہ..."

ایک بہت ہی گڈمڈ ہوا واقعات کا مجموعہ تھا۔ جو خود ان کے لیے بھی برسوں تکلیف کا سبب بنا رہا تھا۔

"آپ دونوں بھی اچھے والدین ثابت نہیں ہوئے کسی نے بھی میرے بارے میں اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کی دونوں ہی ضد پر اترے رہے یہ تو مانتی ہیں نا۔"

وہ اپنے سے آگے دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"تم کپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ وہ لوگ آنے ہی والے ہوں گے۔" مسز کمالی نے سنی ان سنی کر کے کہا۔

"پہلے ہی ضرورت سے زیادہ اہتمام کیا جا چکا ہے اب مزید تیاری کی گنجائش نہیں ہے ٹھیک ہوں میں ایسے ہی۔" اپنے کل سے پہنے ہوئے کپڑوں پر اس نے ایک نگاہ ڈالنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔

"ضد مت کرو زوبی سالار کی بیوی پہلی بار ہمارے گھر آ رہی ہے' تم سوچ سکتی ہو' وہ کتنی تیار ہو گی' اور مجھے تو لگ رہا ہے کہ یوسف نے چند گیسٹ اور بھی بلائے ہیں' یہ اتنا سب کچھ صرف دو لوگوں کے لیے تو نہیں ہو گا نا۔"

"پورا شہر بھی بلا لیں' تو مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔" وہ کہتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔

"کیوں نہیں فرق پڑتا ہے' تم سالار اور اس کی بیوی پر اپنا کیا امپریشن ڈالنا چاہ رہی ہو' یہ ہی کہ تم بہت ناکام ہو اپنی زندگی میں' ایک سلمان کے نہ ہونے کی وجہ سے برباد ہو چکی ہو۔"

مسز کمالی کی آواز نے اسے رکنے پر مجبور کیا۔

"ہزاروں عورتوں کے شوہر خراب نکلتے ہیں' اور کئی بار ان کے پاس اپنے گزارے لائق دو وقت کی روٹی بھی نہیں ہوتی' پھر بھی وہ زندہ رہتی ہیں اور خوش بھی۔ تم نے کیوں خود کو تماشا بنانے کی ٹھان لی ہے آخر۔"

ان کا لہجہ سخت تھا اور پر اثر بھی۔

زوبیہ ان کی بات ختم ہوتے ہی بنا مڑ کر دیکھے تیزی سے لاؤنج سے باہر نکل گئی تھی۔

بیگم کمالی نے مایوسی سے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔

"پتا نہیں اب یہ جینا سیکھے گی بھی یا نہیں۔"

مہمان کسی بھی لمحے پہنچ رہے تھے۔

یوسف کمالی انہیں ریسیو کرنے کے لیے باہر جا چکے تھے اور جب تک وہ بھی باہر آئیں سالار اور گیتی گاڑی سے اتر چکے تھے۔

مسز کمالی نے دور سے ہی اسے نظر بھر کر دیکھا تھا۔ ان کی توقع کے برخلاف وہ بہت زیادہ تیار ہو کر نہیں آئی تھی' مگر اس کے لباس اور جیولری میں بڑی کلاس کی نفاست تھی اور اس کے پر کشش وجود میں توجہ کی ساری صلاحیت۔

بیگم کمالی نے کن اکھیوں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔ عمر کے اس حصے میں کوئی ایسی خاص شکایت باقی نہیں رہی تھی' پھر بھی وہ ان کی حسن پرست طبیعت کے ہاتھوں بہت کچھ سہہ کر بیٹھی تھیں۔

"بہت خوشی ہوئی تمہاری شادی سے مجھے سالار! خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہیں من پسند ساتھی عطا کیا۔"

پورے خلوص کے ساتھ یوسف کمالی' سالار سے مخاطب تھے۔ اس کے چہرے پر پھیلی خوشی نے واضح اشارہ دیا تھا کہ یہ ہی وہ لڑکی ہے' جس سے وہ نہ جانے کب سے محبت کر رہا تھا۔

ڈائننگ روم میں خوش گوار سی گرمجوشی پھیلی تھی۔

گیتی شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ دھیمے انداز میں مسز کمالی سے باتوں میں مصروف تھی۔

اس کے چہرے پر جھولتی لٹ نہ جانے کیا یاد دلا رہی تھی۔

یوسف کمالی نے چھونے سے لمحے میں خود کو بہت دور جاتا محسوس کیا اور واپس پلٹنا بھی۔

"دھت!" ایک چھوٹی سی تنبیہہ خود کو بھی ضروری ہوئی۔

"گیتی' کمالی انکل سے میرا اب دلی تعلق ہے' اور تمہیں اب تک تو پتا چل ہی چکا ہے کہ بہت کم لوگ ہیں میری زندگی میں۔"

سالار گیتی کو بتا رہا تھا۔

کمالی صاحب کو اچھا لگا تھا۔

"زوبیہ کیسی ہے آنٹی' آئی نہیں وہ۔"

"زوبیہ' ہاں شاید وہ۔۔۔"

مسز کمالی کے لیے الفاظ کا انتخاب مشکل ہوا' تب ہی وہ اندر چلی آئی۔

"بڑی عمر ہے تمہاری' ابھی ذکر ہوا' ابھی موجود۔" سالار اس کے لیے احتراماً" کھڑا ہوا تھا اور ساتھ ہی گیتی بھی۔

زوبیہ ایک خوب صورت لباس میں ملبوس تھی' سلیقے سے کیا ہوا میک اپ اور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ۔ بیگم کمالی نے سکون کا سانس لیا تھا۔

تھوڑی دیر کے لیے گیتی اور سالار دونوں ہی زوبیہ کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔

"بہت اچھی بیوی ملی ہے تمہیں سالار! اتنی پیاری لڑکیاں کم ہی دیکھی ہیں میں نے۔" اندر جو کچھ بھی چل رہا تھا اسے کنٹرول کر کے وہ بہت سلیقے کے ساتھ پیش آ رہی تھی' گیتی شرمیلے سے انداز میں ہنس پڑی۔

کمالی صاحب نے ایک بار پھر چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا تھا اس لڑکی کی اداؤں میں' جو اسے ویسے ہی سب سے الگ کر رہا تھا' جیسے کبھی کسی اور کو کیا کرتا تھا۔" انہوں نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

"اور بیٹا گیتی! تمہاری کیا مصروفیت ہے' پڑھ رہی ہو ابھی یا پھر۔" انہوں نے جان بوجھ کر خود کو باتوں میں مصروف کرنا چاہا۔ مسز کمالی کو ان کے منہ سے گیتی کے لیے بیٹا کا لفظ بڑا ہی اچھا لگا تھا۔

وہ انہیں کچھ اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔

سب کو تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ وہ پہلی بار کراچی آئی تھی۔

"اصل میں کبھی ایسا کوئی موقع ہی نہیں ملا' ہم لوگ میرا مطلب ہے میری امی' نانی وہیں رہیں ہمیشہ' یہاں کوئی ایسا تھا ہی نہیں جس کے لیے یہاں آیا جاتا۔"

اس کے لہجے میں سادگی کے ساتھ اب سالار سے ملا اعتماد بھی تھا۔

سالار کے چہرے پر بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔

"اور کمالی صاحب! گیتی کے بارے میں سب سے اہم بات۔" اس نے ذرا رک کر کمالی صاحب کو دیکھا۔ وہ اطمینان سے جوس کا بھرا ہوا گلاس منہ سے لگا رہے تھے۔

"ملک کی نامور ستار نواز بیگم ستارہ جان گیتی کی نانی ہیں' بہت شان دار خاتون۔۔۔"

جوس کا بھرا ہوا گلاس ہلکے سے کانپا اور چند قطرے کمالی صاحب کے لباس پر گرے۔

"ارے' آپ کے کپڑے خراب ہو گئے۔" سالار نے تیزی سے اٹھ کر گلاس ان کے ہاتھ سے لیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ اِن شاءاللہ)

☆

صبا نور

حسد

یوں تو غصہ ہر وقت ہی عروج کی ناک پر دھرا رہتا تھا۔ مگر آج صبح ہی صبح جانے کیوں نقطہ عروج پر جا پہنچا۔ اس نے گڑیا کو کوسا تھا۔ ناشتا بناتے ہوئے برتن اٹھا اٹھا کے پٹخے تھے اور تو اور اپنے اکلوتے راج دلارے منے کو کس کس کے دھموکے جڑے تھے۔ اور یہ کہاں ممکن تھا کہ سارا گھر زیرِ عتاب آئے اور فراز کی جان خلاصی رہے۔ سو اس کی باری بھی آ ہی گئی۔

"جانے کون سا گھن کھا رہا تھا امی ابا کے سونے کو' جو لے کے جھونک دیا اس جہنم میں' اس سے تو کنواری ہی بھلی تھی میں' ابھی کون سی عمر نکلی جا رہی تھی میری' یہ نہ ہوا' اب تک کی زندگی تنگی میں گزری ہے تو کسی ڈھنگ کے بر کا ہی انتظار کر لیتے۔ جانے ایسی کون سی خصوصیت بھا گئی تھی۔ اک ذرا شکل ہی تو اچھی ہے۔ اسی پر ریجھ گئے۔ تو اس میں اپنا کون سا کمال ہے۔ شکل کو کون چاٹتا ہے۔ انسان میں گن ہونے چاہئیں گن۔ دو' چار کلاس زیادہ پڑھ جاتے تو شاید کوئی ڈھنگ کی نوکری ہی نصیب ہو جاتی۔ مگر نا جی! لوگوں نے اپنی کمائی سے کنالوں پر محل کھڑے کر رکھے ہیں۔ بچے مہنگے اسکولوں میں پڑھ رہے ہیں۔ نہ یہ ایسے نااہل ہوتے' نہ مجھے اپنی ہڈیاں رگڑنی پڑتیں۔ دنیا کے مرد دو' دو نوکریاں کرتے بھی گھر کو بھگت رہے ہیں۔ بیویوں کو کمائی کے لیے باہر نہیں دھکیل رکھا۔ شادی کر کے ملا ہی کیا۔ سسکتی زندگی' روز' روز چخ چخ۔ نکما میاں اور یہ فیکٹری کی جان گھلاتی مزدوری جیسے میں مری ہی تو جا رہی تھی شادی کرنے کے لیے' اچھی بھلی زندگی وبال بن گئی۔"

خیر سے عروج نے زبان بڑی لمبی پائی تھی۔ کچھ فراز کی خاموشیوں نے اس زبان کو دھار بخشی۔ اسی طرح کی ہزار فردِ جرم عروج نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس پر عائد کر رکھی تھیں جنہیں وہ سر جھکا کر سن لیتا۔ فراز فطرتاً" صلح جو' نرم طبیعت اور امن پسند واقع ہوا تھا' دوسرے معنوں میں شریف آدمی' جو بیوی سے ڈرتا ہی ہے' سو وہ بھی بلا مقابلہ ہار مان لیتا تھا۔ پہلے پہل تو بڑی بحث و تکرار ہوئی۔ فراز برملا کہتا کہ۔

"گزارا نہیں ہوتا تو کیا ڈاکے مارنے نکل جاؤں۔"

مگر اب خاموشی سے سنتا اور اسکوٹر اٹھا کے اپنی راہ لیتا۔ پلٹ کے کبھی اتنا بھی نہ جتا سکا کہ شادی کے وقت اس پر فراز کی حیثیت اچھی طرح آشکار تھی' اس نے دھوکا تو نہ کیا تھا۔ نہ کبھی عام مردوں کی طرح اسے یہ طعنہ دے سکا کہ وہ کون سی محلوں سے اٹھ کر آئی ہے یا یہ کہ نوکری کے لیے اس نے تو عروج کو نہیں اکسایا تھا۔ مگر شاید اس نے عروج کی بدزبانی سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ یا پھر خود پر عائد کردہ تمام الزامات کو صدقِ دل سے تسلیم کر لیا تھا۔ چائے میں پراٹھا ڈبو کر کھاتے ہوئے بار بار نوالہ اس کے حلق میں اٹکا تھا۔ لنچ کا خالی ٹفن اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ ایسے میں عروج سے تقاضا بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ منا سسکیوں سے رو رہا تھا۔ وہ ناشتے سے ہاتھ کھینچ کر اٹھ گیا۔ برتنوں کی اٹھا پٹخ ابھی جاری تھی۔ گڑیا یونیفارم پہن کے اس کے سر پر سوار تھی۔

"امی! اسکول کو دیر ہو گئی ہے۔" اور حسبِ توقع اس کی بھی شامت آ گئی۔

"تو میرے سر پر کیوں کھڑی ہے؟ جا کے بک اپنے باپ سے۔" عروج نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہا تو وہ سہم کر مڑ گئی تھی۔ پھر الٹے قدموں لوٹ آئی۔

"ابو کہہ رہے ہیں' اسکوٹر کے بریک خراب ہیں' وہ مکینک کو دیتے ہوئے جائیں گے۔"

اس نے ایک بار پھر برتن اٹھا اٹھا کے پٹخنے شروع کر دیے۔ اب وہ رکشہ کر کے گڑیا کو اسکول چھوڑتی ہوئی جائے۔ یعنی اک نیا خرچا' جس کے لیے یقیناً" اسے ہی۔ نکالنے پڑتے مہینے کا آخر تھا۔ فراز ساری تنخواہ اس کی ہتھیلی پر رکھ کر خود ہاتھ جھاڑ لیتا تھا۔ اور اس کی اپنی تنخواہ آنے بہانے سے یوں ٹھکانے لگتی کہ وہ ہاتھ روکنا بھی چاہتی تو نہ روک پاتی۔ اس بار بھی اس نے تنخواہ کے انتظار میں ایک ایک دن گن کر گزارا تھا

اور تنخواہ ہاتھ میں آئی تو چٹنی بن گئی۔ ہزار مسائل' پھر بھی منہ پھاڑے کھڑے تھے۔ اس کے دانت کی تکلیف بڑھ رہی تھی۔ گھڑی کا سیل ختم ہو گیا تھا۔

موبائل کی بیٹری کمزور ہوگئی تھی۔ الماری کے تالے خراب ہوگئے تھے تو پٹ لٹک گئے۔ ناچار اسے اپنی بچت کو ہوا دکھانی پڑی۔ بچوں کو اسکول سے تاخیر ہوجاتی یا اس کی اپنی کمپنی کی بس نکل جاتی تو اسے رکشہ کرنا پڑتا۔ یعنی اضافی خرچ اور اس کا پارہ آسمان کو جا پہنچتا۔ اپنے کھوٹے نصیبوں پر وہ کبھی دوسروں کو اور کبھی خود کو ہی کوسنے بیٹھ جاتی۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے، جب اخبار پڑھتے ہوئے اک اشتہار اس کی نظروں سے گزرا تھا۔ کسی سلائی کمپنی کو ورکر عورتوں کی ضرورت تھی۔ پک اینڈ ڈراپ تھا۔ اور لنچ بھی۔۔۔ اسے اور کیا درکار تھا۔ سو آ گئی اور جب وہ اڑ جاتی تو اس کے زبان کے جوہر سننے کے قابل ہوئے۔ تقدیر کی ساری ستم ظریفی اور حالات کی تمام تر تلخی جیسے زبان میں سما گئی تھی۔ کچھ بھی تھا، مگر یہ تو طے تھا کہ فراز اس سے جیت نہ سکتا تھا۔ سو اجازت دیتے ہی بن پڑی تھی۔

یہ اور بات کہ نوکری کے چار دنوں نے ہی سارے کس بل نکال کے رکھ دیے تھے۔ تھکن جیسے نس نس میں اتر گئی تھی۔ گڑیا جیسے بن پڑتا، اسکول سے لوٹ کے دو، چار کام نبٹا لیتی تو وہ نہ ہونے کے برابر رہتے۔ اور وہ جو اس کا خیال تھا کہ وہ نوکری کرکے اس گھر کی کایا پلٹ دے گی، دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ گھر کے مسائل جوں کے توں تھے۔ کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ سوائے اس کے کہ بچ رہنے والے پیسوں سے سرکش خرچے قابو آگئے تھے۔ فراز کو مہینے کے آخر میں پیٹرول کے پیسے مل جاتے تھے۔ یہ اور بات کہ اس کے وجود کی چولیں ہل کر رہ گئی تھیں۔ یہ تو طے تھا کہ وہ ہار رہی تھی۔ تھک رہی تھی، شاید کام کی زیادتی کے سبب، صبح بچوں کو اسکول اور فراز کو روانہ کرنے میں گھنٹوں لگ جاتے۔ پھر فیکٹری کی جان توڑ دینے والی مشقت۔ اور اس نے ان تمام خساروں کو بڑی سہولت سے فراز کے کھاتے میں ڈال رکھا تھا۔ امی نے جان مار کے اسے دس کلاسیں پاس کرائی تھیں۔ جو اب خاک میں ملتی نظر آتیں۔ وہ شادی سے پہلے کی بات تھی، جب وہ بڑی صابر و قانع اور خوش گفتار ہوا کرتی تھی۔ شادی کے بعد کے لیے تو اس نے بڑی سہل زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ مگر شاید حالات کی سختی یا پھر فراز کے بے ضرر رویے نے اسے دو دھاری تلوار بنا دیا تھا۔

امی کہتیں اور غالباً" درست ہی کہتی تھیں کہ عورت ذات خود کو پل پل مارتے رہنے کا نام ہے۔

"یہ بھی کوئی زندگی ہے۔" یہ اس کا پسندیدہ ترین جملہ تھا۔

اسے زندگی سے اتنے شکوے کبھی نہ رہے تھے، جتنے شادی کے بعد ہوگئے تھے۔ وہ کبھی کبھی خود تک سے خفا ہوجاتی تھی۔ اچھی خاصی سمجھ بوجھ والی ثابت ہوئی تھی۔ جانے شادی کے معاملے میں عقل پر پتھر کیوں پڑ گئے تھے کہ گدھیا کی طرح والدین کی منشا پر سر جھکا دیا اور امی بھی تو اڑ گئی تھیں۔

"زمانہ خراب ہے" "اچھے رشتے نہیں ملتے" یہ وہ۔"

جوں ہی فراز کا رشتہ آیا، جھٹ ہامی بھرلی، جیسے اس سے اچھا بر تو اسے جڑنے کا ہی نہیں "کیا حرج تھا جو دو، چار سال اور نکل جاتے۔ شاید کوئی بھلا رشتہ آہی جاتا۔ بھلے سے کنوارا نہ ہوتا۔ وہ دوہاجو سے بھی بیاہ رچالیتی۔ کم از کم آج یوں سسک سسک کر جینا تو نہ پڑتا۔ ایسی بھی کوئی عمر نہ نکلی جارہی تھی اور کوئی اتنی گئی گزری شکل کی بھی نہ تھی۔ سنا تھا امیر بوڑھے ہنسی خوشی مڈل کلاس کی خوب صورت لڑکیوں کو بیاہ ہی لیتے ہیں۔ مگر ناجی! وہ ہی سات ہزار ماہوار کمانے والا اللہ کا مزدور مقدر ٹھہرا، اور مقدر لکھنے والے نے بھی جیسے لکھ کر مہر لگادی تھی کہ سکھ کا لقمہ تو حلق سے اتر ہی نہیں سکتا۔ میکے میں بھی تنگی ترشی کا منہ دیکھا تھا اور یہاں بھی خیر سے تنگ دستی کا ہی سامنا تھا۔ مہینے کے آخر میں کہیں شادی بیاہ ہو تو دل مار کے بیٹھ جاؤ۔ بچوں کی کوئی ضرورت ہے تو پانچ تاریخ کا انتظار یہاں تک کہ بیمار بھی پڑ جاؤ تو سرکاری اسپتال کی لمبی قطار میں خجل خوار ہوتے پھرو۔

سنا تھا کہ بچے دو ہی اچھے۔ سو انہوں نے اسی ہدایت پر عمل کیا تھا، مگر یہ دو بچے بھی اس وقت بد تر

ثابت ہوجاتے، جب فرمائشوں کا پٹارہ کھول کر ایڑیاں رگڑتے اور عروج کا دل بھر بھر آتا تھا۔

اسے گھر سے قدم نکالنا ہی پڑے تھے۔ آٹھ سال ہوگئے تھے خون کے آنسو روتے ہوئے اور ان آٹھ سالوں نے اس پر اچھی طرح روشن کردیا تھا کہ بنا ہاتھ پاؤں چلائے کچھ بھی بدلنے والا نہیں۔ سو وہ اڑ گئی تھی اور ہمیشہ کی طرح فراز کو مانتے ہی بن پڑی تھی۔

✡ ✡ ✡

گرمی عروج کو پہنچی تو لوڈشیڈنگ کا معمول بھی بدل گیا۔ وہ فیکٹری سے لوٹتی تو بجلی غائب۔ خون کے گھونٹ پی کر گھر کے دھندے بھگتانے لگتی۔ وہ جو عصر، مغرب کے درمیان ذرا سی آنکھ لگا لیتی تھی، اب اس سے بھی گئی۔ آج بھی پھوڑے کی طرح دکھتے وجود کے ساتھ گھر کے کام نمٹائے۔ ہانڈی چڑھائی، بجلی سات بجے کے بعد آئی اور بس اتنی دیر کہ رات کے کھانے سے فارغ ہو کر عشاء کی ادائیگی کرلی جائے۔

گڑیا نے بالٹی بھر کے صحن کا چکنا فرش دھویا اور چارپائیاں بچھادیں۔ فراز رات سونے سے پہلے ریڈیو پر فرمائشی پروگرام سنتا۔ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جاتا۔ بچے ہوم ورک بھگتاتے۔ وہ تخت پر عشاء کی نماز پڑھ کے وہیں سوجاتی۔ بجلی کب آئی، کب گئی، پتا ہی نہ چلتا تھا۔

"کیا پکا ہے؟" منا کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔

"آلو پالک۔"

"پھر سبزی!" وہ ٹھنکا۔ "آپ ہمیشہ ایسی ہی چیزیں پکایا کریں۔ کبھی پھیکی سیٹھی دال، کبھی گلے سڑے ٹینڈوں کی سبزی، میں نہیں کھاتا۔"

"تو اپنے باپ کا کلیجہ نکال کے کھالے۔" اس کے تلووں سے لگی سر پر بجھی۔

ایک تو یہ بڑی مصیبت تھی، موضوع کچھ بھی ہوتا، وہ فراز کی ذات کو ضرور گھسیٹتی۔ جیسے تمام مسائل ایک اس کی ذات کے سبب ہی تو ہیں۔ سامنے صحن میں اخبار پڑھتے فراز نے اخبار کا کونا موڑ کر ایک نظر اسے دیکھا تھا اور پھر سے اخبار میں منہ دے لیا۔

"میں نے کھانا! مجھے نہیں کھانی پالک کے پتوں کی بھجیا!" منا بھی اپنے نام کا ایک تھا۔ مقابل اگر گڑیا ہوتی تو وہ اسے بالوں سے گھسیٹ کر دو چار دھموکے جڑ دیتی، مگر یہ منا تھا، اس کی امیدوں اور محبتوں کا محور و مرکز، سو اس نے دل پر پتھر رکھ کر بٹوے سے بیس کا نوٹ نکال کر اس کی مٹھی میں دبا دیا تھا۔

"اچھا! یہ لو بازار سے کچھ لے کر کھالو اور گھر میں منہ صاف کرکے آنا۔" اسے پتا تھا گڑیا لازمی شور مچائے گی، منا حلیم یا بن کباب پسند کرتا تھا۔ مگر گڑیا حساس و ذمہ دار تھی، جو ملتا صبر شکر کرکے کھالیتی۔

آج مہینے کی پندرہ تاریخ تھی اور آٹے کا کنستر منہ چڑانے لگا تھا۔ کبھی انوکھے لاڈلے کی ایسی تشنہ خواہشات پر وہ فراز کو مجرم گردانتی، مگر اب اچھی طرح پیسے کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوگیا تھا۔ اس نے تو سوچ رکھا تھا کہ اپنی تنخواہ کو ہوا بھی نہ لگنے دے گی۔ گھر تو جیسے تیسے چل ہی رہا ہے۔ بچوں کے فرائض تو فراز کا ذمہ ہیں۔ اسے تو بس گھر کی آمدنی میں اضافہ درکار تھا۔ تاکہ آئندہ کی فکرات سے نجات ملے۔ گڑیا بڑی ہورہی تھی۔ منے کو اس نے میڈیکل پڑھانا تھا، تاکہ آئندہ کی زندگی سکون و اطمینان کے ہنڈولے میں جھولتے گزرے، مگر ناجی! گھر میں رہتے ہوئے گھر کے مسائل سے فرار کہاں ممکن ہے۔

چار ہزار میں گھر کی کایا پلٹ دینے کی سوچ خام خیالی کے سوا کچھ نہ تھی اور یہ اندازہ کچھ ہی دنوں میں ہوگیا تھا۔ سوچا تھا ہر ماہ کچھ رقم بچا کے ایک بڑی رقم منافع کھاتے میں ڈلوا دے گی، پھر جب ماہانہ انکم اس کی تنخواہ کے برابر ہوجائے گی تو وہ نوکری چھوڑ چھاڑ گھر بیٹھ جائے گی، سکون سے پیر پسار کے سویا کرے گی۔ اب آخر ساری زندگی یوں ہڈیاں رگڑتے تو نہیں گزارنی تھی نا! مگر ہوتا یہ کہ ہر ماہ کچھ نہ کچھ خرچا نکل ہی آتا۔ کبھی عزیزوں میں کوئی شادی، جہاں دینا لازمی ٹھہرتا۔ کبھی کوئی بڑی، کبھی کوئی چھوٹی ضرورت، پیسہ ہاتھ میں آتے ہی جیسے پر لگ جاتے تھے۔

وہ خود اپنی مرضی سے اہم ضروریات کی مد میں اپنی تمام کی تمام تنخواہ اٹھا دیتی۔ ایک ایک دن گن کر تنخواہ کا انتظار کرتی اور تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی ضروریات جانے کہاں کہاں سے اگ اگ کر سامنے آجاتیں۔ لاکھ چاہا کہ کسی نہ کسی طرح ایک کمیٹی ہی ڈال دے' اکٹھی رقم ملنے کا کچھ تو آسرا ہو' مگر ناجی! یہ خیال' خیال ہی رہا' بڑی کمیٹی دو یا ڈھائی ہزار سے تو کیا ہی کم میں پڑتی۔ اور اتنی رقم جڑتی تو وہ لان کے دو' چار جوڑے ہی نہ سلوا لیتی۔ گرمیوں کے تپتے دنوں میں کاہے کو رنگ اڑے پرانے جوڑے پہن کے فیکٹری سدھارتی۔

وہ کسی کام سے اٹھ کر اندرونی کمرے میں گئی تو بے اختیار آئینے کے سامنے ٹھٹک گئی۔ بغور خود کو دیکھا' سارا رنگ روپ جیسے مرجھا کر رہ گیا تھا۔ دوسروں کو کمپلیکس میں مبتلا کر دینے والی آنکھیں ہمہ وقت غصہ کرنے کے سبب سکڑ کر رہ گئی تھیں۔ فراز ان آنکھوں کی کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے تھے ان کی شادی کو' کل کی ہی بات لگتی ہے' مگر اب کتنے دن ہو گئے تھے فراز کو اس کی تعریف کیے ہوئے۔ وہ انگلیوں پر دن گننے لگی۔ محدود آمدنی' لاتعداد مسائل' زندگی ان سب کے درمیان کچلی گئی تھی۔ اور اس بیچ میں وہ ایک دوسرے سے کتنے دور ہو گئے تھے۔

وہ دن تو گویا خواب ہوئے' جب وہ آفس سے لوٹتا تو عروج سج سنور کر اس کا استقبال کرتی۔ فراز ہر تنخواہ پر اس کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لایا کرتا تھا۔ اب تو عرصہ ہوا ایک پھولوں کا گجرا بھی لا کر دیے ہوئے۔ سیدھے سبھاؤ تنخواہ اس کے ہاتھ پر رکھ کر ہاتھ جھاڑ لیا کرتا تھا۔ نہ ہی اس کے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریف کرتا' جو ملتا خاموشی سے کھا لیا کرتا۔ نہ مین میخ' نہ نخرا' اور تب تو وہ بھی چن چن کر اس کے پسندیدہ کھانے پکایا کرتی تھی۔ مگر اب... قربتوں پر مصائب کی دھول پڑ گئی تھی' زندگی مشقت کی چکی میں پس رہی تھی اور یہ ساری بھاگ دوڑ پیسے کے پیچھے ہی تو تھی۔ پیسہ اگر نہ ہو تو انسان بے مول ہے۔ انسانی زندگی میں اگر سو مسائل ہیں تو ننانوے پیسے کی کمی کے سبب... شاید اس کے اور فراز کے درمیان بھی یہ فاصلے نہ بڑھتے' اگر وہ خوش حال زندگی گزارتے' مگر یہ بھی ہے کہ کلی طور پر خوش و خرم تو کوئی بھی نہیں رہ سکتا۔

وہ ان ہی سوچوں کے درمیان جانے کب سو گئی۔

☼ ☼ ☼

آج صبح ہی سے سارے کام گڑبڑ ہو رہے تھے۔

منے کو رات سے بخار تھا۔ بار بار الٹیاں کرتا رہا۔

اس نے ناشتا بنایا تو ہاتھ جل گیا۔

رات ستانے کو لیٹی تو نیند آگئی تھی۔ نتیجتاً" سب کے کپڑے استری ہونے سے رہ گئے۔

گڑیا کا پرچہ تھا۔ وہ تیاری میں جتی ہوئی تھی۔ عروج کو کپڑوں کا ڈھیر استری کرتے ہوئے تاخیر ہو گئی۔

گھر سے نکلی تو چپل ٹوٹ گئی' موچی ڈھونڈ ڈھانڈ کے کو کے لگوائے۔ بس تو نکل ہی چکی تھی' مجبوراً" اسے رکشہ کر کے فیکٹری جانا پڑا۔ تب بھی مقررہ وقت سے بیس منٹ لیٹ تھی۔ سپروائزر نے بلا کے خوب ڈانٹ پلائی۔

"بی بی! نوکری کی ہے تو وقت کی پابندی بھی سیکھیں' ورنہ آرام سے گھر بیٹھیں۔" وہ کرخت لہجے میں جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ عروج لب بھینچے سنتی رہی۔ ساری بدزبانی جیسے کہیں جاسوئی تھی۔

فیکٹری کی دو چار لڑکیاں قریب سے ہنستی ہوئی گزریں تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ کبھی وہ بھی ایسی ہی بے فکر ہنسی ہنستی تھی۔ کلستی ہوئی ڈیپارٹ تک آکر اپنی مشین کے سامنے بیٹھ گئی۔

ماحول میں مخصوص کھچا کھچ تھی۔ اس کے آنے کا کسی نے نوٹس نہ لیا تھا۔ وہ خود کسی سے زیادہ سلام دعا کی قائل نہ تھی۔ میل جول بڑھاؤ تو آنے جانے ملنے ملانے میں خرچ ہی ہوتا ہے۔ یہاں تو یہ عالم تھا کہ کبھی آئے گئے کے لیے دودھ تک منگوانے کے پیسے نہ ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کے دعوت نامے مہینے کے آخر میں آتے تو بڑے منہ چڑاتے رہتے۔ وہ شرکت کے لیے

دل مسوس کر رہ جاتی۔

آج دل حد سے سوا بوجھل تھا۔ اک عجیب سی بے کلی' جو کسی انہونی کا پتا دیتی ہے اور یہی ہوا!

دوپہر ہونے سے پہلے گڑیا کا ہچکیوں' سسکیوں سمیت فون آگیا۔ منے کی طبیعت زیادہ خراب تھی۔ وہ لگاتار الٹیاں کر رہا تھا۔ مگر اس بار سپروائزر کو رحم آگیا۔

وہ گرتی پڑتی واپس لوٹی تھی۔ منے کو ڈائیریا کا اٹیک ہوا تھا۔ اس کے قدموں تلے سے زمین نکل گئی۔ پڑوسن سے پیسے ادھار لے کر منے کو لے کر دوڑی' منے کو ڈرپ لگی تھی۔ دوائیاں' اسپتال میں میڈیکل کے ہزار چکر' مگر جب لوٹی تو منا قدرے بہتر تھا۔ کچھ دیر میں سو گیا۔ اک گرم اور تھکن زدہ شام گھر کی دیواروں سے رخصت ہونے کو تھی۔

وہ بھی ذرا ستانے کو لیٹی تو پلکیں بوجھل ہو کر جڑنے لگی تھیں۔ مگر گڑیا سر پر آن سوار ہوئی۔

"ابو کی اسکوٹر درخت سے ٹکرا گئی۔ ان کے سر پر پٹی بندھی ہے۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ فراز پر نظر پڑی تو دھک سے رہ گئی۔ اس کے سر پر بندھی پٹی خون سے سرخ ہو رہی تھی۔

"یہ... یہ کیسے ہو گیا؟" وہ تڑپ کر اس کے نزدیک آئی۔ دل سوزی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ مگر اس نے بس ایک نظر عروج پر ڈالی تھی' پھر شانے پر دھرا اس کا ہاتھ جھٹک کر اندرونی کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

وہ سن رہ گئی۔

اس کی نظروں میں ملامت تھی' نہ کوئی جواب' اور نہ ہی غصہ یا الزام' بس اک تاسف بھری نظر... مگر وہ ذہن میں دھنستی چلی گئی تھی۔

صبح یقیناً" اسے تاخیر ہوئی۔ اور وہ آج بھی اسکوٹر تک نہ پہنچ سکا ہو گا۔ جس کی قصوروار وہ خود تھی۔ مگر... یہ فراز تھا... اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بے زاری و اجنبیت تھی اس کے انداز میں۔ اس حادثہ کی ذمہ دار وہ ہی تو ہو اور اس کا خیال ایسا غلط بھی نہ تھا۔

گڑیا کے ہاتھ گرم دودھ بھجوا کر وہ کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ آنکھیں بھر آرہی تھیں۔ کس بیگانگی سے فراز نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ اور اس کے پاس تھا ہی کیا اس ایک محبت کے مان کے سوا۔

محبت! جو تلخی حالات کی دھند میں کہیں کھو کر رہ گئی تھی اور اس محبت کا آسرا بھی چھن گیا تو وہ خالی ہاتھ نہ رہ جائے گی؟ بس اندھیرا ہی اندھیرا۔ اس سے آگے کچھ سوچا ہی نہ گیا۔

خدا جھوٹ نہ بلوائے تو امی' ابا میں کبھی ایک پل کی نہ بنی تھی۔ امی' ابا کی لغت میں ناشکری اور فضول خرچ تھیں۔ ابا جو بھی کماتے' ایمان داری سے لا کر امی کے ہاتھ پر لا رکھتے' پھر گرہستی سے منسلک سارے سر کے درد امی کے سر میں منتقل ہو جاتے۔ امی کا بازار کا ایک پھیرا لگتا اور تنخواہ آدھی' خیر ابا نے حساب کتاب تو کبھی نہ مانگا تھا۔ مگر امی مہنگائی کے رونے روتیں تو انہیں بہانے بازی لگتی۔

ابا کہتے "امی کے ہاتھوں میں چھید ہیں کہ ان کے رونے ہی نہ ختم ہونے میں آتے تھے۔ فلاں بچے کی بیماری پر لتنے اٹھ گئے۔ فلاں بچی کا داخلہ کرانا ہے' اس کے کپڑے نہیں' اس کے جوتے درکار ہیں' یہ وہ۔

ابا روز کا کرایہ امی سے لے کر کام پر جاتے تھے۔ بیس روپے یومیہ' دس روپے سگریٹ کا خرچہ اور دس روپے کرایہ۔

وہ چائے اور سگریٹ کے رسیا تھے۔ سگریٹ سے سگریٹ جلاتے۔ امی کو ان کی سگریٹ سے بیر تھا اور امی کا پان کھانا ابا کی نظروں میں کھٹکتا کہ دس روپے روز کا خرچ تو یہ ہی ہے اور ایسی ہی باتوں پر تکرار زور پکڑتی۔ ابا کو امی کے میکے سے چڑ تھی اور امی کو وہ مظالم ازبر تھے جو سسرال کی چند سالہ ہمراہی میں ان پر روا رکھے گئے تھے اور کبھی جو امی کسی ضرورت کے تحت ادھر ادھر سے ادھار پکڑ لیتیں تب تو ابا کے انداز دیکھنے لائق ہوتے' وہ ان کے سارے خاندان کو رگید ڈالتے تھے۔ فقیر تک کہہ دیتے' لیکن یہ بھی تھا کہ ان

ناسازگار حالات میں بھی جوڑتوڑ کر کے امی نے عروج کو تو بیاہ ہی دیا تھا۔ جس پر ان کی جتنی پیٹھ ٹھونکی جاتی کم تھی۔

فراز گھر میں بدامنی کا خواہاں نہ تھا یا شاید واقعی اس سے محبت کرتا تھا جو اس کی کڑوی کسیلی شربت کے گھونٹ کی مانند پی جایا کرتا تھا۔ اس نے کبھی عروج کی تنخواہ کا حساب کتاب نہ رکھا تھا' نہ ہی اپنی تنخواہ کی بابت کبھی پلٹ کر دریافت کیا تھا۔ سو ان کی زندگی پرسکون رہتی۔ اگر جو عروج صبر و قناعت کا دامن تھام کر رکھتی' مگر ابا کی جیتی جاگتی مثال بھی کبھی شکر کا کلمہ نہ پڑھوا سکی تھی۔ امی سیر تھیں تو ابا سوا سیر' سو محاذ دونوں طرف سے گرم رہتا۔ مگر شاباش تھی۔ فراز کی جرات' حوصلہ مندی و درگزر کو' عروج کی زبان نہ رکی تو اس نے ہی خود کو محدود کر لیا تھا۔

اس نے کراہ کر کروٹ بدلی تھی۔ کتنے دن ہو گئے تھے اسے فراز سے مسکرا کر بات کیے ہوئے۔ چپکے سے ایک احساس نے اس کے اندر آنکھ کھولی تھی۔ اپنی خطاؤں کا احساس ہوا تھا۔

خطائیں' جو خسارے بخشتی ہیں اور کچھ خسارے ناقابل تلافی بھی تو ہوتے ہیں نا۔

اس کے دل نے تمام الزامات سے فراز کو باعزت بری کر دیا تھا۔ فراز کی محبت کے سوا اس کے پاس تھا ہی کیا۔ اس کا اندر دھیرے دھیرے بدل رہا تھا یا شاید بدل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح قدرے پرسکون تھی۔ آج معمول کی اٹھا پٹخ چیخ پکار نہ تھی۔ پھر کئی دنوں تک یہ ہی معمول چلا۔

فراز کا زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔ جسم پر معمولی خراشیں آئی تھیں۔ تب بھی ہفتہ دس دن کی چھٹی مل ہی گئی تھی۔ اور ان دنوں میں اس نے دیکھا کہ گھر میں خلاف معمول سکون ہے۔ عروج کی طبیعت کا ٹھہراؤ' سب سے بڑھ کر خاموشی ناقابل فہم تھی۔

گڑیا کے اسکول میں فنکشن تھا۔ اسے نیا جوڑا درکار تھا۔ اور نیا جوڑا تو اسے نصیب ہوئے عرصہ گزرا تھا۔ یہ تو پھر گڑیا تھی' مگر اس نے دیکھا' عروج کے سمجھانے بجھانے پر گڑیا نے اس روز اسکول کی چھٹی کر لی تھی۔

بظاہر تو کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ مگر اسے لگ رہا تھا کہ بہت کچھ بدل گیا ہے۔

آج وہ آفس جانے لگا تو لنچ باکس تیار تھا۔ لوٹا تو عروج کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' کچھ دیر بعد وہ اس کے سامنے کھڑی ساسر میں چمچہ بجا رہی تھی۔

"چائے!" جوتوں کے تسمے کھولتے ہوئے فراز نے سر اٹھا کر بڑی بے یقین نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"یہ آج سورج کہاں سے نکل آیا؟" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس کے انداز میں ندامت و شرمساری تھی' یہ ہی کافی تھا' وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

☼ ☼ ☼

اسے تنخواہ ملے کچھ ہی دن ہوئے تھے۔ ضروری اشیا کی فہرست بنا کر گھریلو خریداری کے لیے اتوار بازار آئی تھی۔ جوتوں کے اسٹال کے پاس سے گزری تو دھیان بے اختیار اپنی مرمت شدہ سینڈل کی طرف چلا گیا۔ خریداری تو مکمل ہو ہی چکی تھی۔ اس نے بیگ ٹٹولا تو کچھ مڑے تڑے نوٹ چند سکے پڑے تھے۔ سینڈل کی قیمت ڈھائی سو روپے تھی۔ پرس میں پڑے نوٹوں کی گنتی بھی یاد تھی اور تکلیف دیتی ایڑی بھی۔

اس نے ماہر خریدار کی طرح بھاؤ تاؤ کیا تو دکان دار دو سو پر آ گیا اور بیگ میں موجود کل ایک سو چھہتر روپے تھے' ابھی واپسی کا کرایہ بھی دینا تھا۔ چھٹیوں کے سبب فراز کی تنخواہ میں سے کٹوتی ہوئی تھی۔ ابھی اس نے پڑوسن سے لیا ادھار بھی چکانا تھا۔ اس نے گڑیا کا قلق دور کرنے کو اس کے لیے اچھا جوڑا خریدا تھا۔ اس حساب سے سینڈل کا نمبر تو بہت بعد میں آتا تھا۔

امی درست ہی تو کہتی تھیں عورت ذات پل پل خود کو مارتے رہنے کا نام ہے یا شاید اس کے ہاتھوں میں بھی چھید ہو گئے تھے۔ بڑے بڑے نادیدہ چھید۔

اس نے بے دلی سے سینڈل پیروں سے نکالی اور تھکے تھکے قدموں سے گھر کی راہ لی۔ ☼

مُنا سیّد

ابھی اک خواب باقی ہے

"آج ہمارے پروگرام میں شامل ہیں وہ مشہور و معروف ہستیاں جو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔" میزبان لڑکی اپنے مہمانوں کا تعارف کروا رہی تھی۔

ماہی بہت شوق سے یہ مارننگ شو دیکھا کرتی تھی۔ یہ اس کو اتنا پسند تھا کہ وقت پر نہ دیکھ پانے کی صورت میں نشر مکرر دیکھا کرتی تھی..... ابھی بھی وہ رات کو

مارننگ شو دیکھ رہی تھی۔

"ماہی! ماہی! کہاں ہو تم؟ لگی ہوگی پھر اس بورنگ ٹی وی شو میں اور ہمیشہ کی طرح میری شرٹ پریس کرنا بھول جانا تاکہ صبح میں لیٹ ہو جاؤں آفس سے....."

ماہی کو یہ بات کسی برچھی کی مانند لگی جو سیدھی اس کے دل میں اتر گئی۔

اس نے دل ہی دل میں بڑبڑاتے ہوئے آواز کم کی اور ریموٹ پٹخ کر خضر کی شرٹ استری کرنے چل دی۔

"اتنی مشکل سے بچے سوئے تھے، چند لمحے بھی میں اپنے لیے نہیں نکال سکتی، آخر یہ شخص مجھے چین سے کیوں نہیں رہنے دیتا۔"

شرٹ پر استری باقاعدہ پٹخی جا رہی تھی۔ اور خضر لاؤنج میں صوفے پر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ.....

"کیا یہ وہی ہے، جس سے میں نے ضد کر کے شادی کی تھی؟"

بے رونق چہرہ، الجھے بال، شکن آلود کپڑے..... کچھ بھی تو اب ویسا باقی نہیں رہا تھا، جس پر خضر کی نظر ٹھہری تھی۔

"کہاں کھو گئی میری ماہی؟" اچانک اس کی نظر ٹی وی پر گئی جسے ماہین غصے میں چلتا ہی چھوڑ آئی تھی۔

وہاں پچاس سال سے زیادہ عمر کا ایک شادی شدہ جوڑا براجمان تھا۔ اس کی نظر اس ہنستے مسکراتے جوڑے پر اٹک سی گئی۔ اس کے خیال کے پنچھی نے اڑان لی۔

"یہ بھی تو ہیں..... اتنے خوش باش، اور مکمل وہ بھی شادی کے اتنے سالوں بعد..... اور ہم؟ ہماری شادی کو تو بس پانچ سال ہی ہوئے ہیں، ہم کیوں اتنے بے زار ہیں ایک دوجے سے۔"

اس نے ہاتھ بڑھا کر ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی کی آواز تیز کر دی۔

"ماشاء اللہ! اتنا عرصہ ہو گیا ہے، اتنی انڈر اسٹینڈنگ ہے آپ لوگوں میں۔" میزبان نے ایک ادا سے اپنے بال ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی لڑائی دڑائی ہوئی۔ یا کوئی اختلاف؟"

جوڑے نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا، پھر خاتون نے کہا۔

"کیوں نہیں، چھوٹی موٹی لڑائیاں تو سب کے گھر میں ہی چلتی ہیں۔ خاموش اور بوجھل تو بُت ہوتے ہیں۔ پیار بھری چھوٹی چھوٹی لڑائیاں تو زندگی کا پتا دیتی ہیں۔"

خاتون کے جواب نے خضر کی دلچسپی بڑھا دی۔ اس نے آواز اور بڑھا دی۔ وہ آگے کہہ رہی تھیں۔

"مگر جب ان کو غصہ آتا ہے تو میں خاموش ہو جاتی ہوں اور اگر مجھے کچھ برا لگتا ہے تو یہ ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔"

میزبان نے اگلا سوال پوچھا۔ "اوہ! بس اتنا ہی..... لڑائی کبھی سنگین نہیں ہوئی..... مگر ٹھہریے اس سوال کا جواب جانتے ہیں اس شارٹ بریک کے بعد۔"

☼ ☼ ☼

ماہی کے شرٹ پر تیزی سے استری کرتے ہاتھ کچھ تھم سے گئے۔ لاؤنج میں گونجتی آوازیں با آسانی اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں..... اس کے دل میں خضر کے خلاف پھر آگ سی بھڑکنے لگی۔ اس نے بلند آواز میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔

"خود تو مزے سے آتے ہیں ٹی وی کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔ میں اکیلی جان سارا گھر دیکھوں، ان کے بچے بھی سنبھالوں، آخر کیا کیا کروں۔" اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

"سارا دن بس مشین کی طرح کام کیے جاؤ، کہیں تو سانس لینے کے لیے کوئی روزن ہو، کبھی تو وہ لمحہ ملے جو میرا اپنا ہو....." ایک آہ نکلی تھی اس کے دل سے۔

وہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ ٹی وی کی آواز بڑھنے سے اس کا ارتکاز ٹوٹ گیا۔ وہ خضر کے ساتھ قدرے فاصلے پر آ کر بیٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

"جی ہاں! ہم حاضر ہیں ایک بار پھر سے۔ جی تو

ناظرین ہمارے آج کے مہمانوں سے ہم نے بریک پر جانے سے پہلے ایک سوال پوچھا تھا۔ آیئے! ان کا جواب جانتے ہیں۔"

مہمانوں میں موجود پُروقار شخصیت کے مالک صاحب نے ایک مسکراتی نظر اپنی بیگم پر ڈالی اور میزبان کے طرف مخاطب ہوئے۔

"ہماری عمروں میں پندرہ سال کا فرق ہے اور جو مزاج کا فرق ہے وہ ابھی بھی ہے مگر ہماری خوش گوار زندگی کا سارا کریڈٹ بیگم صاحبہ کو جاتا ہے کہ انہوں نے اس فرق کو کبھی ہمارے تعلقات پر حاوی نہیں ہونے دیا۔"

خاتون نے اچانک ان کی بات کاٹ دی۔ "شروع شروع میں میں بہت تنگ ہوئی، یہ ایک بالکل خشک انسان تھے۔ کچھ بولتے ہی نہیں تھے۔ جو بولوں بس میں ہی بولوں، آگے سے جواب میں ایک سناٹا ہوتا تھا۔ میں خوب چیخ چیخ کر روتی تھی۔ اتنے بڑے گھر میں میرا دل ہولا کرتا تھا۔"

"بس، بس، بس بھی کیجئے۔ ذرا وہ تو بتایئے جب آپ نے پورا گملا ہی اٹھا کر دے مارا تھا مجھ غریب پر..... وہ تو اللہ نے بچا لیا ورنہ میں تو گیا تھا۔"

صاحب کا انداز شرارتی تھا۔ خاتون جھینپ سی گئیں۔

میزبان بولی۔ "واقعی پھر... پھر کیا ہوا؟" اس کی آنکھیں کسی چرخی کی طرح گھوم رہی تھیں۔

"پھر.....!" انہوں نے کچھ کہنا شروع کیا مگر خضر کے کان تو ان آوازوں پر تھے ہی نہیں، اس کے کانوں میں کچھ سریلی سی باز گشت ہونے لگی۔

"چھوڑیں بی جان! یہ کیا، یوں جھٹ سے بھی کوئی ناک چھیدتا ہے بھلا۔"

دو چوٹیاں..... اس کے گول سے چہرے پر بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ اس پر سرمگیں آنکھیں..... وہ اس کی موجودگی سے بے نیاز اپنی چھوٹی سی ناک پڑھائے اپنی دادی سے جھگڑ رہی تھی۔

یہ لوگ ان کے نئے پڑوسی تھے۔ وہ بابا جان کے کہنے پر ان سے "کسی چیز کی ضرورت تو نہیں" پوچھنے آیا تھا اور گیٹ کھلا ہونے کی وجہ سے اس نے ان دونوں کی گفتگو سن لی تھی وہ متذبذب تھا کہ اندر جائے یا واپس پلٹ جائے مگر..... پھر وہ اندر چلا آیا۔ اور وہ لڑکی جس کو اس نے بعد میں ماہی کے نام سے جانا، اس کی زندگی میں چلی آئی۔

اولین رات ہی اس نے ماہی کو بتا دیا تھا کہ وہ کیسے اس کا اسیر ہوا تھا۔ جواباً ماہی ایک شرمیلی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹی وی کی آواز نے ماہین کی توجہ بھی کھینچ لی تھی۔ وہاں خاتون بتا رہی تھیں۔

"میں نے ان کی بہت کیئر کی ہے تب جا کر آج ہم اس قابل ہوئے ہیں کہ ایک دوسرے کے مزاج شناس کہلا سکیں۔ آج کل کی لڑکیاں گھر میں لگ کر یہ سب بھول جاتی ہیں کہ ان کی زندگی کا سب سے اہم فرد یوں نظر انداز ہو رہا ہے۔"

"نظر انداز؟" اس جملے نے ماہی کو چونکا دیا۔ غیر ارادی طور پر اس کی نظر خضر پر پڑی۔ اس کا تھکن زدہ چہرہ، بڑھی ہوئی شیو، ملگجے کپڑے اس کے "نظر انداز" ہونے کی داستان سنا رہے تھے۔

ماہی نے شانے اچکا کر بات کو ہوا میں اڑانا چاہا مگر ان بیگم صاحبہ کا اگلا جملہ اسے شرمندہ کر گیا۔

"میرے لیے میرے بچے بھی ان کے بعد آتے ہیں۔"

"اونہہ! بچے بھلا کیسے....." خاتون کا اگلا جملہ سن کر ماہی حیران رہ گئی۔

"میری والدہ کہتی تھیں کہ شوہر سائبان ہوتا ہے، کڑی دھوپ میں بھی چھاؤں جیسا ہوتا ہے، جس کے نیچے عورت کا سکھ، اس کا گھر اور بچے پنپتے ہیں۔"

ماہی کی نظر ایک بار پھر خضر کی طرف اٹھی جو

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

پروگرام دیکھنے میں محو تھا۔

ماہی کو یکدم احساس ہوا کہ بچوں کی پیدائش کے بعد سے خضر پر سے اس کی توجہ ہٹتی جارہی تھی وہ بچوں میں مصروف ہونے لگی تھی اور ایسے میں خضر دھیرے دھیرے — اس سے دور ہوتا گیا — اس کو یاد آیا، شادی کے شروع کے دنوں میں وہ کیسے ایک دوسرے کی سنگت سے لطف اٹھایا کرتے تھے۔ ساتھ ٹی وی دیکھنا، ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، بارش میں زبردستی اس کو کھینچ کر لے جانا جب کہ وہ بارش سے سخت چڑتی تھی، مگر صرف اس کی خاطر یہ بھی کر لیتی تھی، خضر کو سردی بہت لگتی تھی مگر وہ ضد کر کے آئس کریم کھانے جاتی تھی۔

وہ بے چارہ تو اس کے ساتھ برتن تک دھلواتا تھا۔

خضر ایک ایک کر کے ہر معاملے میں کمپرومائز کرتا چلا گیا۔ پہلے بیڈ سے بے دخل ہوا کہ بچے چھوٹے ہیں، پھر صبح ناشتہ خود بنانا شروع کیا کہ بچے رات کو ماہی کو ستاتے ہیں اور اس کی نیند پوری نہیں ہو پاتی، پھر اپنے چھوٹے چھوٹے کام بھی خود کرنا شروع کر دیے تھے، آہستہ آہستہ ان میں بات چیت بھی کم ہوتی گئی۔

ماہی کو یہ سب سوچ کر جھرجھری سی آگئی۔

"نہیں اب نہیں — میں اپنے اور خضر کے رشتے کو دوبارہ نئی زندگی دوں گی —"

اس نے ٹی وی پر ایک نگاہ ڈالی جہاں میزبان اپنے مہمانوں سے الوداعی پیغام پوچھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر اس جوڑے پر ڈال کر ان کا دل ہی دل میں شکریہ ادا کیا۔ اور ایک نئے عزم کے ساتھ صوفے پر بیٹھے خضر کے قریب جا بیٹھی اور اس کے کندھے سے اپنا سر ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

ماہی کو اپنے کاندھے پر سر رکھتے دیکھ کر خضر چونکا —— اس کے چہرے پر پھیلتی نمی نے اس کو احساس دلایا کہ شاید احتساب کا لمحہ ماہی کی زندگی میں بھی در آیا ہے، جس سے وہ خود بھی گزر رہا ہے۔ اس نے ماہی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا —— بہت دنوں بعد وہ یوں ایک ساتھ بیٹھے تھے۔

"شاید ہم دونوں ہی۔" دونوں ایک ساتھ بولے۔

پھر خضر نے اس کی آنکھوں میں آئی نمی دھیرے سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تم بولو آج میں سنوں گا —— کتنا عرصہ ہوا ہمیں یوں ساتھ بیٹھ کر باتیں کیے ہوئے۔"

"خضر! میں تمہیں اگنور نہیں کرتی تھی۔" اس نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"مگر مجھے لگا کہ میں اب تمہارے لیے اتنی ضروری نہیں رہی، پہلے تمہارا — الگ سونا، اس کے بعد رات گئے تک باہر رہنا، مجھ پر بالکل توجہ نہیں دینا —— میں کبھی تمہاری زندگی میں ماہی کہیں نہیں رہی۔" اس کی آواز میں نمی تھی۔

"واقعی ماہی! ہم دونوں ایک دوسرے سے چھوٹتے جارہے تھے —— تمہارا یوں اپنے آپ سے لاپروا ہو کر صرف بچوں میں مگن ہو جانا، مجھ سے پہلے کھانا کھالینا، میرے آنے سے پہلے سوجانا، مجھ سے غافل ہو جانا۔ میں نے بھی کچھ انڈر اسٹینڈ نہیں کیا اور شاکی ہوتا رہا تم سے —— مگر خیر —— جو ہوا سو بیت گیا۔ اب ہمیں بھی ایک مثالی جوڑا بننا ہے، بالکل ان کی طرح۔ اس نے ٹی وی کی طرف اشارہ کیا۔ "ہے نا ماہی! ہم بھی شادی کے پچیس سال بعد ایسے ہی ہوں گے جیسے وہ تھے۔"

ماہی نے مسکراتے ہوئے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور خضر شادی کے اولین دنوں کی —— نظم گنگنانے لگا۔

آسیہ رزاقی

اے عشق بے خبر

لان میں لگی سبز گھاس سردی اور کہر کی شدت سے مرجھا کر پیلی ہو گئی تھی۔ کیاریوں میں تازہ تازہ لگائی گئی پھولوں کی پنیری نے ابھی سر اٹھانا شروع نہیں کیا تھا، سردی کی وجہ سے ٹھٹھر کر پتوں میں سر دیے پڑی تھی ۔ شام کی تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ دھند نے ہر سمت دندنانا شروع کر دیا تھا۔

برآمدے میں کرسیوں پر شال لپیٹے دونوں لڑکیاں ٹھٹھر رہی تھیں۔ مگر گیٹ پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔ سمن کو چچا، چچی کی آمد کا انتظار تھا۔ عاشی کو اندر جانے کا۔

"شام کی تاریکی نے اداسی پھیلا دی ہے۔ کہر نے بھی اپنے خوفناک پنجے ہر طرف بڑھا دیے ہیں۔ کیسا ڈرا دینے والا ماحول ہو گیا ہے۔"

سمن گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ عاشی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا کہا تم نے؟ شام کی اداسی، کہر کے پنجے، خوفناک پنجے، میرے خدا، سمن! تم آغا حشر والے ڈائیلاگ سے پیچھا نہیں چھڑا سکتیں؟"

"تم کو یہ ڈرامے کے ڈائیلاگ لگ رہے ہیں؟"

سمن صدمے سے چور آواز میں بولی۔

"عاشی! یہ میرے احساسات کی زبان ہے۔ تم تو کیا، کوئی بھی ان کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکتا۔ سچ بتاؤ تمہیں کیا یہ سرد ماحول کی اداسی مایوسی میں لپٹی معلوم نہیں ہوتی؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔ کیونکہ مجھے علم ہے کہ سردی کے موسم میں سردی ہی ہوتی ہے۔ شام زیادہ سرد ہوتی ہے۔ امی ابا گھر میں نہیں اس لیے خاموشی ہے۔"

"تمہیں ایسی سرد شام اور اتنی خاموشی بلکہ سناٹے

سے ڈر نہیں لگتا؟"

"ڈر کی کیا بات ہے؟ اپنے گھر کے اندر ہیں۔ موسم تو ایسے ہی ہوتا ہے ہر سال۔ دسمبر سے کہر کی لہر آتی ہے۔ پورا علاقہ کہر میں لپٹ جاتا ہے۔ ٹرینیں لیٹ۔ ہوائی سروس منسوخ اور گرمی آتی ہے تو گرمی کی شدت۔ کیا ہم گرمی سے بھی ڈریں؟" عاشی کی بے نیازی اور اطمینان قابل رشک تھا۔ ثمن کی اداسی الگ۔

"مجھے تو کہر کی چادر اوڑھے دسمبر کی شام مایوسی کا پیغام دیتی ہے۔"

"پھر تم نے ڈرامائی زبان میں جملہ بولا، چلو اندر' اذان مغرب ہونے والی ہے۔ وضو کر کے نماز پڑھیں گے۔ تمہارا سارا ڈر نکل جائے گا۔"

"چچا چچی آنے والے ہیں۔ میں گیٹ کھول کر آؤں گی۔ تم چلو اندر۔"

"ان کے پاس چابی ہوتی ہے۔ کھول کر آجائیں گے۔ فکر نہ کرو۔"

عاشی کھڑی ہو گئی۔ سردی سے اس کے پیر ٹھٹھر رہے تھے۔ ثمن کی وجہ سے باہر آگئی۔ ثمن کو کمرے میں گھٹن ہو رہی تھی۔ حالانکہ کمرے فراخ ہوادار تھے۔ سردی کی وجہ سے کھڑکیاں بند تھیں۔ گیٹ پر کھٹکا ہوا۔ چچا، چچی اندر آرہے تھے۔ چچی برآمدے میں آکر حیرت سے انہیں دیکھنے لگیں۔

"تم دونوں اس سردی میں یہاں کیا کر رہی ہو؟ عاشی! بیمار ہونے کا دل چاہ رہا ہے۔"

"امی! دراصل ہم تو کہر کی رم جھم میں ماحول کی اداسی کا جائزہ لینے آئے ہیں۔ دیکھیے ثمن کی بہادری۔ کہر نے اپنے خوفناک پنجے پھیلا دیے ہیں۔ ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ مگر ثمن بالکل نہیں ڈری۔ ڈرنے کی بات کیا ہے؟ ہیں ثمن؟"

امی ہنس پڑیں۔ انہوں نے ثمن کے ہاتھ پکڑے۔

"اُفوہ! برف ہو رہے ہیں تمہارے ہاتھ۔ چلو اندر کمروں میں حرارت ہوتی ہے اور یہاں تو لان کی ٹھنڈک۔ کہر کا دھواں۔ کہر اور بڑھے گی۔ بے عقل لڑکیاں۔ کس نے مشورہ دیا تھا۔ باہر بیٹھنے کا۔"

وہ بولتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ اندر حرارت تھی۔ ثمن تو بستر میں گھس کر کمبل میں لپٹ گئی۔

"دیکھا۔ اندر کتنا بہتر ہے۔ خوامخواہ میں بھی تمہارے مشورے پر عمل کر کے سردی کھاتی رہی۔ ابھی چائے بناتی ہوں گرم گرم۔ پھر نماز پڑھیں گے۔"

عاشی نے امی ابا سے چائے کا پوچھا۔ وہ پی کر آئے تھے۔ ابا مسجد جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ عاشی دو پیالی چائے بنا لائی۔ ہیٹر آن کر لیا۔ کمرا خوب گرم ہو گیا تو ہیٹر بند کر دیا۔ کچھ چائے کی گرمی نے بھی جسم میں پہنچ کر اداسی کو کم کر دیا۔

نماز سے فارغ ہو کر عاشی دیر تک دعا مانگتی رہی۔ پھر تسبیح لے کر کوئی وظیفہ پڑھتی رہی۔ ثمن نے پھر بستر سنبھال لیا تھا۔

"تم، اتنی دیر تک کیا پڑھتی ہو عاشی؟ عصر کے بعد بھی، اب بھی۔" ثمن نے پوچھ ہی لیا۔

"اور تم، تم نے شاید دعا کبھی بھی نہیں مانگی۔" عاشی نے الٹا خود ہی سوال کیا۔

"کیا مانگوں؟" ثمن بڑی عاجزی سے بولی۔ مجبور، مایوس لہجہ۔

"ارے، بھئی، اپنے اور اپنے متعلقین کے لیے صحت، سلامتی، پریشانیوں سے بچنے کی دعا۔"

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کے لیے کیا مانگوں؟" وہ واقعی الجھی ہوئی سی لگی۔

"دیکھو، سب کے لیے دعا مانگنی چاہیے۔ دعا بھی عبادت کا حصہ سمجھو۔" عاشی کا فلسفہ ثمن کی سمجھ میں نہیں آیا۔ عاشی نے اچھی طرح سمجھایا کہ اسے کیا کیا مانگنا چاہیے اپنے اللہ سے۔ اللہ ہی قبول کرتا ہے۔ اس کا وعدہ ہے۔

"ہمیں تو..... سب کو ہر طرح کی پریشانیاں ہیں۔ بے شمار دکھ ہیں اور مجھے تو یقین نہیں کہ میری کوئی دعا کبھی قبول بھی ہو گی اور میں نے بھلائی کا کام بھی کبھی نہیں جو اللہ میری سنے گا اور دعا قبول کرے گا۔ میں تو بس بے کار ہستی ہوں۔"

وہ اب بستر سے اٹھ کر چادر درست کر رہی تھی۔ مایوس اور غمگین۔ عاشی اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ ثمن جب سے ان کے گھر آئی تھی۔ اپنی باتوں اور عمل سے حیران ہی کر رہی تھی۔

جب عاشی کے ابا اپنی بھابھی اور ان کی بیٹیوں سے ملنے قصور گئے تھے، وہ دو چار ماہ کے بعد قصور جایا کرتے تھے۔ ایک دو دفعہ امی بھی ان کے ساتھ گئی تھیں۔ وہ خود شاید ایک بار ہی گئی تھی۔ ابا اس بار ثمن کو ساتھ لے آئے اور بتایا کہ ثمن یہیں رہے گی۔ پڑھے گی۔ عاشی بہت خوش ہوئی۔ ہم عمر دوست۔ گھر میں تین بھائیوں کی موجودگی میں ایک بہن کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ ثمن نے آکر پوری کر دی۔ اب سے پہلے ان میں کبھی ملاقات ہوئی نہ تھی یا شاید بچپن میں کبھی ملی ہوں گی جو کہ اب دونوں کو ہی یاد نہیں تھا۔

ثمن کے والد افتخار علی اور عاشی کے والد انصار علی دو الگ ماؤں سے تھے۔ مگر انصار علی میں جو سمجھ بوجھ، رشتوں کا احترام اور محبت کا عنصر تھا۔ افتخار میں بہت کمی تھی۔

افتخار کی ماں دوسری بیوی تھیں۔ بیٹے کے ذہن میں سوتیلے بھائی کے لیے نفرت کے سوا اور کچھ ڈال نہ سکیں۔ لاڈ میں بگاڑ دیا تھا۔ تعلیم بھی واجبی حاصل کر سکے۔ اسی لیے بیوی بھی نیم خواندہ ملیں۔ ساس سے انہوں نے بھی نفرت اور تعصب کا سبق سیکھا تھا۔ خود میں بھی اتنی عقل نہ تھی کہ صحیح فیصلہ کر سکتیں۔ یا بہتر راستہ منتخب کرتیں۔ جو شوہر نے کہا۔ انہوں نے عمل کرنے میں اپنی نجات سمجھی۔

کچھ عرصہ دونوں بھائی ساتھ رہے۔ پھر ماں کی وفات کے بعد چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی سے مکان میں اپنا حصہ طلب کیا۔ انصار اور ان کی بیگم نے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر انہیں بزنس کرنے کا شوق تھا انصار صاحب نے بھائی کی ضد سے مجبور ہو کر قرض ادھار کر کے مکان کی جتنی رقم لگی۔ آدھی رقم ان کے حوالے کی اور وہ گھر اور گھر والوں کو خیرباد کہہ کر سندھ چلے گئے۔

چند سال بعد ملتان آگئے۔ نوکری کر لی۔ رقم کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہو گئی۔ پھر وہ فوت ہو گئے تو ان کی بیوی لڑکیوں کو لے کر قصور آگئیں۔ اپنے میکے، مگر وہاں بھی زیادہ دن نہ رہ سکیں۔ بچی کھچی رقم سے ان کے بھائی نے ایک دکان خرید کر کرائے پر چڑھا دی۔ لڑکا کوئی تھا نہیں۔ تینوں لڑکیاں، بڑی نے ایم اے کر لیا اور اس کو جاب مل گئی۔ دوسری بی اے کر کے اسکول میں پڑھانے لگی۔ پھر بڑی بیٹی کی شادی ہو گئی، شادی ماموں کے گھر سے ہوئی تھی۔

انصار صاحب نے کبھی بھائی کو غیر یا سوتیلا نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ان کی خبر گیری کی۔ ملتان بھی جا کر مل آتے۔ قصور تو قریب تھا اور بچیاں یتیم۔ بھاوج بیوہ ہو کر کمزور ہو گئی تھیں۔ بڑی بیٹی ذہین کی شادی میں انصار صاحب اور بیوی بچے سب شریک ہوئے۔

ذہین سب سے زیادہ حسین تھی۔ دلہن بن کر پری چہرہ ہو گئی۔ عاشی کو ذہین بہت اچھی لگی۔ اس شادی کے بعد پھر کسی کا قصور جانا نہ ہوا۔ انصار صاحب ہی وقت نکال کر چلے جاتے۔ ایک دوبار بیوی گئیں۔ پھر سنا کہ ذہین کو طلاق ہو گئی۔ ننھی سی بچی کو لے کر وہ میکے آگئی۔

ثمن نے بتایا کہ ذہین نے شرط رکھی تھی کہ جاب جاری رہے گی اور تنخواہ وہ اپنی اماں کو دیا کرے گی۔ اس وقت تو ان کے سسرال والوں نے ان کا یہ حق تسلیم کر لیا تھا۔ مگر بعد میں بہو کی مصروفیت کھٹکنے لگی۔ آدھا دن گھر سے باہر گزارنے والی بہو۔ جو رقم تو ماں کو دے آتی اور تھک تھکا کر باقی وقت آرام میں گزارتی۔ حالانکہ ذہین گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ مگر ساس نندوں کو خسارہ نظر آرہا تھا۔ بیٹے کو اکسایا۔

"یا جاب چھوڑو۔ یا تنخواہ گھر میں دو۔ ہمارا بھی حق

ہے۔"

یہ تقاضا بار بار ہوتا رہا۔ ذہین کو ماں اور بہنوں کا حق ادا کرنے کا موقع دینے کو وہ لوگ تیار نہ ہوئے۔ بات بڑھتے بڑھتے طلاق تک جا پہنچی۔ ہنستی مسکراتی ذہین آپا۔ اداسی کا مرقع بن گئیں۔ وہ تو سب کا آئیڈیل تھیں۔ حساس، ہمدرد، ذمہ دار، محنتی، محبت سے لبریز۔ مگر۔۔۔ نصیب اچھے نہ ہوں تو...

انصار صاحب جب بھی جاتے۔ ان لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرتے۔ سمن بھی بہت حساس تھی۔ گھر میں تنگی دیکھ کر اس نے بچت کی خاطر پڑھائی چھوڑ دی۔ ذہین آپا نے بہت سمجھایا۔ "اس طرح تو تم میری قربانی کو رائیگاں کر رہی ہو سمن! تم دونوں کی خاطر میں نے انتہائی قدم اٹھایا ہے۔ اماں کے اطمینان اور تم دونوں کی تعلیم کے لیے۔"

سمن مگر ضد پر آ گئی۔ اس بار انصار صاحب قصور گئے تو سمن کو ساتھ لے آئے۔ عاشی کے کالج میں اس کا داخلہ ہو گیا۔ سمن کے ذہن میں ہمیشہ منفی خیالات آتے۔ اس نے چچا سے بحث کرنے کی کوشش کی کہ اس کی خاطر وہ زیر بار نہ ہوں۔ وہ بغیر پڑھے بھی زندگی گزار لے گی۔ لاکھوں عورتیں کم پڑھی لکھی ہیں، بعض جاہل بھی ہیں۔ زندہ ہیں اور کسی کے احسان کے بغیر محنت کے ساتھ زندگی کے تقاضے پورے کر رہی ہیں۔ اگر میں بھی ان عورتوں جیسی زندگی گزار لوں گی تو .....

انصار صاحب بھی اس کے چچا تھے۔ انہوں نے بہت آرام سے حقوق العباد اور فرائض کی مثالیں دے کر اسے قائل کر لیا۔ وہ تو ہمیشہ تاریک پہلو ہی مد نظر رکھتی۔ مایوسی اور ناامیدی اس کی فطرت کا حصہ بن گئی تھی۔ عاشی اس کی باتوں پر ہنستی تو وہ کہتی۔

"تم ان حالات سے گزرتیں، جن کا ہم نے سامنا کیا ہے۔ تو تم میری ہم خیال ہوتیں۔ تم کیا کوئی بھی ہماری پریشانیوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں مگر وہ، جن پر اتنا برا وقت آیا ہو۔ وہ شاید سمجھ سکے۔" سمن خاصی آزردہ تھی۔

"سمن! مجھے معلوم ہے۔ چچا کی فوتگی۔ پھر تم سب کا قصور آنا۔ پھر ذہین آپا کی ٹریجڈی۔ مگر میری بہن! حالات کا بہادری سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ اللہ خود مدد کرتا ہے۔ دنیا میں رہ کر ہر طرح کے معاملات سے سابقہ پڑتا ہی ہے۔"

"بہادری۔ کیسی بہادری؟ جب ہم پر وقت پڑا تو ہم نے برداشت کیا اور بہادری کس کو کہتے ہیں۔" وہ کچھ جھلا گئی۔

"تم نے تو حالات سے دل برداشتہ ہو کر پڑھائی چھوڑ دی۔ یہ کم ہمتی ہے۔ بہادری نہیں۔"

"بہن صاحبہ..... جب مہینے کے آخر میں روکھی روٹی کھانے کو ملے۔ بچی کے دودھ کے لیے گھر میں ایک پیسہ نہ ہو۔ تو کیسی بہادری اور میں نے اپنی تعلیم کی قربانی دے کر کیا کم ہمتی کی۔ بچی کو دودھ کے لیے ترسایا نہیں۔ کم از کم میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

"بے شک۔ لیکن اس طرح کے حالات سے لاکھوں لوگ گزر رہے ہیں۔ بعض اس سے بھی زیادہ اذیت ناک حالات کا شکار ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے برداشت کی قوت کو زندہ رکھنا پڑتا ہے۔ یہ زندگی کا اصول ہے۔"

عاشی بردباری سے اسے سمجھاتی۔ سمن کے چہرے پر اداسی بڑھ جاتی۔ اپنا تعلیمی سال ضائع کر چکی تھی مگر اب دل جمعی سے پڑھائی کر رہی تھی اور کچھ نہ کچھ وقت چچی کی مدد کے لیے بھی نکال لیتی۔ کبھی کچن صاف کر لیا۔ تو کبھی برتن دھو دیے۔ کبھی صفائی کر لی۔

چچا کے معاشی حالات تو خاصے بہتر ہی تھے۔ مگر مہنگائی کے اثرات یہاں پر بھی نمایاں تھے۔ چچا کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ روز ہی کوئی نہ کوئی مہمان آ جاتا۔ بغیر چائے کے نہ جاتا۔ کبھی کھانے کے وقت کوئی آ گیا۔ تو کھانا بھی کھلا دیا جاتا۔ خواہ دال یا سبزی ہی ہو۔ چچی اس معاملے میں زیادہ تردد نہیں کرتی تھیں نہ کوئی خصوصیت برتی جاتی۔

سمن کو یہ بات بہت پسند آئی۔ ان کے گھر میں یعنی قصور میں اول تو آتا ہی کون تھا۔ کبھی ذہین آپا کی کولیگ یا ماموں ممانی آ جاتے۔ تو ان کے لیے خاص چیز ضرور بنائی جاتی۔ یا بازار سے منگالی جاتی۔ سمن شروع میں بہت اکھڑی اکھڑی رہی۔ چونکہ وہ ایسے ماحول میں پلی تھی۔ جہاں ہر بات میں تاریک پہلو تلاش کرنا آسان ہوتا۔

ہر کسی پر شک اور اعتراض کیا جاتا۔ وہ اس طریقے کو ناپسند کرنے کے باوجود خود بھی مشکوک رہتی۔ جب چچا اسے اپنے ساتھ لے کر آئے۔ وہ سمجھی اب چند دن رہنا ہوگا۔ چچی اسے اضافی بوجھ سمجھ کر واپس بھیجنے کی کوشش کریں گی۔ چچا اسے صرف اماں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے لائے ہیں۔ چچی اس سے گھر کے کام کروایا کریں گی۔ ملازمہ کی تنخواہ بچانے کی ترکیب۔

یہاں آتے ہی اسے عاشی نے بتا بھی دیا کہ ایک ماسی آتی تھی۔ سارا کام کرتی تھی۔ مگر امی نے اسے جواب دے دیا۔ وہ سوچتی ہاں میں جو آ گئی ہوں ان کے بچوں کا حصہ بٹانے، چچا بتا کر گئے ہوں گے۔ اسی لیے چچی نے پہلے ہی ماسی کو چلتا کیا اور ہو سکتا ہے یہ چچی کی ذہانت ہو کہ چچا مجھے لے آئیں۔ سب کی نظر میں اچھے بن جائیں گے اور..... اپنا فائدہ جیسے اماں جب قصور آئی تھیں، ماموں کے گھر میں دو نوکر تھے میاں بیوی۔ ممانی نے انہیں چلتا کیا۔

"لڑکیاں آ گئی ہیں۔ کریں گی سب۔"

یہاں بھی..... اس کی خاص خاطر داری نہیں کی گئی۔ بس عام رویہ تھا۔ عاشی ہی عاشی تھی۔ چچی نے دو منٹ اس سے بات کی، پیار کیا۔ پھر مصروف ہو گئیں۔ بونڈ اور فرید لڑ رہے تھے۔ ایک سیکنڈ کے لیے اسے دیکھنے کے لیے رکے۔ پھر لڑنے لگے۔ کوئی خوشی، جوش و خروش نظر نہ آیا۔

جس طرح کہانیوں میں ہوتا ہے۔ امیر رشتے دار غریب بھائی یا بہن کی اولاد کو پرورش کے لیے گھر لاتے ہیں اور پھر اسے نوکر جتنی حیثیت کے قابل بھی نہیں سمجھتے۔

"میں اپنی عزت خود کرواؤں گی۔" اس نے طے کیا۔ دو تین دن تکلیف میں گزرے پھر وہ کچن میں آ کر برتن دھونے لگی۔ چچی نے اسے دیکھا۔ نظر نہیں چرائی۔ بلکہ عاشی کو بلا کر ڈانٹا کہ سمن کیوں کام کر رہی ہے۔ وہ سمجھی یہ صرف دکھاوا ہے۔ برتن دھوتی رہی۔ چچی نے اس کے ہاتھ سے پلیٹ لے کر سنک میں رکھی۔

"دیکھو بیٹا! یہ کام تو ہو ہی جائیں گے۔ تم یہاں صرف اپنی پڑھائی مکمل کرنے آئی ہو۔ میں نہیں چاہوں گی کہ کام میں الجھ کر تم پڑھائی سے غافل ہو جاؤ۔ ابھی تم صرف اپنے مقصد کی طرف دھیان دو۔"

"اچھا نہیں لگتا چچی! آپ میرے ہوتے ہوئے کام

کریں۔ تھوڑی دیر کی بات ہے۔ کرلوں گی میں۔" اس نے قدرے شرما کر الجھ کر کہا۔

"میں جانتی ہوں۔ مگر جو وقت پڑھائی کا ہے۔ اس میں صرف کتابوں میں دل لگاؤ۔ میں عاشی کو بھی ایسے وقت کام نہیں کرنے دیتی۔ ہاں کوئی اشد ضرورت ہو تو کروالیتی ہوں۔ تم سے بھی کروالوں گی۔ مگر ابھی نہیں، کل داخلہ ہوا ہے۔ تم صرف پڑھو۔"

اسے چچی پھر دکھاوا کرتی لگیں۔ مگر چند دن میں اندازہ ہو گیا۔ جو کہتی ہیں اس پر عمل کرتی ہیں۔ وہ بآسانی خود ہر کام کرلیتی تھیں۔ لیکن سمن کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ عاشی سے کہا۔ تو وہ لاپروائی سے بولی۔

"بھئی امی کو عادت ہے۔ کوثر ماسی تھی۔ تب بھی وہ زیادہ کام خود کرتی تھیں۔ یا کوثر کے ساتھ مل کر کروالیتی تھیں۔ انہیں ہر کام اپنے مرضی کا چاہیے۔ جب تک خود نہ کرلیں مطمئن نہیں ہوتیں۔ تم فکر نہ کرو، کالج سے چھٹی کے دن ہم سنبھال لیں گے۔ انہیں آرام کا موقع ملنے والا نہیں۔ وہ کوئی اور کام نکال کر بیٹھ جائیں گی۔ خالی بے کار کبھی نہیں بیٹھیں گی۔"

سمن کو گھر کے کام کرنے کی عادت تھی اماں خود تو کچھ کرتی نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اب ان کے آرام کا وقت ہے۔ تین بیٹیوں کی موجودگی میں انہیں کچھ کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔

امن بے حد محنتی اور تیز دست تھی۔ ذہین آپا بے حد حساس ذمہ دار اور محبت کرنے والی۔ دراصل گھر تو انہوں نے ہی سنبھالا ہوا تھا۔ شروع سے ہی۔ شادی کے بعد طلاق اور ننھی پری ارسلہ کا ساتھ، ان کے پورے وجود میں خون کی جگہ غم و اندوہ کی روانی تھی۔ ہنسنا تو کیا مسکرانا بھی بھول گئی تھیں۔ مگر پھر بھی ذمہ داری سے اپنے فرائض نبھا رہی تھیں۔ جاب اور گھر کے کام۔ سمن کو ذہین آپا سے محبت بھی تھی۔ ہمدردی بھی۔

طلاق کے صدمے نے کافی دن انہیں مضطرب اور پریشان رکھا۔ جاب ختم ہو گئی۔ گھر میں مسائل کے انبار تھے۔ ان ہی دنوں اس نے پڑھائی سے جدائی منظور کرلی۔ پھر ذہین آپا نے کمر ہمت کس کر جاب کی کوشش کی۔ کالج میں لیکچرر شپ کی آفر ملی۔ اور وہ پھر سے مصروف ہو گئیں۔ اماں نے ان کے غم اور فکروں کی۔ پریشانی کی بھی پروا کیے بغیر طلاق کی ذمہ داری ان ہی پر ڈال دی۔ ہر وقت ان کو الزام دیتی رہتی تھیں۔

صبح ہوتے ہی اماں کا غصہ اور طنز بھرا لیکچر شروع ہو جاتا۔ عجب طرح کی بے سکونی تھی۔ امن اور ذہین آپا کے جاتے ہی وہ سمن پر توجہ دیتیں۔ اسے اپنے شکوک کا ہدف بنا کر مستقل چیخ پکار۔

"وہاں کیوں گئیں؟ کھڑکی پر کس لیے کھڑی تھیں؟ کسے جھانک رہی تھیں؟ چھت پر اتنی دیر کیوں لگی؟ کپڑے پھیلانے گئی تھیں یا کسی سے ملاقات کرنے؟" سمن عاجز آکر چیخ پڑتی۔ روتی اور ہر کام چھوڑ کر بیٹھ جاتی۔ پھر اسے چچا لے آئے۔ پرسکون ماحول اور...... خاموش فضا۔

☼ ☼ ☼

ایک دن اس نے چچا کے پاس ایک نوجوان کو دیکھا۔ سانولا دراز قد۔ عاشی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھی۔ چچا کے سامنے پھر چائے بنا کرلے گئی۔ جب واپس آئی تو سمن کو بتایا۔

"امی کے کزن ہیں چچا زاد۔ ان کی امی ہماری امی کی بھانجی ہوتی ہیں۔ اس لیے ہم انہیں دور رشتوں سے پکارتے ہیں۔ یعنی ماموں بھائی۔ ساہیوال گئے ہوئے تھے اپنی امی سے ملنے ورنہ تو روز آجاتے ہیں۔ یہاں جاب ہے ان کی چائے کو اپنا خون اور جسم کا پیٹرول کہتے ہیں۔ انہیں دن میں کئی بار چائے کی طلب ہوتی ہے۔"

عاشی نے تفصیل سے تعارف کرایا "اور ہاں ہماری آپی کی بیٹی انہیں نانا ماموں کہتی ہے۔"

سمن کو اچھو لگ گیا۔ اف ہنسی بے ساختہ آئی تھی۔

عاشی کی بہن کینیڈا میں تھیں۔ ان کے شوہر کئی

سال سے کینیڈا میں تھے پوری فیملی کے ساتھ۔ اس لیے شادی کے بعد آپی صرف ایک بار ہی آسکیں۔ تین سال کی بیٹی کو لے کر۔ دو ماہ گزار کر چلی گئیں۔ یہ سب وہ پہلے ہی بتا چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایک دن ایاز یعنی ماموں بھائی (یعنی نانا ماموں) گھر آئے تو عاشی اپنی سہیلی کی منگنی میں گئی ہوئی تھی۔ مونا، فرید کرکٹ کھیلنے، چچا مسجد، چچی کے سر میں درد تھا۔ وہ کمرے میں جا کر سو گئی تھیں۔ سمن کو گھبراہٹ سی ہوئی۔ (اکیلی) وہ عین اس کے سامنے آکر انگلی اٹھا کر بولے۔

"آپ سمن ہیں۔ عاشی نے تفصیلی تعارف کرایا تھا۔ ملاقات آج ہو رہی ہے۔" سمن گھبرا کر دوپٹہ سر پر رکھنے لگی۔

"سب گھر والے کہاں ہیں؟ ہماری آپا، بھائی صاحب وغیرہ وغیرہ۔"

"جی، وہ چچی کے سر میں درد ہے۔ وہ سو رہی ہیں۔ چچا مسجد گئے ہیں۔"

"اور عاشی؟ بہت ہی بے فکر قسم کی صاحبزادی ہیں۔ گئی ہوں گی کسی سہیلی کی بسم اللہ یا سالگرہ پارٹی میں۔"

"آپ بیٹھیں۔ میں چائے بنا لاتی ہوں۔ بچے کرکٹ کھیلنے گئے ہیں۔" اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں شکریہ۔ ایں؟ یہ بچے کس کو کہا۔ ارے بچے نہیں۔ پورے افلاطون ہیں دونوں۔ غلط فہمی دور کرلیں۔ وہ تو آپ کو بیچ کھائیں۔ اچھا آپا کو سلام۔ چلتا ہوں۔"

وہ فوراً" چلے گئے۔ شریف آدمی ہیں۔ اس نے فیصلہ کیا۔

چچی خود اٹھ کر آگئیں تو اس نے ماموں بھائی کا بتایا۔

"اے ہے لو میں نے ہی بلوایا تھا۔ اور درد لے کر پڑ گئی۔ مجھے اٹھا دیتیں تم۔" چچی تاسف سے بولیں۔

"نہیں چچی! آپ کو آرام کی ضرورت تھی۔ پھر نیند سے جاگنے پر درد اور بڑھ جاتا۔" چچی نے اسے بغور دیکھا۔ پھر اشارے سے اسے قریب بلایا۔ ماتھے پر بوسہ دیا۔

"بہت سمجھ دار ہو اور ہمدرد بھی۔" انہوں نے کہا۔ سمن جھینپ گئی۔ چچا سے بھی انہوں نے کہا۔

"ہماری بیٹی کو اتنا شعور نہیں۔ وہ تو مجھے جھنجھوڑ کر جگاتی۔ یہ سوچے بغیر کہ میں درد سے نڈھال سوئی ہوں۔ وہ بالکل بے نیاز ہے احساسات سے۔"

چچا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، تھپتھپایا۔ سمن مزید سمٹ گئی اور عاشی شرمندہ ہونے کے بجائے اس سے شکوہ کررہی تھی۔

"کیا تھا اگر تم میرے ساتھ زارا کی منگنی میں چلی چلتیں۔ پھر امی کو یہ فرق نظر نہ آتا۔ مقابلہ اور وہ بھی میری غیر موجودگی میں؟"

"دیکھا۔" چچی نے ہنس کر کہا۔ "ہماری بیٹی کو اب بھی احساس نہیں۔ بجائے شرمندہ ہونے کے یا اپنی نالائقی کا اعتراف کرنے کے۔ شکایت کر رہی ہیں۔ سیکھو بیٹا۔"

"لو جی۔ میری نالائقی نظر آرہی ہے اور وہ آپ کے ولی عہد بہادر جو پڑھائی کے بہانے سات سمندر پار جا کر بیٹھ گئے۔ بہت ہمدرد ہیں اور چھوٹے آندھی آئے یا طوفان گھر میں کچھ ہو تا رہے۔ وہ کرکٹ نہیں چھوڑیں گے۔" عاشی مزید شکوے کرنے لگی۔

سمن کو لگا۔ اسے سمن کی تعریف پسند نہیں آئی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "سوری عاشی! میری وجہ سے تم کو۔" جملہ پورا ہوا نہیں۔

عاشی نے فوراً" مڑ کر کہا۔ "ایں! تمہاری وجہ سے؟ اوہو۔ یہ تو میں سنتی رہتی ہوں اور میرے پاس جواب بھی ہوتا ہے اور اب دیکھنا رات کو —— آکر جو میری خبر لیں گے۔ اف بے چاری اکیلی میں۔"

عاشی مسمسی صورت بنا کر بیٹھ گئی۔ چچی ہنستی رہیں۔ سمن نے چچی کو بستر سے اٹھنے نہیں دیا۔ چچی نے سالن صبح ہی تیار کرلیا تھا۔ سمن نے روٹی پکائی اور تھوڑے سے چاول ابال لیے۔ رات کو جب کھانا میز پر آیا۔ چچی

خوش ہو گئیں۔

"آہا' آج میرا دل روٹی کے بجائے چاول کھانے کے لیے چاہ رہا تھا۔ مگر میں نے کہا نہیں کہ بچاری بچی کیا کیا کرے گی۔ اس کا احساس دیکھو۔ بغیر کہے ہی میری خواہش پوری کر دی۔ سیکھو عاشی! سمن سے ہی سیکھ لو۔ کس طرح بیمار کا خیال رکھنا چاہیے۔ تم تو کمرے میں جا بیٹھیں۔ سمن نے کھانا بھی لگایا۔ تم تو آگئیں پیٹ بھر کر سہیلی کے گھر سے۔"

"ہائے نہیں۔ کہاں بھرا پیٹ۔ دیکھیں خالی پڑا ہے۔ وہاں تو۔"

"ڈھول پیٹتی رہی ہو گی۔ گانے گا کر داد سمیٹ کر پیٹ بھرا ہو گا۔ ہوش ہی کہاں ہو گا کچھ کھانے پینے کا۔"

"ہاں تو اور گئی کس لیے تھی؟ کسی کو ڈھولک بجانی آتی ہی نہیں اور جب ہمارے کھانے کی باری آئی تو بریانی کی کھرچن رہ گئی تھی اور حلیم' آپ کو پتا ہے حلیم مجھے پسند نہیں۔"

"یہ حال ہے۔" چچی نے تاسف سے پہلے عاشی پھر شوہر کو دیکھا۔ "ہماری بیٹی اب ہر فنکشن میں ڈھول بجانے کے لیے بلائی جاتی ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟"

"امی۔" عاشی ماں سے لپٹ گئی۔ "ایسے تو نہ کہیں' لو وہ بھی آگئے۔ آئی شامت۔"

یہ آمد کا اعلان ایاز ماموں بھائی کا تھا۔ وہ فوراً" ہاتھ دھو کر میز کے گرد بیٹھ گئے۔

"میں آیا تھا سہ پہر میں۔" وہ کھانے کا جائزہ لیتے ہوئے بول رہے تھے۔ "گھر میں سناٹا' الو بول رہے تھے۔ کہاں تھے سب لوگ؟ او ہو عیش ہو گئے آج تو آلو گوشت اور چاول۔ واہ پسندیدہ کھانا۔"

انہوں نے چاول کی ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عاشی نے فوراً" ڈش اپنی طرف کھسکالی۔

"خبردار ماموں بھائی! یہ امی کے لیے خصوصی طور پر بنائے ہیں سمن نے۔ ان کی طبیعت خراب ہے یہ بیمار کا کھانا ہے۔"

"اچھا تو آپا سے جو بچیں گے وہ میرے۔ تم تو اپنی سہیلی کی بسم اللہ کے فنکشن سے کھا کر آئی ہو گی۔ خوب ڈٹ کر۔"

"ہائیں' آپ تو کہہ رہے تھے آپ آئے تو گھر میں الو بول رہے تھے۔ پھر میرے سہیلی کے گھر جانے کی خبر کیا کسی فرشتے نے دی۔ یا جن آپ کے تابع ہیں۔"

"فرشتہ نہیں' فرشتی' جن نہیں' جننی خوش؟"

ایاز ماموں بھائی نے مزے سے آدھے چاول اپنی پلیٹ میں نکال لیے۔ ان پر سالن بھی انڈیل لیا۔ عاشی گھورتی رہی۔ چچی مسکراتی رہیں۔ ایاز ماموں بھائی' چچی کے گھر کے باہر کے اکثر کام کر دیتے تھے۔ بینک جانا ہو۔ بل جمع کرانے ہوں یا چچا بھی انہیں اپنے کام بتا دیتے۔ وہ خوشی سے ہر کام کر دیتے۔

عجیب آدمی' دوسروں کا کام کر کے کوئی اتنا خوش ہو سکتا ہے۔ وہاں ماموں سے اماں کچھ کہہ دیتیں تو ماموں سر جھکا لیتے۔ تیوریاں ممانی کی چڑھ جاتیں۔ ان کے لاڈلے سے ایک بار اماں نے بل جمع کرانے کے لیے بڑی لجاجت سے کہا۔ وہ بل وہیں پھینک کر چل دیا۔ بڑبڑاتا ہوا۔ "نوکر سمجھا ہے۔ ہونہہ۔" گھر کے بل جمع کرانے کی ذمہ داری بھی زہین آپا کی تھی۔ کبھی ان کو کام پڑ جاتا اور بل جمع کرانے کی آخری تاریخ قریب ہوتی تو امن اور سمن بینک چلی جاتی تھیں۔ اماں کو اعتراض تو ہوتا۔ مگر مجبوری۔

کالج میں چار چھٹیاں آرہی تھیں۔ چچی نے کہا۔

"تم قصور جانا چاہو تو چلی جاؤ۔ اپنی اماں بہنوں سے مل آؤ۔ پھر پتا نہیں کب چھٹی ہو گی اتنی کہ...... جا سکو۔" سمن سوچنے لگی۔

شاید چچی چند دن کے لیے مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہیں۔ ان کے گھر کا نظام میری وجہ سے اپ سیٹ ہو گیا ہے۔ شاید اب انہیں میرا بوجھ ناگوار لگتا ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ ان کو آزمانا چاہیے۔ مگر کوئی مجھے چھوڑنے جائے گا۔ دو آدمیوں کا بس کا کرایہ۔ پھر میں کس کے ساتھ آؤں گی۔ پھر ڈبل کرایہ۔ وقت۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے۔ جو مجھے لے جانے لانے میں لگا

رہے گا۔

"رہنے دیں چچی! میں وہاں جا کر کروں گی کیا؟ سوائے رنج و غم اور تفکرات کے وہاں اور ہے ہی کیا؟"

"اوہو۔ ماں بہنیں ہیں۔ ان سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ بھی یاد کر رہی ہوں گی تمہیں۔ شاید انتظار بھی ہو گا۔" چچی اسے بہلانے کے لیے کہہ رہی تھیں یا بھگانے کے لیے۔

"کسی کو یاد کرنے کا دستور نہیں ہے وہاں۔ نہ انتظار کا۔" وہ تلخی سے بولی۔

"ایسے نہیں سوچو۔ ماں کی ممتا دکھاوے کے لیے نہیں ہوتی بیٹا! بہت گہری ہوتی ہے ماں کی محبت۔ بھابھی زبان سے چاہے کچھ نہ کہیں۔ دل میں ہر وقت تم کو یاد کرتی ہوں گی۔ مل آؤ گی تو انہیں خوشی ہو گی۔"

چچی سمجھانے لگیں۔ وہ چپ رہی۔ کیا بتاتی اماں ہر وقت بیٹیوں کے نصیب کو رویا کرتیں۔ ہر بیٹی کو شک کی نظر سے دیکھنا۔ برا بھلا کہنا۔

امن بھی چڑچڑی ہو گئی تھی۔ زہین آپا سے لڑتی۔ ان کی طلاق کسی حادثے سے کم نہ تھی۔ امن کا خیال تھا۔ زہین کو گھر بچانے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ کسی سمجھوتے کے لیے شادی قائم رکھنے کی خاطر انا کی قربانی دی جا سکتی تھی۔ مگر تالی دونوں ہاتھ سے بجتی ہے۔ ادھر انا تھی تو ادھر غرور زہین آپا پچھتاتی نہیں تھیں۔ رنجیدہ تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں میں منجمد ہو گئے تھے۔

گھر میں معاشی بدحالی کے علاوہ زہین آپا کا سوگ نحوست کی چھاپ لگا چکا تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد ان کی جاب نے فکروں کو کم ضرور کیا۔ غم کو نہیں۔ اماں کی زبان زہر اگلتی رہتی۔ اس گھر نے خوشی کی کسی خبر' کسی ہونٹوں پر ہنسی پر پابندی لگا دی تھی۔ ماتم کی فضا ٹھہری گئی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔ تمہارے چچا سے کہوں؟ وہ تمہیں چھوڑ آئیں گے۔" چچی نے کہا۔

"نہیں چچی! رہنے دیں۔ میں گھر پر ہی رہ کر کچھ پڑھ لوں گی۔" اس نے بہتر سمجھا کہ چچا کو زحمت نہ دے۔

"چچا کو تکلیف ہو گی۔ پھر وہاں سے لے آنے کے لیے بھی ـــــ اکیلی کیسے آؤں گی؟"

"کیوں بھئی۔ تمہارے چچا جا کر لے آئیں گے۔ قصور دور ہی کتنا ہے۔ جیسے دوسرا محلہ۔"

"خوامخواہ اتنا خرچا ہو جائے گا کرائے پر اور چچا کو فرصت ہی کہاں ہوتی ہے۔"

چچی نے محبت سے اس کا گال چھوا۔ "ارے کتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھتی ہو تم۔ چلو اچھا ہے پھر۔ ابھی رہنے دو۔ پڑھائی کر لو۔ اگلی دفعہ سہی۔"

کمرے میں آکر وہ آنسو بہانے لگی۔ دل تو چاہتا تھا۔ زہین آپا سے' ارسلہ سے ملنے کا۔ مجبوریاں بھی کس بے دردی سے پیروں میں زنجیریں ڈالتی ہیں۔ اگر اماں کے پاس رقم ہوتی تو وہ یہاں کیوں آتی۔ صرف تعلیم کے لیے یا پھر چچا اتنے فارغ ہوتے۔ کرائے کے لیے رقم ہوتی تو موئد کے ساتھ چلی جاتی۔ واپسی کے لیے فرید کو بلا لیتی۔ پتا نہیں چچی کو اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔ عاشی بھی کہنے لگی۔

"دشمن تم فرید کے ساتھ چلی جاتیں۔ موئد جا کر لے آتا پرسوں۔"

"نہیں نہیں' میں بچوں کے ساتھ نہیں بھیجوں گی۔" چچی نے فوراً" کہا۔ "بڑی ذمہ داری کی بات ہے۔ ان لڑکوں کا کیا بھروسا۔ راستے میں کسی اسٹاپ پر اتر گئے تو سمن کیا قصور تک اکیلی جائے گی۔ نہیں بھئی' ایسا خطرہ میں نہیں مول لے سکتی۔"

لو جی سولہ سال کے لونڈے بچے ہو گئے۔ ایاز ماموں بھائی کے بقول افلاطون ہیں۔ مجھے بھی بیچ کھائیں۔

"ارے لو یاد آیا۔ ایاز کا تو ہر تیسرے دن قصور کا چکر لگتا ہے۔ کل بھی اسے جانا ہے۔ اس کے ساتھ چلی جانا۔ وہ گھر تک چھوڑ آئے گا تمہیں۔"

ایاز کے ساتھ؟ کبھی نہیں۔ اماں تو گردن مروڑ دیں گی میری۔ بلکہ الزام لگانے سے بھی نہیں چوکیں گی اور وہ میرے کیا لگتے ہیں جن کے ساتھ جاؤں۔ برابر والی سیٹ پر بیٹھ کر تا بابا۔ وہ تو چچی کو بھی دس باتیں سنانے میں دیر نہیں کریں گی۔ بدگمان انتہا کی۔ ان کی

تلخ زبان ہی تو معاملہ کو خراب کرتی تھی گو کہ اب توانا تو زمانہ، پے در پے صدمات نے انہیں کمزور کر دیا تھا۔ تفکرات نے نچوڑ دیا تھا مگر زبان کی طراری اف۔ اس نے عاشی سے کہہ دیا۔ اب طے کر چکی ہے کہ نہیں جانا۔ تو نہیں جانا۔ پڑھ پڑھ کر ہی چار دن گزار دیے۔ فون پر اماں سے اور امن ذہین آپا سے تفصیلی بات کر لی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا۔ سردی کی شدت کم ہوتے ہوتے تقریباً" ختم ہو گئی۔ خزاں کا خشک مزاج مزید روکھا سوکھا ہو رہا تھا۔ چرچرا کر درختوں کے سارے پتے پیلے ہو کر زمین پر گرتے گئے۔ زمین پر انسانوں کے قدموں تلے کچلے گئے، چرمرا گئے۔ ہر سمت ٹنڈ منڈ درختوں پر کونپلیں پھوٹ پڑیں۔ پھولوں کے پودوں نے سر اٹھا کر شاید اطمینان کی سانس لی۔ ہوا کی خوشگوار سرسراہٹ محسوس کی اور سرشاری سے جھومنے لگے۔ پھر اپنے ننھے منے شگوفے کو پرورش ہوتا دیکھنے لگے۔

بچپن سے نوجوانی کا سفر کرتے پھول اب مہک دینے لگے تھے۔ لان میں سویٹ پی کے رنگ برنگ کے پھولوں کی بہار تو الگ۔ خوشبو بھی سب سے جدا تھی۔ جیسے خوشی کا پیام دیتی۔ کسی اپنے کی آمد کی نوید۔

سمن لان میں جا کر ناک سے سانس لیتی تو مہک اندر تک پھیل جاتی۔ کسی پھول کے پاس ناک لے جا کر سونگھتی تو چھینک آجاتی۔ ساتھ ہی گدگدی سی ہوتی، وہ بے ساختہ ہنس پڑتی۔ سرکنڈوں کے آڑے ترچھے جال کے سہارے کھڑے سویٹ پی کے پودے جھومنے لگتے گویا وہ بھی ہنس رہے ہوتے۔ سمن کا مذاق اڑاتے۔ وہ انہیں تھپڑ دکھا کر اندر آجاتی۔ پھر دھوپ کی تمازت سے پھول مرجھانے لگے۔ سکڑنے لگے۔ پھولوں کی جگہ اب پھلیاں نمودار ہو رہی تھیں۔ صرف گیندے، جعفری اور پٹونیا کے پھولوں پر دھوپ کا اثر نہ ہوا۔ وہ اپنی موجودگی سے بہار کا تاثر قائم رکھنے میں کامیاب تھے۔

ایک دن کیا دیکھا۔ برآمدے میں چچی میز پر بہت سے کاغذات پھیلائے بیٹھی ہیں۔ عاشی بھی وہیں تھی۔ کچھ پڑھ رہی تھی۔ سمن آگے آئی۔ دونوں ماں بیٹی کاغذات میں محو سی تھیں۔

"یہ کیا ہے؟" وہ انتہائی حیرت سے پوچھنے لگی۔ دیکھنے میں تو۔۔۔ امتحانی پیپر لگ رہے تھے۔

"یہ میٹرک کے پیپر ہیں۔" عاشی نے بتایا۔ "ہر سال امی کے پاس آتے ہیں۔ چیک ہونے کے لیے۔" عاشی نے سادگی سے کہا۔

یہ تو اسے علم تھا کہ چچی اپنی شادی سے پہلے بھی کالج میں لیکچرر تھیں۔ شاید دو بچوں کی پیدائش کے بعد گھریلو مصروفیات کی وجہ سے انہوں نے سروس چھوڑ دی۔

"امی کے پاس فرسٹ ایئر سیکنڈ ایئر کے پیپر بھی آتے ہیں۔ پے منٹ بہت اچھی ہوتی ہے۔"

عاشی مزید بتانے لگی۔ سمن کی حیرانی دیکھ کر چچی نے وضاحت کی۔

"بیٹا! مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ اور یہ کم نہیں ہو گی اور بڑھے گی۔ ملک کے جو حالات ہیں۔ ملک کے حکمرانوں کی دولت کی ہوس بڑھ رہی ہے۔ ملک غریب تر ہو رہا ہے۔ ان حالات میں ایک آدمی کی کمائی پر گھر نہیں چلتا۔ سب کو محنت اور جدوجہد کرنا چاہیے اور جن کے بچے زیر تعلیم ہوں۔ ان پر زیادہ ذمہ داری ہوتی ہے۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

"آ۔۔۔ آپ نے چچا کو منع بھی نہیں کیا۔ اب میرا بوجھ بھی آپڑا۔" چچی بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"او میری بھولی بیٹی! تمہارا تو بوجھ ہی بہت کم ہے۔ یہ تو میں اپنے اس نواب بیٹے کی خاطر کرنے پر مجبور ہوں۔ انگلینڈ کی پڑھائی بہت مشکل اور ہم جیسوں کے لیے تو اخراجات پورے کرنا ہی امتحان ہوتا ہے۔ خیر اب تو اس کا آخری سال ہے۔ ان شاء اللہ چھٹیوں میں آئے گا۔ مگر کرایہ تو مجھے دینا ہو گا۔"

چچی کس قدر مطمئن تھیں۔ ان کی یہ بات سمن کو عجیب لگتی تھی۔ (اچھی بھی) وہ ہر بات پر ہنس دیتی تھیں۔ کوئی فکر ہو، پریشانی ہو، ہنس کر بات کریں گی اور لو جی میں تو قصور کے کرائے کی فکر میں جاتی ہی نہیں اور وہ ان کا نواب بیٹا، جہاز کا کرایہ بھی ماں سے وصول کرتا ہے بے غیرت نہ ہو تو۔

"اللہ کا شکر ہے۔ تم لوگوں کی تعلیم کا بار مجھ پر بھاری نہیں۔ بس رمیز کے اخراجات۔"

"تو۔۔۔ وہ خود وہاں کوئی جاب کیوں نہیں کر لیتے۔ سنا ہے۔ زیادہ تر پاکستانی اسٹوڈنٹ کچھ نہ کچھ کام کر کے تعلیم کا خرچا نکال لیتے ہیں۔" وہ بولے بغیر نہ رہ سکی۔ ہائے چچی کی محنت دماغ سوزی کرائے میں اڑے گی۔

"ہاں بھئی۔ کچھ کرتا تو ہے وہ بھی۔ مگر پڑھائی زیادہ اہم ہے۔ ہم سے بھی جتنا ہو سکتا ہے۔ بھیج دیتے ہیں۔ اللہ بڑا مددگار ہے۔" مطمئن واہ جی۔ ادھر چچا بے نیاز، اللہ پر اعتماد، اعتقاد اور خوش بخوش، کاش اماں کو بھی اللہ پر ذرا سا اعتماد ہو جائے۔ تو ہمارے گھر کی نحوست بھی ختم ہو۔

☼ ☼ ☼

محرم کی چھٹیاں آرہی تھیں۔ چچی نے پروگرام بنا لیا۔

"چلو بھئی سمن! ہم تمہیں قصور لے چلتے ہیں۔ میں بھی عرصے سے بھابھی اور بچیوں سے نہیں ملی۔ اچھا ہے اس بہانے مل لیں گے۔ عاشی بھی جانا چاہتی ہے۔"

"چچی! آپ کو زحمت ہو گی۔ پھر چچا یہاں اکیلے۔"

"اکیلے کیوں۔ مؤئد فرید ہیں گھر میں۔ کھانا پکا کر رکھ دوں گی۔ فرید گرم کر لے گا۔"

وہ جب قصور پہنچیں۔ صبح کے دس بجے تھے۔ راستے بھر وہ پچھتاتی رہی کہ چچی کے آنے کی اطلاع کیوں نہ کر دی۔ اب نہ جانے گھر میں صفائی بھی ہوئی ہو گی یا کہ نہیں۔ امن اکثر سستی کر جاتی تھی۔ چھٹی کے دن دوپہر تک سونے کا پروگرام ہوتا۔ مگر خیر شکر ہے امن جاگ بھی گئی تھی اور گھر بھی صاف تھا۔ اماں نے چچی کا بہت تپاک سے استقبال کیا۔ (خلاف توقع) ورنہ تو وہ تو چچا کے آنے پر بھی منہ بنا لیتی تھیں۔

ان کے خیال میں ان کے سسرال والے بہت مطلبی اور خود غرض تھے۔ پتا نہیں کون سی خود غرضی؟ کبھی کھل کر بتایا نہیں۔ چچی نے سب کو تحائف دیے۔ ارسلہ کے لیے وہ بہت خوب صورت فراکیں لائی تھیں۔ چاکلیٹ اور تصویروں والی بچوں کی کتابیں۔

اماں نے حسب توقع پڑوسی لڑکے کو بلا کر بریانی لانے کا کہا۔ چچی نے سن لیا۔ فوراً" منع کیا۔ (حسب توقع)

"ارے بھابھی! کیا کر رہی ہیں۔ جو پکا ہے وہی کھا لیں گے۔ مہمان تھوڑی ہیں ہم۔"

اماں کو اچھا تو نہیں لگا۔ مگر چپ رہیں۔ شکر ہے کہ کھانا ذہین آپا نے بنایا تھا۔ بھنڈی کی بھجیا بھی مزے دار تھی اور آلو کے کٹلس بھی۔ امن نے سویاں چچی کی خاطر بنا لیں۔

اماں خاطر خواہ تواضع نہ کر سکنے پر متاسف تھیں۔ مگر چچی نے شام کی چائے پی کر واپسی کا اعلان کر دیا۔ ساتھ ہی امن سے کہا۔

"تھوڑی سویاں دے دو۔ تمہارے چچا کو بھابھی کے ہاتھ کا ہر میٹھا بہت پسند ہے اور یہ مزعفر تو بالکل بھابھی کے ہاتھ کا لگ رہا ہے۔ جب جا کر کہوں گی کہ بھابھی نے بھیجا ہے۔ بہت خوش ہوں گے۔ پوچھیں گے کچھ نہیں۔ بس کھانے کی جلدی ہو گی۔"

اماں کو ان الفاظ نے نہال کر دیا۔ امن اپنے ہاتھ کا سندھی کڑھائی والا دوپٹہ لے آئی۔ چچی کو بہت احترام سے پیش کیا۔ چچی اس کے کام اور ہاتھ کی صفائی سے بہت متاثر ہوئیں۔ بے حد تعریف کی۔

"چچی! آپ کو پسند آیا؟ میں عاشی کے لیے بھی بنا دوں گی۔" امن نے جوش میں آکر کہا۔ "سمن کے ساتھ بھیج دوں گی۔"

چچی امن کو حیرانی سے دیکھنے لگیں۔ "ایک ہفتے میں بنا لو گی؟ واہ۔ امن تم اپنے ہنر کو کام میں لاؤ۔ تم کہو تو میں آرڈر دلوا دوں گی۔"

امن سٹپٹا کر اماں کو دیکھنے لگی۔ اماں نے کہا۔

"ارے معمولی تحفہ ہے یاسمین! تم بھی بس۔"

"بھابھی! کوئی تحفہ معمولی نہیں ہوتا اور جس میں خلوص کے رنگ ہوں۔ ان کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ امن! تم جیسی ہنر مند لڑکیوں کے ہاتھوں کی محنت سے شہر کے بوتیک لاکھوں کما رہے ہیں۔ تم بھی فائدہ اٹھالو۔ میں یہ دوپٹہ نمونے کے طور پر دکھا کر تمہیں کپڑا بھیجوں گی۔ ڈیزائن تم خود پسند سے بنانا۔ قمیصوں کے گلے، دامن آستین۔ میں تمہیں کتابیں بھی بھیج دوں گی تاکہ ڈیزائن منتخب کرنے میں آسانی ہو، تم دیکھنا۔ بوتیک والے بھی متوجہ ہو جائیں گے۔"

"چچی! کیا، ایسا ہو سکتا ہے؟" امن پرشوق لہجے میں بولی۔

"اور چچی امن کو سندھی ٹانکے کے علاوہ بھی ہر قسم کی کشیدہ کاری آتی ہے۔" ذہین نے انہیں آگاہ کیا۔

چچی نے امن کو شاباشی دی۔ ہمت بندھائی اور یقین دلایا کہ وہ بہت جلد اپنے کام کی مہارت سے سب کو حیران کردے گی۔ چچی کے جانے کے بعد سمن نے بھی انہیں یقین دلایا۔ کہ چچی خود بھی بہت کار گزار ہیں۔ ہر کام کر لیتی ہیں۔ تمہیں بھی کام دلوا دیں گی ان کا حلقہ احباب بہت وسیع ہے۔

ایک ہفتہ جیسے چند گھنٹوں کا ہی تھا۔ وہ مستقل چچا کی محبت، چچی کے سلوک کی تعریف کرتی رہی۔ عاشی کا اپنا پن، دوستی، تعاون، گھر کے سکون کا ذکر۔ اماں کو یہ سب پسند تو نہیں آرہا تھا۔ مگر خاموش تھیں۔ کہ چچی نے امن کو بھی گرویدہ بنالیا تھا۔ ذہین کو بھی اور اس دن عاشی کو آتے دیکھ کر سب حیران تھے۔

"عاشی! چچا بھی آئے ہیں؟"

"نہیں جی۔ ہم بذات خود، بقلم خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ کو ساتھ لے جانے کے لیے۔"

"ہائے اللہ ہم دونوں اکیلی اور تم اکیلی کیسے؟"

"سنا نہیں ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔" وہ اپنے تنہا آنے کا ذکر گول کر گئی۔ چچی نے امن کے لیے چار پانچ قمیصیں اور دوپٹوں کے کپڑے بھیجے تھے۔ ساتھ ہی دھاگے اور ڈیزائن کی کتاب۔ امن کو کپڑے دینے کے بعد عاشی نے چار نوٹ ہزار ہزار کے پرس سے نکالے۔

"یہ لیجیے جناب! یہ ایڈوانس کی رقم باقی رقم کام دیکھ کر ملے گی۔ وہ بھی خوش کرنے والی ہوگی۔ آپ کشیدہ کاری کے دوسرے نمونے دکھا دیں۔ تو اور آرڈر ملیں گے۔" امن کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس نے کشیدہ کاری کے نمونے تیار کیے ہوئے تھے۔

"ارے توبہ چچی! میں بھلا اکیلی آسکتی ہوں؟ امی اتنی آزادی کی قائل نہیں ہیں۔" عاشی اپنی آمد کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"میرے ماموں آفس کے کام سے آئے تھے قصور۔ مجھے یہاں چھوڑ کر گئے ہیں۔ کام سے فارغ ہو کر آجائیں گے۔ ہمیں لینے۔"

سمن نے اماں کو دیکھا۔ وہ پہلے تو عاشی کے تنہا آنے پر خاصی جز بز تھیں۔ اب کسی جوان مرد کے ساتھ بیٹی کو بھیجنے کے سوال پر بھی تیوری پر بل آگئے۔ مگر جب ایاز آئے اور انہوں نے ان سے بالمشافہ ملاقات کی۔ ان کے مؤدبانہ اور شریفانہ طرز عمل ان کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ چلتے وقت کہہ رہی تھیں۔

"ارے بیٹا! آفس کے کام سے جب بھی آتے ہو۔ ادھر بھی آجایا کرو۔ چائے وائے پی لیا کرو۔"

"لڑکا اچھا خاصا شریف ہے۔ آیا تو کوئی کام ہی کر دیا کرے گا۔" انہوں نے ذہین سے اپنا خیال ظاہر کیا۔ وہ شریف لڑکا ارسلہ سے ہی زیادہ مخاطب رہا۔ اسے پیار بھی کیا۔ نظر اٹھا کر کسی کو دیکھا ہی نہیں۔ شریف ابن شریف ہی ہوا۔

شام ڈھلے اپنے گھر پہنچیں۔ پھر وہی لیل و نہار۔ کالج، پڑھائی، کبھی کبھی چچی کی مدد، چچی اکثر ذہین کا ذکر کر کے افسوس کرتیں۔ کتنی حسین، تعلیم یافتہ، سلیقہ شعار، سلجھی ہوئی، قابل لائق لڑکی۔ ناقدروں کے پلے پڑ گئی۔ چلو اچھا ہوا۔ طلاق کوئی قابل تعریف چیز نہیں۔ بلکہ ناپسندیدہ ہے۔ مگر ہاں ذلت اور ناقدری سے بہتر ہے کہ اپنی آزاد زندگی محنت کر کے گزارے۔ اللہ اس کو ضرور کوئی قابل قدر رشتہ دے گا۔" پھر ایک دن کہنے لگیں۔

"میرا کوئی بھائی ہوتا۔ میں تو ایک منٹ سوچنے کے لیے نہ لیتی۔ فٹ شادی کر دیتی۔"

چچا نے عینک کے اوپر سے انہیں دیکھا۔ "ہے تو سہی ایک بھائی پھر دیر کیوں؟"

چچی یک لخت چپ ہو گئیں۔ طلاق، ارسلہ۔ پھر جیسے کسی اور کو سناتے ہوئے بولیں۔

"بھئی۔ ان کی ماں زندہ سلامت موجود۔ میں بھلا کس حق کے تحت ایسا کروں گی؟"

سمن کو ہنسی آگئی۔ بات ان کی بھی صحیح تھی مگر۔

✻ ✻ ✻

گرمی کی چھٹیوں میں وہ قصور جانا چاہتی تھی۔ مگر ایک کلاس فیلو کی شادی تھی۔ عاشی کے پرزور اصرار پر اسے رکنا پڑا۔ عاشی نے کہا تھا۔ "پوری فیملی کو بلایا ہے۔ امی بھی جائیں گی۔ کوئی مسئلہ ہی نہیں۔"

عاشی کو تو کوئی مسئلہ پریشان نہ کرتا۔ مگر سمن کوئی بھی کام کرنے سے پہلے سو بار سوچتی۔ اماں کی نصیحتوں اور ہدایتوں کے مطابق غیروں سے راہ رسم بڑھانے میں نقصان ہے۔ خواہ دوست سہی۔ مگر تھے تو وہ غیر۔ پھر اس کے لیے تحفہ کی فراہمی اور شادی میں پہننے کے لائق اس کے پاس کپڑے نہیں تھے۔

عاشی نے اس کا بہانہ ان سنا کر دیا۔ خود اس کے سارے کپڑے نکال کر بہت غور و فکر کے بعد سمن کا پیلا جوڑا اس نے جھپٹ لیا۔ جس پر امن نے اپنی ہنر مندی کے جوہر دکھائے تھے۔

"یہ میں مایوں کے دن پہنوں گی۔ تم یہ شیشے کے کام کا سوٹ پہن لینا۔"

"مایوں میں یہ... تو شادی کے دن کیا پہنوں گی۔" یہ سوٹ سب سے بہتر تھا۔ عاشی نے چٹکی بجائی۔

"او ٹھیک۔ تم میرا گلابی سوٹ پہن لینا جس پر ستاروں کا کام ہے۔ میں امی کی ساڑھی پہن رہی ہوں۔"

"تم ساڑھی پہنو گی؟ گر جاؤ گی۔" سمن گھبرا گئی۔

"تم ہو گی نا سنبھال لینا۔" عاشی کو سمن کے اندیشے پر ہنسی آئی۔ امی ابا کو بھی بتا کر لطف لیا۔ اور اس دن تو سمن کی حیرت بجا تھی۔

عاشی نے ساڑھی پہنی اور بڑی آسانی سے ہر طرف چلتی پھرتی گھومتی رہی۔ عاشی کو واقعی کسی بات پر کوئی مسئلہ نہ ہوتا شادی ہو گئی۔ پھر ولیمہ۔

✻ ✻ ✻

اس کے اگلے دن چچا کے ساتھ قصور جانا تھا۔ وہ صبح سے ہی برآمدے میں چچا کے انتظار میں ٹہلنے لگی۔ عاشی نے کہا۔

"پانچ بجنے میں ابھی چھ گھنٹے باقی ہیں۔ کیوں خود کو تھکا رہی ہو۔ ابا پانچ بجے سے پہلے نہیں آتے۔" وہ شرمندہ ہو گئی۔

"اچھا، پھر میں روٹی پکا لیتی ہوں۔"

"اور میں سوجی کا سوکھا حلوہ۔" عاشی بھی کچن میں گھس گئی۔ چچی پڑوس میں تھیں۔

کچن سے باہر نکل کر دونوں منہ ہاتھ دھو کر بیٹھی ہی تھیں کہ دروازے پر دستک سن کر سمن دوڑی۔

"چچا آگئے۔" پیچھے عاشی بھی آگئی۔ پھر بغیر پوچھے دروازہ کھولنے کا جو انجام ہوتا ہے۔ سامنے ایک خوب صورت نوجوان لڑکا شوق بھری نظروں سے سمن کو دیکھ رہا تھا۔

"آ۔ آپ کون؟" اس کے منہ سے نکلا۔

"آپ کون؟" ادھر سے جواب آیا۔ "تعارف میں پہل ہو جائے۔" اور اندر گھسنے کی کوشش کی۔

"سنیے۔" سمن نے بہادری دکھائی۔ ڈر کی کیا بات ہے عاشی پیچھے تھی۔

"آپ کو کس سے ملنا ہے۔ اپنا نام بتا دیں۔"

"فی الحال تو آپ سے۔" کہتا ہوا بہ زور اندر آگیا۔ ہکا بکا سی عاشی کو اس سے لپٹے اور ہنستے دیکھ کر سکتے میں آگئی۔

"ہائے اللہ بغیر اطلاع بھائی! بہت خراب ہیں آپ۔"

"اچھا اچھا' موئد' فرید کو بلاؤ۔ باہر سامان رکھا ہے۔ اٹھا لائیں۔" کہتے ہوئے نواب صاحب بیگ لیے اندر آ گئے۔ سامان اٹھایا سمن اور عاشی نے۔ وہ صاحب برآمدے میں کرسی پر پڑے ہوئے تھے۔ سامان آتا دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھے۔ پھر موئد' فرید آ گئے۔ شور مچاتے ہوئے۔ بھائی سے لپٹ گئے۔ ایک ان کی جیکٹ اتار رہا تھا۔ تو دوسرے نے جوتے اتارے۔ عاشی شربت لے آئی اور چائے بنانے دوڑی (آرڈر) سمن منہ بنائے کھڑی دیکھتی رہی۔ (کیا یہ سچ مچ نواب ہیں؟) سوچ کر رہ گئی۔ چچی آ گئیں اور گھر ایک نئے قسم کے شور سے بھر گیا۔ قہقہے' باتیں' سب کی آوازیں گڈمڈ۔ اسے یہ نئی قسم کا شور اس لیے بھی عجیب لگا کہ وہ عادی نہ تھی۔ ان کے گھر میں تو ہنسنا قہقہے لگانا جرم۔ فضول باتیں کرنا بھی مکروہ سمجھا جاتا۔ ہاں اماں کی ڈانٹ ڈپٹ' شکوک و شبہات سے بھرے جملے اور امن کی احتجاجاً ہلکی آواز' زہین کے آنسو۔ کبھی خوشی کا کوئی لمحہ میسر نہ تھا۔ بس ہر وقت سوگ کی ماتم کی فضا۔ ہنسنا کجا مسکرانا بھی جرم بن جاتا۔ کیا جہاں لڑکے نہ ہوں۔ مرد فوت ہو چکا ہو۔ لڑکیوں پر خوشی کے دروازے بند کر دینے چاہئیں۔ کیا لڑکیاں جان دار نہیں ہوتیں۔ ان کے دل کی جگہ ایک سوراخ ہوتا ہے۔ جذبات پر قفل لگا کر پہرے بٹھا دیے جاتے ہیں۔

شاید لڑکوں والے گھروں میں ایسا شور خاص نہ سمجھا جاتا ہو۔ مگر لڑکیوں پر پابندی کیوں۔ اظہار پر بھی پابندی۔

"سمن! آؤ بچے وہاں کونے میں کیوں کھڑی ہو بھئی۔" چچی کو اس کا خیال آیا۔

عاشی امی کو ہنس ہنس کر بتا رہی تھی۔ "سمن شرمندہ ہے۔ بھائی کو پہچانا نہیں۔ ہائے کتنے مزے کا فلمی سین تھا۔ بھائی اندر آنا چاہ رہے تھے۔ یہ انہیں باہر دھکیل رہی تھی۔ دروازہ بند کرنے کی ناکام کوشش' ہاہاہا۔"

"اور تم..... فضول بیوقوف لڑکی۔ آنکھیں پھاڑے' منہ کھولے مجھے گھور رہی تھیں۔" بھائی نے خفگی سے کہا۔ "کھلے منہ سے اتنا تو بتا دیتیں میں کون ہوں؟"

"ہاں بھئی۔ یہ تو کہتیں' یہ میرا پردیسی نواب بھائی ہے۔" چچی نے رمیز کو چپت رسید کی۔

"ہائے میں تو اتنی حیران تھی۔ بالکل گونگی بن گئی تھی۔" عاشی نے وضاحت کی۔

"اچھا چلو اٹھو۔ کھانا لگاؤ۔ تمہارے ابا کو فون کر دیا ہے۔ آتے ہوں گے۔" چچی بیٹے کو کمرے میں لے گئیں۔ لڑکیاں کھانا لگانے لگیں۔ چچا کے آنے کے بعد پھر ایک غلغلہ بلند ہوا۔ رمیز کی آواز سب سے بلند تھی۔ کھانے کے وقت ایاز ماموں بھائی آ گئے۔ نئے سرے سے استقبالی نعرہ۔

کھانے کے دوران ہی رمیز نے بتایا۔ ملتان جانا ہے۔ دوست کی شادی ہے۔ تین دن وہاں لگیں گے۔ دراصل وہ آئے ہی شادی میں شرکت کی غرض سے تھے۔ واہ بھئی کیا ٹھاٹھ ہیں۔ ادھر چچی کمائی کے لیے سر کھپا رہی ہیں۔ بیٹے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے اور بیٹے کو پروا نہیں۔ کیسی بے حسی ہے۔ خود غرضی ہے۔ چچی نے ایک بار بھی نہیں ٹوکا۔

"آپ تو آج قصور جانے والی تھیں؟" ایاز نے اس سے پوچھ لیا۔ سب کھانے کے بعد لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ چچا صوفے پر نیم دراز تھے۔ گھبرا کر سیدھے ہوئے۔ "ارے' اوہ' بالکل بھول گیا۔"

چچا شرمندہ ہوئے۔ سمن اور زیادہ شرم سار ہوئی۔ عاشی چائے بنا لائی۔

"اچھا' پھر..... چائے پی کر چلتے ہیں۔" چچا نے جیسے مجبوراً ارادہ کیا۔

"ماموں بھائی۔" رمیز کو جیسے کچھ یاد آیا۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ کل آپ کو قصور جانا ہے تو آپ ہی انہیں اپنے ساتھ لے جائیں۔ قصور تو یہ رہا چند منٹوں پر۔"

"میں؟" ماموں بھائی کے ہاتھ میں بسکٹ تھا۔ جو مارے حیرت کے اظہار میں ان کے ہاتھ سے گرا اور چائے کی پیالی میں ڈوب گیا۔ شاید بلا ارادہ۔ یا ارادۃً ہاتھ سے چھوٹا تھا۔

"میں اگر قابل اعتماد ہوتا تو کیا ہی بات تھی۔" ان کے لہجے میں بھی مایوسی تھی۔ مصنوعی۔

"یار! یہ رمیز نے اچانک آ کر سب کچھ بھلا دیا۔" چچا تاسف سے بولے۔ "اور یہ دو تین دن کے لیے ملتان جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ لو بھلا۔"

"چچا! رہنے دیں میں پھر بعد میں چلی جاؤں گی۔" اس نے چچا کو شرمندگی سے نکالنے کے لیے مطمئن لہجے میں کہا۔

"یہ قصہ کیا ہے؟ قصور۔ بعد میں۔ قصور کیا آپ لوگ قلفی فالودہ کھانے جا رہے ہیں؟" قصور کا قلفی فالودہ مشہور تھا۔ مگر رمیز کے چہرے اور لہجے میں بھی بناوٹ تھی۔

"میں ہی لے جاتا۔ مگر میرا کوئی تعارف ہی نہیں۔" مزید گوہر افشانی فرمائی۔ سب ایک ساتھ بولنے لگے۔ تفصیلی تعارف۔ چچی کی ڈانٹ سب سے بلند تھی۔ وہ رمیز کو اس کی بے خبری پر ڈانٹ رہی تھیں۔

"اچھا' اچھا وہ حیدر آباد' ملتان والے چچا' خانہ بدوشی اور سیاحت کے دلدادہ۔ ٹھیک ہاں ہاں قصور' وہ انگلینڈ جانے سے پہلے میں گیا تھا چچی سے ملنے۔ اکیلی بیٹھی تھیں بے چاری۔" لہجہ اور الفاظ سراسر مذاق اڑانے والے اور مصنوعی تھے۔ "ویسے ماموں بھائی آپ ہی لے جائیں سمن کو۔ الگ الگ سیٹوں پر بیٹھ کر۔"

"کاش۔" ماموں بھائی اب تیسرا بسکٹ چبا رہے تھے۔ "میں ٹھہرا بے اعتباری۔" آج ہی دوبارہ ایاز نے شکوہ کر ڈالا۔ حالانکہ اتنے دنوں میں تو کبھی کچھ بولے نہیں۔

"تو میں ہی ملتان سے آ کر لے جاؤں گا۔ جانا تو ہے چچی سے ملنے۔" رمیز لاپروائی سے بولے۔

"میں..... اب پرسوں ہی چلی جاؤں گی چچا کے ساتھ۔" اس نے حتمی فیصلہ کیا اور چلی آئی۔

"بہت سمجھ دار اور معاملہ فہم ہے۔" چچی تعریفی انداز میں کہہ رہی تھیں۔

"حالانکہ چچا نے کبھی معاملہ فہمی کا مظاہرہ نہیں کیا۔" رمیز' ابا کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر چپ ہو گیا۔ ایاز ماموں بھائی رات تک موجود رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔ سمن تصور میں اپنے گھر قصور پہنچی ہوئی تھی۔ جہاں اماں تھیں۔ زہین آپا۔ امن اور ارسلہ ننھی فرشتی۔ اماں زبان کی تلخ تھیں۔ وہ بھی مجبور تھیں۔ پوری زندگی اذیت میں گزاری۔ ابا کی کم تعلیم مناسب کام نہ ملنا۔ پہلے یقیناً وہ اتنے بدگمان نہ تھے۔ ماں کے سبق کے باوجود بھائی کی محبت کے معترف تھے۔ پھر اماں کے دن رات کے شکوے شکایتیں۔ اماں بھی اپنی ساس کی زیر ہدایت ابا کے کان بھرتی رہیں اور آخر اثر ہو ہی گیا۔ انہیں بھی شکایتیں ہو گئیں۔

چچا کی شادی ابا کی شادی کے بعد ہوئی تھی۔ ایک اعلا خاندان اعلا تعلیم یافتہ لڑکی سے۔ انہوں نے بھی سب کو متحد کرنے کی کوشش کی۔ مگر اماں نے طے کر لیا کہ سسرال سے پیچھا چھڑانا ہے۔ سوتیلے بھائی سے دور رہنا اچھا۔ دراصل ساس کی تربیت بھی اور چچی کے حسن' تعلیم اور شائستگی سے ان کو خود میں کمی بھی نظر آئی۔ خاندان والے مقابلہ کرتے تھے۔ اس سے بھی چڑ ہو گئی۔ احساس کمتری نے جوش دلایا۔ سوتیلی ماں نے سب کے اختلاف کے باوجود بیٹے کی چھوٹی عمر میں شادی کر دی۔ اسی لیے ان کی تعلیم بھی ادھوری رہ گئی۔ پھر شروع میں کئی بچے بھی ضائع ہوئے تو اماں کو بھی ساس کی بات پر یقین آ گیا کہ یاسمین جادو ٹونے کراتی ہے۔ حالانکہ چچی کے آنے سے پہلے بھی دوبارہ وہ اس سانحے سے گزر چکی تھیں۔ مگر جو سوچ لیتیں۔ وہ حرف آخر ہوتا۔ پھر ہر قدم پر ناکامی۔ آخر فکر و پریشانیاں ابا کی جان ہی لے گئیں۔

چچا نے تو پھر بھی کئی دفعہ کہا کہ آ کر ساتھ رہو۔ جو دال روٹی نصیب میں ہے مل بانٹ کر کھا لیں گے مگر ابا کی شرمندگی' اماں کی ضد آخر باپ کے ورثے سے اپنا حصہ الگ کر کے گھر چھوڑ کر جانے والے ابا سب سرمایہ ختم کر کے خود بھی ختم ہو گئے اور لامحالہ انہیں ماموں کے گھر پناہ لینی پڑی۔ جہاں ویسی ہی لاتعلقی اور بے حسی ملی۔ جو اماں کو کبھی ملی تھی۔

شاید یہ تربیت کا ہی اثر تھا۔ یا ان کے نصیب کھوٹے تھے بقول اماں کے۔ دادی اماں کی رشتے دار تھیں اور ماموں کے گھر سے نکل کر کرائے کے گھر آنے تک جمع پونجی اختتام تک پہنچی۔ اگر قصور آتے ہی ماموں اماں کے پاس جو بچا ہوا سرمایہ رہ گیا تھا اس سے ایک دکان خرید نہ لیتے اور کرائے پر نہ دے دیتے تو شاید گھر میں فاقے ہوتے۔ یا کوئی سنگین حادثہ۔

اور ادھر چچا کے گھر میں سکون تھا۔ اطمینان۔ چچا ترقی کرتے کرتے بہت اونچے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ اب بھی کسی کمپنی میں اعلیٰ عہدے پر تھے۔ چچی پہلے کالج میں پڑھاتی رہیں۔ اب بھی کچھ نہ کچھ کرتی ہیں۔ سادہ اور باوقار زندگی۔ یہی الفاظ ان پر سوٹ کرتے تھے۔ ذہین آپا کی جاب کی بدولت گھر کے حالات درست ہوئے۔ مگر پھر ماموں کے بیٹے ابرار کو ذہین سے محبت ہو گئی۔ ابرار کے یہی الفاظ تھے۔ وہ شادی کے لیے زور دے رہا تھا۔ ممانی کا انکار شدید۔ ممانی نے ماموں کو اپنا ہم خیال بنا لیا اور ذہین پر الزام عائد کیے۔ اماں بھی گھبرا گئیں۔ جو رشتہ ملا۔ جھٹ پٹ شادی کر کے انہیں گھر سے نکالا مگر وہ پھر سے واپس آ گئیں۔

سسرال والوں کو ذہین آپا کی سروس کا لالچ تھا۔ ذہین آپا نے شرط رکھ دی کہ وہ اپنی تنخواہ اماں کو دیں گی۔ چھوٹی بہنوں کی تعلیم مکمل ہونے اور شادیاں ہونے تک۔ بس یہی وجہ، وجہ نزاع بنی۔ ان لوگوں نے بچی کے بارے میں بھی نہیں سوچا جو صرف ایک سال کی تھی۔ اماں کو ذہین سے اختلاف تھا۔ پیسے کی خاطر گھر تباہ کر دیا۔ ہم تو جیسے تیسے کسی طرح گزار لیتے۔ تو تو گھر نہ اجاڑتی۔ مگر ذہین آپا بھی اصول کی سخت تھیں۔ اگر ان لوگوں کو ان کی تنخواہ کا لالچ تھا۔ تو پہلے بتا دیتے، کوئی درمیان کا راستہ نکالا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ انہوں نے رشتہ ہونے سے پہلے شرط رکھ دی تھی۔ یہ لوگ بھی اپنی شرط رکھتے، تو یہ شادی ہوتی ہی کیوں؟

”یہ انصاف تو نہیں۔ بہو ہماری، خدمت کرے میکے کی۔ سارا دن اسکول گزارے۔ ہمارا گھر خالی کا خالی۔ کیا فائدہ ہوا بیٹے کی شادی کا۔“ تنازع بڑھتا گیا۔

”نوکری چھوڑ دو۔“ شوہر نے حکم دیا۔ وہ گھر چھوڑ کر آ گئیں۔ طلاق کے بعد ممانی کو پھر خطرہ ہوا۔ انہوں نے بیٹے کو بڑی کوشش کے بعد دوبئی بھجوا دیا۔ غرض اب ذہین آپا تھیں اور اماں کی فضیحتیں، بدمزگی، سکونی اسی لیے وہ چند دن ٹل جانے پر خوش تھی۔

چچی نے ٹٹولا۔ ”کوئی بات نہیں بیٹا! تم چاہو تو میں تمہیں قصور پہنچا آؤں۔“

”نہیں چچی! ابھی تو رمیز بھائی آئے ہیں۔“

”آئے ہیں تو ایک مہینہ رہیں گے اور دیکھو۔ اسے بھلا کب پروا ہے۔ تین دن کے لیے ملتان جا رہے ہیں موصوف۔ انہیں دوستی عزیز ہے۔“

”چچی! آپ روک لیں انہیں۔ آپ کا دل چاہتا ہو گا۔ ہر وقت آپ کے سامنے رہیں۔“

”نہیں بیٹا۔ اتنی کمزور نہیں ہوں میں۔ بچوں کی خوشی ہی میری سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔“

کتنا فرق ہے۔ اماں میں اور چچی میں۔ اماں تھیں انہیں ہماری ہنسی بھی ناگوار تھی۔ حالات، صدمات، کسمپرسی، بے چارگی اور سب سے بڑھ کر غلط فیصلے سب مل کر شخصیت کو کس طرح بگاڑ دیتے ہیں۔ شکر کہ ابا نے اپنی تعلیمی کمی کو ہم بہنوں پر لاگو نہیں ہونے دیا۔ ہمیں اعلا تعلیم دینے کا خواب ذہین آپا نے پورا کیا اب امن اور میں بھی ان شاءاللہ۔

اماں کو اولاد نرینہ کے نہ ہونے کا شدید احساس تھا۔ شروع میں ماموں نے کچھ دستگیری کی تھی۔ پھر ہاتھ کھینچ لیا۔ اماں تو مرجھا کر رہ گئیں۔ لڑکیوں کا ساتھ۔ مہنگائی، ممانی کی تلخ بیانی، ذہین آپا کی سروس نے سہارا دیا تھا۔ ممانی کو ان کی نوکری پسند نہیں آئی۔ ان کا بیٹا بی اے کر کے گھر بیٹھا تھا اور ذہین ایم اے کر کے کمانے بھی لگی۔ عجیب چپقلش تھی۔ بیٹے کی خواہش کے باوجود وہ ذہین سے شادی پر راضی نہ ہوئیں۔ (سارے ٹبر کو میرا بیٹا بھگتے گا۔ نا بابا۔)

☼ ☼ ☼

رمیز نے دو دن گھر میں گزارے، پھر تیسرے دن ملتان روانہ ہوا۔ رمیز سے ملنے کافی لوگ آتے رہے تھے۔ خاصی رونق اور چہل پہل رہی تھی۔ اب سناٹا تھا۔ عاشی نے حالات کا اندازہ کر کے کئی ڈشیں تیار کر لیں۔ کئی چیزیں فریز کر لیں۔ چچی بھی روز کہیں چلی جاتی تھیں۔ پھر رمیز صاحب آئے۔ مگر ساتھ ہی دولہا، دلہن بھی تھے۔ ان کی خاطر تواضع اور مصروفیت۔ پھر دولہا دلہن مری چلے گئے اور رمیز نے سو سو کر نیند پوری کی۔

”چلو بھئی۔ قصور چلتے ہیں۔“ چچی نے دھماکہ کر دیا۔ آنے جانے کی ٹیکسی کی گئی۔ عین وقت پر رمیز بھی ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ چچی نے راستے سے کئی چیزیں۔ پھل، مٹھائی وغیرہ خریدے۔ اماں نے حسب سابق بہت تپاک کا مظاہرہ کیا۔ رمیز کو گلے لگا کر آب دیدہ ہو گئیں۔

”تم تو بالکل اپنے چچا کے جیسے لگ رہے ہو۔“ اماں نے رمیز کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔

”جی چچی! اتنی لوگ مجھے بتا چکے ہیں کہ میں چچا جیسا ہوں۔ بس چال ڈھال ابا جیسی ہے۔“

پتا نہیں چال ڈھال ”طنزاً“ یا ”اشارتاً“ کہا تھا یا واقعی۔ ذہین آپا چائے لے آئیں۔

”تمہاری ماں کا ہم پر بڑا احسان ہے۔“ رمیز کو چائے دیتے ہوئے اماں نے کہا۔

”میں اب پچھتا رہی ہوں کہ تم لوگوں سے رابطہ کیوں نہ رکھا۔ ورنہ شاید ہم پر اتنی مشکلیں نہ آتیں۔“

اماں کا لہجہ اور آواز دکھ سے بھری تھی۔ پچھتاوے۔ چچی نے اماں کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہا۔

”بھابھی! شرمندہ نہ کریں۔ میں کیا میری بساط کیا؟ یہ تو قدرت کی طرف سے اشارے ہوتے ہیں۔ جب اللہ نے چاہا۔“

”پھر بھی مجھے اب بہت پچھتاوا ہے۔ اپنی جہالت، تمہارے چچا کی سادگی۔ چلو اللہ کی یہی مرضی تھی۔ مگر میں نے سب سے تعلق ختم کر کے اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری۔“ ہائے اماں نے کب قبولا جب ابا رہے نہ سرمایہ۔

”چچی.... کیا کہہ رہی ہیں۔ تعلق کبھی ختم نہیں ہوتا۔“ رمیز نے اماں کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”دیکھیں، میں انگلینڈ جانے سے پہلے آپ سے ملنے آیا۔ آج پھر آ گیا۔ تعلق کیسے ختم ہوا۔ اگر ایسا ہوتا۔ تو میری شکل چچا سے کیوں کر ملتی۔“ سب کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

”امن بیٹا! کھانا بھی کھائیں گے یہ لوگ۔“ اماں نے اشارہ کیا۔

چچی نے حسب سابق کہا۔ ”بھابھی! میں لوہاری کی مشہور نہاری لائی ہوں۔ آپ کو بہت پسند تھی نجر کے وقت افتخار بھائی کو برتن دے کر بھیجتی تھی۔ نان بھی ہیں۔ اچھی طرح لپیٹ کر رکھ دو۔ کھانے کے وقت گرم ملیں گے۔ جو کچھ پکا ہے۔ وہ بھی کھائیں گے۔ ڈرائیور کو نہاری اور نان رمیز جا کر دے آئیں گے۔“

امن نے کپڑے میں لپٹے شاپر میں رکھے نان لے کر کہا۔

”جی چچی! میں نے ڈرائیور کو چائے بھی بھیج دی تھی۔“ سمن کچن میں جا کر برتن دھونے لگی۔ ذہین اور امن رمیز کے ساتھ باتوں میں لگ گئیں۔ رہ رہ کر وہاں سے رمیز کے قہقہوں اور ذہین کی ہنسی کی آواز آتی رہی۔ امن نے آ کر دیکھا۔

”ارے تم کیوں برتن دھونے لگیں۔“

”کیوں، میں کیا مہمان ہوں؟ رہنے آئی ہوں۔“

”تمہارا دل لگ گیا؟“

”ہاں لگانا پڑتا ہے۔ مجھے دو تین سال رہنا ہے۔“

”توبہ۔ رمیز بھائی کتنا ہنساتے ہیں۔ اتنے لطیفے یاد ہیں انہیں۔ ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔“

”امن آپی! اماں کو بہت برا لگ رہا ہو گا۔“ سمن نے امن کو ڈرانا چاہا۔

”بعد میں ڈانٹیں گی کہ لڑکے کے ساتھ ٹھی ٹھی ٹھا ٹھا کیوں ہو رہا تھا۔“

”نہیں ڈانٹیں گی۔“ امن کا اطمینان۔ ”چچی سے بہت مرعوب ہیں۔ پتا ہے۔ چچی کے وہ بھائی بھی اکثر

آجاتے ہیں۔ چچی ان کے ساتھ مجھے کپڑے آرڈر کے بھجوا دیتی ہیں۔ وہی آکر لے بھی جاتے ہیں۔ تو اماں نے کبھی اعتراض نہیں کیا۔ میں ہی چائے وغیرہ لے کر ان کے سامنے جاتی ہوں۔" امن نے دھماکہ کردیا۔

سمن دم بخود دیکھتی رہی۔

"امن آپی! اماں کو کیا ہوگیا ہے؟" وہ حیران لہجے میں بولی۔

"ضرورت، مفاد، احساس زیاں سب ہی کچھ۔" امن نے برتن الماری سے نکالے۔

"اور چچی نے سب کچھ بھلا کر ہمارے لیے نئے راستوں کا تعین کیا۔ تمہیں بتاؤں اتنا کام آگیا ہے کہ اب میں نے جاب چھوڑ دی۔ چچی زندہ باد۔"

"اب کیا اماں خوش ہیں؟ لڑتی نہیں۔ ذہین آپا سے۔ تم سے۔"

"ہم میں برداشت، اماں میں تحمل جاگ گیا ہے۔" امن نہاری گرم کرنے لگی۔

"دراصل مسئلہ صرف معاشی زوال نہیں۔ اماں کی ضد اور جہالت ہے۔ مگر اب وہ زمانے کی ہوا کا رخ پہچان چکی ہیں۔ ہم نے بھی عرصے کے بعد امید کی کرنوں کو جگمگاتے دیکھا۔ پہلے کیا تھا۔ بھوک، مشقت، مایوسی، نہ اپنے ہم عمروں کی طرح بے فکری سے کچھ کھایا۔ نہ پہنا۔ سڑک پر بس کا انتظار۔ گھر میں سکون کے منتظر۔

گرمی، دھوپ، بارش اور تنہائی۔ ماموں سے بندھی امیدوں کی ڈور بھی ڈھیلی ہوتے ہوتے تقریباً گھس کر ٹوٹنے لگی۔ تب چچی نے ہمیں سہارا دیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ حالانکہ چچا جب آتے۔ ہر طرح مدد کرتے۔ ہماری فیس، بجلی کے بل، جتنا ہو سکتا تھا۔ اماں اس پر ناراض کہ وہ بھیک دینے آتے ہیں۔

ایک بار جب میں نے کہہ دیا تھا۔ "ماموں تو بھیک بھی نہیں دیتے۔" تو اماں نے مجھے مارا تھا۔ ان کا تعصب، حقیقت سے نظر چرانا۔ پچھتاوے تو اندر اندر پنپ رہے تھے۔"

سمن خاموش رہی۔ اسے علم تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی۔

چچی مختلف مزاج کی ہیں۔ چچا کے ہر معاملے میں ان سے متفق۔ چچا، چچی کی ہر رائے کو اہمیت دیتے۔ ان کے مزاج میں عاجزی تھی۔ اماں کے مزاج فرعونیت سے تعلق رکھتے تھے۔ چچی کو کبھی بھی چچا کے کسی عمل پر شکوہ کرتے نہیں سنا۔

رمیز کے لندن کی یونیورسٹی میں داخلے کے لیے انہوں نے اپنی گاڑی فروخت کردی۔ کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنا۔ سب قناعت پسند تھے۔ اماں کو اس ماحول سے اس لیے بھی دلچسپی نہیں ہوئی کہ وہ اپنی ساس سے صرف سسرال کی، چچا کی برائی ہی سنتی رہیں۔

ابا میں سادگی تھی۔ قابلیت نہ تھی۔ وہ اماں کی تیزی طراری سے ڈر جاتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ دونوں میں چخ چخ کھٹ پٹ بڑھتی گئی۔ حالات بھی سازگار نہ رہے اور ماموں نے بھی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا۔ تب اماں کی آنکھیں کھلیں۔

ذہین آپا کو جس طرح ممانی کے غضب سے ڈر کر غلط قسم کے لوگوں میں بیاہ دیا گیا۔ اس کا انجام ظاہر تھا۔ ملتان میں ابا کی وفات پر چچا آئے تو انہوں نے پھر سے پیش کش کی تھی کہ اب وہ لاہور آکر ہمارے ساتھ رہیں۔

اماں کو میکے کا بڑا غرور تھا۔ چند دن کے بعد سے ممانی سے تلخیاں، دوسرے رشتے داروں کی سرد مہری کا سامنا۔ اماں کی خالہ زاد بہن۔ جن سے اماں کی بہت دوستی تھی۔ وہ بھی دوستی کو خیرباد کہہ کر دیکھتے ہی تیور چڑھا لیتی تھیں۔

سمن نے ایک بار اماں سے کہا۔ وہ ٹال گئیں۔ امن نے یہی سمجھایا۔

"ان کا زیادہ قصور نہیں ہے۔ معمولی رشتے داروں سے لوگ دامن بچاتے ہیں۔ خاص طور پر بیوہ یا یتیم بچوں سے۔ ڈرتے ہیں کہ شاید یہ کچھ مانگنے آئے ہیں۔"

"تمہیں پتا ہے سمن!" امن نے کچھ شرما کر کہا۔ "چچی نے میرے لیے ایک رشتہ تلاش کرلیا ہے۔"

"ہیں؟ مجھے نہیں بتایا چچی نے۔" وہ بے حد حیران ہوئی۔ "کیا لاہور میں؟"

"ہاں، ایک بار آئے تھے وہ لوگ۔۔۔۔ پھر چچی نے بتایا کہ میں پسند کرلی گئی ہوں۔" امن بہت خوش تھی۔ مطلب یہ کہ اسے بھی وہ لوگ پسند آئے تھے۔

"ویسے میں سوچتی ہوں۔ یہ چچی چیز کیا ہیں۔ انہیں ہم سے اچانک ہمدردی کیوں ہوگئی۔ اماں نے ہمیشہ ان کی برائیاں کیں۔ کم از کم تعریف تو کبھی نہیں کی۔"

"جناب! جب سے بدولت نے ان کے گھر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ وہ ہماری گرویدہ ہوگئیں۔ میں سفیر ہوں تم سب کی۔" وہ شوخی سے امن کو دیکھنے لگی۔

"دراصل انہوں نے خراب حالات نہیں دیکھے۔ اگر ہم ان ہی کے ساتھ رہ رہے ہوتے۔ تو ہمیں اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ تھوڑی بہت چپقلش تو ہوتی۔ مزاجوں کے فرق کی وجہ سے۔ مگر چچا ناانصافی نہ کرتے ماموں کی طرح۔ پتا ہے۔ میں اتنی بدگمان تھی۔ جب چچی نے مجھے کپڑے بھیجنے شروع کیے۔ میں نے سوچا، یقیناً" چچی کا بھی کمیشن ہوگا اس میں۔ کوئی اپنے مفاد کے بغیر بھلا کسی کے لیے کیوں زحمت کرے گا۔ مگر خیر اب میں اس طرح نہیں سوچتی۔ کیونکہ مجھے بہت فائدہ ہو رہا ہے۔ ممانی بھی آکر دیکھ گئی ہیں۔ انہوں نے اماں کی خالہ زاد بہن کو بتایا۔ اب ان لوگوں کے فون بھی آتے ہیں۔ مجھے کپڑے بھیجے۔ میں نے انکار کر دیا۔ مصروفیت کا بہانہ کرکے۔ کہہ دیا کہ لاہور کے بوتیک کے آرڈر پورے کرنے ہیں۔ یہ ہے دنیا اور رویے۔"

کھانا لگ گیا تھا۔ اماں اور چچی مذاکرات میں مصروف تھیں۔ یقیناً" امن کی شادی زیر غور تھی۔ رمیز اور ذہین کی گفتگو بھی عروج پر تھی۔ ارسلہ رمیز کی گود میں چڑھی بیٹھی تھی۔ امن نے اسے گھورا۔

"ارسلہ! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ماموں کے کپڑے گندے کروگی؟" اس نے ذہین کو بھی ملامتی نظروں سے دیکھا۔

رمیز نے کہا۔ "ابھی تو میں نے اسے گود لیا ہے۔ فوراً" ہی تم اتارنے آگئیں۔ بھئی اس ننھی پری کو میں نے بیٹی بنا لیا ہے۔"

"آپ اس کا مطلب سمجھتے ہیں؟" امن یک دم سنجیدہ ہوگئی۔

"میں بہت احمق ہوں۔ اس لیے تم ہی سمجھا دو۔" سمن نے دیکھا، اماں اندر آکر ان دونوں کو دیکھ کر ہنس رہی تھیں۔ اسے تو چکر آگیا۔ اماں کی غصے اور بدمزاجی سے اینٹھی ہوئی شکل ہی ہمیشہ دیکھی تھی۔ ہنستا دیکھ کر امن اور سمن دونوں حیران تھیں۔

کھانے کے بعد اماں نے سمن سے کہا۔ "اب تم سب سے مل ملا لیں۔ امن سے رازداری بھی کرلی۔ ایسا کرو کہ تم یاسمین کے ساتھ چلی جاؤ۔ بھائی کچھ دن کے لیے لندن سے آیا ہے۔ مہمانوں کی وجہ سے بہت کام بڑھ جاتا ہے۔ چچی کی مدد کردینا۔ سمجھیں۔"

سمن تعجب سے انہیں دیکھنے لگی۔ عجیب فرمائش تھی۔

"ارے بھابھی! وہ بچاری تو آپ لوگوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے آئی ہے۔"

"ہاں۔ چھٹیوں میں تم سے کچھ سیکھ لے گی۔"

"امی! چچی ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" رمیز نے گفتگو میں حصہ لیا۔ "چچی سے تو سمن نے کچھ سیکھا نہیں۔ پرسوں میں نے کہا۔ دو پیالی چائے بنا دو۔ چائے بعد میں بنی۔ ہاتھ پہلے جلا۔"

ہائے اللہ۔ رمیز بھائی! توبہ، اتفاق سے ہاتھ برنر سے ٹکرا گیا تھا۔ معمولی طور پر جلا تھا۔"

اماں افسردہ ہوگئیں۔

"تم سے سلیقہ ہی نہیں عقل بھی سیکھ لے گی۔ میں تو ناکام ماں ہوں۔ مایوسی کے سوا اور کچھ نہ دیا انہیں۔"

"بھابھی! بہت اچھی بچیاں ہیں آپ کی۔ آپ کی تربیت نے ہی انہیں اتنا سمجھ دار بنایا ہے۔" چچی اماں کو گلے لگائے انہیں تسلی دے رہی تھیں۔

"یاسمین میری تربیت نہیں۔ دنیا، لوگوں کے رویے اور حالات سے سبق لیا ہے۔ ورنہ میرے پاس نہ عقل نہ علم۔ بس! امن کو اپنے جیسا بنا لو۔"

”چچی! ایسا کرتے ہیں کہ چار پانچ دن کے بعد میں آ کر سمن کو لے جاؤں گا۔ ابھی تو وہ آپ سے بھی اچھی طرح نہیں ملی۔“ رمیز کو سمن کی ہونق شکل دیکھ کر ترس آگیا۔

”ہاں اماں! اچھا ہے۔ کچھ میری مدد کر دے گی۔ چچی نے اس بار بہت کام دے دیا ہے۔“

امن کی تجویز بھی رد ہو گئی۔ ذہین نے کہہ دیا کہ چونکہ ان کی چھٹیاں ہیں۔ وہ امن کی مدد کر دیں گی۔ سمن چچی کی مدد کرے۔ سمن کے کان غالباً ”صحیح کام نہیں کر رہے تھے۔ ذہین اور امن کی مدد؟ چچی نے پیش کش کی کہ چند دن بعد وہ خود آکر سمن کو لے جائیں گی، اس پر اماں نے کہا۔

”یاسمین! تم کیوں زحمت کرو گی۔ وہ تمہارا بھائی ہے نا۔ جو قصور آتا رہتا ہے۔ وہ کسی دن آکر لے جائے۔“ سمن کو لگا وہ بے ہوش ہونے والی ہے ’اماں کے وہ شکوک، بدگمانی، شعلہ اگلتی زبان کہیں پھر..... جوش میں آکر..... اس پر الزام لگا دیں تو۔

”چلو پھر، میں چچی کے ساتھ چلی جاتی ہوں۔“ اس نے فیصلہ کر لیا۔ اس طرح وہ ان کے ساتھ ٹیکسی میں جا بیٹھی۔ خاموش اور اداس۔ رمیز نے محسوس کر لیا۔

”امی! شاید سمن جلد بازی میں غلط فیصلہ کر کے پچھتا رہی ہے۔ دیکھیے۔ اداس فاختہ۔“ وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔

”شاید ماموں بھائی کے ساتھ جانے کے ڈر سے۔“

اف رمیز بھائی کے انداز ے۔ کھڑکی کے باہر ٹریفک رواں دواں تھی۔ شور تھا۔ فضا میں پیٹرول کی بُو اور دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شام کی دھند نے پیڑوں اور درختوں کو اپنی سرمئی چادر اڑھا دی تھی۔ سڑک کی لائٹیں جل اٹھیں۔ گھر آگیا تھا۔

عاشی نے اسے دیکھا۔ تو خوشی کی چیخ ماری اور وہیں کھڑے ہو کر ڈانس کرنے لگی۔ چچا نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

”واہ، یہ تو کمال ہو گیا۔ صبح سے عاشی کو مسلسل سمن کہہ رہا ہوں۔ عادت جو پڑ گئی ہے اور عاشی اس بات پر مجھ سے ناراض کہ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔“ انہوں نے چچی سے عاشی کی شکایت کی۔

”ابا! مجھے داد دیں۔ میرے اعزاز میں واپسی ہوئی ہے سمن کی یعنی کہ آپ کے ولی عہد بہادر کے لیے۔ خاطر تواضع کے لیے۔“ وضاحت بھی کی۔

چچا نے رمیز کو گلے لگا کر کہا۔ ”ہاں ولی عہد تو ہو تم۔ اس غریب خانے کے۔“ ”طنزاً“ کہا۔

”بہت اچھا کیا بیٹی! تم آگئیں۔“ انہوں نے سمن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”چچا کی خاطر۔“

”غلط فہمی دور کر لیں۔ ماموں بھائی کے ڈر سے میرے ساتھ آگئیں۔“ سمن کچن میں جا گھسی۔ عاشی سے پوچھ لیا۔ ”کیا پکایا تھا دوپہر میں۔“ وہ نہیں چاہتی تھی کہ عاشی بھی سوال کر کے واپسی کی وجہ معلوم کرے۔

ویسے وہ کافی حد تک اس گھر کے لوگوں کے مزاج سمجھ گئی تھی۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ کسی دوسرے کی جستجو کے بغیر۔ عاشی بھی ویسی ہی تھی۔

رات اسے دیر تک نیند نہیں آئی۔ اماں کس طرح بدل گئیں۔ ان کا وہ اکھڑپن، بدمزاجی، ہر کسی پر شک، بدگمانی، بیٹیوں تک پر شبہ اور چچا چچی سے بھی ہزاروں شکوے۔ کیا بقول امن کے ضرورت اور مفاد، احساس زیاں بھی ہے تو وہ تو مزاج بدل سکتا ہے اور ضرورت پوری ہونے پر کیا پھر پہلا والا مزاج واپس آسکتا ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کے کردار سے ہی مطمئن نہیں تھیں اور اب ایاز کے ساتھ بھیجنے پر تیار۔

ایسی کایا پلٹ۔ اگر چچی کی بروقت امداد کی بدولت تھی تو پہلے بھی چچا چچی کے ساتھ کئی سال گزارے تھے۔ تب ان کی خوبیاں ان کو نظر نہیں آئیں۔ کیوں؟ شاید اس لیے کہ پہلے برے حالات سے سابقہ نہ ہوا تھا۔

آنکھوں پر ساس کی چڑھائی ہوئی بدگمانی اور نفرت کی پٹی چڑھی ہوئی تھی۔ چلو۔ کسی طور انہیں صحیح غلط کا اندازہ تو ہوا۔ ورنہ تو ساری دنیا انہیں غلط ہی نظر آتی تھی۔ ذہین آپا کی طلاق نے مزید آگ لگائی۔ وہ یہی سمجھتی رہیں کہ ابرار کی وجہ سے شادی ختم ہوئی۔ ذہین آپا خود اس قدر پریشان اور دکھی تھیں۔ اوپر سے اماں کی زبان کے تیر دل چھید دیتے۔ وہ برابر کہتی رہیں۔

”کوئی وجہ میری طرف سے نہیں۔ ان لوگوں کی دغا بازی، وعدہ خلافی اور زیادتی کی بدولت سب ختم ہوا ہے۔ میں اس پر شرمندہ نہیں۔ میں نے جو شرط رکھی تھی۔ اس پر عمل کرنا میرا فرض تھا۔ ماں بہنوں کی ذمے داری مجھ پر فرض ہے۔ میں اس سے روگردانی نہیں کر سکتی۔ یہ بات میں نے پہلے ہی طے کر لی تھی۔ سوچا تھا۔ امن تعلیم سے فارغ ہو کر کسی اچھی جاب سے لگ جائے۔ تو میں بھی بری الذمہ ہو جاؤں گی۔ مگر ان لوگوں نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کی کوشش کی۔ کیا میں آپ لوگوں کو پائی پائی کو ترستا دیکھتی۔ اتنی خود غرض نہیں ہوں۔“

مگر اماں کا کہنا ایک لحاظ سے درست تھا کہ گھر بچانے کی ہر ممکن کوشش بھی عورت کا فرض اولین ہے..... خواہ ماں بہن بھوکی بیٹی رہیں۔ مگر ذہین کے شوہر ارشد نے کوئی موقع مفاہمت کا آنے نہیں دیا۔ ذہین آپا بچاری رات رات بھر رو رو کر تکیہ بھگوتیں۔ بچی کی ذمہ داری اس کے اخراجات اماں یہی کہتی رہیں کہ ذہین ابرار کے چکر میں آکر ضد کر بیٹھی اور ابرار صاحب دبئی جا بیٹھے۔ حالانکہ یہ اماں کا وہم اور شک ہی تھا۔ چچا جب آتے۔ اماں کا منہ بگڑ جاتا۔

”یہ دیکھنے آتے ہیں کہ ان سے الگ ہو کر ہم نے کیا پایا۔ کیا کھا پی رہے ہیں۔ مذاق اڑانے آتے ہیں ہمارا۔“

وہ قرض ادھار کر کے چچا کے سامنے بہتر سے بہتر کھانا رکھتیں۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہم اب بھی ان کے محتاج ہیں۔ ”وہ تو چاہتے ہیں کہ ہم فاقے کریں اور ان کے آگے ہاتھ پھیلائیں۔“

چاہے اس قرض ادھار کی وجہ سے گھر والوں کو دو وقت فاقے ہی نہ کرنے پڑیں۔ یا روکھی روٹی سے پیٹ بھریں۔ خواہ بچی کے لیے دودھ نصیب نہ ہو۔ اپنی ضد، شان دکھا کر کس پر احسان ہوتا۔ وہ نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ چچی تو ذہین آپا کی شادی میں آئی تھیں۔ اماں کی طنز بھری باتوں سے گھبرا گئیں۔ پھر نہیں گئیں۔ مگر چچا کے ہاتھ تحفے ضرور بھیجا کرتیں۔

”کپڑے بھیجے ہیں۔ یہاں کیا ہم ننگے رہتے ہیں۔ ان چیلوں کے بغیر کیا ہم زندہ نہیں رہتے۔“

چچا کے جاتے ہی ان کا لیکچر شروع ہو جاتا۔ اپنے بھائی کے خشک اور بے رحم رویے پر خاموش رہتیں۔

”ماموں تو آکر دیکھ جاتے ہیں کہ ہم کس طرح جی رہے ہیں۔“ امن چڑ جاتی۔ ”ہاں بھئی۔ وہ سگے ہیں۔ مگر کبھی رومال تک نہ دیا کہ لو بی بی..... آنسو پونچھ لو۔“ اماں امن کو دو ٹھوکا رسید کرتیں۔ ماموں کا دیا ہر زخم پھول بن کر مہک جاتا۔ زبان سے اماں نے کبھی ماموں پر تنقید نہ کی۔ اب..... وہی اماں وہی چچا چچی اور پچھتاوے۔ ابا کو ورغلا کر اپنا حصہ مانگنے کی ترغیب اماں کی ہی تھی۔

سسرال والوں سے دور جا کر رہنا ان کا خواب تھا پھر، ابا سادہ طبیعت تھے۔ تعلیم کی کمی اور صلاحیت کی کمی، ماں نے لاڈ میں شادی کم عمری میں کر دی۔ اماں ابا سے تین چار سال بڑی تھیں۔ ابا پر خوب رعب جمایا۔ اذیت ناک تجربوں کے بعد آخر عقل آگئی۔

وقت عقل دیتا ہے۔ چھین بھی لیتا ہے۔ تجربے خوشگوار ہو سکتے ہیں۔ تلخ بھی۔ انسان میانہ روی اختیار کر لے تو زیادہ خرابی نہ ہو۔ امن کا رشتہ خوشی کی لہر لے آیا۔ کاش ذہین آپا کو بھی اچھا رشتہ مل جائے۔ ارسلہ کو باپ کی محبت دینے والا۔

صبح دیر سے آنکھ کھلی۔ ناشتہ عاشی نے بنا لیا تھا۔ سمن شرمندہ ہو گئی۔

”چلو ہم ناشتہ کرتے ہیں۔ پھر تم بھائی اور ماموں بھائی کے لیے پراٹھے بنا دینا۔ میں نے تمہارے حصے کا کام رکھ چھوڑا ہے۔ بھائی نہا رہے ہیں۔ ماموں بھائی اخبار میں گم ہیں۔ فرصت سے فائدہ اٹھا لو۔ چائے دانی بھی اٹھاؤ۔“

دونوں میز پر آئیں۔ چچا چچی ناشتہ کر رہے تھے فرید موئد جا چکے تھے۔ سمن پراٹھے بنا کر لائی تو ماموں بھائی اور رمیز موجود تھے۔ ماموں بھائی کچھ پریشان تھے۔ چچی

پوچھ رہی تھیں۔

"تو کیا آج ہی چلے جاؤ گے۔"

"جی' اسی لیے صبح آ گیا۔ ایک ہفتے کی چھٹی ملی ہے۔ آپا! دعا کریں۔"

سمن نے ایاز' رمیز اور چچی کو چائے بنا کر دی۔ ناشتے کے بعد ایاز چلے گئے۔ رمیز ان کی اداسی دور کرنے کے لیے ساتھ ہی چل پڑے۔

"ماموں بھائی! میں آپ کو قصور یاترا کا قصہ سناؤں۔ آپ جاتے ہیں آفس کے کام سے۔ خشک بور کام۔ میں گیا سمن کے گھر۔ جہاں مجھے ملی ایک ننھی پری۔ پیاری' میرا دل چاہا اسے اپنے ساتھ لے آؤں۔ مگر وہ تو اپنی ماں کے بغیر کہیں بھی جانے کو راضی نہیں۔"

"ہاں۔ مجھے بھی بہت پیاری لگی۔ معصوم اور حسین۔" ایاز بھی مسکرائے۔ ان کا موڈ بھی بدل گیا تھا۔ سمن کے لبوں پر تبسم دوڑ گیا۔ ارسلہ اتنی ہی پیاری تھی۔ چچی اب کوئی پرانا سوئٹر ادھیڑ کر گولے بنا رہی تھیں عاشی نے بتایا۔ گولے لچھیاں بنا کر ان کو گرم پانی اور سرف سے دھو کر سکھائیں گی۔ پھر گولے بنیں گے اور موئد فرید کے موزے اور دستانے بُن کر تیار کریں گی۔ ہو سکتا ہے بھائی کے لیے بھی بُن لیں۔" سمن حیرانی سے چچی کو دیکھنے لگی۔ ایسا کام ان کے گھر کبھی ہوتا نہ دیکھا۔

"امی کو دیکھو۔ کیا بے فکری ہے۔" عاشی منمنائی۔ "ساری ذمہ داری سے منہ موڑ لیا۔ یہ ہی بتا دیں کہ کیا پکایا جائے۔"

"میں نے تو کبھی کسی سے نہیں پوچھا۔" چچی اپنی جگہ سے ہی بول پڑیں۔ "جو سمجھ میں آیا۔ بنا لیا۔ اپنی عقل استعمال کرنا سیکھو یا سمن سے پوچھ لو۔ تم سے زیادہ عقل ہے اس میں۔"

عاشی نے بے یقینی سے سمن کو گھورا۔ پھر ہنس پڑی اور عاشی نے سمن کی عقل کے مطابق کھانا پکانا شروع کر دیا۔

"ارے ہاں۔ سنا ہے امن آپی کی شادی ہو رہی ہے۔ چلو خوب ہلا گلا کریں گے اور میں تمہیں ساڑھی پہناؤں گی۔ اچھا کون لوگ ہیں۔"

"پتا نہیں۔" سمن آٹا گوندھ رہی تھی "چچی نے کروائی ہے بات۔"

"ہاں۔" عاشی نے لمبی ٹھنڈی سانس بھر کہا "ہماری امی کا بس چلے تو کوئی لڑکی کنواری نہ رہے۔ ایک بس میں ہی انہیں نظر نہیں آتی۔" کیا دل فگار لہجہ تھا۔ سمن سٹپٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ آواز بھی تو کم نہیں کی تھی۔

"کیا مطلب۔ انہیں تمہاری فکر نہیں؟"

"ہاں نا' نہیں ہے فکر۔ سب کے جوڑے بناتی ہیں۔ میں بچاری لنڈوری۔" یاسیت۔

"بہت فکر ہے میری جان۔" باہر سے چچی نے پچکار کر کہا۔ "تمہارا جوڑ ملے تو ٹانکوں۔" سمن دانتوں میں زبان دبا کر عاشی کو دیکھنے لگی۔ جو ہنس رہی تھی۔

"اسی لیے تو زور سے بولی تھی میں کہ پتا چلے۔ میرا بھی خیال ہے کہ نہیں۔" عاشی نے شرارت سے چہکتے سے کہا۔

"تمہارے لیے تو سب سے اچھا رشتہ تلاش کریں گی چچی۔ تم اکلوتی جو ہو۔"

"واہ..... کیا شان ہے اکلوتی بیٹی کی۔" عاشی ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولی۔ "کچن میں پسینہ پسینہ' مسالوں کی بدبو' جھوٹے برتنوں کے ڈھیر۔ سر دُکھے یا ہاتھ جلے۔"

"عاشی! چچا کوئی ماسی کیوں نہیں رکھ لیتے۔ مطلب یہ کہ۔"

"اس لیے کہ یہ ساری ذمہ داری امی کی ہے اور جب تک بھائی پڑھ کر آ نہیں جاتے۔ ماسی میں ہی رہوں گی۔" چمچہ زور سے پٹخا۔

"اب ایسا بھی نہیں ہے۔ سارے مشکل کام چچی ہی کرتی ہیں۔ میں اور تم تو اب چھٹیوں کو انجوائے کر رہے ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"اچھا' تو تم انجوائے کرو۔" عاشی نے ہاتھ جھاڑے۔ "میں چلی سونے۔" سمن حیرانی سے اسے باہر جاتا دیکھتی رہی۔ عجیب قسم کا غصہ تھا بھئی۔ ماں

کے لیے۔ مگر فوراً" ہی منہ پھلائے پیر پٹختی وہ واپس آئی۔

"امی نے دھکا دے کر اندر کیا ہے۔" سمن کو ہنسی آ گئی۔ عاشی بھی ہنس رہی تھی۔

"دیکھو۔ آج کل بھی وہ کتنے کام کرتی ہیں۔ پہلے تو پورا گھر سنبھالا ہوا تھا۔ ہم کب کچھ کرتے تھے۔ پھر کچھ نہ کچھ چچی آمدنی بڑھانے کی بھی کوشش کرتی ہی تھیں۔ دیکھو نا۔" سمن اس کے بگڑے موڈ کو ٹھیک کرنے کے لیے سمجھا رہی تھی۔

"مجھے معلوم ہے۔ دادی نہ بنو۔ چچی کی چچی۔" منہ پھولا ہی رہا۔ "ایک ماسی آخر کتنا لیتی ہے۔ خود بھی تکلیف اٹھاتی ہیں۔ بھائی کے لیے وہ سب کچھ کرتی ہیں اور بھائی ہی نہیں۔ دوسروں کا بھی خیال رہتا ہے انہیں۔ موئد کے اسکول میں ہفتہ وار لیکچر دینے جاتی ہیں اور اب امن آپی کے آرڈر لینے بوتیک اور اسٹور کے چکر لگاتی ہیں۔ خود تکلیف ہمیں بھی تکلیف' بس ایک مقصد پیسہ کماؤ' پیسہ بچاؤ' لندن کی پڑھائی بہت مہنگی ہے اور ابھی کیا ہے۔ موئد فرید کے لیے بھی کریں گی۔"

"تمہارے لیے بھی کروں گی اور سمن کے لیے بھی۔" چچی مسکراتی اندر آئیں۔ ہاتھ میں ادھڑے اون کی لچھیاں تھیں۔ جو انہوں نے ایک سائڈ پر رکھ کر تسلے میں پانی چولھے پر رکھ کر سرف ڈالا۔

"یہ گرم ہو جائے تو اس میں لچھیاں ڈال کر چولھا بند کر دینا۔ میں جاتی ہوں۔ سلائیاں تلاش کروں۔ آدھے گھنٹے بعد دھو کر ڈوری پر ڈال دینا۔" وہ چلی گئیں۔ عاشی نے سر تھام لیا۔

"لو جی پہلے اون پکاؤ۔ پھر دھو کر سکھاؤ۔"

☼ ☼ ☼

صبح چچی نے بتایا۔ وہ اور رمیز ساہیوال جا رہے ہیں۔ ایاز کی امی ٹھیک نہیں ہیں۔ اس وقت ایاز کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے۔ پریشان ہے بچارا۔ عاشی کو موئد فرید سے پیار سے پیش آنے' موئد فرید کو کمرے میں کچرا نہ پھیلانے' چچا کو رات جلد سو جانے کی نصیحت کے ہار پہنا کر جانے لگیں۔ سمن کو پیار سے چھو کر بولیں۔

"تم سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ شاید ہمیں کئی دن لگ جائیں۔ چچا سے سودے کے پیسے لے لینا۔ اشرف کو بتانا' وہ لا دے گا۔" اشرف پڑوسیوں کا نوکر تھا۔

رمیز نے دروازے کے پاس سمن کے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔ "تم کیوں اداس ہو؟ میں جلدی آ جاؤں گا۔"

سمن حق دق ہو کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ لو اور سنو' وہ اداس کیوں ہوتی۔

"وہاں سے آ کر قصور لے جاؤں گا ٹھیک؟"

دو تین دن انہوں نے خوب تجربے کیے۔ چائنیز کھانا' سبزی چاول' سوپ' حلوہ نہ جانے کیا کیا بنایا اور سب کو بہت مزا آیا۔ موئد فرید کو بھی اور چچا کو بھی۔

چوتھے دن چچی رمیز اور ایاز کے ساتھ آ گئیں۔ ایاز کی امی فوت ہو گئی تھیں۔ کافی دیر سب لاؤنج میں بیٹھے افسوس کا اظہار کرتے رہے۔ ایاز بہت افسردہ اور کمزور بھی لگے۔ بالکل اکیلے رہ گئے۔ نہ کوئی بھائی نہ بہن۔ بے چارے۔ ایاز کو دو دن چچا نے روک لیا۔ پھر وہ چلے گئے۔ رمیز نے سمن سے پوچھا۔ "چلتی ہو قصور؟"

"ہائیں! تم قصور کیوں جاؤ گے؟" چچی نے پوچھا۔

"امی! ماموں بھائی بہت اپ سیٹ ہیں۔ میں رات کو ان کے گھر جا کر سوؤں گا۔ پھر صبح انہیں قصور جانا ہے۔ میں ان کے ساتھ قصور چلا جاؤں گا۔ جتنی دیر وہ آفس میں رہیں گے۔ میں چچی کے گھر۔ اس لیے سمن سے کہا۔ جانا ہے تو تیار رہے۔"

"ہاں' مگر نہیں۔ بھابھی ایک دو دن میں امن کے سلسلے میں آنے والی ہیں۔ ان کے ساتھ چلی جائے گی۔"

چچی نے بتایا۔ سمن نے سر ہلا دیا۔ رمیز رات کو ایاز کے پاس چلے گئے۔ اگلے دن دونوں قصور سے آ گئے۔ ایاز نے خود کو کافی سنبھال لیا تھا۔ دو تین دن بعد اماں

آئیں۔ مگر اسے لے کر نہیں گئیں۔

"رمیز کے جانے کے بعد آجانا۔ یہ لوگ تمہارا اتنا خیال کر رہے ہیں۔ تمہارا بھی کوئی فرض ہے کہ نہیں؟" اماں کو نہ جانے بھولے بھٹکے کتنے فرائض یاد آرہے تھے۔

"میں امن آپی کے ساتھ کچھ تیاری کروالیتی۔" وہ منمنا کر رہ گئی۔

رمیز کے جانے میں تھوڑے دن رہ گئے تھے۔ چچی تو خاصی مطمئن تھیں۔ چچا اداس ہو رہے تھے۔ رمیز بھائی ان کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دینے لگے۔

"ابا! آپ پریشان نہ ہوں۔ میں واپس آکر آپ کو خوش کر دوں گا۔ پھر میں اور آپ شطرنج کھیلا کریں گے۔" چچا ہنس پڑے۔

انہیں شطرنج بالکل پسند نہ تھی۔ افیموں کا کھیل، جبکہ رمیز اور ایاز اکثر شطرنج کی بساط بچھا کر سر جھکائے چال چلنے میں گھنٹوں سوچ بچار کرتے۔ ایک بار رمیز نے کہا۔

"ابا! یہ بادشاہوں کا میدان جنگ ہے۔ بہادری یا تیغ تلوار کے بجائے تدبر سے دشمن کو زیر کرنے کی کوشش۔"

چچا سے بحث کرنے لگے۔ رمیز ان سے ہار گئے۔ تھک کر بولے۔ "سمن! چلو ہاتھ جلاؤ۔ میرا مطلب ہے دو کپ چائے بناؤ۔" وہ کئی دفعہ اس کی نادانی کا مذاق اڑا چکے تھے۔

"واہ! میری بیٹی اتنی اناڑی نہیں ہے۔" چچا حمایت میں بولے۔ "تم لوگ ساہیوال گئے تھے۔ تو کیا مزیدار کھانے پکائے کہ واہ وا۔"

"یعنی کیا مطلب کہ پیر بھی جلائے۔" وہ جھک کر اس کے پیر دیکھنے لگے۔ چچی کو موقع مل گیا۔ فوراً" سمن کی تعریف میں لگ گئیں۔

"جہاں جائے گی گھر کو جنت بنا دے گی۔ بہت سلیقہ شعار ہے۔"

"امی! ہمارے گھر کو جنت بنا دیا کیا؟" انہوں نے آہستہ سے کہا۔ چچی ہنس دیں۔

اس میں شک نہیں کہ رمیز سے گھر میں رونق تھی۔ وہ سب کے ساتھ بہت محبت سے پیش آتے۔ موئد فرید کی لڑائیاں ختم ہو گئیں۔ بہت فرماں بردار ہو گئے تھے بھائی کے۔ عاشی نے بھی انہیں ڈانٹنا کم کر دیا تھا۔ رمیز اکثر عاشی سے سرگوشیاں کرتے پائے جاتے۔ سمن کے پاس آتے ہی دونوں چپ، سمن کو عجیب سا لگتا۔ عاشی سے پوچھا تو وہ بڑی رازداری سے بولی۔

"بھائی کا راز، میں افشا نہیں کروں گی۔ وعدہ کر چکی ہوں۔" نہ جانے وہ کون سا راز تھا۔ شاید لندن میں کوئی لڑکی۔ یقیناً" یہی بات ہے۔ مگر وہ کیوں بے چین ہو گئی۔ ماتھے پر پسینہ آگیا۔

"امی! بس ایک سال، صرف ایک سال۔ میں ان شاء اللہ آپ کے لیے خوش خبری بھی لاؤں گا۔ اکیلا نہیں، بہترین جاب کے ساتھ آؤں گا اور آپ کو خوب ستاؤں گا۔ اچھے اچھے کھانوں کی فرمائش کے لیے۔ کیا خیال ہے۔ سمن کو اچھی طرح سکھا دیں۔"

"واہ جی اور مجھے؟ بھائی! یہ ناانصافی ہے۔" عاشی نے شور مچایا۔

"جنابہ بہن صاحبہ! آپ کے لیے ایک اعلا درجے کا تحفہ لاؤں گا۔ بہترین کوالٹی کا دولہا۔" عاشی منہ بنا کر رہ گئی۔ رمیز کی روانگی کے وقت سب اداس تھے۔

"اور سمن کے لیے کیا لائیں گے بھائی؟"

"اس کے لیے۔۔۔۔ میں خود آجاؤں گا۔" رمیز نے چپکے سے کہا۔ "ٹھیک ہے؟" سمن ہٹ گئی۔ عاشی شوخی سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔ یاد رکھیے گا۔"

وہ اندر جا رہے تھے اور سمن ان کی پیٹھ دیکھ رہی تھی۔ یہ کیا کہہ گئے رمیز بھائی اتنی ناسمجھ بھی نہ تھی کہ لہجہ نہ پہچانتی۔ مگر کبھی بھی کچھ ان کی طرف سے اظہار ہی نہیں ہوا تھا۔ کم از کم چچی کو تو، یہ جاتے جاتے کس بندھن میں باندھ گئے رمیز بھائی۔

وہ ایئرپورٹ سے سب کے ساتھ آتو گئی۔ مگر لگتا تھا سماعت وہیں چھوڑ آئی ہے سوائے عاشی کے کسی نے

محسوس نہیں کیا۔

✡ ✡ ✡

پھر وہ قصور آگئی۔ چچی کچھ آرڈر اور بھی لائی تھیں اور مکمل کیا ہوا سامان لے گئیں۔

امن بے حد مصروف تھی۔ وہ چاہتی تھی شادی سے پہلے اتنا تو پیسہ کما لے کہ اپنی پسند کی کچھ چیزیں لے سکے۔ وہ آرڈر کے کپڑوں میں منہمک رہتی۔ ذہین آپا امن کے کپڑے سیتی رہتیں۔

سمن نے کچن سنبھال لیا تاکہ ذہین آپا کو مدد ملے۔ گھر کے حالات خاصے بہتر ہو گئے تھے۔ اماں کا مزاج بالکل نارمل تھا۔ ممانی آگئیں۔ امن نے آرڈر کے کپڑے لپیٹ کر اندر رکھے اور کچن میں جا گھسی گو کہ ممانی کو امن کی مصروفیت کا علم تو تھا۔ مگر اماں کی تاکید تھی کہ کسی کو کچھ دکھانے کی ضرورت نہیں۔ نظر بد کا اندیشہ ہے۔

ممانی ذہین کے سیے کپڑے دیکھ کر تعریف کرنے لگیں۔ "درزی سے بھی زیادہ اچھے کپڑے ہیں۔" پھر وہ سمن سے پوچھنے لگیں۔

"لاہور میں کون کون ہے۔ کہاں رہتی ہو۔ کھانا کون پکاتا ہے؟"

سمن نے رمیز کے ذکر کے بغیر سب سچ سچ بتا دیا۔

"چچی کھانا خود بناتی ہیں۔ میں اور عاشی باری باری شام کی چائے بنا لیتے ہیں۔ کپڑے سب اپنے خود دھوتے ہیں۔ سوائے چچا کے۔ ان کے کپڑے لانڈری سے دھل کر آتے تھے۔" ممانی بھنویں اچکاتی رہیں۔ پھر ان کا چھوٹا بیٹا آگیا۔ کھوجتی نظروں سے ہر طرف دیکھتا رہا۔

برآمدے میں چار بید کی کرسیاں اور میز، بیٹھک میں سیکنڈ ہینڈ صوفہ نیا اضافہ کافی عرصہ بعد ممانی آئی تھیں چائے پی کر، سمن کے ہاتھ کے رول اور نمک پارے کھا کر چلی گئیں۔ تو حسب توقع ماموں آگئے۔ کھوج، آتے ہی بیٹے کی دبئی کی کمائی چھوٹے کی بے روزگاری کے بعد سوال کر لیا۔

"امن نے نوکری چھوڑ دی۔ کیوں؟ کچھ کمائی ہو جاتی تھی۔ کیا کوئی دوسری جاب مل گئی ہے۔"

اماں نے بتا دیا۔ "لاہور کی بوتیک کے لیے کام کر رہی ہے۔ گھر بیٹھے کام کر لیتی ہے۔"

ماموں ممانی کی ہدایت کے مطابق سوال کرنے لگے۔ بتانا پڑا کہ اسکول کی تنخواہ سے دس گنا زیادہ معاوضہ ملتا ہے۔ یاسمین کی بہن کا بوتیک ہے۔ وہ آرڈر کے مطابق کپڑا اور ڈیزائن بھیج دیتی ہیں۔ خود منگوا لیتی ہیں۔ ایاز کا ذکر نہیں کیا۔ امن کی نسبت طے ہونے کا ذکر کیا۔ بہت خوش ہوئے۔

"شادی کے لیے جس چیز کی ضرورت ہو، مجھے بتانا۔" انہوں نے امن سے کہا۔ امن بہت متاثر ہوئی۔ بھیگی آواز میں بولی۔

"ماموں! آپ کی محبت اور دعاؤں کی ضرورت ہے مجھے۔"

"بیٹا! افسوس میں تم لوگوں کے لیے کچھ کر نہیں سکا۔" افسردہ ہو گئے۔ شاید اب محبت بیدار ہو گئی۔ احساس جاگ گیا۔

"ہاں۔ وہ تمہاری ممانی کہہ رہی تھیں۔ سمن نے بہت لذیذ رول اور نمک پارے کھلائے تھے۔ بھئی ہمیں بھی چکھاؤ۔"

سمن فوراً" چائے اور رول لے آئی۔ انہوں نے بھی بہت تعریف کی۔ سو روپے انعام کے دیے۔ جو اس نے امن کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے لے لیے۔ ماموں ادھر ادھر دیکھتے رہے۔ کچھ سوچ میں گم پھر بولے۔

"ہاں۔ وہ عرشیہ نے کہا ہے۔ سمن اچھی ہے۔ سالار کو جوں ہی کام ملا۔ ہم منگنی کر لیں گے۔ ابھی تو تمہارے کان میں بات ڈالنے کے لیے آیا ہوں۔" سب ہکا بکا ہو گئے۔ سمن کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پھر اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔

"ماموں، میں؟ نہ ذہین آپا جیسی حسین نہ ان جتنی قابل، نہیں ماموں! یہ ممکن نہیں۔ آپ ممانی کو بتا دیں۔"

ماموں کا رنگ اڑ گیا۔ خلاف توقع جواب خود لڑکی کی طرف سے۔

"بس بیٹا! نصیبوں کی بات ہے۔ ذہین کی جہاں قسمت تھی۔ وہیں..... ہم نے تو..... بڑے خلوص سے" وہ گڑبڑا گئے۔

"تو ماموں! ذہین آپا تو اب بھی..... آپ چاہیں تو پھر یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔" امن نے ماموں کے سامنے آ کر کہا۔ ماموں مزید گڑبڑائے۔

"نہیں۔ اب تو مشکل ہے۔ دیکھو..... سمن کی بات اور ہے۔ اپنوں کی بات....."

اماں سوچتے ہوئے بولیں۔ "ابھی تو پڑھ رہی ہے۔ پھر سوچ کر جواب دوں گی۔"

"نہیں اماں! اب یہ ممکن نہیں۔" امن نے سر اٹھا کر کہا۔ "ماموں! جب ایک بہن کو ریجیکٹ کیا گیا۔ تو دوسری کا بھی نہیں ہو سکتا۔" ماموں چپ چاپ چلے گئے۔ بعد میں اماں نے امن کو خوب لتاڑا۔ حسب توقع۔

"کمبختو! کہاں ٹپکے جا رہے ہیں رشتے۔ کہہ دیا۔ یہ ممکن نہیں۔ ارے اس طرح ٹکا سا جواب دیا جاتا ہے؟"

"ہاں اور ابرار بھائی کے کہنے پر آپ ماموں سے بات کرنے گئی تھیں۔ ان کا ٹکا سا جواب سن کر روتی ہوئی آ گئیں۔ میں نے کہا بھی تھا۔ یہ سوال تو ماموں کی طرف سے ہونا چاہیے۔ آپ نے کہا۔ واہ میرا بھائی ہے۔ ہم کوئی الگ تو نہیں اور بھائی نے کیا جواب دیا۔ ہمیں رشتہ کرنا ہوتا تو ہم خود تمہارے پاس آ کر تم سے رشتہ طلب کرتے۔ تم نے تو حد کر دی۔ بیٹی کو قابو میں رکھو۔ اماں، کتنا تکلیف دہ۔ اذیت ناک، بلکہ شرمناک جواب دیا تھا آپ کے بھائی نے۔ کتنے دن ہم منہ چھپائے بیٹھے رہے۔ آپ کی بے عزتی پر۔" امن رونے لگی۔

"ہم تو وہی ہیں اماں! اور آپ بھی وہی۔ بدلا تو کچھ نہیں پھر سمن کیا کہیں کی شہزادی ہے۔ جو اپنے نکھٹو، بد دماغ بیٹے کا رشتہ لے کر آ گئے۔" ذہین بول اٹھی۔ "اماں کو سخت غصہ آیا۔

"ہاں تو، تم کب چاہو گی کہ جہاں تمہاری شادی نہ ہو سکی۔ وہاں سمن کی ہو۔ تمہارے تو آگ لگ گئی ہو گی۔" اماں پرانی جون میں آ چکی تھیں۔

"میں تو کچھ نہیں بولی اماں!" ذہین آپا نرم لہجے میں بات کر رہی تھیں۔ "سمن نے خود ہی جواب دیا ہے۔ مگر افسوس آپ ابھی تک ممانی کی ذہنیت نہیں سمجھ سکیں۔ ہمیں انتظار کی سولی پر لٹکا کر ہمارا تماشا دیکھیں گی۔ آپ کو جب پتا چلے گا۔ جب سالار کی شادی کا کارڈ ملے گا اور وہ صاف انکاری ہو جائیں گی کہ انہوں نے ماموں کو بھیجا تھا۔ خود آئی تھیں تو کیوں نہ بولیں۔ ماموں کو جھٹلانا آسان ہے۔ اس لیے ہم سمن کی اچھی جگہ کریں گے ان شاء اللہ۔"

"ہاں، یہاں تو رشتوں کی لائن لگی ہے جیسے۔ درختوں پر لٹک رہے ہیں۔ جو مرضی توڑ لو۔"

"اماں! آپ کیوں دل برا کر رہی ہیں۔ ہو جائے گا اس کا۔ ابھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" امن نے دیر تک سمجھایا۔ انہیں ٹھنڈا کرنے کے لیے کہہ دیا۔ "چچی میرے لیے کر سکتی ہیں۔ تو سمن کی فکر کیوں نہیں کریں گی۔ آپ اللہ پر بھروسا تو کریں۔"

اماں سمن کو ٹیڑھی ترچھی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ سمن ڈر کر کمرے میں جا چھپی۔

☼ ☼ ☼

اتفاق سے اگلے دن چچی کا فون آ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ذہین کے لیے بھی مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں۔ اماں نے سمن کی خودسری کا بتایا۔ چچی ہنسنے لگیں۔

"ارے، ابھی اس کا ذکر نہ کریں۔ پڑھائی مکمل ہو جائے تو اللہ کے فضل سے کوئی اچھا رشتہ ضرور مل جائے گا۔ فکر نہ کریں۔ ہماری بچیاں لاکھوں میں ایک ہیں۔ پڑھنے دیں اسے۔"

اماں کو کچھ اطمینان تو ہوا۔ سمن کی جان میں جان آئی۔ چھٹیوں کے ختم ہونے میں ابھی ایک ہفتہ تھا کہ چچی آ گئیں۔ عاشی کی نسبت طے ہو گئی تھی۔ واہ۔ یہ عاشی تو بڑی تیز نکلی۔ سمن چچی کے ساتھ لاہور آ گئی۔ گھر میں خاصا جوش و خروش تھا۔ مؤید فرید کے دوست آتے۔ اور ڈانس گانے ڈھولک کے پروگرام بناتے۔ عاشی مگر نا خوش اسے شادی کی جلدی نہیں تھی۔

"جلدی؟ جب اچھا رشتہ آ جائے تو اسے رد کرنا کفران نعمت ہوتا ہے۔" سمن نے سمجھایا۔

"اور دادی اماں! کیا دو سال بعد مجھے اچھا رشتہ نہ ملتا۔ یا پھر ان ہی لوگوں سے کہہ کر دو سال کی مہلت لے لی جاتی۔ مگر امی کو تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا شوق ہے۔"

"دو سال، دو سال بعد کون آ رہا ہے۔ یا کیا ہونے والا ہے؟" وہ چونکی۔

"بھئی بھائی مجھ سے کئی سال بڑے ہیں۔ ان کی پہلے ہونی چاہیے تھی۔"

"ہاں، یہ تو اصول کی بات ہے۔" سمن نے گردن ہلائی۔

"تو یہ اصول کی بات تم اپنی چچی کو بھی بتا دو۔"

"ہائے اللہ میں بتا دوں؟ تم نے خود کیوں نہیں کہا۔"

"کہا تھا۔ بولیں پہلے وہ اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جائے۔ اس کی کمائی کھا لیں۔ وہ اپنے اور اپنی بیوی کے اخراجات کے لیے ہمارا احتیاج نہ رہے۔ پھر۔"

"پہلے تو تم کو شکوہ تھا کہ چچی سب کی شادیاں کراتی ہیں۔ تمہاری فکر نہیں تو۔"

"پرانی بات ہے۔ اب میں چاہتی ہوں۔ میں بھائی کی شادی میں خوب ہلا گلا کروں۔ بھابھی کو سجاؤں۔ سنواروں۔ اب میں امریکہ چلی گئی۔ تو پتا نہیں آ سکوں یا نہیں۔"

"ہائیں! بھائی کی شادی میں آنے سے کون روکے گا نہیں؟"

"روکے گا نہیں، میں خود رکوں گی۔ اگر بھائی کی شادی ایک سال کے اندر ہوئی۔ تو میں ایک سال کے اندر کیسے آ سکوں گی۔ بجٹ فیل ہو جائے گا میرا۔"

سمن کو یاد آیا۔ آخر چچی کی بیٹی ہے۔ بچت، کفایت، دل پر جبر کرنا یہی کچھ اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ یہی سیکھا ہے۔ وہ عاشی کو ابھی سمجھ نہیں سکی۔ کیا وہ اتنی صابر ہے؟

"اوہو۔ تم کیوں حیران ہو۔ اصل میں امریکہ جا کر جلدی تو نہیں آ سکتی۔ سسرال والے کیا سوچیں گے کہ مجھے قدر نہیں۔ بھئی اب قدر دان تو ہوں میں۔ سسرال جا کر ان ہی کے اشاروں پر چلنا ہو گا۔ وہ کہیں گے بیٹھو۔ میں بیٹھ جاؤں گی۔ انہوں نے کہا۔ کھڑی ہو جاؤ، میں کھڑی کی کھڑی ہائے۔ ان کی مرضی سے آؤ۔ ان کی مرضی جاؤ۔"

"ہائے..... اتنی فرماں برداری۔" سمن کپکپا گئی۔

"تو اور کیا۔ سسرال کوئی مذاق ہے؟ یاد رکھو۔ وہی زندگی کامیاب ہوتی ہے۔ جہاں ایک دوسرے کی خواہش کا احترام کیا جائے۔ قدر کی جائے۔ سسرال والوں کی عزت۔ تعاون اور محبت کی جائے۔ یہ ہیں ہماری امی کے اقوال زریں۔ سنہری اصول۔" عاشی ہنس دی۔

سمن اب سمجھی۔ وہ مذاق کر رہی تھی۔ مگر وہ اس پر عمل ضرور کرے گی سنجیدگی سے۔ کیونکہ اس نے یہی دیکھا۔ یہی سیکھا تھا۔ وہ چچی کی اور بھی قدر داں ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

شادی میں ابھی دیر تھی۔ امتحان کے بعد۔ مگر گھر میں رنگ و روغن اور دوسری تیاری بھی شروع ہو گئی۔ ماموں بھائی روز آتے۔ انہیں وقفے وقفے سے چائے بنا کر دینا سمن کی ذمہ داری تھی۔ وہ چائے پی کر کہتے۔ "اچھی ہے بہت اچھی ہے۔"

اور عاشی منہ دبا کر ہنستی سمن چڑ جاتی "کیوں ہنستی ہو تم؟"

"کیونکہ ماموں بھائی تم سے ڈرتے ہیں۔ تمہاری تعریف کے بہانے چائے کی تعریف کرتے ہیں۔"

"نہیں، وہ چائے کی ہی تعریف کرتے ہیں۔"

"جی نہیں، وہ زبان سے آدھی تعریف باقی دل میں

کہتے ہیں۔ اچھی بچی ہے ہم کی بچی ہے۔"
اس دن ماموں بھائی بہت خوش تھے۔ گنگنا رہے تھے۔ ماں کی وفات کے بعد بہت افسردہ رہنے لگے تھے۔ مگر آج خوش نظر آئے۔ خود ہی بتانے لگے۔
"میری خالہ آرہی ہیں۔"
"اچھا؟ فوزیہ آپا آرہی ہیں۔ خیر تو ہے۔ بلکہ خدا خیر کرے۔" عاشی بعد میں ہنس دی۔
"بھئی۔ وہ کیا خوفناک چیز ہیں؟ جو تم کو خیریت مطلوب ہے۔"
"نہیں، وہ تو انتہائی دلچسپ ہستی ہیں۔ ہنسی کا گول گپا ہیں۔ کس مقصد سے آرہی ہیں؟"
"کیا بغیر مقصد کے کوئی رشتے دار نہیں آسکتا؟"
"بحث نہ کریں ماموں بھائی! بتادیں آپ کے لیے کوئی لڑکی۔ گھر بسانے کے لیے۔"
"بھانجی بہت تیز ہو تم، ہاں یہی بات ہے۔"
"اچھا تو کون ہے وہ۔ آپ نے یقیناً اسے پسند کر لیا ہوگا۔" وہ مسکرائے۔ "ہاں، نہیں ابھی صرف دیکھا ہے۔ پسند خالہ کریں گی۔"
"ماموں بھائی! پھر تو اچھا ہوگا کہ آپ عاشی کی شادی کے دنوں میں ہی اپنی دلہن بھی لے آئیں۔ واہ۔" ثمن بے ساختہ بول پڑی۔
وہ چچی کو اپنی خالہ کی آمد کا بتا کر چلے گئے۔ چلتے چلتے ثمن سے کہنے لگے۔
"تم مجھے ماموں بھائی نہ کہا کرو۔"
"اچھا تو نانا ماموں کہوں۔" ثمن پھر ہنس دی۔ وہ مسکرائے اور چلے گئے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن خالہ آگئیں۔ بہت دلچسپ چیز۔ گول مول ہنسی کا گول گپا۔ چلتی تھیں تو لگتا تھا لڑھک رہی ہیں۔ ہنستی تھیں تو پیٹ زیادہ ہلتا تھا۔ سانس لینے میں حلق سے کئی آوازیں برآمد ہوتیں۔ بات کرتیں تو ہر جملے کے آخر میں کھانسی آجاتی۔ چچی نے فوراً کہا۔
"فوزیہ! ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ کسی بیماری کو معمولی نہ سمجھنا چاہیے۔ ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔"
"تو خالہ! میں بیمار تو نہیں ہوں۔" کھانسی۔
"تو یہ کھانسی۔ ہر بات کے آخر میں۔"
"یہ تو میری گردن موٹی ہے اس لیے۔" پھر کھانسی۔
"تم پوری گوشت کا پہاڑ بن گئی ہو۔ خدا کے لیے رحم کرو خود پر۔"
"سارے ٹوٹکے آزما چکی۔ آپ بھی بتادیں۔ کر لوں گی۔" دو کھانسی۔
"بھئی۔ ڈائٹنگ چارٹ آزماؤ۔ ڈاکٹر کے مشورے سے۔ پیٹ مشک بن چکا ہے۔"
"لو جی۔ اب میں غیر مردوے کو اپنا پیٹ دکھاؤں۔" کھانسی۔ تھل تھل کر کے ہنسی۔
"ساہیوال میں لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے؟ اور وہ کھانے کی ضرورت کیا۔ میلوں سے نظر آجاؤ گی۔ فوزیہ کل میں تمہیں لے چلوں گی ڈاکٹر کے پاس۔"
مگر وہ ڈاکٹر سے شاید ڈرتی تھیں۔ چچی نے انہیں چارٹ بنا کر دیا۔ پڑھ کر خوب ہنسیں۔ سارا جسم ہنسا۔ عاشی پکڑ نہ لیتی تو کرسی سے نیچے لڑھک جاتیں۔
"ہائے خالہ! میں تو بھوک سے مر جاؤں گی۔ ایک وقت کھانا نہ کھاؤں تو دو دن بستر سے نہیں اٹھ سکتی۔ آپ نے روٹی چاول بند کر دیے۔ گھاس پھوس پر کب تک گزارا ہوگا۔ توبہ سبزی وہ بھی کچی۔ میں کیا بکری ہوں۔"
کھانسی، کھانسی۔ عاشی اور ثمن ہنس رہی تھیں۔ چچی انہیں گھور رہی تھیں غصہ اور ملامت کی نظر سے اور وہ چارٹ پڑھ کر عجیب شکلیں بنا رہی تھیں۔ پھر چارٹ وہیں چھوڑ کر اٹھیں اور ماموں بھائی کے لائے ہوئے گول گپوں پر ٹوٹ پڑیں۔ معلوم ہوا کہ ان کی فرمائش پر آئے ہیں۔
پھر درجن بھر نہیں تو آدھے درجن کیلے کھا کر سو گئیں۔ انہیں تو رات ہو رہی تھی۔ جمائی لے کر پوچھا۔ "خالہ! کیا پکایا ہے۔ بھوک لگی ہے۔"
سبزی، گوشت، دال چاول، معمول کا کھانا تھا۔

مقدار البتہ زیادہ تھی۔ مگر فوزیہ آپا کو یہ آئٹم زیادہ پسند نہیں آیا۔ سالن روٹی سے فارغ ہو کر دال چاول اچار کے ساتھ کھاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر پیالہ بھر کر سویاں کھائیں۔ آخر میں آم کھاتے ہوئے بولیں۔
"اے لڑکیو! کھاؤ۔ مجھ سے تکلف نہ کرو۔ میں بھی تکلف نہیں کرتی اے بھئی۔ آدمی دنیا میں آیا کس لیے ہے۔ کھانے پینے۔ اللہ نے یہ نعمتیں ہمارے لیے اتاری ہیں۔" آم کی طرف اشارہ کیا اور چوتھے آم کی طرف لپکیں۔ اس سے پہلے ہی چچی نے پلیٹ اٹھا کر عاشی کو دی۔
"لو یہ آم چھیل کر کاٹ کر اپنے ابا کو دے آؤ۔"
فوزیہ آپا کو یہ حرکت پسند نہیں آئی۔ بولیں۔
"لاؤ میں چھیلتی ہوں۔ اور آم لے آؤ۔ سب کے لیے کاٹ دوں گی۔" کھانسی۔
"نہیں، بس ٹھیک ہے۔" چچی نے کہا اور اشارہ کیا کہ برتن اٹھالو۔
"خالہ! بچیوں کو کھانا ختم کرنے دیں۔ ابھی تو ان کا پیٹ بھی نہیں بھرا ہوگا۔" کھانسی۔
"نہیں فوزیہ آپا! ہم نے کھا لیا ہے۔" عاشی برتن سمیٹنے لگی۔
"لو اتنا سا۔ تب ہی تو اتنی سوکھی کانگڑی ہو۔ کمزوری ہے۔ کیا واقعی تم اتنا کم کھاتی ہو۔"
"جی کافی ہے۔"
"تب ہی یہ حال ہے۔ بھئی ہمیں تو صحت مند لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔" کھانسی۔
"فوزیہ آپا۔ آپ کو امی نے کھانے سے روک دیا۔ آپ اور کھالیں۔" فوزیہ آپا پیٹ پکڑ کر ہنسنے لگیں۔ بولیں
"میں برا نہیں مانتی۔ خالہ نے میری ڈائٹنگ شروع کروا دی ہے۔" کھانسی، کھانسی۔
ثمن اور عاشی کو ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ ان کے کھانے کی رفتار اور مقدار سے پہلے ہی حیران ہو چکی تھیں۔ اگلے دن ایاز ماموں بھائی کھانے پر موجود تھے۔ اپنی خالہ کی پلیٹ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔
"خالہ! یہ پلیٹ میں ساری چیزیں اناپ شناپ کیوں بھرے جا رہی ہیں۔"
"کھانے کے لیے۔" بے فکری۔
"آپ کیا؟ کتنے دن کے فاقے سے ہیں آپ۔ رحم کریں میرے بچارے خالو پر۔"
"خالو؟ یہ انصار بھائی یعنی انصار خالو؟"
"وہ نہیں۔ سلیم خالو۔ آپ کے واحد شوہر، میرے اکلوتے خالو۔ جن کی آپ اکلوتی بیوی ہیں۔ رحم کریں خود پر۔ بیمار ہو گئیں تو بدنام میں ہو جاؤں گا۔"
"اللہ نہ کرے۔ اب باتوں میں لگا کر مجھے کھانے سے نہ روک۔ اتنے مزے کے کوفتے شلجم ہیں۔ شب دیگ کہتے ہیں اس کو۔ کھاؤ۔ ثمن نے بنایا ہے۔ خالہ کہہ رہی ہیں۔"
"تو..... ثمن نے سویٹ ڈش بھی بنائی ہے اور ثمن بیسن کا حلوہ بہت مزے کا بناتی ہے۔ اس کی باری کب آئے گی؟ لو اس میں گاجر میتھی اور دال چاول بھر لیے۔ اف ختم کریں گی؟"
"ہاں، یہ ختم کر کے حلوہ کھاؤں گی۔" کھانسی۔
"حلوہ انتظار نہیں کرے گا۔ ختم ہو جائے گا۔"
"ہائیں جادو کا ہے۔ خود بخود ختم کیسے ہوگا؟" منہ میں پورا سالم کوفتہ بھر لیا۔
"جس طرح آپ کوفتوں کا قلع قمع کر رہی ہیں۔ شلجم کے ٹکڑوں کا پہاڑ بنا رہی ہیں۔ اس پہاڑ کو سر کرنا' کے ٹو سر کرنے کے برابر ہے۔ چلیے حلوہ چکھیں۔" چچی سر تھامے ان کے "دی اینڈ" کی منتظر بیٹھی تھیں۔
دو دن رہ کر چلی گئیں۔ سب نے سکھ کا سانس لیا۔ نہ وہ کسی لڑکی کو دیکھنے کے لیے گئیں۔ نہ ان سے ملنے کوئی آیا۔
دراصل انہیں کھانے کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا۔ پتا نہیں رشتہ کرانے آئی تھیں یا بھوک مٹانے۔ ایاز ماموں بھائی بعد میں صفائی دیتے رہے کہ اپنے گھر میں اتنا نہیں کھاتی تھیں۔ دراصل بہت بدمزا پکاتی ہیں۔ کہیں جا کر لذت کام و دہن سے مستفید ہوتی ہیں۔ مگر چچی کا خیال تھا۔ بھوک بیماری کی

صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس کا علاج ہونا چاہیے۔ عاشی، ثمن پڑھائی میں غرق تھیں۔

☼ ☼ ☼

تیاری تو دونوں نے کی تھی۔ اب امتحان سر پر تھے۔ عاشی کو شادی کے امتحان کی بھی فکر تھی۔ بارے امتحان ختم ہوئے اور دونوں رات دن سونے میں لگ گئیں۔ دونوں کا مقابلہ جاری تھا کہ رمیز نے آ کر سب کی نیندیں اڑا دیں۔ ماموں بھائی کی آمد و رفت پھر بڑھ گئی۔ قہقہے اور چائے کے دور۔

ثمن کو احساس ہوا کہ ماموں بھائی اس کی طرف بڑے شوق کی نظر ڈالنے لگے ہیں۔ وہ انہیں چائے دیتی تو وہ شرما جاتے۔ رمیز رات کو سب کے ساتھ دیر تک قصے سناتا۔ موئد، فرید کی تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لے کر انہیں نصیحت بھی کرتا۔ بڑے بھائی کی طرح۔ کبھی ثمن سے مذاق۔ کبھی عاشی کی سسرال کا ذکر۔ دولھا کا مضحکہ اڑاتا۔ پھر نجانے کیا ہوا۔ وہ یک دم سنجیدگی کا نقاب پہن کر بدلا ہوا شخص بن گیا۔ بات چیت کم سے کم ہو گئی۔ ہنسی مذاق موقوف ...... چچی، چچا تو اپنے کاموں میں مصروف رہتے۔ ثمن نے شدت سے محسوس کیا۔ عاشی اپنے جہیز کے کپڑوں میں الجھی رہتی۔ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہوا۔

رمیز کے لہجے میں تلخی آ گئی تھی۔ یہ کیسے؟ ثمن زیادہ ہی اس کی تلخ مزاجی کا نشانہ بنتی۔ وہ سہم گئی۔ یہ کیا ہو رہا تھا۔ کون بتاتا اور چچی تو یوں بھی بہت خوش تھیں۔ دراصل رمیز نے آتے ہی انہیں حیرت زدہ کر دیا تھا۔ آتے ہی ڈالرز کی گڈیاں، کریڈٹ کارڈ اور چند طلائی زیورات ان کے حوالے کر کے مسکراتے رہے۔ دراصل کسی کو علم نہیں ہونے دیا اور دوران تعلیم جو بھی کام ملتا کر لیتے۔ اپنی پڑھائی کے لیے خود ہی پیسہ کماتے۔ یہاں سے جو رقم جاتی۔ وہ محفوظ کرتے گئے اور تعلیم تو ایک سال پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ یہ پورا سال وہ بہترین جاب حاصل کر کے سرمایہ جمع کرتے رہے۔ کسی کو خبر نہ دی۔ چچی اپنی کوششوں سے جو بھی رقم ملتی، بیٹے کو بھیج دیتی تھیں۔

"میں نے سوچا، آپ کو ناکارہ کیوں کروں۔ ابھی موئد فرید کو بھی لندن میں پڑھنا ہے۔ ان کی تعلیم میرے ذمے۔"

"ارے میرا بیٹا۔ تم نے تو میری ساری فکر ہی ختم کر دی۔ سنیے۔" چچا کو مخاطب کیا۔

"رمیز نے عاشی کی شادی ہی نہیں۔ اپنی شادی کے اخراجات سے بھی آزاد کر دیا ہے۔ بس اب میں رمیز کی جلد سے جلدی شادی کروں گی۔ فیصلہ۔"

"رمیز سے پوچھے بغیر؟"

"پوچھنا کیا ہے۔ کہہ دیا ہے۔ جہاں میں کہوں گی، میرا بیٹا وہیں کر لے گا۔ فرماں بردار ہے۔" چچا نے اٹھ کر رمیز کی پیٹھ ٹھونکی۔

"پس ثابت ہوا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔"

"ابا! میں آپ جیسے دانش ور کا بیٹا ہوں۔ آپ کو ہمیشہ کام کرتے دیکھا۔ میں بھی وہاں مزدوری میں لگا رہا۔ مگر اب آپ کو آرام کرنا چاہیے۔ آرام، آرام۔"

"عنقریب بیٹا! مگر کیا یہ بہتر نہ ہو گا کہ عضو معطل بنے رہنے کے بجائے معاشرے اور ملک کے کار آمد مزدور بن کر اپنی ذمے داریاں پوری کریں۔"

☼ ☼ ☼

پھر رمیز کے دوستوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ سارا دن چائے کی دہائی۔ عاشی چڑ جاتی۔

"حد ہے۔ بیٹی کی شادی ہے۔ اسے کچن میں جھونک دیا۔ لو بھلا کوئی ماسی اب تو رکھ لیں۔" مگر بے خبر ابا، بے نیاز امی۔

ایاز ماموں بھائی کے چچی سے راز و نیاز ہوتے۔ آخر ماسی بھی آ گئی۔ کام کم ہو گیا اور عاشی کے دوپٹوں کی لیس لگ گئی۔ ساڑیوں میں فال بھی ثمن نے ہی لگا دی۔ تو اسے قصور جانے کی جلدی ہوئی۔

امن نے بھی اس کے لیے کئی کام تیار کیے ہوئے تھے صبح ناشتے کے بعد اس نے چچا کو اخبار میں گم۔ چچی

کو فون سے فارغ پا کر کہہ دیا۔

"چچی! آج قصور چلی جاؤں؟" رمیز دروازے تک پہنچ کر رک گئے۔

"آج؟ ایسا کرو۔ کل ایاز کو قصور جانا ہے۔ ان کے ساتھ چلی جانا۔"

"نہیں چچی! میں ان کے ساتھ سفر نہیں کروں گی۔ وہ جزبز ہوئی۔ (میرے کون ہوتے ہیں بھلا خوامخواہ) رمیز نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"اچھا تو زندگی بھر کا سفر ان کے ساتھ کیسے کرو گی؟" طنز اور تضحیک بھرا لہجہ تھا۔ تلخ آواز۔ ثمن نے الجھی نظروں سے رمیز کو دیکھا۔ عجیب سا جملہ تھا۔

"میں کیوں؟ خدانخواستہ ان کے ساتھ زندگی کا سفر ...... کروں گی؟" بھنا گئی تھی وہ۔

"اس لیے کیونکہ ان کے ساتھ تمہاری شادی طے ہو گئی ہے۔" وہ باہر جاتے جاتے رک گئے۔ ثمن کے چہرے کی کیفیات کوئی دوسری کہانی سنا رہی تھیں۔

"چچی ...... !" وہ احتجاجاً دبی زبان سے بولی۔ "یہ کب؟ یعنی مجھے تو خبر ہی نہیں۔" چچی نے اقرار میں گردن ہلائی ضرور۔ مگر وہ بیٹے کے انداز پر بھی چونک گئیں۔ جو کہہ رہا تھا۔

"امی! کیا ثمن سے کسی نے نہیں پوچھا تھا؟" جواب طلب نظریں۔

"بھابھی سے فوزیہ نے بات کی تھی۔" چچی کچھ الجھ گئی تھیں۔ "انہوں نے انکار نہیں کیا۔" ثمن برتن میز پر چھوڑ کر باہر آ گئی۔ کمرے میں کرسی پر ڈھے گئی۔

"اماں! میں کیا اتنی دوبھر ہوں۔ کبھی سالار تو کبھی ایاز جو عاشی کے ماموں بھائی ہیں۔ اچھا تو اس لیے اس دن کہہ رہے تھے۔ مجھے ماموں بھائی نہ کہا کرو۔ اچھا بچو! نہ تمہیں تگنی کا ناچ نچایا۔ دیکھنا تم، میں چیز کیا ہوں۔ فوزیہ خالہ نہ بن کر دکھایا تو۔ کھو کھلا کر دوں گی تمہیں۔ کھا کھا کر۔ ٹھونس ٹھونس کر۔ نگل نگل کر۔" دانت پیس پیس کر جبڑے دکھ گئے۔ تو رونے لگی۔ بے چارے ماموں بھائی۔ کبھی اس طرح ان کے لیے سوچا ہی نہ تھا۔ خاصے ماموں ہی لگتے تھے۔ جوان ماموں۔ روتے روتے نیند آ گئی۔

عاشی دوبار آئی۔ بے خبر سوتا دیکھ کر چلی گئی۔ آخر جگانا پڑا۔

"چلو کھانا کھا لو سب کھا چکے ہیں۔"

"سوری عاشی! مجھے بالکل بھوک نہیں۔" واقعی بھوک مر چکی تھی۔ عاشی کے جانے کے بعد اٹھ کر وضو کیا۔ نماز پڑھ کر ہاتھ دعا کے لیے اٹھا لیے۔ کیا مانگوں؟ کس کے لیے؟ کسی کو کچھ خبر نہیں۔ مگر اللہ تو باخبر ہے۔ پھر اس نے میری خواہش کیوں پوری نہیں کی۔ اب مانگوں؟

کبھی اپنے لیے کچھ مانگا نہیں۔ دوسروں کی فکروں میں مبتلا۔ زرین آپا کے لیے خوشگوار زندگی۔ امن کے لیے۔ ارسلہ کے لیے۔ یہاں تک کہ اماں کی صحت، زندگی، خوش مزاجی کی خواہش ہی زیر دعا رہی۔ آج وہ صرف اپنے لیے مانگنے کی خواہش کر رہی تھی۔ تو الفاظ ملتے نہ تھے۔ بس دل کی زبان تھی۔ جو مجبور کر رہی تھی۔ کتنی دیر تک منہ ہاتھوں سے چھپائے بیٹھی رہی۔ پھر اٹھتے ہوئے دیکھا۔ عاشی ٹرے میں کھانا لیے اس کی منتظر بیٹھی تھی۔

"میں نے بھی نہیں کھایا۔ سوچا، یہ چند دن تمہارے ساتھ کھانا تو کھا لوں۔ سسرال والے پتا نہیں کچھ کھانے کو دیں گے یا بھوکا ماریں گے۔" ثمن جانتی تھی۔ عاشی اس کو ہنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ موڈ خوشگوار بنانے کی ایک اور کوشش۔

"آؤ۔ شروع ہو جاؤ۔ آج ہم فوزیہ آپا بن جاتے ہیں۔ ہو جائے مقابلہ سالن بہت مزے دار ہے۔ چلو ریڈی ون ٹو۔"

ثمن جاء نماز کرسی پر رکھ کر باتھ روم میں گھس گئی اور آنسوؤں کو پانی سے دھونے لگی۔ عجیب آنسو ہیں۔ دل کے بھید کھول دیتے ہیں۔ عاشی حیران ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے کیا بتائے۔ رمیز کی وہ تلخ آواز یا وہ انکشاف۔ جس نے ساری امیدیں ختم کر دیں۔ رمیز کے لہجے میں تیر جیسی لپک تھی۔

سچ مچ کا تیر تو نہ تھا۔ پھر دل پر اتنی چوٹ کیوں لگی۔

زخم جیسی ٹیسیں کیوں اٹھ رہی ہیں۔ عاشی نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ دونوں کھانا کھاتی رہیں۔ عاشی ٹرے لے کر چلی گئی۔ وہ وہیں لیٹ گئی۔ کسی کو کچھ بتانے کا فائدہ بھی کیا۔

اماں کے دل میں جو آتا ہے۔ کرتی ہیں۔ ابا کو بہلا پھسلا کر سب سے الگ کر کے لے گئیں اور سب کو نفرت کی ترازو میں تولتی رہیں۔ ذہین آپا کی زندگی برباد کی۔ کل بھی ان سے بات ہوئی۔ بہت رو رہی تھیں۔ ابرار بھائی دبئی سے آ گئے تھے اور اب پھر ان کا مطالبہ ذہین سے شادی کا تھا۔ مگر ماموں کی لاعلمی میں اماں نے منظور کر لیا۔

اب انہیں ماموں کی پروا رہی نہ بد دماغ بھابھی کا ڈر ابرار کو چند دن بعد دبئی جانا تھا اور ذہین آپا سے نکاح کر کے۔ اتفاق سے امن نے اماں اور ابرار کی گفتگو سن لی۔ ابرار نے ارسلہ سے لاتعلقی کی شرط رکھ دی تھی۔ اماں کو یہ بھی منظور تھا۔ "ہم پال لیں گے۔" انہوں نے تسلی دی۔ انہیں ذہین آپا کی ممتا کا خیال ہی نہ آیا۔ ذہین آپا نے صاف انکار کر دیا۔ نکاح والے دن۔ جب ابرار بارات لانے کی تیاری کر رہا تھا۔

ذہین بہانے سے گھر سے نکل کر اپنی ایک کولیگ کے پاس آ گئیں۔ وہیں سے فون کر رہی تھیں۔ سمن شدید صدمے کے زیر اثر تھی۔ سارے ڈر کے اس نے گھر فون نہیں کیا کہ وہاں اماں نے نہ جانے کیا حشر برپا کیا ہو گا۔ چونکہ شادی کو خفیہ رکھنا تھا۔ اس لیے سمن کو بھی لاعلم رکھا گیا۔

رات اسے نیند بھی کم آئی۔ بار بار ارسلہ کا خیال آتا۔ کیسے عاشق صادق تھے ابرار بھائی۔ ان کو اس بچی سے کیا تکلیف ہوتی۔ محبت کرنے والے تو محبوب کے کتے کو بھی محبوب رکھتے ہیں۔ یہ کس قسم کا عاشق تھا۔ جسے وہ ننھی پری گوارا نہ ہوئی۔ غیر لوگ بھی اسے رک کر دیکھتے اور پیار کرتے اور باپ کی شفقت سے محروم معصوم بچی۔

ماں سے جدا کرتے ہوئے خوف نہیں آئے گا۔ خدا کے غضب سے ڈرنے کا اب رواج ہی نہیں رہا شاید۔ کل ذہین آپا کے فون کے بعد سوچا تھا۔ چچی سے کہوں گی۔ ماموں بھائی سے ذہین آپا کی شادی کر دیں وہ ارسلہ کو بہت پیار کرتے ہیں جب جاتے ہیں اس کے لیے چاکلیٹ بسکٹ کھلونے لے کر جاتے ہیں۔ گو کہ ذہین آپا سے تو کبھی ملے نہیں۔ مگر..... اب یہ نیا انکشاف۔ ماموں بھائی اور میں۔" آنسو پھر سے چھپکنے لگے۔ اچانک چچی آ گئیں۔

"کیا بات ہے سمن؟" وہ پلنگ پر آ کر بیٹھیں۔ وہ اٹھ گئی۔ "نہ دوپہر کو کھانے پر آئیں۔ نہ اب تک باہر نکلیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" سوچ کے گہرے سمندر میں لہروں کا شور۔

"عاشی بتا رہی تھی۔ تم رو رہی تھیں۔" اف یہ شور۔ کس سوال کا کیا جواب دے۔

"بیٹا! کوئی بات ہے تو مجھ سے کہو۔ کچھ برا لگا یا آج قصور نہ جا سکیں اس لیے۔"

"نہیں چچی! کوئی بات نہیں ہے۔" مری مری آواز میں اس نے کہا تھا۔ آنسو چھپا لیے۔

"کچھ تو ہے۔ کیا سوچ رہی تھیں۔ میں اندر آئی تو تم چونک کر اچھل پڑی تھیں۔" اف نادانی۔

"مجھے بھی نہیں بتاؤ گی؟ اپنی چچی کو۔" اف وہ پیار بھرا لہجہ۔ شہد آگیں آواز۔ کوئی شک نہیں۔ چچی نے اپنے سلوک سے سب کے دل جیت لیے تھے۔ اماں جیسی متعصب عورت کا بھی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ آنسو ٹپکنے لگے۔ چچی نے اسے اپنے سے قریب کر لیا۔

"ہاں۔ کیا پریشانی ہے؟" سمن نے آنسو دوپٹے کے آنچل میں جذب کر لیے۔ چپکے سے بولی۔ "ذہین آپا۔"

"اللہ خیر۔ کیا ہوا ذہین کو۔" گھبرا گئیں۔ سمن ہمت کر کے انہیں سب کچھ بتاتی گئی۔

"ہوں تو تم کیا..... صرف اس لیے رو رہی تھیں۔ میں کچھ اور سمجھی۔"

"چچی! ذہین آپا جتنی حسین ہیں۔ اتنی ہی دل کی بھی خوب صورت ہیں۔ بے حد سلیقہ مند۔ ایک بار اماں ان کی قسمت پھوڑ چکی ہیں۔ اب پھر۔ کیا انہیں اچھی خوشگوار زندگی گزارنے کا حق نہیں۔ ارسلہ میں ان کی

جان ہے۔ کتنی بھی محبت ہم سب کر لیں۔ ماں کی ممتا کا مقابلہ نہیں۔"

"بے شک خیر اول تو یہ کہ کوئی انسان کسی کی قسمت بنا سکتا ہے نہ بگاڑتا ہے۔ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے۔ وہ جسے چاہے۔ جب چاہے نواز دے۔ اب تم کیا چاہتی ہو؟"

"میں بس کوئی ایسا ہمدرد۔ جو ارسلہ کو باپ کا پیار دے۔ ثواب سمجھ کر۔ میں نے سوچا تھا۔ آپ سے کہوں گی۔ آپ ماموں بھائی سے۔ اگر وہ راضی ہو جائیں۔ میں نے تو ان سے ذہین آپا کی بہت تعریفیں کی تھیں۔ وہ شاید سمجھے نہیں۔"

دل کا بوجھ اتار کر وہ کتنی ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

"کیا حرج تھا۔ اگر ماموں انہیں بہو بنا لیتے۔ صرف اس لیے کہ اماں کے پاس دینے کے لیے جہیز نہ تھا۔ ہمارے ابا فوت ہو چکے تھے۔ ہمارا کوئی بھائی نہ تھا۔ تو اس میں ہمارا کیا قصور یا ذہین آپا کی خطا.....؟" چچی اس کی پیٹھ سہلاتی رہیں پھر اٹھ کر چلی گئیں۔ جواب کیا دیتیں۔ معاملہ تو کچھ اور ہو چکا تھا۔ رو رو کر سر میں درد ہو گیا تھا۔ وہ باہر آ گئی۔ کچن میں جا کر چائے بنانے کی تیاری کرنے لگی۔

عاشی نے آتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ "چائے کم بنانا۔ بھائی مؤید، فرید کو جم خانہ لے گئے ہیں۔ فٹ بال میچ دکھانے۔ وہیں سے چائے پی کر آئیں گے۔ بھائی نے کہا۔ زندگی میں کچھ تبدیلی ہونی چاہیے۔ کرکٹ چھوڑو۔ فٹ بال آزماؤ۔ بہت چیں چیں کی دونوں نے۔ انہوں نے دونوں کی گردنیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیں۔ اوہ سوری گردنیں نہیں گدی۔ بلکہ گدیاں اور دھکیلتے لے گئے اور چائے لے کر تم ہی امی ابا کے پاس جاؤ گی۔ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔ سارا دن چولھے میں گھسی ہوں۔ مجھے سسرال کے بارے میں اندازے لگانے کے لیے کچھ وقت دو۔ پلیز، حد ہے کسی کو میرا خیال ہی نہیں۔"

"اور وہ ماسی۔" سمن آخر ہنس پڑی۔

"ماسی..... میری اہم ضرورت کی چیز لینے بازار گئی ہے۔ اوہ مائی ڈیر سسٹر اپنی۔" وہ ٹرے میں چائے لے کر لاؤنج میں پہنچی۔ چچا، چچی اپنے کمرے میں تھے۔ کچھ بحث تھی یا۔

"میں نے اس دن بھی تم سے کہا تھا بیگم! قریبی رشتے داروں میں شادیوں کے خطرناک نتیجے دیکھے گئے ہیں۔ بچے بیمار یا ابنارمل۔ اب تم نے وہی ناک دوسری طرف سے پکڑنے کی تیاری کر لی۔ بات تو وہی ہے۔ صرف نام تبدیل کر لیے۔"

"مجھے سائنس کی تحقیق سے انکار نہیں اور ہم تابڑ توڑ شادیاں کر بھی نہیں رہے۔ بھئی غور کریں۔ میں اور آپ غیر خاندان، افتخار بھائی بھابھی بہت ہی دور کے رشتے دار۔ آپ کی والدہ کا آپ کے والد سے اور افتخار بھائی کی والدہ کا بھی آپس میں کوئی رشتہ نہ تھا۔ صرف آپ کے والد ہی تو ہیں جو۔

اچھا اس طرح دیکھیں تو رفیع بھائی جو بالکل غیر خاندان میں شادی کر کے لائے۔ بہو بھی ان کی غیر۔ مگر پوتا ایب نارمل۔ یہ سب اللہ کی مرضی پر ہے۔ آپ اللہ پر بھروسا کریں۔ ہماری نیت نیک ہے۔" وہ چائے لے کر اندر آ گئی۔

باہر جاتے میں چچا کی آواز سنی۔ "بیٹے سے بھی پوچھا۔"

ماسی کھانا اچھا بنا لیتی تھی۔ عاشی کو صرف سمن کو ہنسانا ہوتا تو وہ اسی طرح کلم کا ڈھنڈورا پیٹتی تھی۔ ورنہ دوپہر میں بھی وہی کھانا پکا کر گئی تھی۔ اور عاشی صاحبہ..... مؤید فرید فٹ بال میچ دیکھ کر بہت محظوظ ہوئے تھے۔ خود بھی ایک میچ کھیل کر ہار کر آئے تھے۔ بہت جوش و خروش سے آنکھوں دیکھا حال بتا رہے تھے۔ رمیز بالکل خاموش نظر جھکائے کھانے میں مصروف تھے۔

بھوک تو سمن کو بھی نہیں تھی۔ وہ صرف سب کا ساتھ دینے کے لیے آ گئی۔ ورنہ سب سوال کرتے۔ متوجہ ہو جاتے۔

☼ ☼ ☼

صبح بہت روشن تھی۔ چچا خود اسے لے کر جا رہے

تھے۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر کمرے سے نکلی۔ چچی اپنے کمرے میں تھیں۔ اندر سے رمیز کی آواز آئی۔ بہت کھنکتی ہوئی۔ چہکتی ہوئی۔ خوشی سے معمور۔ جوش سے بھرپور۔ "امی' سچ؟ آپ نے ماموں بھائی سے....."

"ہاں۔ میری ان سے لمبی میٹنگ ہوئی۔ میں نے اچھی طرح سمجھایا ہے۔ وہ تنہا آدمی ہے۔ اسے ایک فیملی سوٹ کرتی ہے۔ مکمل فیملی پھر یہ کہ محبت اعتماد اور خوشی حاصل کرنے کے لیے دوسروں کو بھی اعتماد محبت اور خوشی دینا ضروری ہوتا ہے۔ میں نے بہت سوچ کر تمہاری بہتری کے لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔"

"اور وہ مان گئے؟"

"وہ بحث کب کرتا ہے۔ بہت نیک، ہمدرد اور محبتی لڑکا ہے۔ بس اللہ اسے بہت خوشیاں دے۔ جو لوگ دوسروں کا احساس کرتے ہیں۔ خوش رہتے ہیں۔" وہ عاشی کو تلاش کرتی موئد کے کمرے میں گھسی۔ جہاں فرید موئد عاشی کو اس کی شادی کے پروگرام بتا رہے تھے۔

قصور میں سب اچھا تھا۔ ذہین آپا موجود تھیں۔ امن بے حد مصروف۔ اماں اور چچا کمرے میں چلے گئے۔ امن اسے بتانے لگی۔

"ذہین آپا نے ماموں کو فون کر دیا کہ ابرار آج بارات لا رہے ہیں۔ ماموں وہاں پہنچ گئے۔ ابرار بھائی کی خوب ٹھکائی کی۔ وہ زخمی حالت میں ہی ایرپورٹ بھاگ گئے۔ ماموں یہاں بھی آئے تھے۔ مگر یہاں ذہین آپا تھیں ہی نہیں۔ اماں بھی انجان بن گئیں۔"

"کیا حرج تھا۔ اگر ماموں اب بھی مان لیتے۔" سمن افسردہ ہو گئی۔

"مان گئے تھے۔ مگر ارسلہ کے بغیر۔" امن بھی افسوس کرنے لگی۔

سمن نے ارسلہ کو گود میں بٹھا لیا۔ "کیسی قسمت ہے بچی کی۔ اپنے باپ کی بے رخی' بے حسی' دوسرا کوئی محبت دینے کا روادار نہیں۔ کاش رمیز بھائی ہی راضی ہو جاتے۔ اس دن گود لینے کی بات کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ذہین آپا کو اپنا لیتے۔"

کل اتنی باتیں چچی سے کر لیں۔ یہ بات ان کے کان میں ڈال دیتی۔ وہ ایاز کو سمجھا سکتی ہیں تو رمیز تو بیٹے ہیں فرماں بردار۔ اف موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ وہ صحن میں بیٹھی آسمان پر اڑتی چیلوں کو دیکھنے لگی۔ سنا تھا آسمان پر چیلیں جمع ہو کر اڑتی ہیں تو بارش ہوتی ہے۔ بادلوں کا نام نہ تھا۔ بارش کیسے ہو گی۔ دن ڈھلے چچا واپسی کے لیے جا رہے تھے۔ تو وہ انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی۔ چچا سے رازداری کے لیے۔ موقع ابھی نکلا نہیں۔

"چچا..... آپ سے ایک بات کہنی تھی۔" ہچکچا کر کہا۔ چچی کی بات اور تھی۔ چچا کا تو رعب بھی تھا۔

چچا نے رک کر دیکھا۔ "ہاں بیٹا کہو۔"

"چچا' چچی سے کہیے گا۔ وہ ذہین آپا کے لیے' رمیز بھائی کے لیے مطلب۔" گڑبڑا گئی۔

"رمیز کے لیے۔ کیا؟"

"وہ رمیز بھائی کو راضی کر لیں۔ ذہین آپا بہت ہی اچھی ہیں۔" چچا حیرت کی زیادتی سے کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ "کاہے کے لیے راضی کر لیں؟"

"وہ چچا شادی کے لیے۔" بات کہہ کر نڈر ہو گئی۔

"وہ راضی ہو جائیں گے۔ انہیں ارسلہ بہت پیاری لگتی ہے۔ ورنہ پھر..... وہ کسے اپنا باپ کہے گی۔ کون اس کا بابا بنے گا۔ وہ بہت بدقسمت ہے۔" چچا نے اس کے جھکے ہوئے سر کو غور سے دیکھا۔

"کیا صرف اس کے لیے قربانی دو گی؟"

سمن نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ "میں؟ کیوں؟ قربانی تو رمیز بھائی دیں گے اگر مان گئے تو۔ ظاہر ہے انہیں ایک سے بڑھ کر ایک کنواری لڑکی مل سکتی ہے۔ مگر ..... ارسلہ کو ان سے بہتر باپ شاید نہ ملے۔ آپ سب اس کو محبت دیں گے۔ چچا! آپ چچی سے۔"

"اچھا' اچھا کہہ دوں گا۔ تمہاری چچی کہتی ہیں۔ سمن بہت سمجھ دار معاملہ فہم اور ایثار کرنے والی لڑکی ہے۔ جس گھر جائے گی اسے جنت بنا دے گی۔" چچا ہنسے اور خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ عجب طرح سے

ہنسے تھے چچا۔ اندر آ کر وہ امن کے کپڑے اور دیگر سامان دیکھنے لگی۔ اسے بھی کافی کام کرنا تھا۔ عاشی کی مہندی والے دن وہ لوگ لاہور پہنچے۔ ذہین کو کالج سے چھٹی نہیں ملی۔ پرنسپل صاحبہ علیل تھیں اور کالج میں بہت کام تھا۔

ذہین کو اپنی ایک کولیگ کے گھر رہنا تھا کیونکہ ارسلہ سب کے ساتھ لاہور آ گئی تھی۔ عاشی کمرے میں بہت برے موڈ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ "اب آئی ہو۔" وہ بگڑ کر بولی۔

سمن کو ہنسی آ گئی۔ "ہاں آ تو گئی۔"

"نہ آتیں۔ مہمانوں کی طرح کل ہی آتیں۔ شادی کے دن۔" مزید خفگی۔

"بات کیا ہے؟"

"ادھر دیکھو۔ سامنے برآمدے میں۔ وہ سرخ کپڑوں والی۔ وہ میرا میک اپ کرنے آئی ہیں۔ ان کا اپنا میک اپ دیکھو۔ بھتنی لگ رہی ہیں۔ مجھے بھی بھتنی بنا دیں گی۔ میں ان سے میک اپ نہیں کرواؤں گی۔ امی کو بتا دو۔"

"تو تم خود ہی بتا دیتیں۔ اب وہ اتنی ظالم ماں بھی نہیں ہیں کہ تمہاری بات نہ مانیں۔ ہر بات کا جھگڑا بنا دیتی ہو۔"

عاشی دانت کچکچا کر بولی۔

"ظالم ماں نہیں ہیں۔ مگر ظالم ساس ضرور بنیں گی آزما لینا۔ اتنا کہا مجھے میک اپ نہیں کرانا۔ مہندی کی دلہن میک اپ کے بغیر اچھی لگتی ہے۔ سادہ معصوم' شفاف پھر شادی کے دن روپ آتا ہے۔ میک اپ کے بعد مگر یہ ہماری امی جان محترمہ کی دوست کی بہن ہیں۔ اس لیے اور یاد رکھو ادھر یہ آئیں میک اپ کے لیے۔ میں گھسی باتھ روم میں۔ باتھ لینے کے لیے' تم کو پتا ہے نا میں نہانے میں کتنی دیر لگاتی ہوں۔"

دھمکی دھماکے دار تھی۔ سب جانتے تھے عاشی منہ ہاتھ دھونے' وضو کرنے میں چالیس منٹ لیتی تھی۔ نہانے میں دوگنا ٹائم۔ اگر وہ واش روم میں گھس گئی۔ لاک کر کے۔ تو خیر نہ تھی۔ خواہ مہمانوں کے جانے کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وقت آجاتا۔ وہ ایک خوفناک سچویشن کا ادراک کر کے بوکھلائی ہوئی دوڑ پڑی۔

جانے چچی کہاں تھیں۔ سانس پھول گیا گھبراہٹ میں۔ آخر نظر آگئیں۔ چچی اس کی حالت دیکھ کر گھبرائیں۔

"ارے سمن! خیر تو ہے۔" سمن نے دیکھا ہی نہیں رمیز بھی وہیں موجود تھے اور اس کو دیکھ کر پُراسرار انداز میں مسکرا رہے تھے۔

"چچی پلیز! آپ انہیں منع کر دیں۔" الفاظ بھی زبان پر تھرتھرا رہے تھے۔

"الٰہی خیر۔ اب کیا ہو گیا۔ کس کو منع کر دوں۔ جلدی بتاؤ۔ میرا دم نکل جائے گا۔" سمن کو لگا۔ مزید خطرناک صورت حال ہے۔ گھبرا کر جلدی جلدی بولی۔

(کہیں چچی کا دم نکل گیا۔ تو قاتل وہی ہو گی اور شادی کا گھر۔ اف نہیں) "چچی وہ بیوٹیشن کو منع کر دیں۔ عاشی میک اپ نہیں کرائے گی۔ وہ باتھ روم میں بند ہو کر بیٹھی رہے گی۔ آپ کو پتا ہے ناں۔ نہانے میں کتنی دیر لگاتی ہے۔ سب سمجھتے ہیں بے ہوش ہو گئی ہے۔ چچی آپ۔"

رمیز کا قہقہہ اسے بے موقع لگا۔ چچی سر تھام کر رہ گئیں۔ "توبہ ہے۔ اتنی دیر میں میرا خون خشک ہو گیا کہ اللہ جانے کس کو منع کرنا ہے۔ شاید عاشی شادی سے انکار کر رہی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں۔" سمن ان کے پاس بیٹھ گئی۔ شرمندہ سی۔

"چچی! سوری میں خود بہت گھبرا گئی تھی۔ عاشی نے ایسا خوفناک نقشہ کھینچا کہ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔"

"اور محترمہ کا سانس بھی۔" رمیز نے لقمہ دیا۔

"اور امی آپ راشدہ آنٹی سے کوئی بہانہ کر دیں۔ اگر عاشی بند ہو گئی۔ تو ان صاحبہ کا سانس بند نہ ہو جائے۔"

"توبہ رمیز! اللہ نہ کرے۔" چچی ہول کر بولیں۔

"امی! مجھے اپنا مستقبل بہت عزیز ہے۔" سمن کا دل سکڑ گیا۔ (کیا یہ مان گئے؟)

"چلو میں کچھ کرتی ہوں۔" چچی اٹھیں۔

"امی۔ ان سے پوچھیں۔ ابا سے۔ جو کہا تھا۔ مجھ سے نہیں کہہ سکتی تھیں۔"

"رمیز! میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ اب چپ رہو۔ سمن بہت سمجھ دار ہے۔" سمن کا دل ہی نہیں سانس بھی رکنے لگا۔ (مان گئے ہیں۔ ارسلہ کو فوراً گود میں چڑھا لیا تھا آتے ہی)

وہ باہر آئی تو بہت ست تھی۔ کتنا آسان ہوتا ہے۔ زبان سے کچھ کہہ دینا۔ عمل کتنا مشکل۔ آگے اندھیرا ہے۔ تو قربانی دینے پر تیار ہیں رمیز بھائی۔

☼ ☼ ☼

عاشی کی شادی بہت سادہ اور باوقار طریقے سے ہوئی۔ دولہا بہت خوش شکل کھلنڈرا سا لگا۔ نکاح کے بعد اسٹیج پر دولہا، دلہن کو بٹھایا گیا۔ سالیوں نے کچھ مذاق بھی کیا۔ جسے وہ خوش دلی سے اور خوش مزاجی سے انجوائے کر رہا تھا۔ عاشی شادی کے دن بھی لمبے گھونگھٹ میں رہی۔ بیوٹیشن کا آدھے سر پر سیٹ کیا ہوا دوپٹہ اس نے ہال میں آنے تک نوچ کر گھونگھٹ میں بدل دیا۔

دولہا نے ابھی تک اسے دیکھا نہ تھا۔ فون پر بات چیت ہوئی تھی۔ وہ اب عالم شوق میں جھک جھک کر گھونگھٹ کو ہٹانے کی کوشش کرتا۔ عاشی سر مزید جھکا لیتی۔ پھر اس نے ہاتھ سے ہی ذرا سا دوپٹہ ہٹایا۔ گھونگھٹ کے اندر سے آواز آئی۔

"امریکہ میں شرم بیچ کھائی۔" دولہا ذرا پاس ہوا۔ عاشی نے کہنی ماری۔

"ہٹو پیچھے رہو۔" دولہا ہنس دیا۔

امن سے اس نے کہا۔ آپ کی بہن مرکھنی ہے۔ یا کٹ کھنی۔" امن خاص لی بنی تھی۔

"پتا چل جائے گا آج۔ کل ضرور مجھے بتانا۔" امن نے اور ڈرایا۔

"توبہ کریں جی۔ پوری زندگی گزارنی ہے۔ آپ کو بتا کر اپنا حشر نہیں کرواؤں گا۔" کھانے کا اعلان ہوا۔ سب کھانے کے لیے چلے گئے۔ مگر کئی سہیلیاں اور کزنز اسٹیج پر دولہا سے مصروف گفتگو تھیں۔ دولہا دلہن کے لیے کھانا وہیں آگیا۔ عاشی نے دولہا کو کہنی ماری۔

"مردوں میں جا کر کھاؤ۔ عورتوں میں بیٹھنے کا بڑا شوق ہے۔" دولہا ہائے وائے کرتا اٹھا۔ اس کے ہٹتے ہی عاشی نے سمن کو اشارے سے بلا لیا۔

"آؤ۔ ہم کھاتے ہیں۔" سمن کی سٹی گم تھی۔

"کیا ہو گیا ہے عاشی! کتنا بول رہی تھیں تم۔ کیا سوچ رہے ہوں گے دولہا بھائی۔"

"تو گھونگھٹ کا اور فائدہ کیا ہے۔" عاشی کی اندر سے آواز آئی۔ "پہلے دن ہی سیٹ کر رہی ہوں۔ اپنے مطابق، ورنہ یہیں لڑکیوں میں بیٹھ کر ہا، ہو، ہو کرنے کا پروگرام تھا موصوف کا۔ چلو بیٹھو اچھا اچھا کھانا ہے اور فوزیہ آپا بن جائیں۔ ڈرو نہیں گھونگھٹ ہے۔ ٹوٹ پڑو۔ کوئی نہیں دیکھے گا۔"

"تمہارے پاس گھونگھٹ ہے۔ میرے پاس نہیں۔" وہ چڑ گئی۔

اگلے دن ولیمہ بھی ہو گیا۔ ولیمہ کے دن بھی عاشی نے دولہا پر رعب جمانے کا سلسلہ قائم رکھا۔ پھر یہ لوگ قصور آگئے۔

رمیز نے گاڑی خرید لی تھی۔ اسی پر انہیں چھوڑنے آئے تھے۔ راستے بھر امن اور ارسلہ سے ہی مذاق کرتے رہے۔ وہ کھڑکی سے باہر کے نظاروں میں محو رہی۔ (بظاہر)

ہائے اللہ کتنا مشکل فیصلہ کیا تھا اس نے۔ اور ان کو دیکھو۔ چچی کے ایک دفعہ کے کہنے سے ہی مان گئے۔ کوئی انکار، احتجاج کچھ نہیں۔ چچی کی ہر بات مان لینے والی ہوتی ہے۔ ایاز بھی مان گئے۔ اور چلو بچی کو باپ کا پیار تو ملے گا۔ بلکہ چچا چچی۔ یہی تو چاہتی تھی میں پھر۔ اب ماتمی صورت کیوں؟

پھر ذہین آپا بھی آگئیں اور شادی کا حال پوچھتی رہیں۔ امن ہنس ہنس کر عاشی کی باتیں بھی سناتی رہی۔ سمن لاتعلقی سے سنتی رہتی۔ کس قدر دلچسپی لے رہی ہیں ذہین آپا۔ اتنا شوق تھا۔ تو کالج کی چھٹی کر کے آ ہی جاتیں۔

"تم کو کیا ہوا ہے؟" امن نے سمن کی خاموشی نوٹ کر لی تھی۔

"عاشی کی جدائی کا غم ہے۔" ذہین آپا نے نتیجہ اخذ کرنے میں پھرتی دکھائی۔

"اوہو۔ تو لاہور میں رہنا ہے۔ جب تک وہ امریکہ نہیں جاتی۔ روز مل لیا کرنا۔"

امن نے تجویز پیش کی۔ یا مشورہ۔ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ ہاں جی روز مل لیا کرنا۔ جیسے وہ خدائی فوجدار ماموں بھائی اسے ہر وقت عاشی سے ملاتے ہی رہیں گے اور اگر وہ بسیار خور خالہ دو دن کے لیے بھی آگئیں۔ پکا پکا کر میرا تو حلیہ بگڑ جائے گا۔ چلو ایک ترکیب تو ہے۔ بدمزا کھانے بنا کر خالہ بھانجے سے انتقام لیا جا سکتا ہے۔

عاشی کی ضرورت اب زیادہ ہی تھی۔ اس سے کہتی۔ اپنے بھائی سے پوچھو۔ انگلینڈ روانگی کے وقت جو وعدہ کر کے گئے تھے۔ ایک لمحے میں بھلا دیا۔ ہونہہ چھ برس کی بیٹی کی ماں کے لیے راضی برضا، شرم نہیں آئی اور وہ ماموں بھائی مجھ سے بارہ سال تو بڑے ہوں گے۔ انہیں کب شرم آئی۔

وہ تن دہی سے امن کے کپڑوں پر استری کرتی رہی۔ دوپٹے پر لیس اور گوٹا لگانے میں غلطیاں کر کے ادھیڑتی رہی۔ سیتی رہی، ذہن اپنی شادی میں اٹکا رہا شاید عاشی بھی اسی لیے بولتی تھی۔ اندر کی گھٹن نکالنے کے لیے بولنا ضروری ہے۔

☼ ☼ ☼

ایک دن ممانی آگئیں۔ اپنے نکھٹو بیٹے کے ساتھ۔ گھور گھور کر اسے دیکھتا رہا وہ بے غیرت بنی فالسے کھاتی رہی۔ اف شادی کے دن سب دیکھیں گے۔ میرے ساتھ وہ کھڑوس بارہ سال بڑے ماموں بھائی اور ذہین آپا کے ساتھ ہینڈسم خوب صورت رمیز، ارسلہ کو گود میں لے کر تصویریں کھنچواتے ہوئے۔ کتنا مذاق اڑائیں گے سب۔ خاص کر یہ سالار کھو کھو کر کے مصنوعی ہنسی کے ساتھ۔

"تینوں کی شادی ایک ہی دن ہوگی۔ اسی گھر سے رخصتی ہوگی۔ اللہ نے چاہا اور میں.... ذہین کے ساتھ رہوں گی۔ یہ انصار بھائی اور یاسمین کا فیصلہ ہے۔" اماں ممانی کو بتا رہی تھیں۔ اس کا سانس رکنے لگا۔

ایک ساتھ شادی' شادیاں کسی نے بتایا نہیں۔ ہونہہ کسی نے پہلے بھی کب بتایا تھا۔ مجھ سے پوچھ کہنے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی' مجھے کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا۔ کوئی کیوں میری اپنی ماں بہنیں۔ میری حیثیت ہی کیا ہے۔ جلتی بھنتی فالسے کھاتی رہی۔ پھر انجان بن کر امن سے پوچھنے لگی۔

"امن آپی! آپ کی شادی سے پہلے مہندی بھی ہوگی۔ کیا پروگرام ہے۔"

"کیوں تمہیں میری مہندی پر ڈانس کرنا ہے جو پروگرام پوچھ رہی ہو۔"

"ہاں' بہنوں کی مہندی میں چھوٹی بہنیں بلکہ بڑی بہنیں بھی ڈانس کرتی ہیں۔"

"عاشی کی شادی میں مہندی میں تم نے ڈانس نہیں کیا۔"

"وہاں ڈانس کا پروگرام تھا ہی نہیں۔ آپ کی مہندی میں کرلوں گی۔"

"پھر تو ذہین آپا بھی ڈانس کرلیں گی۔ ارسلہ کو گود میں لے کر ناچتی کودتی کیا اچھی لگیں گی۔"

امن یقیناً" اس کا مذاق اڑا رہی تھی۔ اسے لگتا۔ سب اسی کا مضحکہ اڑاتے ہیں یہ کہ وہ سب سے چھوٹی ہے مگر اس کا دولہا سب سے بڑا ہے۔ وہ خود بھی اپنا مذاق اڑاتی تھی۔ اب بھلا وہ ذہین آپا سے کہہ سکتی تھی کہ رمیز کو میرے لیے چھوڑ دیں۔ ماموں بھائی کو آپ لے لیں۔ کچھ فائدہ نہیں۔

اماں کہتی تھیں۔ لڑکے والوں کی مرضی ہے جسے چاہے پسند کریں۔ اسے کسی رازدار کی ضرورت تھی دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لیے۔ ایرپورٹ پر رمیز نے کہا تھا۔ وہ جملہ اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ عرصہ گزارنے پر بھی وہ ایک لمحہ ذہن سے نہ نکلتا۔ لگتا تھا عاشی نے بھی سنا تھا۔ وہ مسکرائی تھی۔ اف کبھی عاشی سے پوچھا کیوں نہیں اور کیا وہ بھول گئی؟ وہاں لاہور میں پوچھ لیتی۔ غلطی پر غلطی۔ سانپ گزر گیا۔ لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ یہ کوئی فلم تو نہیں کہ شادی کے وقت لڑکی بدل گئی۔ دولہا بدل گیا۔ ہم حقیقت کی دنیا میں رہتے ہیں۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ وقت کے ساتھ شاید میں بھی بھول جاؤں۔ کسی نے کوئی وعدہ کیا تھا۔ میں نے چپکے چپکے کسی کو چاہا تھا۔ ہر دن انتظار کیا تھا۔ مجھے بھی صبر آ ہی جائے گا۔ وہ دل کو سمجھاتی رہی۔ مگر اتنی بہادر نہ تھی۔ آنسو پلکوں میں اٹکے رہتے۔ امن مذاق اڑاتی تو اماں اس کی حمایت کرتیں۔

"ارے وہ چھوٹی ہے۔ تم لوگوں کی طرح بے شرم ڈھیٹ بھی نہیں ہے۔ اسے جدائی کا غم ہے۔ تمہارے جیسی دیدہ ہوائی نہیں ہے۔" اسے بتا دیا گیا۔

تینوں کو ایک ساتھ رخصت ہونا ہے۔ چچا چچی اور عاشی ان سب کو مایوں بٹھانے آگئے۔ تینوں بہنیں پیلے جوڑے پہن کر بیٹھی تھیں۔ عاشی کے گلے لگ کر وہ خوب روئی۔ عاشی بھی افسردہ تھی۔ اس کا دولہا امریکہ چلا گیا تھا۔ اب پتا نہیں کب عاشی کو بلائے گا۔ بلائے گا بھی یا یہیں سسرال والوں کی خدمت کے لیے وقف کردے گا۔ یہ عاشی کا خیال تھا۔ پھر وہ سب کچھ بھلا کر گانے گانے لگی۔ تالیاں بجاتی رہی۔ ذہین سے کہنے لگی۔

"ذہین آپا...؟!"

ماموں بھائی تو یہاں آنے کے لیے بے قرار تھے۔ انہیں رسمیں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اصل میں میری مہندی کے دن ہی مایوں تھی۔ اس دن ماموں بھائی کی خالہ کو ساہیوال سے آنا تھا۔ وہ بچارے اسٹیشن چلے گئے۔ گاڑی اس دن چھ گھنٹے لیٹ تھی۔ تو ماموں بھائی وہیں پلیٹ فارم پر ٹہلتے رہے اور فوزیہ آپا ساہیوال اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر۔ وہ زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکتیں اور لیٹنے کا اسٹیشن پر انتظام نہ تھا۔ وہ گھر چلی گئیں۔ ماموں بھائی ہاں بے چارے آدھی رات کو آئے۔ رسموں کے بعد۔"

ہنس ہنس کر سنا رہی تھی۔ کھانے کے بعد دیر رات میں چچا وغیرہ چلے گئے۔ سمن تکیے میں سر رکھتے ہی رونے لگی۔ امن نے تاسف سے کہا۔

"لو جی ان کی برسات شروع ہوگئی۔ بے بادل برسات.... ہمیں بے شرم بنانے میں تلی ہوئی ہیں محترمہ۔ چلو ذہین آپا! ہم بھی شروع ہو جائیں آخر ہماری بھی شادیاں ہیں۔ اماں سے جدائی کا ہمیں بھی دکھ ہے۔"

"میری جدائی نہیں ہے۔ اس لیے مجھے رونا نہیں آتا۔" ذہین سمن کے پاس لیٹ گئیں۔

"اماں میرے ساتھ رہیں گی۔ تم لوگ روز آجانا بے شک۔" سمن کا جی چاہا چیخیں مار کر روئے۔ اگلا دن بھی اس کے مسلسل آنسو ٹپکانے کا دن تھا۔ تیسرے دن بارات۔ تصور میں تو اماں کے ہی کچھ رشتے دار تھے یا آس پڑوس محلے والے۔

ابا کے خاندان کے لوگ لاہور سے بارات میں آئے تھے۔ چچا نے خود اماں کی طرف کا انتظام کروایا تھا۔ ماموں ممانی صبح سے آگئے۔ گھر کے اندر عورتیں۔ باہر گلی میں شامیانے لگا کر مردانے کا انتظام تھا۔ تین باراتیں۔ تینوں دولہا شان دار۔ یہ خواتین کے تبصرے تھے۔ تینوں کی بری عالی شان' خوش قسمتی ہو تو ایسی۔

ذہین کے کمرے میں تینوں بہنیں لائن سے بیٹھی تھیں۔ فرش پر ممانی اور چچی بھی تھیں۔ عاشی بھی۔ جب نکاح کے لیے چچا' ماموں وکیل گواہ کو لے کر آئے۔ پہلے ذہین کا نکاح ہونا تھا۔ سمن نے لمبا گھونگھٹ نکال لیا۔ کان میں انگلی ٹھونس لی وہ کچھ دیکھنا سننا نہیں چاہتی تھی۔ بہت کڑا وقت تھا۔ سخت مرحلہ مگر پھر بھی ذہین کے سامنے عبارت پڑھتے ہوئے جب چچا نے ایاز محمود کا نام لیا۔ وہ سن کر اچھل پڑی۔ گھونگھٹ اٹھا کر اس نے عاشی سے کہا۔

"یہ.... یہ چچا غلط نام۔" عاشی نے کہنی ماری۔ (وہ اس عمل میں ایکسپرٹ ہو چکی تھی)

"چپ کرو بے وقوف۔"

"عاشی یہ تو۔ ماموں بھائی کا نام لے رہے ہیں۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ہاں ان ہی سے ذہین آپا کی شادی ہوئی ہے احمق!" عاشی اس کے کان میں گھس کر منمنائی۔ "اور ذرا شرم کرو مجھ سے سمجھیں۔"

"تم نے کی تھی شرم مجھ سے۔" وہ بھی چنچنائی۔

"منہ چھپا کر بیٹھو۔ میں تمہاری اکلوتی نند تمہیں حکم دیتی ہوں۔ تم میری نند نہیں بھابھی!" اس کے حواس غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کیا میں بے ہوش ہو رہی ہوں اس نے اپنے چٹکی کاٹی۔ نشانہ غلط ہو گیا۔ کپکپائی انگلیاں عاشی کے بازو میں چبھ گئیں۔ عاشی اچھل کر دور ہٹ گئی۔

دو بہنوں کے نکاح کے بعد اب چچا سمن کے سامنے آکر بیٹھ گئے اور رمیز کے نام پر زبان دانتوں میں دبالی۔ وہ سائن کرنے کے لیے گھونگھٹ ہٹا کر کاغذ پر جھک گئی۔ امن عاشی کو گلے لگاتے ہوئے مسکرائی۔

"عاشی! تمہارے کہنے سے ہم نے راز کھولا نہیں۔ داد دو ہم سب کو۔ کیسا ڈرامہ کیا۔ سمن! انجام کیسا تھا ڈرامے کا؟"

"انجام بخیر' تمت بالخیر اور سب پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں بے ہوش ہونے جا رہی ہوں۔"

☼

اپنا گھر

سدرہ سحر عمران

"یہ راضیہ میری سگی خالہ کی بیٹی ہے، کوئی کہہ سکتا ہے بھلا؟ اماں جان دیتی تھیں اپنی بھانجی پر۔ یہ میرا دل تھا کہ ثمرو کو بھابھی بناؤں... وہ خود بھی چاہتی تھی۔ اسے بہت پسند تھے سکندر بھائی مگر اماں... میری مان لیں، یہ ہو سکتا تھا بھلا... ہمیشہ خود کو ٹھیک اور دوسروں کو غلط سمجھتی آئی ہیں۔"

اس کی زبان جتنی تیزی سے چل رہی تھی اس سے کہیں زیادہ تیز ہاتھ مشین پہ چل رہے تھے۔

وہ اپنی بھتیجی کی فراک سینے میں مشغول تھی اور اس کی واحد سہیلی کنزیٰ اس کی داستان امیر حمزہ انہماک سے سن رہی تھی۔ دونوں "بھابھی بھوں" والی تھیں۔ دونوں کی دکھتی رگ ایک ہی تھی، اس لیے جب بھی ملتیں "بھابھی نامہ" شروع ہو جاتا۔ دونوں ایک دوسرے سے کہہ سن کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھیں۔

"ثمرو اچھی لڑکی تھی۔" کنزیٰ نے رائے دینا ضروری خیال کیا۔

وہ کالج کے زمانے میں ان دونوں کی مشترکہ دوست رہ چکی تھی۔ اب تو جانے کہاں تھی، کالج چھوٹتے ہی دوستانہ بھی چھوٹ گیا تھا۔ اب تو بس دونوں ہی رہ گئی تھیں پورے گروپ میں، وہ بھی اس لیے کہ ہم محلہ بھی تھیں۔

"ہاں تو اور کیا... بس ہماری برادری کی نہیں تھی۔ میں نے بہت قائل کیا اماں کو۔ سکندر بھائی اور ابا بھی مان گئے تھے، پر اماں۔ انا کا مسئلہ بنا بیٹھی تھیں۔ مجھ سے بات کرنا تک ترک کر دیا تھا۔"

یہ کہانی وہ ہزار بار سنا چکی تھی لیکن جب بھی راضیہ کی کسی نئی کہانی کا تذکرہ ہوتا، وہ مکمل سیاق و سباق کے ساتھ پھر شروع ہو جاتی۔

"بہن کی محبت بڑا جوش مار رہی تھی۔ اس سوکھی چمرخ راضیہ کو جھٹ سے بہو بنا لائیں کہ ہم کہیں نیا محاذ نہ کھول بیٹھیں۔ وہ مجھے خالہ زاد کی حیثیت سے پھر بھی پسند تھی، میری ہم عمر اور ہم جماعت تھی۔ اس لیے اچھی دوست بھی تھی، مگر ادھر رشتہ بدلا، ادھر راضیہ بی بی کے مزاج ہی بدل گئے۔ سکندر بھائی سے شادی کیا ہوئی محترمہ دن رات ہواؤں میں اڑنے لگیں۔ سیدھے منہ بات کرنا تو در کنار کام کی بات بھی یوں کرتی ہے جیسے احسان عظیم کر رہی ہو۔ اماں نے کہا شروع شروع میں ایسا ہی ہوتا ہے ہر لڑکی اپنی ملکیت جتانا چاہتی ہے۔ اسے چار دن شوق پورا کر لینے دو پھر خود ہی سنبھل جائے گی۔ میں چپ چاپ محترمہ کو برداشت کرتی رہی۔ کام بھی زیادہ تر خود ہی کر لیتی تھی لیکن پورے دو سال گزر گئے۔ اس کے دلہناپے کا وہی حال رہا۔ ہر وقت چوتھی کی دلہن بنی رہتی۔ ہر وقت تک سک سے تیار رہتی۔ بس کھانے کے وقت کمرے بلکہ حجرے سے باہر تشریف لے آتیں۔ یہ دیکھنا سلائی ٹھیک لگی ہے نا۔" اس نے دھاگا توڑ کر فراک اس کی طرف اچھالی۔

"اب کیا کہتی ہیں راضیہ بھابھی؟" وہ فراک دیکھنے لگی۔

"کہنا کیا ہے، وہی الگ گھر کی فرمائش۔ ایک تو مجھے سمجھ نہیں آتی آج کل کی لڑکیوں کو سسرال میں تکلیف کیا ہوتی ہے۔ کیا وہ اپنا گھر نہیں ہوتا؟ یہ آخر کیوں خاندانی نظام کے تحت رہنا نہیں چاہتیں۔ جاتے ہی الگ گھر کی فرمائش کرنے لگتی ہیں، جیسے گھر تو سو دو روپے میں بن جائے گا شوہر ذرا سا ہاتھ میں کیا ہو، ملکہ عالیہ تصور کرنے لگتی ہیں خود کو۔ اپنی علیحدہ سلطنت بنا کر راج دھانی کرنا چاہتی ہیں۔ بھئی مل جل کر رہو۔ کیا برائی ہے اس میں... سیانے کہتے ہیں اتفاق میں برکت ہے۔ سکندر بھائی کی دوکان داری کا کیا ہے، کبھی سیزن ہو تو اچھی خاصی کمائی ہو جاتی ہے ورنہ مکھیاں ہی مارتے ہیں۔ یہ گارمنٹ والے۔ دونوں چھوٹے بھائی ابھی پڑھ رہے ہیں۔ ساری ذمہ داری سکندر بھائی پر ہے یہ محترمہ الگ ان کی جان عذاب کیے رکھتی ہیں۔ اماں ابا تو

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

کسی گنتی میں نہیں ہیں بیچارے۔"

"اب کالر ٹھیک سے لگانا۔ پہلے نشان لگالو۔" کنزی نے فراک اس کی طرف بڑھائی۔

"اماں پہ کبھی غصہ آتا ہے، کبھی ترس۔ بڑے چاؤ سے بیاہ کرلائی تھیں بھانجی کو، دو سالوں میں ہی نشہ اتر گیا ان کا۔ پوتے کی خواہش تھی لیکن راحیلہ پیدا ہوئی تو بھی اللہ کی رضا جان کر ایک لفظ نہیں منہ سے نکالا۔"

"بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں سفینہ!" اس نے ٹوکا۔

"ہاں تو میں نے کب انکار کیا۔ ہم بھی رحمت ہی سمجھتے ہیں جاہل لوگوں کی طرح منہ نہیں سجاتے تھے ہم نے پڑھ لکھ کر گنوایا نہیں ہے۔ مجھے تو راحیلہ بہت بہت پیاری ہے مگر اس کی ماں... اب تین ہفتوں سے روٹھ کر میکے بیٹھی ہے۔ اس تین کمروں کے مکان میں دم گھٹتا ہے اس کا۔ خود جیسے سرے محل میں رہتی رہی ہے۔ ہم سے بھی گئے گزرے حالات ہیں خالو کے اور بچوں کے مزاج۔ اللہ توبہ!" اس کا ہاتھ پھر سے مشین کے ہتھے پر چلنے لگا تھا۔

"سکندر بھائی کیا کہتے ہیں؟"

"انہوں نے کیا کہنا ہے۔ مالی حیثیت جانتے ہیں اپنی۔ شاید کبھی نازک مزاج بیوی کی فرمائش پوری کر بھی دیں لیکن اب تو کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ میں تو کہتی ہوں اماں سے رہنے دیں وہیں، خود ہی مزاج ٹھکانے آجائیں گے بی بی کے۔ پر میری اپنی شادی طے ہو گئی ہے۔ ایک ماہ ہی ہے درمیان میں میرے سسرال والے کیا کہیں گے۔ ہمیں ہی برا بھلا کہا جائے گا۔ راضیہ بی بی کے کرتوت تو کوئی نہ دیکھے گا۔ یہ دنیا بڑی بری لگتی ہے مجھے، کبھی حق کا ساتھ نہیں دیتی۔"

"تمہاری پھپھو ہی لگتی ہیں وہ تو۔ انہیں پتا ہی ہو گا۔"

"سگی پھپھو تھوڑی ہیں۔ ابا کی چچازاد ہیں، اور اب رشتے داری جڑی ہے تو ملنا ملانا ہوا ہے ورنہ پہلے کب آنا جانا تھا ہمارا ایک دوسرے کے گھر۔ خوشی غمی میں آمنا سامنا ہو جاتا تھا کبھی۔ اماں اپنی جوانی میں بہت تنک مزاج ہوا کرتی تھیں۔ اب تو جانے کیا ہو گیا ہے انہیں لب سیے بیٹھی رہتی ہیں۔"

"جب سے ان کی امی کا انتقال ہوا ہے تب سے ایسی ہو گئی ہیں نا۔" کنزی کمرے میں کھلتی کھڑکی سے برآمدے میں بچھی چارپائی پر انہیں خیالوں میں گم بیٹھا دیکھ رہی تھی۔

"ہاں، نانی سے بہت محبت تھی اماں کو۔ ہر بات، دکھ سکھ ان سے شیئر کیا کرتی تھیں۔ اب تو جیسے ان کے اندر بھی زندگی ختم ہوتی جارہی ہے۔" وہ ملول سی ہو گئی۔

"تمہاری دو نندیں تو شادی شدہ ہیں نا؟" اس نے سفینہ کی اداس شکل دیکھ کر بات کا رخ بدلنا چاہا۔

"ہاں... اور دو چھوٹی ہیں ابھی۔ کالج میں پڑھتی ہیں تین بھائی بھی چھوٹے ہیں۔ فراز سب سے بڑے ہیں۔" اس کے ذکر پر وہ مسکرائی۔

"تم پچھلی بار بتا رہی تھیں کہ سعودیہ کا ویزا لگ گیا ہے ان کا۔" اس نے استفسار کیا۔

"ہاں! دو ماہ بعد چلے جائیں گے نا۔ تب ہی جلدی میں شادی ہو رہی ہے۔"

"کیا تم بھی سعودیہ چلی جاؤ گی؟" اسے اشتیاق ہوا۔

"پتا نہیں۔ ابھی تو کچھ کہہ نہیں سکتی۔" اس نے شانے اچکائے۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔ راضیہ بھابھی بھی خود ہی لائن پر آجائیں گی۔ تم زیادہ فکر مت کیا کرو۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑے گئے ہیں تمہارے۔ اچھے دنوں کا تصور کر کے خوش ہو لیا کرو۔ یہ باتیں تو زندگی کے ساتھ چلتی رہتی ہیں۔" اس نے محبت سے سمجھایا۔

"تمہاری تو جان چھوٹ گئی ہے نا شادی کے بعد بھابھیوں سے اسی لیے خوش رہ لیتی ہو۔"

"تمہاری بھی چھوٹ ہی جائے گی۔ ایک ماہ ہی تو ہے۔" وہ مسکرائی۔

"ابھی تو دونوں چھوٹوں کی بھی شادی کرنی ہے۔ ان کی بیویاں جانے کیسی طبیعت کی ہوں گی۔ میرا تو ایسا دل بھرا ہے راضیہ بھابھی سے کہ ان کا سوچنا بھی نہیں چاہتی۔" اس کے لہجے میں اکتاہٹ در آئی۔

"سب کچھ حالات کے دھارے پر چھوڑ دو اسی میں بھلائی ہے۔ تم یہ فراک مکمل کرو۔ میں خالہ سے گپ شپ لگالوں۔" وہ اس کے پاس سے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی اس لیے خاندان کے بڑوں نے بیچ میں پڑ کر راضیہ کی صلح کروادی تھی۔ اگرچہ جھگڑا ابھی کوئی نہ ہوا تھا، اسے شادی کے دن تک اماں کی فکر رہی تھی کہ اس کے بعد انہیں کون سنبھالے گا۔ وقت پر کھانا دینا، دوا کھلانا۔ وہ اسی فکر میں گھل رہی تھی۔

اس کے سسرال والے اچھے تھے۔ چند ہی دنوں میں وہ ان میں رچ بس سی گئی تھی۔ فراز الگ اس کی ناز برداریاں کرتا۔ اتنی توجہ اور محبت ملنے پر وہ کھل گئی تھی اور دنوں میں ہی اس نے صحت پکڑلی تھی۔ اماں تو اسے خوش دیکھ کر بہت نہال ہوتیں۔ راضیہ البتہ خوب جلتی بھنتی تھی۔ سفینہ نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

اس روز وہ میکے آئی ہوئی تھی۔ اماں تو اب کافی باتیں کرلیتی تھیں اس سے۔

"فراز نے اکیس تاریخ کو جانا ہے اماں! میرا دل بہت اداس ہے، اتنی جلدی وہ اتنی دور چلے جائیں گے۔" وہ ان کی جدائی کا سوچ کر ہی افسردہ ہو جاتی۔

"ابھی روزی روٹی کے لیے اسے بھاگ دوڑ تو کرنی ہے۔ جہاں اللہ نے دانہ پانی لکھ دیا، وہیں جاکر محنت کرے گا وہ۔ تو اپنے سسرال میں دل لگا۔ سب لوگ کتنے اچھے ہیں، تیری کتنی پروا کرتے ہیں۔ صرف ایک فراز سے تعلق تو نہیں جڑا تیرا۔ یہ سب بھی تو تیرے اپنے ہیں۔"

"یہ بات تو ہے اماں! پر فراز کی بات الگ ہے۔"

"چھوٹا دل نہ کر۔ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ بہادری سے کرنا چاہیے۔ کیا خبر فراز کا وہاں دل لگے یا نہیں تو پہلے ہی اسے پریشان نہ کر۔"

"اچھا اماں۔ نہیں کرتی آپ کے لاڈلے داماد کو پریشان۔" وہ اماں کے پاس آکر اپنا ہر دکھ بھول جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

سال بھر بعد جب اس کی گود میں ننھا سعد آچکا تھا۔ فراز پاکستان آیا ہوا تھا۔ وہ سب ہی بے انتہا خوش تھے اور تب اس کے دل میں خواہش جاگی کہ وہ بھی فراز کے ساتھ چلی جائے۔ اس کے ساتھ رہے۔ آخر یہ اس کا حق بھی تو تھا۔ اپنی اس خواہش کا ذکر اس نے فراز سے بھی کر دیا۔

"فراز! کیوں نہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔ آپ میرا بھی ویزا بنوا دیں۔ میرا بہت دل چاہتا ہے آپ کے ساتھ رہنے کو۔" اور اس کی بات پر فراز چپ سا ہو گیا تھا۔

"کیا ہوا؟ کیا میری بات بری لگی ہے آپ کو، کوئی غلط بات کردی ہے میں نے؟"

"یہاں کوئی پرابلم ہے تمہیں؟"

"نہیں تو۔ مجھے کیا پرابلم ہو سکتی ہے، سب میرے ساتھ ٹھیک ہیں، اس لیے کہ میں اچھی ہوں سب کے ساتھ۔ لیکن فراز آپ میرے شوہر ہیں۔ میرا اصل تعلق تو آپ کے ساتھ ہے نا، میں آپ کے حوالے سے اس گھر میں آئی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں، اپنے گھر میں۔"

"تو کیا یہ تمہارا گھر نہیں ہے؟" انہیں دکھ سا ہوا تھا۔

"ہے، بالکل ہے۔ میں نے کب انکار کیا پر میں۔" اسے سمجھ نہ آئی کہ وہ آگے کیا کہے۔

"اگر یہ تمہارا گھر ہے تو اس گھر میں ہی رہو سب کے ساتھ مل کر۔"

"اور آپ۔ آپ کے بغیر کیسے رہوں میں۔ میرا دل نہیں لگتا۔" اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

"دل لگاؤ گی تو لگے گا نا۔ میں ہر چھ ماہ بعد دو ماہ کے لیے آیا کروں گا اور سفینہ جب تک میرے بہن بھائی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو جاتے' میں ان سے الگ ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"میں نے الگ ہونے کو کب کہا ہے۔" وہ حیران ہوئی۔

"تم میرے ساتھ چلی جاؤ گی تو ایک طرح سے الگ ہی ہو جاؤ گی۔ یہ سب میرے اپنے ہیں۔ میرے بغیر رہ لیتے ہیں اور میں بھی۔ بہت مشکل ہے مگر زندگی کی ضروریات اور ترجیحات کے لیے ہاتھ پاؤں بھی مارنے پڑتے ہیں۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔ میرے حوالے سے۔ سب کا تعلق ہے تم سے۔ وہ تم میں مجھے دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں اور اب تو میرا بیٹا بھی آگیا ہے۔ جانتی ہو نا اماں کتنا خوش ہیں۔ بلائیں لیتی نہیں تھکتیں تمہاری اور میری۔ میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں ہمیشہ۔ سب کے ساتھ مل جل کر اتفاق سے۔"

اور سفینہ کو کوئی پرانی بات یاد آئی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

مزید پندرہ دن رہ کر فراز واپس سعودیہ چلا گیا تھا۔ وہ بہت اداس اور ملول رہنے لگی تھی۔ اس کے ذہن میں ہر وقت اس کی باتیں اور محبت گردش کرتی اور اس کا دل چاہتا' وہ اڑ کر فراز کے پاس پہنچ جائے۔ اسے فراز سے شکایت سی ہو گئی تھی کہ وہ کیوں اسے اپنے ساتھ رکھنا نہیں چاہتا' کہیں وہ وہاں کسی اور میں دلچسپی تو نہیں لیتا...!

یہ وہ خیال تھا جو اسے راتوں کو نیند سے بیدار کر دیتا اور وہ پہروں کروٹیں بدلتی خلا میں گھورتی رہتی۔ آہستہ آہستہ اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہونے لگا۔ وہ کمرا نشین ہوتی گئی۔ اس کی نندیں اور دیور اس کا رویہ دیکھ کر پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ اس کی ساس کو اس کی صحت کی فکر دامن گیر رہتی۔ وہ ہر وقت اس کا خیال رکھتیں مگر اس کا دل ہی اچاٹ ہو چکا تھا۔ وہ آدم بیزار ہوتی گئی۔ اسے سب رشتے جھوٹے' بناوٹی اور خود غرض لگتے۔ وہ مستقل فراز کی آمد کی منتظر رہنے لگی۔

☼ ☼ ☼

سعد کی طبیعت رات سے بہتر نہ تھی۔ بدلتے موسم نے اس کی صحت پر بھی اثر ڈالا تھا۔ وہ تھا بھی نازک مزاج۔ ذرا سی بے احتیاطی پر بیمار پڑ جاتا۔ اس کی ساس رات سے اس کے ساتھ ہی جاگ رہی تھیں۔

"پھپھو! یہ روئے کیوں جا رہا ہے۔" وہ خود بھی رونے والی ہو رہی تھی۔

"تکلیف میں ہے نا میرے بچے۔ چھوٹے بچے کا پتا بھی تو نہیں چلتا کہ اسے کہاں درد ہو رہا ہے۔ میں سونف والا جو شاندہ بنا دیتی ہوں' اسے پلانا۔ شاید پیٹ میں درد ہو رہا ہو اسے۔"

"آپ اسے پکڑیں' میں بنا کر لے آتی ہوں۔ میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے اس کے رونے کی آواز سن کر۔"

"ماں ہونا اسی لیے..." وہ مسکرا دیں اور وہ انہیں دیکھنے لگی۔

"ماں اپنے بچے کے لیے کتنی بڑی نعمت خداوندی ہے پھپھو! خود سے زیادہ اسے اپنے بچے کی فکر ہوتی ہے' اپنی نیندیں تج کر کے وہ اپنے بچے کے ساتھ جاگتی ہے' اس کی تکلیف میں اس کے ساتھ روتی ہے۔" اس کے آنسو بہنے لگے تھے۔

"اسی لیے تو ماں کا مقام و مرتبہ دنیا کے ہر رشتے سے عظیم تر ہے پگلی! ماں کا رشتہ ہی تو ہر غرض' مطلب سے پاک ہوتا ہے' کتنی تکلیفیں اور دکھ سہہ کر وہ اپنے بچے کی پرورش کرتی ہے۔ اسے اپنے لہو سے سینچ کر پروان چڑھاتی ہے۔" وہ عام سے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

"اور جب اولاد جوان ہوتی ہے' اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہے تو وہ اپنی ماں کا ہر احسان بھول جاتی ہے' جو خود تکلیف میں رہ کر اس کے دکھ کا ازالہ کرتی تھی' وہی ماں اولاد کی آنکھوں کو کھٹکنے لگتی ہے۔ جو اپنے بچوں کے لیے چھتنار ہوتی ہے' اسے زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی ہے۔ اسی کا وجود اسے ناگوار گزرنے لگتا ہے۔ ہے نا پھپھو!" اس کی آنکھیں بے تاب برس رہی تھیں۔ سعد' دادی کی گود میں جا کر رونا بھول چکا تھا۔

"پاگل ہوئی ہے کیا۔ ایسے کیوں روئے جا رہی ہے' میرا دل ہول رہا ہے۔" انہوں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح ان کے شانے سے آ لگی۔

"یہ ہم بہوویں ہوتی ہیں' کم ظرف اور خود غرض جو ماں جیسا مقام و مرتبہ رکھنے کے باوجود اپنے شوہر کو اس کی ماں سے چھین لینا چاہتی ہیں۔ جس نے پیدا کیا' پروان چڑھایا' اسے زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا۔ اس کے لیے دعاؤں کا سایہ کیے رکھا۔ اسی سے دور کرنا چاہتی ہیں بیٹے کو۔ صرف چند خواہشات کے لیے۔ اتنے اٹوٹ اور بے غرض رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔ میرے بیٹے کو ذرا سی تکلیف ہے اور میں اذیت میں مبتلا ہوں' چاہتی ہوں کہ کسی طرح اسے سکون مل جائے۔ اسے چین آجائے۔ یا اللہ! اس کے حصے کی ہر تکلیف مجھے دے دے' پر میرے بچے کو آرام دے دے اور کل جب یہ بڑا ہو گا' اس کی بیوی آئے گی تو اسے مجھ سے جدا کر دے گی۔ میرے بیٹے کو مجھ سے چھین لے گی۔ ہے نا پھپھو!" وہ بس روئے جا رہی تھی۔ پھپھو کو اس کی آدھی ادھوری بات ہی سمجھ میں آئی تھی۔

"سب انگلیاں برابر نہیں ہوتیں' دنیا میں اچھے برے لوگ ہوتے ہیں' کہیں ساس بری ہوتی ہے' کہیں بہو۔"

"لیکن کردار تو عورت کا ہے نا' یہ ہی کیوں کم ظرف اور چھوٹے دل کی ہے۔"

"عورت اپنی فطرت سے مجبور ہے بچے! یہ کم عقل اور حاسد ہے' پر مجھے یقین ہے' میری بہو بہت اچھی ہے' بہت نیک خصلت کی مالک ہے' یہ مجھ سے میرا بیٹا نہیں چھینے گی' ہے نا۔" انہوں نے اس کا چہرہ پکڑ کر کہا تھا۔

"کبھی نہیں پھپھو! کبھی بھی نہیں' یہ میرا وعدہ ہے آپ سے' جتنا حق میرا ہے ان پر' اس سے کہیں زیادہ آپ کا ہے۔ آپ ماں ہیں' آپ کے مقام و مرتبے کو کوئی چیلنج نہیں کر سکتا۔ کوئی آپ کی محبتوں کا بدل نہیں دے سکتا' میں جان گئی ہوں اس بات کو' مان گئی ہوں۔" وہ دوپٹے سے اپنے اشک پونچھ رہی تھی۔

"کاش! ہر عورت کی سوچ تیری طرح ہو جائے تو گھروں میں لڑائی جھگڑا اور فساد کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ عورت ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ گھر کا سکھ اور سکون چاہتی ہے یا شیرازہ بندی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں پھپھو! یہ صرف عورت کے اختیار میں ہے۔ یہ ہی اس کے ظرف کا امتحان ہے۔ وہ خاوند کے گھر کو اپنا گھر مان لے تو اس کے دل سے اپنے الگ گھر کی خلش مٹ جائے۔"

اتنے دنوں سے اس کے دل میں پلنے والی بے چینی اور کشمکش ختم ہو چکی تھی۔

☼

سائرہ عارف

میری صبح کا ستارہ

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غرور ہے۔ بچپن کا منگیتر باوجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کرلی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں ددھیال پر پڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس سے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہو گئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لا کر دیتی ہے اور پیسہ بٹورتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک ذہنی طور پر کمزور بھائی شہزاد ہے۔ جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور مشورہ دینے کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاصی انسیت ہے، جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

ناولٹ

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال، کاشف کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے، جب کاشف، ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دور رہے، لیکن کاشف، اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقد ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں، بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پیسہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابل برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۹

نویں قسط

"کب، کہاں، کیسے ان سب سوالوں کے جواب تو مجھے وہاں جا کر ہی ملیں گے سارا! صبح تنویر صاحب سے ملوں گا تو۔"

"اسے چھوڑنا نہیں نواز! ہم اس سے اپنی پائی پائی وصول کریں گے۔ ہمارا لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔ سب کچھ واپس لینا ہے۔" سارا نے نفرت بھرے لہجے میں نواز کو باور کرایا تھا کہ اب اسے معافی نہیں ملے گی۔ نواز اکرم نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"مگر وہ تو، وہ تو خالی۔" وہ اسے بتانا چاہتا تھا کہ پولیس کے مطابق وہ خالی ہاتھ ان کے ہاتھ لگا ہے۔ زیورات، روپیہ پیسہ کچھ بھی اس کے پاس نہیں تھا، مگر وہ یہ بات سارا کو بتا کر اس کے غصے کو مزید ہوا نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی ادھوری بات پر ہی سارا نے اسے گھورا تھا۔

"کیا... کیا وہ تو... تمہیں ہمدردی ہو رہی ہے اس کمینے، گھٹیا، دھوکے باز سے؟ اللہ واسطے معافی مت دے دینا۔ یاد رکھنا نواز! اسے ایسی کڑی سزا دلوانی ہے کہ اس کی سات نسلیں بھی یاد رکھیں، سمجھے تم۔"

"ہاں ہاں، ہاں بالکل ایسا ہی ہو گا۔" سارا کے حکم سے انکار کی تاب کہاں تھی۔

"اور ہاں۔" وہ جاتے جاتے پلٹی، "اس بات کا خاص دھیان رہے کہ ماہی کو اس بات کا علم نہ ہو۔ بڑی مشکل سے تو وہ اپنے گھر میں سیٹ ہوئی ہے اور خدانخواستہ اسے یہ بات پتا چلی تو وہ بہت پریشان ہو جائے گی۔ بلکہ کچھ الٹا سیدھا بھی کر دے گی۔" سارا نے تشویش بھرے لہجے میں کہا تو نواز کو بہت اچھا لگا۔

"یہ تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ اسے یہ بات بالکل بھی پتا نہیں چلنا چاہیے ورنہ وہ... ابھی تک کاشف سے ہمدردی رکھتی ہے۔ میں اسے نہیں بتاؤں گا۔"

"ٹھیک... میں ذرا تیار ہو جاؤں۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا ہے۔"

"کبھی کبھی سارا بہت غیروں جیسا سلوک کرتی ہے میرے ساتھ، بالکل اجنبی بن جاتی ہے۔" نواز وہیں بیٹھا بڑی دیر تک سارا کے رویے کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ جب بھی اس کے نزدیک ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اسے ہمیشہ ایک حد میں باندھ دیتی تھی اور بے چارا نواز دوبارہ اپنے خول میں سمٹ جاتا تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ دیکھو آیان! میں نے میرب کے لیے یہ جیولری بنائی ہے۔" عالیہ زیورات کے ڈبے لے کر اس کے کمرے میں ہی آ گئی تھیں۔ آیان سیدھا ہو بیٹھا، پانچ چھ ڈبے دیکھ کر وہ حیران ہوا۔

"ماما! اتنا زیور؟ اتنی مہنگائی ہے اور پھر بھی..." ڈبوں کے اندر دھرے بھاری بھرکم زیورات اور بڑے بڑے سیٹ دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ عالیہ مسکرائیں۔

"بیٹا جی... یہ کچھ میرے زیور ہیں اور کچھ نئے ہیں۔ اکلوتی بہو ہے سارے ارمان نکالوں گی۔ دنیا والوں کو بھی تو دکھانا ہے۔ اس کی ماں سارا علوی نے تو مجھے کئی بار سنایا ہے کہ اب دیکھیں گے آپ اپنی بہو کے لیے کیا کرتی ہیں۔"

"سارا آنٹی تو ماما! مجھے خاصی چھچھوری سی لگتی ہیں۔ جب دیکھو میرب کی تعریف ہی کرتی رہتی ہیں۔ میرب نازک مزاج ہے۔ بے حد لاڈلی ہے۔ بہت خوب صورت ہے۔ یہ ہے وہ ہے۔" عالیہ ہنس پڑیں۔

"صرف میرب کی ہی تعریف کرتی ہے۔ دوسری بے چاری تو اسے نظر بھی نہیں آتی۔ شکر ہے اس کا مسئلہ حل ہو گیا ورنہ۔"

"ورنہ میری شادی لٹک جاتی۔ ویسے ماہین کا جواب شوہر ہے نا، احمد، پڑھا لکھا اور بہت مہذب ہے۔ کسی پروفیسر کا بیٹا ہے۔ ماہین کی تو لاٹری نکل آئی۔ ورنہ وہ کلرک، آوارہ اور گھٹیا انسان تو رشتے داری کے لائق ہی نہ تھا۔"

"اچھا ہوا اس سے جان چھوٹ گئی ہے۔ شرم آتی تھی اسے اپنا رشتے دار بتاتے ہوئے۔ تمہاری سالی کا میاں بن جاتا۔ ملنا ملانا تو ہونا ہی تھا۔" عالیہ نے بھی ناک چڑھا کر اپنی ناپسندیدگی کا بھرپور اظہار کیا تھا۔

"مہندی کا فنکشن کمبائن ہو گا۔" وہ اب زیورات کے ڈبے سمیٹتے ہوئے اسے مزید معلومات دے رہی تھیں۔ "ولیمہ پی سی میں ہو گا۔" انہوں نے بتاتے ہوئے آیان کو دیکھا، جو سامنے لگے آئینے میں اپنا جائزہ لے رہا تھا۔

"ماما! میرب اگر خوب صورت ہے تو کم تو میں بھی نہیں ہوں۔"

عالیہ نے چونک کر آئینے میں نظر آتے اس کے خوب صورت عکس کو دیکھا تھا۔

"تم میرب سے زیادہ خوب صورت ہو بیٹا! ماشاءاللہ، اللہ نظر بد سے بچائے۔ میرب کا اور تمہارا کیا مقابلہ۔ لڑکیاں تو میک اپ کر کے بن سنور کر خوب صورت لگتی ہیں اور تم تو یونہی بہت خوب صورت ہو۔ شہزادے جیسے ایک بات یاد رکھنا آیان! میرب کو اپنی خوب صورتی کا کچھ زیادہ ہی احساس ہے۔ تم اسے خود پر حاوی نہ ہونے دینا۔"

عالیہ نے بے حد سنجیدگی سے اسے سمجھایا تھا اور آیان واسطی جو پہلے ہی خود پسندی کا شکار تھا، مزید اکڑ گیا تھا۔ دوسروں کے منہ سے اپنی تعریفیں سن کر وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کرتا تھا۔ اور ایک عجیب سا نشہ اس کے اندر باہر چھا جاتا تھا۔

"میرب بہت خوش قسمت ہے۔ اسے مجھ جیسا خوب صورت ترین شخص ملا ہے۔" اس نے بڑی ادا سے اپنا کالر کھڑا کر کے خود کو خود ہی سراہتے ہوئے کہا تھا۔

"میرب۔" اسی دوران میں اسے میرب کی کال بھی آ گئی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے کال ریسیو کی۔

"کہاں غائب ہو؟" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔

"غائب نہیں، حاضر ہوں جناب!" اس نے بھی شوخی سے بالکل اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے بازار جانا ہے۔ تم آ جاؤ۔" اس نے استحقاق بھرے انداز میں کہا تھا۔

"شاپنگ!" اس نے محض مذاق سے پوچھا تھا۔

"ہاں... تو اور بازار میں کیا کرتے ہیں۔ ڈرائیور گاڑی لے کر کہیں گیا ہوا ہے تم فوراً آ جاؤ۔" اس نے خاصے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"سوری میڈم! آئی ایم ناٹ یور ڈرائیور۔"

اس نے قدرے رکھائی سے اسے جواب دیا تھا۔ میرب کو جھٹکا لگا۔

"واٹ' آیان! خیریت ہے نا' کیا ہو گیا ہے تمہیں؟"

"محترمہ! میں اس وقت بازار جا کر شاپنگ کی خواری کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں سو' تم اپنی ماما یا کسی اور کے ساتھ چلی جاؤ پلیز' مائنڈ نہ کرنا اوکے۔"

"اوکے بائے۔" میرب نے منہ بنا کر واضح ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے فوراً" ہی فون بند کر دیا۔

"بائے۔" اس نے فون رکھا۔ "ماما ٹھیک کہتی ہیں۔ یہ لڑکی کچھ زیادہ ہی نخریلی ہے اور میں بھی پھر اسی کی ٹکر ہوں۔" اس نے طنز سے خود کو دیکھ کر گویا میرب کو جواب دیا تھا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"سمجھتا کیا ہے خود کو' بڑا آیا شہزادہ چارلس۔۔۔ ہوں! نخرے دیکھو ذرا۔" میرب جلی بھنی بیٹھی تھی۔ سارا علوی نے اندر آتے ہوئے اس کی بڑبڑاہٹ سنی۔

"کیا ہوا میری جان! کون ہے شہزادہ چارلس؟"

"ماما۔۔۔ آیان سمجھتا کیا ہے خود کو۔ ابھی سے اس کے اتنے ناز نخرے ہیں۔ بعد میں تو وہ مجھے گھاس بھی نہیں ڈالے گا۔" اس نے بے حد خراب موڈ کے ساتھ کہا۔

"کیا مطلب! کیا ہوا ہے۔" سارا نے چونک کر پوچھا۔ میرب کے ہر معاملے میں وہ بہت حساس تھی۔

"ماما! میں نے آیان سے کہا کہ مجھے بازار لے چلو شاپنگ کے لیے تو کہتا ہے۔ میں تمہارا ڈرائیور نہیں ہوں' سوری۔"

"تم نے اسے کیا بتایا تھا؟"

"وہ ماما' میں نے اس سے کہا تھا کہ ڈرائیور گاڑی لے گیا ہے۔ تم آجاؤ تو۔"

"میرب! تمہیں کب عقل آئے گی۔ وہ واقعی تمہارا ڈرائیور نہیں ہے' ہونے والا شوہر ہے۔" سارا نے اسے ڈانٹا۔ میرب کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا۔

"میرب! میری جان ابھی تمہیں احتیاط کرنا ہو گی۔ دیکھو' مرد شادی سے پہلے اور ہوتے ہیں اور شادی کے بعد بالکل مختلف۔ ابھی وہ اگر خود کو بڑا پھنے خان سمجھ رہا ہے تو سمجھ لینے دو۔ شادی کے بعد تو بڑے بڑے پھنے خان سیدھے ہو جاتے ہیں اور تم تو اتنی حسین ہو کہ وہ بعد میں اپنی سُدھ بُدھ کھو بیٹھے گا۔"

"نہیں ماما! وہ بہت نخریلا ہے۔ اسے اپنی پرسنالٹی پر بہت زیادہ ناز ہے۔ اتراتا ہے لڑکیوں کی طرح۔" میرب کا موڈ بہت سخت خراب ہوا تھا۔

"میں نے تو تمہیں پہلے ہی سمجھایا تھا۔ مرد کی شکل نہیں' جیب دیکھو۔ اگر شوہر کم خوب صورت ہو تو وہ اپنی خوب صورت بیوی سے دب کر رہتا ہے' مگر تم نے میرے تجربے سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ تمہیں تو آیان کی خوب صورتی نے اٹریکٹ کیا تھا نا تو اب ایک خوب صورت نخریلے مرد کے ناز نخرے اٹھانے کو تیار ہو جاؤ۔"

"ہوں۔۔۔ ناز نخرے اٹھاتی ہے میری جوتی۔ میرب کو ناز نخرے اٹھانے کی نہیں' اٹھوانے کی عادت ہے ماما یو نو۔" اسے ماں کا طعنہ بڑی بری طرح چبھا تھا۔

"اور آپ مجھے بار بار یہ شکل اور جیب والی مثال کیوں دیتی ہیں۔ اگر آیان کی شکل اچھی ہے تو جیب بھی خالی نہیں ہے۔ میں اچھی طرح دونوں کا فرق سمجھتی ہوں۔ اسی لیے آیان کو پسند کیا تھا کہ دونوں خوبیاں اس کے اندر موجود ہیں۔ اور رہا نخرہ تو شادی کے بعد اس کا سارا نخرہ نکال دوں گی۔ مجھے جانتا نہیں ہے وہ۔" سارا علوی اس کے تنتنے پر مسکرائی تھیں۔

"آرام سے' آرام سے' تحمل' حوصلے کے ساتھ' جہاں بات صرف میٹھا بولنے سے سنور جائے' وہاں ڈنڈا اٹھانے کی زحمت سے بچنا چاہیے میری جان!"

"جی ماما۔۔۔ تو پھر اب کیا کیا جائے۔ بازار جانا تھا۔"

"ڈونٹ وری۔ میں نواز سے کہتی ہوں۔ تم ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان نہ ہوا کرو۔ اور اتنے معمولی مسئلے آیان کے ساتھ شیئر کرنے کی ضرورت بھی نہیں

تھی۔ اس میں اپنی ہی بے عزتی ہوتی ہے۔"

"جی ماما۔" اس نے سر ہلایا تو سارا نے اس کا گال تھپتھپایا۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت دیر سے یونہی بلا مقصد ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ خاموش' گم صم' اس کی نظریں تومیٹ پر بنے پیلے پیلے سورج مکھی کے پھولوں پر تھیں مگر ذہنی طور پر وہ یہاں موجود نہ تھی۔

"آہم۔۔۔" احمد نے چند منٹ اس کا بغور جائزہ لیا تھا۔ پھر قریب آکر ذرا زور سے گلا کھنکارتے ہوئے میز پر بیٹھ گیا تھا۔ ماہین بے ساختہ چونکی تھی۔

"آپ۔۔۔ آپ کب آئے آفس سے۔"

"کچھ دیر قبل ہی۔ جب آپ گہری سوچ کے سمندر میں ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔" وہ ہنسا تو ماہین اپنی بے خبری پر شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ فوراً" اس کے قریب سے اٹھی تھی۔

"میں۔۔۔ میں آپ کے لیے کھانا لگاؤں۔"

"ابا جان نے کھا لیا؟" وہ کف الٹتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"جی ہاں!" اس کی نظریں اب تک سن فلاورز پر جمی تھیں۔ احمد کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔

"اوکے' میں چینج کر کے آتا ہوں۔ تم کھانا لگاؤ۔ مل کر کھائیں گے۔" اس نے بڑے دوستانہ انداز اور نرم لہجے میں کہا تھا۔

منہ ہاتھ دھو کر وہ دوبارہ ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا تو ٹیبل پر کھانا لگا ہوا تھا اور وہ۔۔۔ اسے ہنسی آگئی۔ اس کی نظریں ہنوز سن فلاور پر تھیں۔

"تمہیں سن فلاورز پسند ہیں؟"

"نہیں' ہاں' میں تو یونہی۔" وہ گڑبڑا گئی تھی۔

"مجھے پسند ہیں۔ ہر طرح کے حالات میں ڈھلنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ محاورہ سنا ہو گا تم نے۔ چڑھتے

مشہور مزاح نگار اور شاعر

انشاء جی کی خوبصورت تحریریں،

کارٹونوں سے مزین

آفسٹ طباعت، مضبوط جلد، خوبصورت گرد پوش

کتاب کا نام		قیمت
آوارہ گرد کی ڈائری	سفرنامہ	450/-
دنیا گول ہے	سفرنامہ	450/-
ابن بطوطہ کے تعاقب میں	سفرنامہ	450/-
چلتے ہو تو چین کو چلیے	سفرنامہ	275/-
نگری نگری پھرا مسافر	سفرنامہ	225/-
خمار گندم	طنز و مزاح	225/-
اُردو کی آخری کتاب	طنز و مزاح	225/-
اس بستی کے کوچے میں	مجموعہ کلام	300/-
چاند نگر	مجموعہ کلام	225/-
دل وحشی	مجموعہ کلام	225/-
اندھا کنواں	ایڈگر ایلن پو/ ابن انشاء	200/-
لاکھوں کا شہر	او ہنری/ ابن انشاء	120/-
باتیں انشاء جی کی	طنز و مزاح	400/-
آپ سے کیا پردہ	طنز و مزاح	400/-

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

سورج کو سلام۔ وہ ان کے اوپر فٹ آتا ہے۔" ماہی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چمکی تھی۔

"آپ کھانا کھائیں نا۔" اس نے اسے یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے دیکھ کر ٹوکا تھا۔

"ہاں ہاں۔ تم بھی لونا بلکہ پہلے مجھے نکال کر دو۔" اس نے پلیٹ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا' ماہین نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جی....!" پلیٹ میں تھوڑا سا سالن ڈال کر اس نے ہاٹ پاٹ اس کی جانب بڑھایا۔ احمد نے آدھی روٹی لے کر پلیٹ میں رکھی۔ وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ ماہین نے صرف آدھی روٹی لے کر پلیٹ اپنے سامنے کرلی تھی۔ اور جگ اٹھا کر پانی کا گلاس بھرا تھا۔

"آپ روٹی پانی کے ساتھ کھاتی ہیں۔" احمد نے ٹوکا تو وہ بے ساختہ چونکی۔

"جی نہیں' یہ تو!"

"سالن ڈالیں' ایسے۔" اس نے چمچ بھر کر چکن قورمہ اس کی پلیٹ میں نکالا۔

"بس' بس اتنا زیادہ سالن۔" وہ بوکھلا کر بولی۔

"یہ زیادہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسے ختم کرو۔" اس نے حکم دیتے ہوئے کہا تو ماہی نے بے بسی سے اپنی پلیٹ کو دیکھا اور کھانا شروع کردیا۔

احمد کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھری تھی۔ مگر اس نے خود کو کمپوز کرکے سنجیدگی سے ساری توجہ کھانے پر رکھی تھی۔ ماہین اس کا ساتھ دے رہی تھی اور اس نے بھی جان بوجھ کر زیادہ کھانا کھایا تاکہ وہ آرام سے کھاسکے۔

"واہ' واہ.... مزا آگیا بہت اچھا کھانا بنایا ہے تم نے' بڑی لذت ہے تمہارے ہاتھ میں۔ بڑے عرصے بعد کسی عورت کے ہاتھ کا بنا کھانا کھایا ہے۔"

"تو کیا آپ ہوٹل سے کھاتے تھے؟" ماہین نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں خود پکاتا تھا۔ ابا جان ہوٹل کا کھانا کہاں کھا سکتے ہیں۔ ویسے اب میں خاصا ایکسپرٹ ہوگیا ہوں کوکنگ میں' کافی چیزیں بنالیتا ہوں۔"

"اچھا...." ماہین نے بے حد حیرانی سے پوچھا تھا۔

"تمہیں اتنی حیرانی کیوں ہورہی ہے؟"

"کیونکہ میں نے آج تک کبھی کسی مرد کو کوکنگ کرتے نہیں دیکھا ہے۔"

"ٹی وی میں تو دیکھا ہوگا۔" احمد ہنس کر بولا۔

"ٹی وی میں تو دیکھا ہے' میں گھر کی بات کررہی ہوں۔"

"اوہ.... پھر تو آپ کو گھر میں کوکنگ کرکے دکھانا ہی ہوگی۔ کل چھٹی ہے اور میں صبح آپ کو ناشتہ بنا کر کھلاؤں گا۔"

"مگر مجھے اچھا نہیں لگتا۔ عورت کی موجودگی میں مرد کا کچن سنبھالنا۔" ماہین نے کہا تو اس نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

"عورت اگر گھر اور گھر سے باہر دونوں جگہ کام کرسکتی ہے تو مرد کیوں نہیں بھئی' ویسے بھی میں گھر میں کام کرنا خلاف شان نہیں سمجھتا۔"

"آپ کی سوچ تو بہت اچھی ہے۔" اس نے پہلی بار تعریف کی تھی' احمد کو بہت اچھا لگا تھا۔

"آپ سارا دن کیا کرتی رہیں؟" احمد نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ فراغت' بس گھر کا سارا کام تو ماسی نے ہی کیا تھا۔ میں نے بس کھانا بنایا ہے۔"

"اس کا مطلب آپ بور ہوتی رہیں؟"

"نہیں' ہاں فارغ بندہ بور تو ہوتا ہے ناں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بھی سچ بول گئی تھی۔

"ظاہر ہے' اور بوریت دور کرنے کا کوئی طریقہ تو ضرور سوچنا چاہیے' کیوں؟"

"جی...." وہ اتنے دوستانہ انداز اور بے تکلف لہجے میں بات کررہا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر ہی سہی' اس کے ساتھ شامل گفتگو تھی۔

"جاب کرنا چاہوگی؟" احمد کے سوال پر وہ چونکی۔ آنکھوں میں بے اختیار چمک آئی تھی۔

"آپ' آپ اجازت دیں گے؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بالکل' میری طرف سے اجازت ہے۔" اس نے بڑی فراخ دلی سے اسے اجازت دی تھی۔ ماہین نے کچھ حیرانی سے اسے دیکھا۔

"میں نے اس شخص کے ساتھ کبھی اچھا رویہ نہیں رکھا۔ ہمیشہ بدگمان رہی لیکن اس نے بڑی محبت اور تحمل سے میرے رویوں کو برداشت کیا' یہ دوسروں سے کتنا مختلف ہے۔" وہ سوچوں میں ڈوب گئی تھی۔ احمد کب اٹھ کر چلا گیا۔ اسے خبر بھی نہ ہوئی۔ اس نے گہرا سانس لے کر برتن سمیٹے۔ ٹیبل صاف کی اور جب وہ اخبار سمیٹ رہی تھی تو یکدم نظر اس شہ سرخی پر جا پڑی تھی۔

"مفرور مجرم کاشف احمد کو گرفتار کرلیا گیا۔ اس نے ٹھٹک کر دوبارہ خبر کو پڑھا۔ پھر دوبارہ اور سہ بارہ.... کاشف کی خبر کے ساتھ اس کی تصویر بھی تھی۔ بڑھی ہوئی شیو۔ کمزور جسم' اندر کو دھنسی آنکھیں۔

"ماہی یار! میں نے...." احمد بڑے دوستانہ سے موڈ میں کچھ کہتا ہوا باہر نکلا تھا مگر ماہین پر نظر ڈالتے ہی ٹھٹک گیا تھا۔ وہ اخبار اٹھائے کھڑی تھی اور اس کی نظریں جیسے کسی خبر پر جمی تھیں۔ "کیا پڑھ رہی ہو اتنے غور سے؟" اس نے تھوڑا آگے ہوکر دیکھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"ماہین۔" اس نے کانپتے ہاتھوں کو تھاما۔

"یہ' یہ کاشف ہے یہ.... کاشف.... مجھے اس سے ملنا ہے۔ مجھے...." احمد نے ساکت ہوکر ماہین کے چہرے کو دیکھا جو شدت جذبات سے سرخ ہو رہا تھا۔ احمد کو دھچکا لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرب نواز اکرم تو ہر روپ' ہر انداز اور ہر رنگ میں پیاری لگتی ہے۔ ضروری تو نہیں کہ مہندی کے دن صرف سبز اور پیلا رنگ ہی پہنا جائے۔ میں تو گھسا پٹا فیشن کرہی نہیں سکتی ہوں۔"

ڈارک میرون اور کوپر امتزاج والی بے حد خوب صورت امبرلائن شرٹ اور تنگ پاجامے میں وہ بہت حسین اور مغرور لگ رہی تھی۔ اس کی ساری سہیلیاں' مہمان خواتین اور آیان کی طرف سے آنے والے مہمان سبھی نے اس کی بہت تعریف کی تھی اور اسی لیے وہ گردن اکڑائے بڑے غرور سے سبھی کو دیکھتے ہوئے اپنے تعریفوں پر خود بھی شوخ ہوگئی تھی۔

"آیان بہت لکی ہے' جو اسے میرب جیسی لڑکی ملی ہے۔" اس کی سہیلی نے بڑے خوشامدی انداز میں' اس کے سسرالی رشتے داروں کو جتایا تھا۔

"ارے واہ۔ ہماری نظر میں تو میرب بہت لکی ہے۔ جو اسے آیان جیسا ڈیشنگ اور ہینڈسم شوہر مل رہا ہے۔ آیان کے لیے اتنے رشتے آئے تھے کہ ہمیں تو سلیکشن مشکل ہوگئی تھی۔ وہ تو خود آیان نے میرب کو پسند کرلیا۔" اس کی خالہ ساس جتا رہی تھیں۔

میرب نے چونک کر بغور انہیں دیکھا۔ بڑا زعم تھا انہیں بھی اپنے بھانجے پر۔ "ارے بھئی' دولہا اور دلہن دونوں ہی ماشاءاللہ بہت خوب صورت ہیں۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔ بہت پیاری جوڑی ہے۔"

عالیہ واسطی نے ہنستے ہوئے ماحول کی سنجیدگی اور چہروں پر پھیلے تناؤ کو محسوس کرکے گویا معاملہ رفع دفع کیا تھا۔ مگر یہ بات میرب کے دل میں اتر گئی تھی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آیان سمیت اس کے خاندان والوں کو اچھی طرح بتائے گی کہ کون زیادہ اسمارٹ اور خوب صورت ہے اور میرب کو آج تک کبھی کسی نے کسی کے بھی مقابلے میں نیچا دکھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور اب آیان کی سبقت.... اس کا موڈ سارے فنکشن میں بگڑا بگڑا سا تھا' حالانکہ آیان بہت خوش تھا اور اس نے کئی بار میرب کے قریب ہوکر سرگوشی کرنے کی کوشش بھی کی تھی' مگر میرب نے غیر دلچسپی سے محض ہوں ہاں ہی کی تھی۔ اور اسے آیان نے اس کی شرماہٹ سمجھ کر نظر انداز کردیا تھا۔

وہ حجلۂ عروسی میں بیٹھی تھی۔

"اف میرے خدا! آج تو تمہارا ہزبینڈ بے ہوش ہو جائے گا۔" اس کے کانوں میں پارلر والی کی آواز گونجی

تھی۔ صبح سے رات تک بیٹھے ہوئے اپنے حسن کی وہ اس قدر تعریفیں سن چکی تھی کہ اب تو جیسے پتھر پر لکیر تھا کہ آیان بھی اسے اتنا ہی سراہے گا۔ اس نے بغور چاروں جانب دیکھا۔

"ہوں ٹیسٹ تو بڑا اچھا ہے۔" کمرا بہت ہی خوب صورتی سے سجا تھا۔ ہر ہر چیز میں نفاست اور خوب صورتی کے ساتھ ساتھ امارت نمایاں تھی۔ اسے اپنے قیمتی اور بے حد اسٹائلش جہیز کے فرنیچر پر فخر محسوس ہوا تھا۔ جو اس وقت کمرے کی شان و شوکت بڑھا رہا تھا۔

"ہاں ارشی' اوہ یار' تھینک یو' تھینک یو ویری مچ' بس بس اتنی زیادہ تعریفیں نہ کیا کرو۔ اچھا..." وہ موبائل پر کسی سے بات کرتے ہوئے کمرے میں آیا۔ میرب سنبھل کر بیٹھ گئی تھی۔

"بالکل یار! تھینک یو اوکے بائے۔" وہ کان سے موبائل لگائے خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے کنگھی کر رہا تھا۔ موبائل ڈریسنگ پر رکھا۔ اس نے ایک آخری نظر دوبارہ آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر ڈالی۔

"اُفوہ! آج تو میں بہت تھک گیا ہوں۔ اُف میری گردن۔" وہ اپنی گردن کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"ارے یہ تم کیسے بیٹھی ہو۔ اتنا بوجھ لاد کر جاؤ چینج کر کے آؤ۔ ایزی ہو جاؤ۔"

آیان کی اگلی بات نے گویا اس کے سر پر بم دے مارا تھا۔ اس نے حیرت سے اسے گھورا' مگر وہ تو اپنی شیروانی کے بٹن کھولنے میں مصروف تھا۔ اس نے خفگی سے اسے گھورا۔

"آیان..... میرا گفٹ۔" اس نے اس بہانے سے اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ارے یار! تمہارا گفٹ بھولا نہیں ہوں۔ میری دراز میں ہے مگر تم پہلے ایزی ہو جاؤ۔ مجھے تو ڈر ہے۔ اتنا بھاری جوڑا اور یہ زیورات' میک اپ ہم تم تھک کر بیمار ہی نہ پڑ جاؤ۔" آیان کی بات پر اس کا خون کھول گیا تھا۔ اس نے غصے سے گہرا سانس لیا اور ڈیڑھ لاکھ کا لہنگا گھسیٹ کر بیڈ سے نیچے اتر گئی۔

"یار! آج تو ہر بندے نے میری تعریف کی ہے۔ ہر لڑکی مجھے دیکھ رہی تھی۔ بلکہ خواتین کی نظریں بھی مجھ سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ میں اسٹیج پر بیٹھا ان کی باتیں سن کر ہنس رہا تھا۔" اس نے اب تک میرب کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی ہی ذات کے نشے میں گم تھا۔

"میری بھی ہر شخص تعریف کر رہا تھا۔ عورتیں تو عورتیں مردوں کی نظریں بھی مجھ پر ہی تھیں۔" میرب کب پیچھے رہنے والی تھی۔ اس کے لہجے پر آیان نے چونک کر اسے دیکھا۔

"آں ہاں' ہاں واقعی۔ تم بہت اچھی لگ رہی تھیں نا۔" وہ بے ساختہ چونکی۔

"لگ رہی تھی؟ یعنی اب نہیں لگ رہی ہوں۔" اس نے پلٹ کر بغور اسے دیکھ کر پوچھا تھا۔

"اب بھی لگ رہی ہو۔ بھئی تم بھی خوب صورتی میں مجھ سے کم تو نہیں ہو۔ اسی لیے چھوڑو اس بحث کو' یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔" وہ ہنس کر اس کے قریب آ کر اسے بڑے پیار سے دیکھتا ہوا گویا اعتراف کر رہا تھا۔

میرب مسکرا دی۔ وہ اس سے کچھ اور سننا چاہتی تھی مگر وہ لاپروائی سے کندھے جھٹک کر ڈریسنگ روم میں چلا گیا تھا۔ میرب کا دل جل کر رہ گیا۔ وہ غصے سے نوچ نوچ کر اپنے زیورات اتارنے لگی۔ رگڑ رگڑ کر میک اپ صاف کرتے ہوئے اسے حقیقتاً رونا آ گیا تھا۔ اتنا قیمتی میک اپ' دو گھنٹوں کی محنت اور پینتیس ہزار روپیہ' سب خاک میں مل گیا تھا۔

"تم سمپل زیادہ اچھی لگتی ہو۔" وہ باہر آئی تو آیان نائٹ ڈریس میں تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

"آرام کرو یار! بہت تھک گئی ہو نا۔" وہ اس کی خاموشی کا مطلب اور ہی سمجھا تھا۔ میرب کا موڈ آف تھا۔ وہ خاموشی سے چپ چاپ بستر پر لیٹ گئی تھی۔

"میرب! کیا بات ہے بھئی۔ خاموش کیوں ہو؟"

آیان نے اس کی غیر معمولی سنجیدگی پر چونک کر پوچھا۔ وہ اتنی خاموش طبع تو نہیں تھی۔

"تھک گئی ہوں۔ پلیز سونے دو۔" اس نے بیزار' تھکے ہوئے انداز میں کہہ کر کروٹ بدل لی تھی۔ آیان نے گہرا سانس لے کر اسے دیکھا۔

"عجیب لڑکی ہے۔ سمجھتی کیا ہے خود کو جیسے میں اس کے لیے مرا جا رہا ہوں۔" آیان نے نائٹ بلب جلایا اور بڑبڑاتا ہوا لیٹ گیا تھا۔

"بڑا آیا شہزادہ گلفام' مجھے دیکھا تک نہیں' سراہا تک نہیں' تعریف کے دو بول بھی نہیں بولے۔ الٹا اپنی تعریفیں کر رہا ہے' نہ جانے کس کس نے فون کیا تھا۔ اب یہ چاہتا ہے کہ میں بھی اس کی تعریف کروں۔" اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔

"میرب یار! کروٹ تو ادھر بدل لو۔ اب ایسی بھی کیا تھکاوٹ۔" آیان نے چند منٹ اس کے کروٹ بدلنے کا انتظار کیا تھا۔ پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنی جانب پلٹایا تھا۔

"یار! آج تو ہماری ویڈنگ نائٹ ہے۔" اس نے سرگوشی کرتے ہوئے اس کے رخسار کو چھوا۔

"اچھا واقعی' خیال آ گیا تمہیں۔" وہ ناراضی سے منہ پھلا کر بولی۔

"کیا مطلب خیال آ گیا! بھئی یہ تو حقیقت ہے کہ تم میری بیوی بن کر اس وقت میرے کمرے میں موجود ہو۔" اس نے بڑے رومانٹک انداز میں اس پر جھک کر اس کے بالوں میں اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بچوں کی طرح بہلایا تھا۔

"تم نے ایک بار بھی میری تعریف نہیں کی۔ مجھے سراہا نہیں۔ میں کتنی خوب صورت لگ رہی تھی۔ تم نے تو مجھے غور سے دیکھا بھی نہیں ہو گا۔ میرا جوڑا کتنا قیمتی ہے۔ سب نے تعریف کی مگر تم' تم اتنے بور' نفسی اور سڑیل ہو کہ تم نے میری کوئی بھی چیز غور سے نہیں دیکھی۔ تمہیں سوائے اپنے اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔" وہ اچھے خاصے غصے سے بول رہی تھی۔

"غلط' یار اب ایسا بھی کم عقل' کوڑھ مغز نہیں ہوں میں۔ سب کچھ دیکھا ہے میں نے۔ تمہارا ڈریس' جیولری' میک اپ سب بہت اچھا تھا۔ تم بھی بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ جانتا ہوں میں مگر اپنے ویوز تمہارے ساتھ شیئر نہیں کیے۔ کیونکہ مجھے لگا۔ یہ سب کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آیان کی بات پر میرب کا پارہ اور بھی چڑھ گیا تھا۔

"کیوں..... اوہ" بھڑکی۔ "مجھے اپنی ان دیر جنوں لورز سے بھی کم تر سمجھتے ہو تم جن کی دن رات تعریفوں کے پل باندھتے ہو۔ جھوٹی سچی باتیں کرتے ہو اور میرے لیے تو تمہیں جھوٹ بولنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔"

"یار! کہہ تو رہا ہوں نا۔ تم تو ہو ہی خوب صورت' پھر جھوٹی سچی تعریفوں کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن اگر تم پھر بھی مائنڈ کرتی ہو تو میں ضرور تمہاری تعریف کیا کروں گا۔ اگرچہ مجھے صرف تعریفیں سننے کی عادت ہے۔"

"ہاں ہم تم تو دنیا کے واحد خوب صورت ترین انسان ہو نا۔" میرب کے سامنے کوئی خود کو اس سے بڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش کرے۔ یہ اسے گوارا نہ تھا۔ اسی لیے فوراً" تڑخ کر بولی تھی اور جواب دینا تو آیان واسطی کو بھی خوب آتا تھا' مگر موقع کی نزاکت کا احساس کر کے وہ خاموش ہو گیا تھا کہ شادی کی پہلی ہی رات وہ میرب کے ساتھ جھگڑا کیوں کرتا' مگر یہ خاموشی بھی عارضی ثابت ہوئی تھی۔

شادی کے اگلے ہی روز ولیمہ کے فنکشن میں جانے سے پہلے وہ دوبارہ ایک دوسرے کے خلاف صف آراء تھے' کیونکہ آیان واسطی اور میرب نواز دونوں دو انتہاؤں کے باسی تھے اور دونوں ہی اپنی "انا اور میں" کی بلند چوٹی پر کھڑے تھے اور نیچے اترنے کو ان میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا۔ کمرے کے اندر دونوں کے درمیان اپنے اپنے ڈریسز کے حوالے سے بحث ہو رہی تھی اور کمرے سے باہر عالیہ واسطی اپنا سر تھامے بیٹھی آنے والے دنوں کا بخوبی اندازہ کر سکتی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"مجھے ہر صورت میں کاشف سے ملنا ہے۔" ماہین نے اس کا بازو تھام کر بے حد سختی سے کہا تھا۔

"مگر وہ جیل میں ہے اور پولیس اس سے تفتیش کر رہی ہے۔" احمد نے اسے سمجھانے کی ناکام کوشش کی حالانکہ اس کے لہجے انداز اور رویے سے وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ وہ اسے اس کی ضد سے ہٹا نہیں سکے گا۔

"جانتی ہوں۔ پھر بھی پلیز مجھے کاشف سے ملوا دو' پلیز میں نے اب تک تم سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ اور نہ ہی آئندہ کروں گی۔ میری یہ پہلی اور آخری خواہش سمجھ کر مان لو احمد؟"

اس نے بے بسی سے ماہین کو دیکھا۔ وہ ضبط کی کن کڑی منزلوں کو طے کر آیا تھا۔ ضدی انداز میں اس کا بازو تھامے روتے ہوئے اپنی بات کرتی ماہی نہیں سمجھ سکتی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ اس کی بیوی تھی اور ڈیڑھ ماہ کے اس شادی شدہ عرصے میں ایک بار بھی اس نے احمد کے لیے اتنی بے چینی اور اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

احمد کے اندر چھن سے کچھ ٹوٹا تھا' اس نے بے بسی سے ماہین کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں لے جاؤں گا' مگر پہلے نواز انکل سے تو پوچھ...!

"ان سے میں پوچھ لوں گی۔ تم فکر مت کرو۔" اس نے بے تابی سے بات کاٹی

"ٹھیک ہے۔"

"تو پھر کب چلیں؟" وہ جیسے اڑ کر اس تک پہنچنے کو تیار تھی۔

"جب تم کہو گی' ابھی چلیں؟" اس نے پل بھر میں فیصلہ کیا تو ماہین نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"ہاں چلیں۔" وہ دونوں جب تھانے جانے کے لیے نکلے تو اس وقت دن کے اڑھائی بج رہے تھے۔ پورا راستہ وہ بہت خاموش رہی تھی۔ کچھ پریشان' کچھ گم صم اور کچھ فکر مند سی۔ کئی بار احمد نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تھی' مگر وہ محض ہوں ہاں کر رہی تھی۔ غیر دلچسپی اس کی ہر ہر ادا سے واضح تھی۔ اسی لیے احمد نے دوبارہ اسے مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کی۔

تھانے جا کر پولیس والوں کے رویے اور نازیبا سلوک پر اسے اور بھی غصہ آیا تھا۔

"آپ کون ہیں جی...؟" پہلا سوال ہی پتھر کی طرح پھینکا گیا تھا۔

"اس مجرم سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" لہجہ اور انداز دونوں ہی بہت برے تھے۔

"تعلق بتائیں۔ رشتہ واضح کریں۔" تمام تر وضاحتوں کے بعد بھی وہ ان سے کاشف کا کوئی مجرمانہ سا تعلق نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ احمد نے غصے اور جھنجلاہٹ سے ڈی ایس پی صاحب کا نمبر ملایا۔

"اوئے جناب! آپ تو غصے میں آ گئے ہیں۔ اتنا غصہ۔ تفتیش کرنا تو ہماری ڈیوٹی میں شامل ہے۔" اسے ڈی ایس پی صاحب سے بات کرتے دیکھ کر وہ انسپکٹر فوراً" ٹریک پر آ گیا تھا۔

"آئیں جناب آئیں۔" وہ انہیں لے کر اپنی ڈھلکتی توند پر زبردستی بیلٹ چڑھاتا ہوا حوالات کی طرف آ گیا تھا۔

"اوئے کاشف! اٹھ اوئے۔ تیری ملاقات آئی ہے۔" اس نے جنگلے پر زور سے اپنی اسٹک ماری تھی۔ ماہین کی نظر فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھے سر جھکائے شخص پر جا ٹکی تھی۔ جس نے انسپکٹر کی آواز سن کر بے ساختہ اپنا سر اوپر اٹھایا تھا۔

"اوئے ادھر آ' یہ دیکھ کون آئے ہیں۔" انسپکٹر کے لہجے میں چھپے طنز اور معنی خیزی کو احمد نے فوراً" محسوس کر لیا تھا۔

"ماہین! مجھے معاف کر دو۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارے ساتھ بہت دھوکہ کیا ہے اور اس کی سزا بھی مجھے مل گئی ہے۔ دیکھو نا آج میں خالی ہاتھ ہوں بالکل خالی ہاتھ۔ پولیس مجھ سے روپیہ' پیسہ زیورات نکلوانا چاہتی ہے' مگر میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ دیکھو تو میرے ہاتھ خالی ہیں۔ مجھ سے سب کچھ رانی

نے چھین لیا ہے۔"

وہ خالی ہاتھ ماہین کے آگے پھیلائے روتا ہوا' گڑگڑاتا ہوا بے حد قابل رحم لگ رہا تھا۔ ماہین نے یکدم سلاخوں کو تھام لیا۔

"یہ تو ہونا ہی تھا کاشف! اسے کہتے ہیں مکافات عمل۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔

"تم صحیح کہتی ہو ماہین! میں نے تمہارے ساتھ بہت برا کیا ہے۔ میں بہت گرا ہوا اور گھٹیا' حقیر انسان ہوں۔ میں تو تم سے نظر ملا کر بات کرنے کے قابل بھی نہیں ہوں۔" وہ سلاخوں سے باہر ہاتھ نکال کر یکدم ہی گھٹنوں کے بل جھک گیا تھا اور ماہین کے پاؤں تھام لیے تھے۔

"مجھے معاف کر دو ماہی! مجھے..." زار و قطار روتے ہوئے وہ اپنی تمام غلطیوں کا اعتراف کر کے معافی مانگ رہا تھا' احمد نے ماہین کو دیکھا۔ جس نے اپنے پاؤں اس کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کروا لیے تھے اور سپاٹ چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں' میں تمہارا سارا نقصان پورا کر دوں گا ماہین! تم پولیس والوں سے کہو یہ مجھے نہ ماریں۔ میں محنت کر کے تمہاری ایک ایک پائی واپس کر دوں گا۔ میں تمہارا سارا پیسہ..."

"چپ ہو جاؤ۔" یکدم وہ اس کی بات کاٹ کر چیخی "بار بار پیسوں کا نام مت لو۔ تم نے میرا اعتماد' اعتبار توڑا ہے' لیکن قدرت نے میری ساری محرومیوں کی تلافی کر دی ہے۔" اس نے یکدم احمد کو دیکھا۔

"یہ احمد ہیں۔ میرے شوہر' جس رات میرا تم سے نکاح ہونا تھا۔ میرا ان سے نکاح ہوا اور اب میں بہت خوش ہوں' بہت مطمئن۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ تم نے مجھے چھوڑ دیا اور مجھے احمد مل گئے۔ میں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں تمہیں بہت سخت اور عبرتناک سزا دلواؤں گی' مگر آج تمہیں یوں نشان عبرت بنا دیکھ کر مجھے تم پر ترس آ رہا ہے۔ میں نا سمجھ تھی۔ تم تو میری کسی گناہ کی سزا تھے اور کسی نیکی کا انعام یہ ہے۔ آئیں احمد چلیں!" اس نے بے حد اعتماد کے ساتھ احمد کا ہاتھ تھام کر کاشف پر آخری نظر ڈالی اور عقوبت خانے کی چار دیواری سے باہر نکل آئی۔

"تھینک یو ماہین!" احمد نے اس کا ہاتھ تھام کر بے حد سرشاری سے کہا تھا اور ماہین بے ساختہ مسکرا دی تھی' اس کے اندر گڑی کیل' جس کی چبھن نے اسے لہولہان کر رکھا تھا' آج نکل گئی تھی۔ جس طرح شہزادی کے بدن میں گڑی کیل نے اسے مردہ کر دیا تھا کہ وہ سانس تو لے سکتی تھی' مگر زندگی کی تمام دلچسپیوں سے کٹ کر صرف ایک بیڈ پر لیٹی رہتی تھی۔ اسی جادوئی کہانی کی جادوئی شہزادی کی طرح وہ بھی بظاہر زندہ تھی' مگر بدن میں گڑی کیل پل پل ٹھکرائے جانے کی اذیت سے دوچار کرتی تھی۔ اپنی ذات پر سے اس کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔

احمد کی محبت' اعتماد اور توجہ بھی اسے اس احساس ندامت سے نہیں نکال سکتی تھی' مگر اب کاشف سے مل کر اسے دیکھ کر جیسے بدن میں بسی ساری چبھن کا خاتمہ ہو گیا تھا۔

کاشف کو معاف کرنے کے بعد ایف آئی آر بھی واپس لے لی تھی اس نے' وہ جیل سے تو رہا ہو گیا تھا مگر اپنے ضمیر کا قیدی بن گیا تھا اور یہی اس کا انتقام تھا۔

"ماہین بہت اچھی لڑکی ہے۔ اس نے ثروت سے صبر اور برداشت سیکھی ہے۔ بہت ملنسار' خدمت گزار کیونکہ ہمدردی اور رحم دلی اس کے خون میں شامل ہے..."

نواز اکرم نے اپنی بیٹی کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا اور اب اس کے ساتھ رہتے ہوئے اسے بھی اس کی خوبیوں کا اچھی طرح ادراک ہو رہا تھا۔ وہ بابا جان کی چہیتی بہو تھی۔ ان کی بہت خدمت کرتی تھی۔ اباجان کی طرف سے اب اسے کوئی فکر' کوئی پریشانی نہیں تھی۔

انسان مطمئن اور مسرور ہو تو سچی خوشی چہرے پر جگمگاہٹ پیدا کرتی ہے' اور یہ جگمگاہٹ آج کل احمد

اور ماہین دونوں کے چہروں پر دیکھی جاسکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا مسئلہ ہے تم دونوں کے ساتھ؟ ڈیڑھ ماہ کی شادی شدہ لائف میں میرب چار بار ناراض ہو کر اپنے گھر گئی ہے اور تم میری ضد پر اسے منانے جاتے ہو۔ یہ کیا رنگ ڈھنگ اپنایا ہوا ہے تم دونوں نے؟ آیان تم میری مشکل کو سمجھ نہیں سکتے ہو۔ تمہارے بابا بھی تمہارے لیے بہت پریشان ہیں۔ ایسا تماشا ہمارے خاندان میں پہلے کبھی نہیں ہوا۔"

عالیہ واسطی کے صبر کا پیمانہ آج جواب دے گیا تھا۔ بہت بار خاموشی سے وہ ان دونوں کی جھڑپ سن کر نظر انداز کر دیتی تھیں، مگر رات کو ہونے والا جھگڑا معمولی سی بات سے شروع ہوا تھا اور آہستہ آہستہ اتنا بڑھا کہ جھگڑے کی آواز کمرے سے باہر آنے لگی تھی۔ تب وہ ضبط نہ کر سکیں اور ان دونوں کے بیچ آگئی تھیں۔

"تم دونوں کا مسئلہ کیا ہے۔ نئے نویلے شادی شدہ ہو کر بھی یوں لڑتے ہو جیسے برسوں کا ساتھ ہو اور اب ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا بھی حوصلہ نہیں ہے۔"

"آنٹی! آیان بہت پوزیسیو ہے۔ بہت نیرو مائنڈڈ ہے۔" میرب نے خفگی سے اسے بتایا۔

"جی نہیں، میں نیرو مائنڈڈ نہیں ہوں، بلکہ میرب کو اپنے دوستوں سے فرصت نہیں ہے، ہر وقت فون آتے ہیں ان کے۔ میں نے کہا بھی ہے کہ اب تم ان تمام چھچھورے، آوارہ لوگوں سے جان چھڑالو مگر۔"

"تم بھولے ہو اپنی آوارہ سہیلیوں کو ؟ دن رات ان کے فون آتے ہیں۔ تب مجھے بھی ایسے ہی تکلیف ہوتی ہے۔"

میرب نے اس کی بات کاٹ کر دوبدو جواب دیا تھا اور جس انداز اور لہجے میں دیا تھا، عالیہ واسطی کے طوطے اڑ گئے تھے۔ اس انداز میں تو کبھی انہوں نے خود بھی اپنے بیٹے سے باز پرس نہیں کی تھی، حالانکہ وہ آیان واسطی کی آزادانہ روش اور فلرٹ بازیوں سے کسی نہ کسی حد تک آگاہ بھی تھیں۔

"میں مرد ہوں۔ لڑکوں کو کیا فرق پڑتا ہے اور ویسے بھی میری دوستی صرف اور صرف دوستی تک ہی محدود ہے۔"

آیان نے ہٹ دھری سے اپنی غلط بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے مفروضہ گھڑا تھا اور میرب کو اس غلط مفروضے پر مزید طیش آیا تھا۔

"اور میری بھی دوستی صرف اور صرف دوستی تک ہی محدود ہے جناب! اور جب مجھے تمہاری دوستیوں پر اعتراض نہیں ہے تو تمہیں میرے تعلقات پر کیا تکلیف ہے۔" عالیہ واسطی نے حیرانی سے میرب کو دیکھا۔

"دیکھو! میں یہ برداشت نہیں کر سکتا ہوں کہ تمہارے پرانے فرینڈز اب بھی تمہیں وقت بے وقت کال کریں اور ڈسٹرب کریں، کیونکہ اب تمہارا وقت میرا ہے۔" آیان واسطی واقعی بہت پوزیسیو تھا۔ اپنی چیزوں اور خود سے منسلک لوگوں کے بارے میں۔

"جی اور بالکل یہی بات میں بھی کہتی ہوں کہ تمہاری فضول فرینڈز فون کر کے ڈسٹرب نہ کریں۔ میں بھی یہ بات برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ اس سے بڑھ کر اونچی آواز میں چیخ سکتی تھی اور چیخ رہی تھی۔

"اف..... بس کرو تم دونوں، چیخ چیخ کر لڑ رہے ہو۔ ایک دوسرے کو طعنے دے رہے ہو، جہالت کی حد ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ تم دونوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو۔" عالیہ واسطی دونوں کی باتیں اور انداز دیکھ کر پہلے حیرت زدہ تھیں پھر غصے میں آگئی تھیں۔ ان کے ڈانٹنے پر آیان تو یکدم خاموش ہو گیا تھا مگر میرب کو ان کا ڈانٹنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"آنٹی! آپ اپنے بیٹے کو سمجھائیں۔ یہ اس قدر فلرٹ انسان ہے۔ مجھے پہلے اندازہ ہوتا تو میں کبھی اس سے شادی نہ کرتی۔" اس نے انگلی اٹھا کر آیان کی طرف بڑے تنفر سے اشارہ کیا تھا۔

"اور مجھے بھی اگر تمہاری آوارگیوں کا علم ہو جاتا تو تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ تم مجھ سے محبت کی دعوے دار ہو مگر محبت کرتی نہیں ہو۔" آیان کا جواب اسے ساکا گیا تھا۔ جواباً پھر خوب زوردار جھڑپ ہوئی تھی۔ عالیہ واسطی کے بیچ بچاؤ کے باوجود اور نتیجہ ہمیشہ کی طرح وہی تھا۔

"اب میں اسے لینے نہیں جاؤں گا۔ مائی فٹ! سمجھتی کیا ہے خود کو۔ آنا ہوگا تو آجائے گی خود ہی۔" عالیہ واسطی کے سمجھانے پر اس نے صاف صاف جواب دے دیا تھا اور اب عالیہ واسطی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیا کریں، میرب خود سے تو کبھی نہیں آئے گی۔ انہیں اچھی طرح ان ڈیڑھ دو ماہ میں اس کی عادتوں کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اوپر سے اسے سارا علوی کی مکمل شہہ بھی حاصل تھی۔

"اب کیا کیا جائے۔ میرا ہیرے جیسا بیٹا مٹی میں رل گیا ہے۔ قدر نہیں کی میرب نے اس کی۔" وہ آہ بھر کر افسوس سے کہتیں تو انور واسطی طنز سے مسکرا دیتے تھے۔

"تمہارے ہیرے جیسے بیٹے کو اپنی قدر کروانی بھی نہیں آئی عالیہ بیگم! اس کی ضد تھی یہ کہ شادی کروں گا تو صرف اور صرف میرب نواز سے اب بھگتے، صبر اور تحمل تو دونوں کے اندر نہیں ہے۔ پھر کیسے گھر بسائیں گے دونوں۔"

اور وہ انور کی اس بات سے سو فیصد متفق تھیں۔ کوئی حل کوئی سلجھاؤ نظر بھی نہیں آتا تھا۔ اس بار تو آیان نے صاف صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اب میرب کو منانے نہیں جائے گا اور اس کے اس انکار پر عالیہ واسطی بہت ڈسٹرب تھیں۔

☼ ☼ ☼

"چاہتا کیا ہے وہ، ہر دوسرے روز تمہیں ذلیل کر کے، لڑ جھگڑ کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ سمجھ کیا رکھا ہے اس نے تمہیں۔ اب تم نہیں جاؤ گی اس کے گھر۔ اس بار تم دیکھنا میں اسے سیدھا کرتی ہوں۔"

سارا علوی کو جو کچھ میرب نواز نے بتایا تھا۔ اسے سن کر وہ بے حد غصے میں آگئی تھی۔ سارا کا مارے طیش کے برا حال تھا۔ میرب اس وقت بے حد معصوم بنی، بے بسی اور لاچاری کی ایکٹنگ کرتے ہوئے اپنی ماں کی تمام ہمدردیوں کو سمیٹ رہی تھی۔

"ماما! میں تو آپ کی اور بابا کی عزت کے لیے مجبور ہو کر خود پر ضبط کرتی ہوں۔ ورنہ آیان جیسا سلوک میرے ساتھ کرتا ہے۔ میں کبھی بھی اس کے ساتھ نہ رہوں۔"

"مجھے اندازہ تھا اور میں نے یہ بات تمہیں پہلے بتا بھی دی تھی کہ تم غلط لڑکے کا انتخاب کر رہی ہو۔ وہ صرف دیکھنے میں خوب صورت ہے۔ ورنہ اس کی اکڑ اور غرور تو مجھے پہلے دن سے نہیں بھایا تھا۔ پتا نہیں تم نے کیوں اسے سلیکٹ کر لیا۔ ورنہ تمہارے لیے کیا رشتوں کی کمی تھی۔"

سارا نے اسے خفگی سے جتایا تھا۔ آیان کی شہرت لڑکیوں کے حوالے سے اچھی نہ تھی۔ نواز یہ بات جانتا تھا مگر میرب کو بتا نہیں سکا۔ کیونکہ میرب سارا کی بات پر تو یقین کرتی تھی مگر نواز کی بات پر وہ کان نہیں دھرتی تھی۔

اس کے اپنے باپ سے تعلقات بہت رسمی سے تھے۔ وہ ماہین کی طرح باپ سے قریب نہ تھی۔

"ماما! میں آیان سے پیار کرتی ہوں۔" اس نے ماں کی لعن طعن پر ہلکے سے جتایا تھا۔

"ہوں پیار۔ اچھی محبت ہے بھائی۔ ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی تمہیں برداشت نہیں ہوتی ہیں۔ مجھے دیکھو مجھے تمہارے بابا سے کوئی محبت نہیں ہے مگر پھر بھی میں ان کی بہت سی باتیں سہہ جاتی ہوں۔"

میرب نے حیرانی سے ماں کو دیکھا۔ "بے چارے بے ضرر سے بابا، ماما ان کی ہر بات برداشت کرتی تھیں۔ ماما کا یہ اسٹیٹمنٹ بالکل غلط تھا۔ الٹا بابا ہی ماما کی ہر بات کو برداشت کرتے تھے، جبکہ اس کے اور آیان کے بیچ بالکل الٹ تھا۔ آیان کو بھی اس کے گھر والوں، دوستوں اور جاننے والوں خصوصاً" لڑکیوں نے سر پر

چڑھایا ہوا تھا اور ایسا ہی حال میرب کا بھی تھا۔

"بہرحال سوچ لو۔ اگر اب بھی تم آیان کے منانے پر چلی گئیں تو یہ روز کا تماشا بن جائے گا۔ تمہارے باپ کو تو اسی بات پر اعتراض ہے کہ تم آیان سے لڑتی کیوں ہو؟"

"میں آیان سے لڑتی ہوں..... ماما! وہ خود مجھ سے جھگڑا کرتا ہے۔" میرب نے ماں کی بات پر غصے سے دہرایا تھا۔

"میں جانتی ہوں یہ بات مگر سب کو یہ سمجھانا تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔ اسی لیے جیسا میں کہوں، ویسا ہی کرو۔ میں اس بار آیان کو نہیں اس کے والدین کو بلاؤں گی، عالیہ واسطی اپنے بیٹے کی گارنٹی دے اور تمہیں خوش رکھنے کا وعدہ کرے۔ تب ہی میں تمہیں بھیجوں گی۔" سارا کی بات پر اس نے الجھ کر ماں کو دیکھا۔

"مگر ماما! عالیہ آنٹی یا انور انکل کو اس معاملے میں انوالو کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم خود۔"

"ضرورت ہے۔ تم بچی ہو۔ بزرگوں کی اہمیت کو نہیں سمجھتی ہو۔ کل کلاں کوئی مسئلہ ہوتا ہے تو میں عالیہ واسطی کو پکڑ لوں گی اور اسی خوف سے آیان بھی دب کر رہے گا۔ عزت، بے عزتی کے معاملے میں بڑے زیادہ حساس ہوتے ہیں۔ نوجوانوں کو کیا پروا۔"

سارا کی بات پر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ بات تو واقعی ٹھیک تھی۔ آیان واسطی کو اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ ان کی لڑائی سے لوگوں میں کیا چہ مگوئیاں ہوتی ہیں اور ان کے جھگڑے خاندان بھر میں گرما گرم موضوع بنے ہوئے ہیں۔ البتہ عالیہ آنٹی کو اس نے اس معاملے میں بہت پریشان دیکھا تھا اور آیان جتنی بار بھی اسے واپس لینے آیا تھا، عالیہ آنٹی کے کہنے پر ہی آیا تھا۔

"ٹھیک ہے ماما! آپ جیسا کہیں گی، میں ویسا ہی کروں گی۔" تجربہ جیت گیا تھا، اس نے مسکرا کر اپنی ناتجربہ کار بیٹی کو دیکھا۔ اب وہ زیادہ بہتر طریقے سے آیان واسطی سے اپنی بیٹی کے لیے شرائط منوا سکتی تھی۔

"تم آیان کو فون نہیں کرو گی اور نہ ہی اس کا فون ریسیو کرو گی۔ اسے اپنی بھرپور ناراضی دکھاؤ۔ اب بات میرے اور عالیہ کے درمیان ہو گی، اوکے۔"

"اوکے مام....." اس نے سارا کے گلے میں بازو ڈال کر لاڈ سے اس کا گال چوم کر بہت فرماں برداری سے کہا تو سارا خوش ہو گئی۔

"میری جان۔ اسی لیے تو میں کہتی ہوں، میرب میری بیٹی ہے۔ کیونکہ میرب میری ہر بات سمجھتی ہے جانتی ہے اور مانتی ہے۔" اس نے پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تو میرب نے فخر سے گردن اکڑائی۔

"تھینک یو مام۔"

☼ ☼ ☼

"رضا! مجھے تو نواز بھائی پر بہت رحم آتا ہے۔ بے چارے ایک بیٹی کی مشکل کو حل کرتے ہیں تو دوسری کی پرابلم شروع ہو جاتی ہے۔ اب میرب دوبارہ لڑ جھگڑ کر میکے آئی بیٹھی ہے۔" شہناز نے گرم گرم چائے کا کپ رضا کے سامنے میز پر رکھا اور اسے اطلاع دی۔

رضا نے چونک کر اخبار ایک طرف ہٹایا تھا۔

"عالیہ بے چاری بہت پریشان ہے۔ ابھی شادی کو میرا خیال ہے دو ماہ بھی نہیں ہوئے اور یہ لڑ کر چار دفعہ میکے آ چکی ہے۔ میرے سمیر کو ٹھکرایا تھا نا۔ اچھی سزا مل رہی ہے۔" شہناز نے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

"اوہو شہناز! کسی کی پریشانی سے خوش نہیں ہوتے۔ تمہیں تو شکر کرنا چاہیے کہ وہ تمہاری بہو نہیں بنی ورنہ آج جو پرابلمز عالیہ کو فیس کرنا پڑ رہی ہیں، وہ تمہیں بھگتنا پڑتیں۔ پھر سوچو کیا ہوتا۔" رضا کی بات پر شہناز نے بے اختیار کانوں کو پکڑ لیا تھا۔

"توبہ توبہ، عالیہ کی ہمت ہے جو وہ اس فتنی کو برداشت کر رہی ہے۔ ورنہ میں تو اگلے ہی دن اسے گت سے پکڑ کر نکال باہر کرتی اور سارا نے اسے بگاڑا ہوا ہے۔ ہر غلط کام میں اس کا ساتھ دے کر اس کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ عالیہ کو بلا رہی ہے کہ آ کر بیٹے کی ضمانت دے۔ بھلا یوں بھی ضمانتیں دی جاتی ہیں۔"

شہناز کی معلومات قابل رشک تھیں۔

"میں نواز سے بات کروں گا۔ وہ میرب کو سمجھائے گا۔"

"ہاہا۔" شہناز نے قہقہہ لگایا۔ "ارے میاں! وہ عورت۔ بے چارے نواز کو کیا سمجھتی ہے اور میرب باپ کے سمجھانے پر تو کبھی بھی نہیں مانے گی۔ وہ بالکل ماں جیسی ہے۔"

"پھر بھی آخر کو باپ ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ اس معاملے سے لاعلم ہے۔"

رضا پُرسوچ انداز میں کہہ رہا تھا۔ شہناز نے سر ہلایا۔

"ہاں چلیں کوشش کر کے دیکھ لیں۔ شاید وہ باپ کی بات کو سمجھ لے۔"

رضا نے نواز سے بات کا فیصلہ اسی وقت کر لیا تھا اور نواز کے جواب نے اسے حیران کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہاں اب آپ جائیں اور جا کر بیٹے کی نخریلی بیوی اور ساس سے مذاکرات کریں۔ ان کی شرائط مان کر اپنی انسلٹ کروا کر بہو کو منا کر واپس گھر لے آئیں۔" انور واسطی نے بے حد طنز سے عالیہ کو جتایا تھا کہ عالیہ کو طیش آ گیا۔

"شرائط مانتی ہے میری جوتی۔ میں بھی کوئی گری پڑی عورت نہیں ہوں۔ سارا علوی سے زیادہ امیر اور ایجوکیٹڈ ہوں۔"

عالیہ واسطی نے بھی اب اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا تھا۔ ادھر ادھر سے جو باتیں سننے کو مل رہی تھیں، وہ انہیں چڑانے بلکہ طیش دلانے کو کافی تھیں۔

"اتنا غصہ! بیٹے کا مسئلہ حل نہیں کرنا؟" انور نے بغور اسے دیکھا۔

"نہیں کیونکہ اس بار تو بیٹا خود بھی کہتا ہے کہ وہ روز روز کے ان جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہے۔ میرب خود گئی ہے اور خود ہی آئے گی اب۔"

"مگر عالیہ! اگر میرب نہ آئی تو کتنی باتیں بنیں گی۔ ہم نے شہر بھر کی لڑکیوں کے رشتے ٹھکرا کر تو میرب کا رشتہ لیا تھا۔"

"جب انہیں لڑکی والے ہو کر شرم نہیں آ رہی تو پھر ہم کیوں لحاظ کریں۔ میں تو ہرگز ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

وہ صاف دو ٹوک انداز میں کہہ کر اٹھ گئی تھیں اور انور واسطی پریشانی اور فکر مندی سے بیٹھے رہ گئے تھے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد انہوں نے نواز اکرم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ہیلو!" دوسری جانب سے کچھ دیر بعد فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"ہیلو نواز! انور واسطی بول رہا ہوں۔"

"ارے انور بھائی! کیسے ہیں آپ؟ جناب! بڑے دن کے بعد آج آپ نے بات کی ہے۔ طبیعت کا سنائیں۔" نواز اکرم نے بڑے پُرجوش اور محبت بھرے انداز میں بات کی تھی۔

"اللہ کا شکر ہے نواز صاحب آپ سنائیں، بزنس سیٹ جا رہا ہے۔"

"اللہ کا کرم ہے انور بھائی! آپ نے بہت عرصے سے چکر نہیں لگایا۔ آپ تو کہتے تھے کہ آپ کا گھر، میرا گھر ہے۔ پھر بھول گئے۔"

نواز اکرم نے ڈھکے چھپے لفظوں میں شکوہ کیا تھا۔

"نہیں نواز صاحب! بھولا نہیں ہوں اور آپ کے گھر کو ابھی بھی اپنا ہی گھر سمجھتا ہوں۔ بس یہ بچوں کی وجہ سے کچھ ایسے حالات ہو جاتے ہیں کہ دوریاں بڑھنے لگتی ہیں۔" نواز اکرم پل بھر میں ان کے لہجے میں ڈھکے ہوئے مطلب کو سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے گہرا سانس لیا۔

"بچوں کی لڑائی سے ہم بڑوں کے تعلقات خراب نہیں ہونے چاہئیں انور بھائی!"

"ٹھیک کہتے ہیں آپ نواز صاحب! مگر اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے بچوں کے رویوں میں صبر تحمل اور برداشت پیدا ہو، جو دونوں میں نہیں ہے۔"

انور واسطی بات کرتے کرتے اصل بات کی جانب آگئے تھے۔ نواز کا دل پل بھر کو گھبرایا۔ یعنی اب اصل معاملے پر بات کا وقت آگیا تھا۔

"آیان بیٹا بہت اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا ذہین اور سمجھ دار ہے، پھر بیوی کے معاملے میں اتنا تنگ نظر کیوں ہے۔ میرب نے بہت لاڈ پیار اور آزاد ماحول میں پرورش پائی ہے۔ وہ بہت زیادہ پابندیاں برداشت نہیں کرسکتی ہے۔"

نواز اکرم کو سارا اور میرب نے جو بتایا تھا، وہ اسی بات کو بڑے نرم الفاظ میں ان سے کہہ رہے تھے حالانکہ سارا نے تو آیان کے وہ ظلم و ستم سنائے تھے۔ اور میرب نے جس طرح رو رو کر اپنے سسرال والوں کی تنگ نظری، خشکی فطرت اور کنجوسی کے واقعات سنائے تھے، نواز اکرم کانپ کر رہ گئے تھے مگر بیٹی کے باپ تھے۔ اسی احساس نے لہجہ اور زبان قابو میں رکھا تھا۔

"کیا... کیا کہہ رہے ہیں آپ نواز صاحب! آیان تنگ نظر، خشکی اور قدامت پسند ہے؟ اور یہ یقیناً" آپ کو میرب نے بتایا ہوگا۔ ہے نا۔" ان کے طنزیہ لہجے پر نواز اکرم ٹھٹکا تھا۔ اور فوراً" ہی اثبات میں جواب بھی نہیں دے سکا تھا۔

"انور بھائی! جس کے ساتھ جو سلوک ہوا ہوتا ہے۔ وہی اس کے بارے میں بتا سکتا ہے نا۔ مجھے آیان سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اتنی جلدی بدل جائے گا۔"

"نواز صاحب..." انور واسطی نے اپنے بڑھتے غصے کو بمشکل قابو کیا تھا۔ "آپ کو جو کچھ بھی بتایا گیا ہے، وہ ون سائیڈڈ ہے۔ آیان نے میرب کے ساتھ کیا کیا، یہ تو آپ کو معلوم ہوگیا، مگر میرب نے آیان اور ہم سب کے ساتھ کیا کیا، وہ آپ کو معلوم نہیں ہوگا، اور ہوگا بھی کیسے، ظاہر ہے آپ کی بیٹی خود اپنی زبان سے تو اپنے کارنامے نہیں سنائے گی نا۔ جو کچھ میرب نے ہمارے ساتھ کیا۔ وہ سب آپ کو میں بتاتا ہوں تاکہ آپ دونوں طرف کا معاملہ سن کر فیصلہ کرسکیں اور یقیناً" آپ بہتر فیصلہ کریں گے۔" انور واسطی کے بے انتہا سنجیدہ لہجے میں کچھ ایسا تھا، جو نواز اکرم بے ساختہ ٹھٹکے تھے۔

"میں ضرور سنوں گا انور بھائی! آپ بتائیں مجھے قصوروار کون ہے۔"

"میرب، میرب تمہاری بیٹی..." انور واسطی نے ایک پل بھی سوچے بغیر ٹھک سے جواب دیا تھا، اور پھر نواز اکرم نے بڑے ہی تحمل اور صبر سے انور واسطی کی ایک ایک بات سنی تھی۔ اس دوران کئی بار ان کے چہرے کا رنگ بدلا تھا، ماتھے پر پھیلی شکنوں کا جال مزید گہرا ہو رہا تھا۔ آنکھیں ایک نقطے پر پرسوچ انداز میں جمی تھیں۔

"نواز صاحب! میری کوئی بیٹی نہیں ہے، مگر پھر بھی بیٹی کے باپ کا دل کتنا حساس اور نرم ہوتا ہے، میں جانتا ہوں، اسی لیے میں نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ آپ کا دل نہ دکھے مگر آپ کو ساری صورت حال سچ سچ بتانا ضروری تھا۔ اسی لیے یہ تلخ اور بے ادب گفتگو کرنا پڑی ہے۔ بہرحال یہ بالکل سچ ہے۔ آپ کو میری بات پر یقین نہیں آتا تو آپ دوسروں سے بھی تصدیق کرسکتے ہیں، مگر اتنا سوچ لیجئے گا کہ اس بار میرب کی ضد ہم پوری نہیں کریں گے۔ وہ خود گئی ہے اور خود ہی آئے گی۔ اللہ حافظ۔"

انور واسطی نے بہت ہی مدبر اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنا پیغام نواز کو دے دیا تھا۔ اور اب ریسیور پر ہاتھ دھرے وہ گہری سوچ میں ڈوبے اس کے کہے ایک ایک لفظ کو ذہن میں دہراتے ہوئے اس کی سچائی کو پرکھ رہے تھے۔

"یہ سب جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ میرب اور سارا دونوں کی عادتوں سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ اور میرب کا روز روز لڑ جھگڑ کر گھر آنا، سارا کی حمایت، اف" اس نے پریشان ہو کر اپنا سر تھام لیا۔

"یا اللہ! کتنا بدقسمت ہوں میں۔ ماہی کی طرف سے تھوڑا اطمینان ہوا ہے تو اب میرب۔ کیا کروں میں، کس سے کہوں، ثروت! ہاں ثروت سے یہ سب کہنا بہت ضروری ہے، ورنہ یہ ٹینشن تو میری جان

لے لے گی۔"

وہ سارا سے بات نہیں کرسکتے تھے۔ ابھی وہ ثروت کو فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ رضا کا فون آگیا۔

"کیا مسئلہ ہے یار؟" اس نے چڑ کر گرین بٹن آن کیا۔

"ہیلو نواز! یار کہاں تھے تم، کب سے تمہیں فون کر رہا ہوں مگر تم..."

"ہیلو کے جواب میں اس نے فوراً" اپنے مخصوص لہجے میں اسے لتاڑنا شروع کردیا تھا۔ نواز نے بے ساختہ ایک گہرا سانس لیا۔

"خیریت تو ہے۔"

"خیریت کہاں یار! جب بیٹیاں اپنے سسرال والوں سے لڑ جھگڑ کر میکے آجائیں تو خیریت کہاں ہوتی ہے۔" رضا کی بات نے اسے بری طرح چونکا دیا تھا۔

"کیا مطلب۔ کھل کر کہو رضا، کس کی بات کر رہے ہو۔"

"میرب کی یار! تمہیں پتا نہیں یہ بات معلوم بھی ہے یا نہیں کہ میرب اپنے شوہر سے لڑ کر آئی ہے۔"

"تم یہ بات کیسے... تمہیں کس نے بتایا۔"

"یار! ساری دنیا کو پتا ہے۔ سوائے تمہارے تمہیں تو میرب نے یقیناً" کچھ اور ہی بتایا ہوگا، مگر میں تمہیں اصل حقیقت سے آگاہ کر رہا ہوں، تاکہ تم میرب کو سمجھاؤ اور اس سے کہو کہ وہ خود اپنے سسرال جاکر آیان سے معافی مانگے، ورنہ..." رضا کے بے انتہا سنجیدہ لہجے اور "ورنہ" نے نواز اکرم کو منجمد کردیا تھا۔

"دیکھو اس بار معاملہ صرف میرب اور آیان کے بیچ نہیں ہے۔ عالیہ بھابھی نے بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ میں میرب کو منانے اور لینے نہیں جاؤں گی۔ میرب کو خود آنا ہوگا جبکہ سارا بھابھی کہہ رہی ہیں کہ میرب کی واپسی آیان کے والدین کی موجودگی میں شرائط کے ساتھ ہوگی۔ سارا اور میرب کی من پسند شرائط پر۔ یار خدارا بھابھی کو سمجھاؤ بیٹی والے اتنے رعب داب سے شرائط نہیں منوایا کرتے۔ نہ ہی بیٹے والے مانتے ہیں۔"

رضا کیا کہہ رہا تھا، نواز اکرم کا پورا وجود جھٹکوں کی زد میں تھا۔ ایک پرایا اجنبی بندہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کی بیوی اور بیٹی کیا کیا کر رہی ہیں۔

"نواز... نواز... ہیلو..." دوسری جانب اس کی طویل خاموشی سے گھبرا کر رضا نے اسے زور زور سے پکارنا شروع کردیا تھا۔ نواز نے سر جھٹکا۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

"ہاں... ہاں سن رہا ہوں۔" ہارے ہوئے شکستہ لہجے اور بہت ہی مدھم آواز میں اس نے جواب دیا تھا۔

"یار! میرا مقصد تمہیں پریشان کرنا نہیں تھا۔ نہ ہی تمہیں شرمندہ کرنا ہے، میں تو محض دوستی کا حق نبھا رہا ہوں۔ میرب تمہاری بچی ہے۔ میری بھی بچی ہے، میں نہیں چاہتا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہو۔ میرا مطلب تم سمجھ رہے ہو نا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں رضا! تمہارا بہت شکریہ۔ تم میرب کو اپنی بیٹیوں کی ہی طرح سمجھتے ہو۔"

کچھ مزید انکشافات سننے کے بعد نواز نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا تھا۔

"ارے نواز! تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ خیریت، کس کا فون ہے۔" سارا ابھی ابھی اوپر والی منزل سے نیچے آئی تھی... اور اسے راہداری میں یوں گم صم سر جھکائے بیٹھے دیکھ کر ٹھٹک کر قریب آئی تھی۔

"سارا... تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟" وہ بے انتہا سنجیدہ تھا۔

"جھوٹ؟ کون سا، کیسا، کس بات میں؟" اس نے ماتھے پر بل ڈال کر حیرانی سے پوچھا تھا۔

"میرب اپنے سسرال والوں سے لڑ کر ناراض ہو کر آئی ہے اور تم نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے اسے لڑ جھگڑ کر گھر سے نکال دیا، تم نے مجھ سے جھوٹ بولا۔" بے حد سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔ سارا نواز ایک پل کے لیے ٹھٹکی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں جھوٹ کیوں بولوں گی؟ جھوٹ تو اس نے بولا ہے، جس نے تمہیں فون کیا ہے۔ کبھی کسی کے سسرال والے اپنی غلطی بھی مانتے ہیں۔ سب ہی بہو کو غلط کہتے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے نواز! تم نے کبھی بھی اپنی بیوی اور بیٹی پر اعتبار نہیں کیا۔ ہمیشہ دوسروں کے دھوکے اور باتوں میں آئے ہو۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما!" اسے اپنے پیچھے میرب کی تلخ اور طنزیہ آواز آئی تو وہ چونک کر پلٹا۔

"بابا کو صرف اور صرف ماہین کی پریشانیوں اور تکلیفوں سے غرض اور مطلب ہوتی ہے۔ میں کتنی تکلیف میں ہوں، میری زندگی کتنی مشکل ہے اور میں سسرال والوں کے کیسے کیسے ظلم برداشت کر رہی ہوں، یہ انہیں کیا پتا۔ بس جس نے بھی میرے خلاف بات کی، میری جھوٹی سچی شکایتیں لگائی ہیں، انہیں صرف اور صرف ان ہی پر بھروسا ہے۔" میرب نے گلوگیر آواز میں انتہائی دکھی لہجے میں شکوہ کیا تھا۔

"یہ... یہ ٹھیک نہیں ہے بیٹا! میرے لیے تم اور ماہین دونوں برابر ہو۔ میں تمہیں بھی ماہی جتنا..."

"جھوٹ، بالکل جھوٹ..." اس نے چیخ کر باپ کی بات کاٹی تھی۔

"آپ کو ماہین سے زیادہ پیار ہے، مجھے تو آپ نے کبھی اپنے پیار کے قابل ہی نہیں سمجھا۔ ہمیشہ ماما کے حوالے کر کے نظر انداز کیا ہے۔ نہ پہلے نہ اب، آپ کو میری پروا کبھی نہیں تھی بابا! ابھی بھی نہیں۔"

وہ روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی تھی۔ سارا بے حد ناراضی اور ملامت بھری نظروں سے انہیں دیکھ رہی تھی اور اپنی جگہ چور سے بنے نواز اکرم صورت حال کے یوں پلٹ جانے پر حیران اور کچھ شرمندہ سے کھڑے تھے۔

"اگر انور واسطی جھوٹ بول رہا تھا تو رضا بھی... نہیں اسے کیا ضرورت تھی جھوٹ بولنے کی۔ وہ تو مجھے سمجھا رہا تھا۔ میرب کا بھلا کر رہا تھا۔ تو پھر..."

"مجھے آیان واسطی سے بات کرنی ہوگی۔" بالآخر انہیں اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آیا تھا۔ اگر آیان کے گھر والے برے تھے تو آیان میرب کے حق میں کیوں برا بن گیا تھا، جبکہ یہ شادی خود اس کی پسند سے تھی۔ نواز اکرم اپنے اس فیصلے پر کچھ مطمئن سا ہو کر سارا کے کمرے کی جانب چل دیا۔ وہ اس سے ناراض ہو گئی تھی اور اسے بہرحال اسے منانا تھا کہ وہ سارا کی ناراضی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

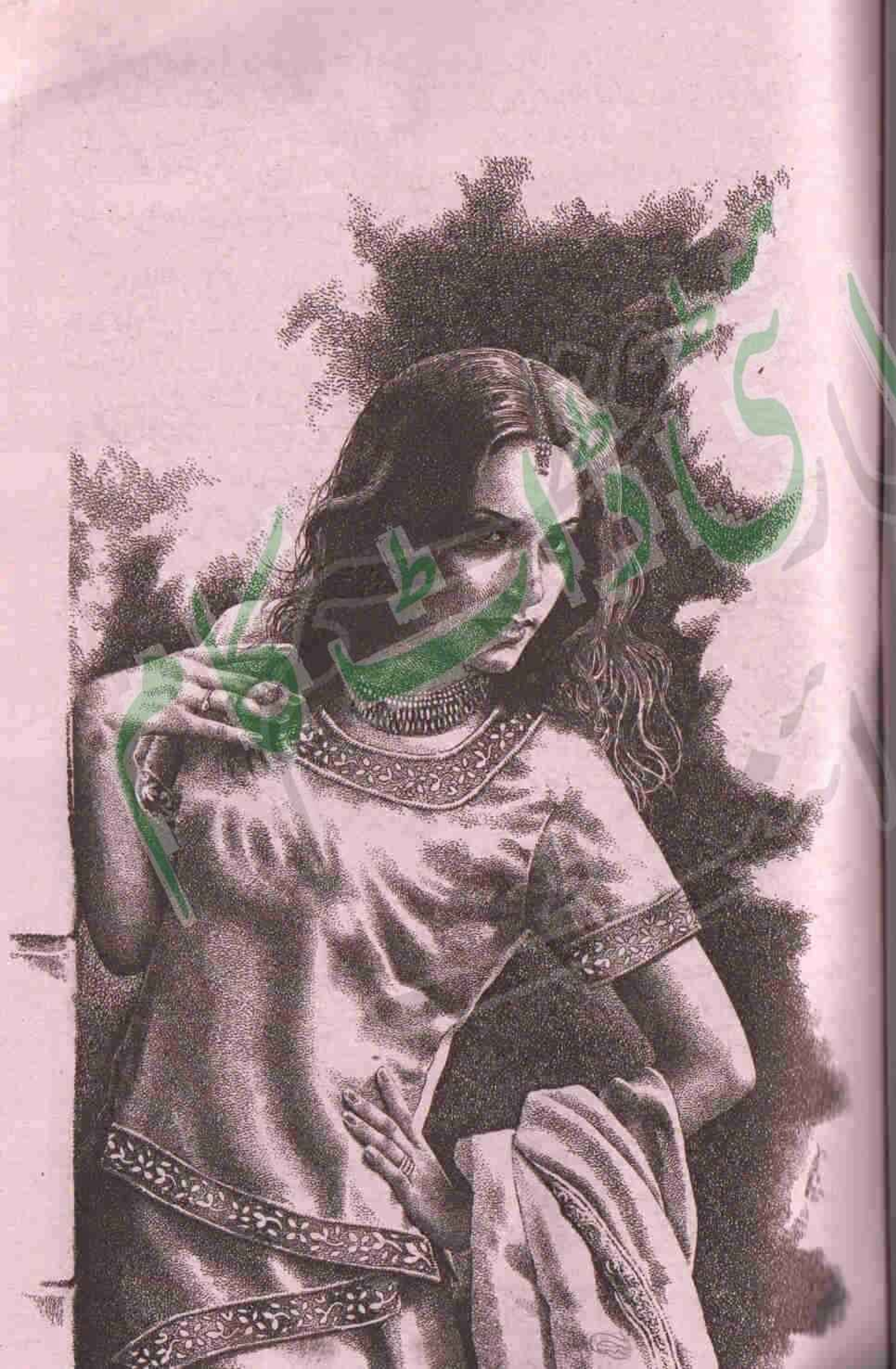

رمشا خالد

وہ عکس کون

آج اماں کو مرے چالیسواں دن تھا۔
صبح سے ہی گھر میں بھانت بھانت کی آوازیں گونجنا شروع ہو گئی تھیں، خاموشی نے اپنا بستر لپیٹ لیا تھا اماں بہت نیک اور خوش اخلاق خاتون تھیں، کوئی فقیر کبھی ان کے گھر سے خالی نہیں جاتا تھا، عقلمند اتنی کہ سارے میں "سیانی بی" مشہور تھیں، لگائی بجھائی کی عادی نہیں تھیں۔ سب کو اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو ان سے بہتر سامع نہیں ملتا تھا۔
جو بھی ان سے ملتا، ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ان کی وفات کا سن کر لوگ جوق در جوق دوڑے چلے آئے تھے۔
وہ کونے میں سمٹی بیٹھی تھی۔ آتے جاتے کوئی خاتون اسے گلے لگا کر تو کوئی سر پر ہاتھ پھیر کر، صبر کی تلقین کرنا نہیں بھولتی تھی۔ وہ بس خالی خالی نظروں سے خود پر ترس کھاتی نظریں دیکھ رہی تھی۔ ان چالیس دنوں میں وہ اماں کو اتنا رو چکی تھی کہ اسے لگتا اس کے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔
کھانا کھانے کے بعد سب جانا شروع ہو گئے تھے، وہ کمرے میں آ کر دوپٹہ تان کر لیٹ گئی، وہ جب بھی پریشان ہوتی یونہی لیٹ جاتی۔ اماں کو ہول اٹھنے لگتے، وہ کبھی اس کے لیے چائے بنا لاتیں، کبھی کسی اور کام کے بہانے اٹھا دیتیں وہ جب تک دوپٹہ نہ لپیٹتی اماں اس کے اردگرد منڈلاتی رہتیں اور کچھ نہیں تو دوپٹہ

مکمل ناول

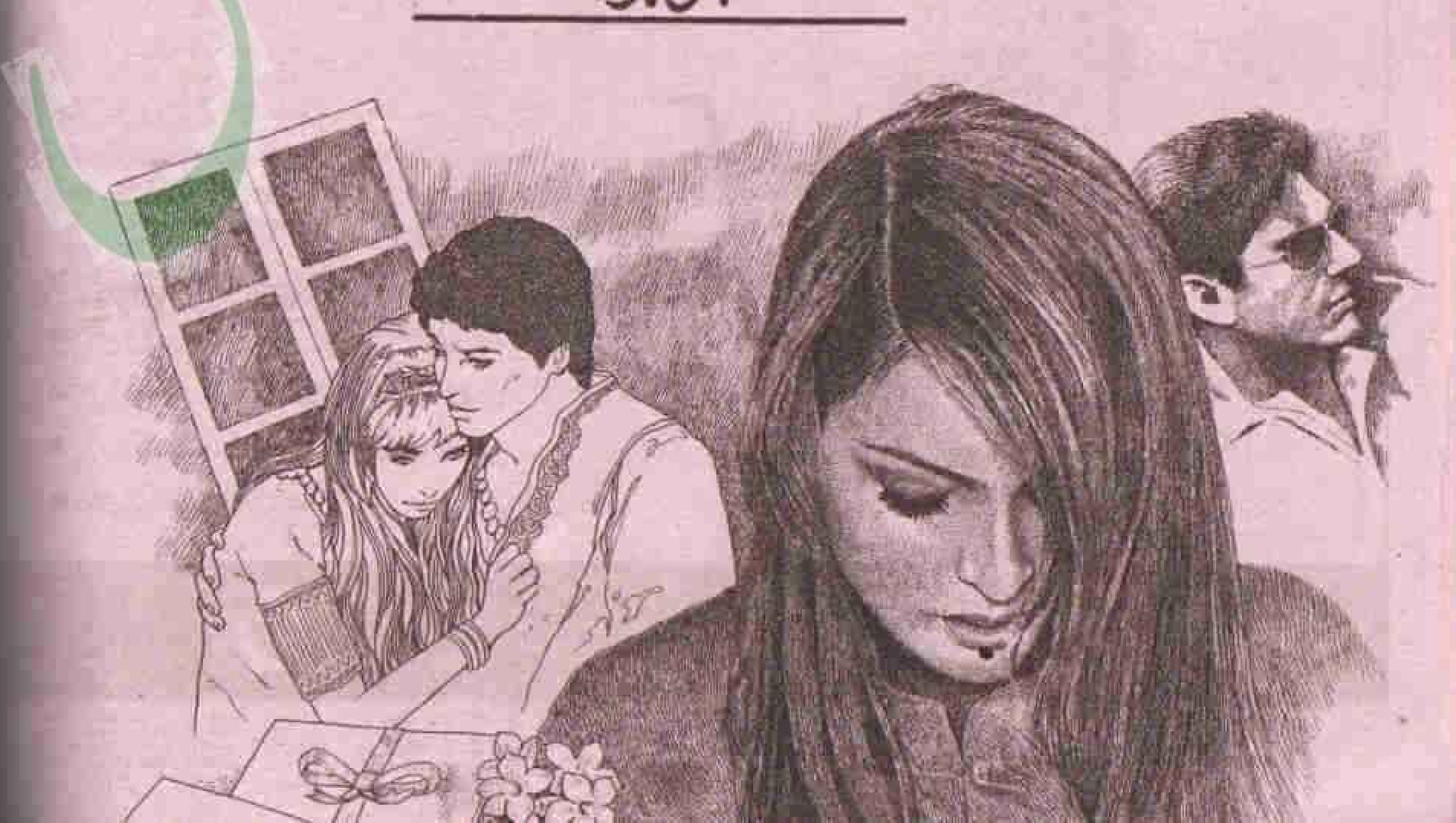

کھینچ لیتیں، پھر وہ ہوتی اور اماں۔ وہ اندر کی ساری بھڑاس ان کے سامنے نکال لیتی، اماں غور سے سنتی رہتی تھیں، جب بول بول کر وہ تھک جاتی تھی تو اٹھ کر اسے گلے لگا لیتیں، کیسی پریشانی، کہاں کا دکھ؟ ان کی محبت بھری بانہوں میں سماتے ہی وہ سب بھول جاتی تھی۔

"آہ اماں!" اس کی آہ بے ساختہ تھی۔ اب دوپٹہ ہٹانے کوئی نہیں آئے گا، یہ سوچ کر دل پر گھونسا پڑا تھا۔ وہ گھبرا کر برآمدے کی سیڑھیوں پر آبیٹھی۔

پورے گھر میں سناٹے کا راج تھا، مہمان جا چکے تھے، ٹینٹ اتر چکا تھا، دریاں اور چاندنیاں سمیٹی جا چکی تھیں۔ خالی دیگیں سیڑھیوں کے پاس ایک دوسرے کے اوپر دھری تھیں، صحن میں جابجا چاولوں کے دانے، روٹیوں کے ٹکڑے اور چچڑی ہڈیاں بکھری تھیں۔

اماں کو گھر میں گرد کا ذرہ تک نظر آجاتا تو وہ سارے کام پس پشت ڈال کر فوراً "پائپ لگا لیتیں اور آج..... اس نے فرش پر انگلی گھسیٹ کر اٹھائی۔ پور پر مٹی کی تہہ جم گئی۔ تھک کر ستون سے ٹیک لگالی۔ دائیں دیوار نے زرد چنبیلی کا لباس اوڑھ رکھا تھا، وہ ہاتھ بڑھا کر پھول توڑ توڑ کر ہوا میں اڑانے لگی۔ اماں کو پھول بس پودوں پر اچھے لگتے تھے، انہیں توڑنا سخت ناپسند تھا، یہ چنبیلی کا پودا تو ابا نے اپنی وفات سے ایک دن پہلے یہاں پر اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا، اماں اسے ہرا بھرا رکھنے کے لیے کیا کیا جتن نہیں کرتی تھیں۔ روز اپنے ہاتھ سے پانی دیتیں، صفائی کرتیں، کھاد ڈالتیں، یہ خیال آتے ہی اس کے ہاتھ تھم گئے۔ ان کے بعد تو کسی کو اپنا ہوش نہیں تھا پانی دینے کا خیال بھلا کیسے آتا؟

"کم از کم مجھے تو خیال رکھنا چاہیے تھا۔" ان چالیس دنوں میں اسے پہلی بار اپنے سوا کسی اور کا خیال آیا تھا، وہ اٹھی اور جا کر فوارہ بھر لائی، وہ بھی کیا کرتی اماں کی اچانک موت نے اس کے حواس سلب کر لیے تھے۔ وہ اچھی بھلی تھیں کہ اچانک بخار نے آلیا، موسم بدل رہا تھا، موسمی اثرات گردانتے ہوئے زیادہ توجہ نہیں دی، وہ ڈاکٹر کو دکھانے کا کہتی رہ گئی مگر انہوں نے پروا نہ کی۔ ان کا بخار بڑھا تو تھک کر اس نے بھیا کو اطلاع کر دی، وہ بھابھی اور بچوں سمیت دوڑے چلے آئے تھے مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ اماں شاید ان ہی کے انتظار میں تھیں ان سب کو اپنے پاس رات دیر تک بٹھا کر باتیں کرتی رہیں، ایک ایک کا چہرہ اچھی طرح آنکھوں میں سمو کر آنکھوں کی پیاس بجھائی اور صبح ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند کر ان کو بلکتا چھوڑ گئیں۔

"کم از کم میرا خیال تو کیا ہوتا اماں۔" خالی فوارہ قدموں میں رکھ کر وہ بے دم سی سر ہاتھوں میں پکڑ کر بیٹھ گئی۔ کچن سے کھٹ پٹ کی آوازیں آرہی تھیں۔

"میزاب! چائے پیو گی؟"

کچن کے دروازے سے بھابھی نے جھانکا مگر وہ ساکت بیٹھی رہی۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئیں، اس نے گھٹنوں میں سر دے کر آنکھیں موند لیں۔

تب ہی ایک بھاری ہاتھ اس کے سر پر آٹھہرا۔ وہ سیدھی ہو بیٹھی۔ بھیا اس کے قریب بیٹھ کر کتنی ہی دیر اس کا سر تھپتھپاتے رہے۔

"کہتے ہیں ماں کا نعم البدل نہیں ہوتا..... سچ کہتے ہیں۔" ان کے لہجہ میں شکستگی تھی۔ "ماں کے غم میں ساری زندگی بھی آنسو بہائیں تو کم ہے مگر کیا ہمارے آنسو انہیں واپس لا سکتے ہیں؟" وہ ایک پل کو رکے "نہیں ناں، یہ سوائے انہیں اذیت اور تکلیف کے کچھ نہیں دیں گے اور مرنے والوں کو تکلیف نہیں پہنچایا کرتے، یہی سوچ کر میں نے اپنے آنسو پونچھے ہیں، بیٹا! تم بھی اپنی آنکھوں میں اب انہیں جگہ مت دینا۔" وہ اس کی سوجی ہوئی آنکھوں میں دیکھ کر بولے۔

بھابھی چائے لے آئیں۔ ایک کپ اسے اور ایک کپ بھیا کو تھما کر چپ چاپ اندر چلی گئیں۔ دونوں خاموشی سے چائے سے نکلتی بھاپ کو تکتے رہے اور

بھاپ کم ہوتے ہوتے ختم ہو گئی، تب بھیا چونکے۔

"تمہیں پتا ہے اماں کی سب سے بڑی خواہش کیا تھی؟" ٹھنڈی چائے کا گھونٹ بھرتے انہوں نے پوچھا وہ بت بنی بیٹھی رہی "تمہیں خوش دیکھنا۔"

"تو پھر کیوں مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔" وہ شکوہ کناں ہوئی۔

"پگلی! یہ ان کے اختیار میں تھوڑی تھا؟ اگر ہوتا تو وہ ایسا کبھی نہ کرتیں، لیکن ان کے لیے صدقہ جاریہ بننا، قبر میں انہیں سکون پہنچانا تو ہمارے اختیار میں ہے، ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟" انہوں نے تصدیق چاہی۔

بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ طویل سانس خارج کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگی۔ وہ بہت دیر تک اسے سمجھاتے رہے۔ تسلی دیتے ہوئے، زندگی کے ہر موڑ پر اپنے ساتھ کا یقین بخشتے رہے تھے، یہ ان کے سمجھانے کا اعجاز تھا کہ رات گئے جب وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں جا رہی تھی تو ان چالیس دنوں میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر اللہ سے کوئی شکوہ شکایت نہیں بلکہ اماں کی مغفرت کی دعائیں تھیں۔

☼ ☼ ☼

سرکلر روڈ پر قائداعظم بازار کو چھوڑ کر تھوڑا آگے رہائشی علاقے میں سفید درودیوار اور سیاہ گیٹ کی حامل "فاروق منزل" تھی۔

فاروق صاحب اس قصبے کے واحد بوائز کالج کے سابق پرنسپل تھے۔ سخاوت ان کا وصف تھی، دائیں ہاتھ سے نیکی اس خوبی سے کرتے تھے کہ بائیں ہاتھ تک کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ ان کے دو بچے تھے بڑے عمر فاروق اور ان سے پندرہ سال چھوٹی میزاب رحمت۔ میزاب کی پیدائش سے ایک سال پہلے انہیں اپنی شریک حیات کے ہمراہ حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی حرم پاک میں میزاب رحمت سے بہتی رحمتوں میں سراپا بھیگتے ہوئے دونوں میاں بیوی نے بے ساختہ اپنے لیے رحمت کی دعا کی تھی جو اگلے سال پوری ہو گئی، سفید کمبل میں لپٹے گلابی پھول کو دیکھتے ہی فاروق صاحب نے اسے میزاب رحمت کا نام دے دیا تھا۔ وہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اماں، ابا، بھیا اس کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔

وقت آگے بڑھا، عمر فاروق کو فارغ التحصیل ہوتے ہی شاندار تعلیمی ریکارڈ کی بنا پر فوراً "نوکری مل گئی۔ اماں تو تھیں ہی اسی انتظار میں فوراً "ابا کے چچازاد بھائی کی بیٹی بیاہ لائیں۔ ابا بھی شاید اسی انتظار میں تھے، پوتے ٹیپو کی پیدائش کے کچھ ہی دنوں بعد آنکھیں موند لیں۔ یہ صدمہ اس کے لیے بہت بڑا تھا کئی دنوں تک گم صم رہی اور اب ابا کے جانے کے سات سال بعد وہ بھی اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر جا چکی تھیں۔

☼ ☼ ☼

بھابھی اور بھیا کی دلجوئی کے سبب وہ زندگی کی طرف لوٹ تو آئی تھی مگر شاید زندگی گزارنا بھول گئی تھی۔

گریجویشن کے پیپرز کے بعد رزلٹ کے انتظار میں اس نے تین ماہ پہلے ہی قریبی اسکول جوائن کیا تھا مگر اب جانے کو دل نہیں مانتا تھا۔ بچوں کے پیپر قریب تھے میڈم خود اسے بلانے آئیں تو اسے جانا پڑا اور کچھ نہیں تو کم از کم بچوں کے درمیان وقت تو کٹ ہی جاتا تھا۔

وہ اس وقت اسٹاف روم میں اکیلی بیٹھی تھی' کاپیاں چیک کر رہی تھی' پیریڈ آف ہونے کی بیل بجتے ہی ٹیچرز نے اسٹاف روم کا رخ کیا۔ وہ حسب سابق سر جھکائے اپنے کام میں مصروف رہی۔ اس کا اگلا پیریڈ بھی فری تھا۔ مس ثمرہ اور مس حنا کا بھی اگلا پیریڈ فری تھا۔ ان دونوں نے اس کے دائیں بائیں کرسیاں سنبھال لیں' ثمرہ کے ہاتھوں میں ٹیسٹ کی کاپیوں کا بنڈل تھا جبکہ حنا فارغ تھی اس نے میز پر پڑا اخبار اٹھالیا۔

"میزاب! بھابھی واپس نہیں گئیں؟ ان کا کب تک ادھر رہنے کا ارادہ ہے؟" ثمرہ نے اچانک پوچھا۔

"پتا نہیں۔" مختصر جواب دے کر وہ پھر کاپیوں پر جھک گئی۔ ثمرہ اس کی محلے دار تھی اس لیے گھریلو حالات سے واقف تھی۔

"کیوں میزاب! تمہارے بھیا بھابھی تمہارے ساتھ نہیں رہتے؟" قتل و غارت گری کی خبروں سے تنگ آ کر حنا نے اخبار بے دلی سے میز پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"دراصل بھیا کی شہر میں نوکری ہے' شادی کے بعد کچھ عرصہ تک تو بھابھی ادھر رہی تھیں' پھر اماں نے خود انہیں بھیا کے ساتھ بھیج دیا تھا' انہیں وہاں اکیلے بہت مسئلہ ہوتا تھا' اب تو ان کے دو بچے بھی ہیں۔ دونوں ادھر زیر تعلیم ہیں۔" اس کے بار بار کے سوالوں سے بچنے کے لیے میزاب نے تفصیلی جواب دیا۔

"اوہو' پھر تو چاہ کر بھی دوبارہ یہاں سیٹ نہیں ہو سکیں گے یعنی تمہیں ان کے ساتھ جانا پڑے گا۔"

اس کا دل زور سے دھڑکا۔ "کیا مجھے اب اپنا گھر بھی چھوڑنا ہوگا؟"

"تمہارے بھیا کا شہر میں ذاتی مکان ہے؟" حنا باتوں کی شوقین تھی' اوپر سے اس وقت فارغ تھی' اس لیے سوال پر سوال کیے جا رہی تھی۔

"نہیں' بھابھی کے چاچو ملک سے باہر ہوتے ہیں اس لیے ان کا پورشن کرائے پر لے رکھا ہے۔" اس نے آخری کاپی پر سائن کر کے اسے میز پر رکھا۔

"یعنی' اپنے سسرال میں رہتے ہیں۔" حنا نے ہونٹ سکیڑے' میزاب کو اس کا انداز برا لگا تھا مگر تحمل سے بولی۔

"ان کی مجبوری ہے' ان کی نوکری ہی ایسی ہے کہ انہیں کئی کئی دنوں تک دوسرے شہروں میں دورے پر جانا ہوتا ہے۔ ایسے میں بھابھی اور بچوں کو پیچھے اکیلے بھی تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔"

"تم نے سنا نہیں حنا! انہوں نے پورشن "کرائے" پر لے رکھا ہے' ویسے بھی یہ ان کی مرضی سسرال میں رہیں یا سول لائن میں۔" ثمرہ دانت پیس کر بولی جیسے کہہ رہی ہو' تمہیں اس سے کیا تکلیف ہے۔ اسے حنا کے فضول سوال زہر لگ رہے تھے۔

مگر میزاب ان کی باتوں پر توجہ دیے بغیر پیشانی پر تفکر کی لاتعداد لکیریں سجائے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔

پھر گھر جا کے بھی ہمہ وقت اس کے ذہن میں اپنی رہائش کا مسئلہ چکراتا رہا۔ یہ تو ظاہری بات تھی وہ اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی تھی اور نہ بھابھی مستقل اس کے ساتھ رہ سکتی تھیں' بھیا تو جا چکے تھے۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں اس لیے بھابھی اس کے ساتھ رہ رہی تھیں' اگلے ہفتے بچوں کے اسکول کھلنے والے تھے۔

اس کے بعد؟ بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے ذہن میں گونجا۔

"کیا مجھے یہ گھر چھوڑ کر جانا ہوگا۔" "نہیں کبھی نہیں میں کہہ دوں گی بھیا سے' میں اکیلی رہ سکتی ہوں ان در و دیوار سے لپٹی اماں ابا کی یادیں مجھے سہارا دینے کو کافی ہیں' جس نے جانا ہے چلا جائے میں ہرگز اس گھر سے دور نہیں جاؤں گی۔" چھت کی کڑیاں گنتے گنتے وہ رات دیر تک خود کو طفل تسلیاں دیتی نیند کی آغوش میں سمٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اسکول سے لوٹی تو بھیا آئے ہوئے تھے ان سے مل کر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ بھیا اور بھابھی سے عمروں کا فرق اتنا تھا کہ وہ چاہ کر بھی ان سے بے تکلف نہیں ہو پائی تھی۔

نماز کے بعد وہ حسب معمول اماں کے ایصال ثواب کے لیے قرآن مجید پڑھ رہی تھی جب اسے گمان ہوا جیسے بھیا نے کمرے میں جھانکا ہو۔ سپارہ مکمل کر کے احترام سے قرآن پاک شیلف میں رکھتے ہوئے وہ ان کے کمرے میں چلی آئی۔ دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا' سامنے بھابھی بیڈ پر کپڑے پھیلائے انہیں سلیقے سے تہہ کر کے بیگ میں رکھ رہی تھیں۔

"بھابھی نے پیکنگ بھی شروع کر دی اور مجھے بتایا تک نہیں۔" اسے جھٹکا لگا تھا۔

"آؤ میزاب! باہر کیوں کھڑی ہو۔"

"بھابھی! بھیا کہاں ہیں؟ انہیں شاید مجھ سے کام تھا۔"

"وہ ذرا باہر گئے ہیں' آتے ہی ہوں گے۔" وہ مصروف سی بولیں' پیکنگ کی کوئی توجیہہ نہیں دی تھی سو اس نے بھی نہیں پوچھا۔ جواب وہ پہلے سے جانتی تھی جسے جانتے ہوئے بھی سننے کی ہمت وہ خود میں نہیں پاتی تھی' اس لیے پلٹ کر برآمدے کی سیڑھیوں آ بیٹھی۔ صحن میں ٹیپو' مونا کو سائیکل چلانا سکھا رہا تھا۔

"بھیا نے بھی کبھی مجھے ایسے ہی سائیکل چلانا سکھائی تھی۔ اونہوں' اس سے بھی زیادہ پیار سے ٹیپو تو مونا کو بہت ڈانٹ رہا ہے۔"

بھولی بھٹکی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گوشوں تک ٹھہری تھی جب بھیا کسی اجنبی کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور اسے چائے کا کہہ کر اجنبی کو لیے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ اس اجنبی کو گھر دکھاتے پھر رہے تھے۔ اس نے بہت بار سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا مگر وہ دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں چکرا رہی تھی۔

"بھیا اس گھر کو کرائے پر دینے کا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں؟" اس نے خود کو تسلی دی تھی' ٹیپو بھیا کا پیغام لیے چلا آیا۔ انہوں نے اسے اوپر ٹیرس پر بلایا تھا۔

ہر سیڑھی چڑھتے ہوئے اس کا دل جیسے ڈوب ڈوب سا جاتا تھا' اوپر بھیا ریلنگ پر دونوں ہاتھ جمائے خلا میں کسی نادیدہ نکتے کی گہرائیوں میں کھوئے تھے' بھابھی قریب ہی کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ اسے آتا دیکھ کر باقی ماندہ چائے ایک گھونٹ میں ختم کر کے' برتن سمیٹ کر سیڑھیاں اتر گئیں۔

"آؤ میزاب بیٹھو۔" گردن موڑ کر اسے بیٹھنے کا کہتے ہوئے وہ پھر سے آسمان کی وسعتوں میں کھو گئے۔

وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کرسی پر ٹک گئی' خاموشی کا چھوٹا سا وقفہ دور کہیں سے بھاگتا ہوا ان کے درمیان پل بھر کو سانس درست کرنے بیٹھ گیا' دل کی دھڑکنیں واضح کرتی اذیت ناک خاموشی سے اسے وحشت ہونے لگی' قریب تھا کہ بھاگ جاتی مگر بھیا کے لفظوں نے اسے پتھر کر دیا۔

"میزاب! میں نے یہ گھر بیچنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگی۔ اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"دیکھو میزاب! اینٹ سیمنٹ سے بنی عمارتیں گھر نہیں ہوتیں' گھر رشتوں سے بنتے ہیں' جب تک اماں ابا زندہ تھے یہ ایک گھر تھا' ان کے جانے کے بعد یہ ایک مکان ہے' صرف ایک مکان' جس سے ان کی یادیں ضرور جڑی ہیں مگر بیٹا! یادوں کا مسکن ہمیشہ دل ہوتا ہے' ہم دنیا میں کہیں بھی چلے جائیں' جہاں ہمارے دل دھڑکیں گے' ہر طرف ان کی یادوں کی خوشبو پھیلے گی' یہ گھر جتنا تمہیں عزیز ہے اتنا مجھے بھی ہے' یہ فیصلہ آسان نہیں تھا۔ بہت سوچ سمجھ کر میں

نے فیصلہ کیا ہے۔"

وہ ابھی بہت کچھ کہہ رہے تھے' مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

بھیا بہت دیر تک اسے سمجھاتے رہے' دلاسے' وعدے' تسلیاں' مگر وہ سن سی میز کی سطح پر نظریں گاڑے بیٹھی رہی۔

"مجھے یقین ہے میری پیاری بہنا کو میرے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بہت دیر سمجھانے کے بعد وہ میز پر رکھی فائل کو کھول کر اس کی گود میں رکھتے ہوئے مان سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

وہ جو اپنا حق جتا کر ان کے فیصلے کو شدت سے رد کرنے کا سوچ رہی تھی' مشینی انداز میں ان کی بتائی جگہوں پر سائن کرتی چلی گئی۔ اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتے نیچے چلے گئے اور وہ...... جو سمجھتی تھی اماں کو چالیس دن رونے کے بعد اس کے آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے ہیں' میز کی سطح پر سر ٹکائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تین گھنٹے کی مسلسل ڈرائیو کے بعد گاڑی گرین لائن کی متوسط کوٹھی کے سامنے جا رکی۔ بھیا گیٹ کھولنے کے لیے اترے' ٹیپو اور مونا ان سے بھی پہلے اندر بھاگ گئے۔

چھوٹا سا ڈرائیو وے' جس کے کنارے سفیدے کے درخت اور اطراف میں دو چھوٹے چھوٹے گھاس کے قطعے تھے' عبور کر کے گاڑی پورچ میں جا رکی جہاں پہلے سے دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بھیا ڈگی سے بیگ نکالنے لگے۔ بھابھی پرس میں چابیاں تلاش کر رہی تھیں۔

"نیا ٹھکانہ۔" وہ باہر نکل کر زیر لب بڑبڑاتے ہوئے دیکھے بھالے در و دیوار کا جائزہ لینے لگی۔

یہ ابا کے چچا زاد بھائیوں کا گھر تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے تین اطراف میں جالی دار برآمدے۔ دراصل تین الگ الگ پورشن تھے جن کے پیچھے وسیع صحن تھے' سامنے والا پورشن بھابھی کے والد قاسم انکل کا تھا جہاں وہ اپنے دو بیٹوں اور بہوؤں کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ بھابھی ان کی اکلوتی بیٹی تھیں' دائیں طرف عاصم انکل کا پورشن تھا ان کی فیملی مختصر سی تھی ایک بیٹا ارمان اور بیٹی امینہ۔ بائیں طرف والا پورشن کبھی انکل ہاشم کا ہوتا تھا جو عرصہ دراز سے بیرون ملک مقیم تھے تو بھیا ہاشم انکل کا پورشن کرائے پر لے کر رہنے لگے تھے' انکل نے خراب ملکی حالات کے پیش نظر اب مستقل باہر سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تو یہی پورشن انہوں نے "فاروق منزل" بیچ کر خرید لیا تھا' اب یہ پورشن بھیا کا تھا۔

"میزاب! رک کیوں گئیں؟ آؤ ناں!" اپنے پورشن کی جالی کا کنڈا کھولتی بھابھی نے گم صم گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑی میزاب کو آواز دی۔

طویل سانس خارج کرتے ان کے پیچھے جاتے ہوئے اسے اپنا آپ "کٹھ پتلی" کی مانند لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کم گو تو شروع سے تھی مگر یہاں آ کر تو جیسے بولنا ہی بھول گئی تھی۔ یہ بھرا پرا گھر تھا۔ سب کے آپس کے تعلقات بہت اچھے تھے بے تکلفی سے ایک دوسرے کے پورشنز میں آنا جانا تھا' اس کی دلجوئی کے خیال سے کبھی کوئی آنٹی تو کبھی بھابھی آتی رہتی تھیں۔ اسے پاس بٹھا کر ادھر ادھر کی باتیں کرتیں' اپنے ہاں آنے کو کہتیں مگر اس کا باہر نکلنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ وہ بس چپ چاپ انہیں تکے جاتی یا پھر پہروں کمرے میں بند بے معنی باتوں پر کڑھتی رہتی۔ یہاں آنے کے دوسرے ہی روز بھیا کو دورے پر بیرون شہر جانا پڑ گیا تھا اسے لگا جیسے انہیں اس کی پروا نہیں اسی لیے یہاں لے کر آتے ہی دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر چلے گئے ہیں' بھابھی کوئی کام کہتیں تو لگتا اسے مفت کی نوکرانی سمجھنے لگی ہیں اگر نہ کہتیں تو لگتا عضو معطل کا درجہ دے رکھا ہے۔

اب بھی اس پر قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔ نیم تاریک کمرے میں نادیدہ نقطے پر نظر جمائے پراگندہ سوچوں کی وجہ سے سر پھٹنے لگا تو چپل گھسیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ کھولا تو نظر دروازے کے دوسری طرف لگے آئینے میں اپنے عکس سے الجھی۔ اماں کے بعد وہ شاید پہلی بار اپنا عکس غور سے دیکھ رہی تھی۔

"کیا یہ میں ہوں؟"

خود کو دیکھ کر وہ حیران رہ گئی تھی۔ زرد ہوتی رنگت' پپڑی زدہ ہونٹ' ویران آنکھیں' الجھے بال...... حیرت سے خود کو دیکھتے ہوئے اس نے دیوار پر سجی اپنی پچھلی سالگرہ پر اماں کے ساتھ کھنچوائی تصویر کو دیکھا۔

درمیانہ قد' گداز سراپا' گلابی مائل شفاف رنگت' موٹی موٹی جگمگاتی آنکھیں' کٹاؤ دار بھرے بھرے ہونٹ' ستواں ناک جو اس کے چہرے پر بہت بھلی لگتی' باقی کی کسر کمر تک آتے گھور سیاہ ریشمی بالوں نے پوری کر دی تھی۔ وہ اماں کے پہلو میں مشرقی حسن کا مکمل نمونہ بنی کھڑی تھی۔ اسے یاد تھا یہ تصویر کھنچوانے سے پہلے اماں نے کتنی ہی دعائیں پڑھ کر اس پر پھونکی تھیں۔

"سدا یونہی شاداب رہے میری بچی۔" اس نے آنکھیں موند کر ان کے بوسے کی حدت کو اپنے ماتھے پر محسوس کیا' آنکھیں کھولیں تو اپنا پژمردہ سراپا سامنے تھا۔

اس نے کچھ سوچتے ہوئے قدم واپس اندر کی طرف بڑھا دیے۔ وارڈ روب سے اچھے سے کپڑے نکالے' ایک گھنٹے کے شاور نے اسے بہت فریش کر دیا تھا۔ تولیے سے بال خشک کر کے تھوڑے سے کیچر میں جکڑے اور باقی نیم گیلے بالوں کو پیچھے کھلا چھوڑ دیا' کریم لگا کر آنکھوں میں سیاہ ڈورے ڈالنے کے بعد آئینے میں دیکھا وہاں پہلے والی میزاب کھڑی تھی ہاں مگر آنکھوں کی چمک مفقود تھی' چہرے کی ملاحت میں سوگواری رچی تھی' باہر جانے سے پہلے اس نے مڑ کر تصویر کو دیکھا' اماں کے چہرے سے جھلکتے سکون نے دل کو اطمینان بخشا تھا۔

امینہ اور بھابھی سفیدے کے درختوں کے سائے میں کرسیوں پر بیٹھی تھیں' میز پر چائے کے برتن سجے تھے۔

"آؤ ناں میزاب! رک کیوں گئیں؟" امینہ نے آواز لگائی۔

وہ جو واپس پلٹنے کو تھی رک گئی۔

"ان لوگوں کے پاس آپ پھر کبھی بیٹھ جائیے گا' ابھی ہمارے ساتھ پارک چلیں' ہمیں آپ کو اپنے دوستوں سے ملوانا ہے۔" ٹیپو اور مونا اس کا ہاتھ پکڑ کر اصرار کرنے لگے' وہ بھی تبدیلی چاہتی تھی اس لیے آرام سے چل پڑی۔

فٹ پاتھ کے کنارے سبزہ ہی سبزہ پھول ہی پھول تھے ہر گھر کی دیوار پر پھولوں کی بیلیں سجی تھیں' ہر طرف ہریالی تھی۔

ٹیپو اور مونا کی باتیں سنتے ہوئے وہ ارد گرد کا تفصیلی جائزہ بھی لے رہی تھی۔ پارک دس منٹ کی واک پر تھا' شام کا وقت تھا اس لیے خوب چہل پہل تھی۔

بچوں نے اپنے دوستوں سے اس کا غائبانہ تعارف کروا رکھا تھا' اس لیے وہ اسے دیکھتے ہی پہچان گئے' اپنے ساتھ کھیلنے کی آفر بھی کی جسے نرمی سے ٹال کر وہ تالاب کے کنارے گلابوں کے کنج کے پاس سفید مرمر کی بینچ پر آ بیٹھی تھوڑے سے فاصلے پر شان سے کھڑے املتاس کی ٹہنیاں ہولے ہولے ہل رہی تھیں۔

وہ ہوا میں رچی گلابوں کی خوشبو کو اپنے اندر اتارتے ہوئے تالاب کے نیلگوں پانی پر تیرتی بطخوں کی جوڑی کو دیکھنے لگی' ان کے پہلو میں تیرتے ان کے بچے تو اور بھی پیارے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آ ٹھہری۔

وہ لڑکی تھی یا گلاب' ٹریک پر مخالف سمت سے دوڑ کر آتے ہوئے اس کی نظر گلابوں کے کنج پر پڑی تو قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا' کانوں سے ہیڈ فون نکالتے ہوئے وہ بے اختیار اس کی طرف بڑھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر املتاس کے تنے سے ٹیک لگا کر سینے پر ہاتھ باندھ کر دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا۔

پُرشوق نظروں کی تپش محسوس کر کے وہ چونکی۔ سامنے دراز قد' گندمی رنگت' شفاف آنکھوں والے

نوجوان کو محویت سے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس کی پیشانی پر بل اور آنکھوں میں ناگواری در آئی، جسے دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرایا۔

"ہیلو! کیسی ہیں آپ؟ کیا پہچانا نہیں مجھے؟"

اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھ کر اسے حیرت نہ ہوئی، میزاب سے آخری ملاقات بھی غالباً" سات آٹھ سال پہلے ہوئی تھی مگر اس کے باوجود وہ اسے پہچان گیا تھا۔ "میں ارمان ہوں، ارمان عاصم۔"

"تو؟"

کہہ کر وہ فوراً" اٹھ گئی اور وہ بس "ارے ارے" کرتا رہ گیا مگر وہ رکی نہیں۔ اس کی پُرشوق نظروں نے گھبرائی الجھی گلاب سی لڑکی کا دور تک پیچھا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شام کا وقت تھا، سفیدے کے درختوں تلے چہل پہل تھی۔ ایک طرف مونا اور ٹیپو اپنے کزنز کے ساتھ کھیل رہے تھے، دوسری طرف کرسیوں پر بھابھی اور امینہ باتیں کرتے ہوئے چائے اور سموسوں کے ساتھ لطف اندوز ہو رہی تھیں، سموسے امینہ بطور خاص ارمان کی فرمائش پر بنا کر لائی تھی۔

"ارے واہ! میرے بغیر ہی شروع ہو گئیں۔" وہ شرٹ کی آستین موڑتا کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"تم اب واش روم میں نہانے کے بجائے سوئمنگ شروع کر دو تو ہم تو تمہارے انتظار میں سوکھتے رہے۔" بھابھی اس کے لیے چائے نکالتے ہوئے مسکرائیں۔ وہ شاور لینے میں گھنٹوں لگاتا تھا۔

"مونا! یوں کرو اپنی میزاب پھوپھو کو بھی بلا لاؤ۔"

"مما! میں گئی تھی ابھی مگر وہ نہیں آئیں۔" وہ کیچ لینے کے لیے بھاگتے ہوئے بولی۔

"مجھے تو سچی بات ہے میزاب کی طرف سے پریشانی ہونے لگی ہے، شرمیلی تو شروع سے تھی، مگر اتنی تنہائی پسند تو کبھی نہیں تھی، جتنی یہاں آ کر ہو گئی ہے، اب تو اس سے خود سے بات کرو تو جواب دے دیتی ہے ورنہ پہروں چپ چاپ خلاؤں میں گھورتی رہتی ہے، اماں کے جانے کا بہت اثر لیا ہے اس نے۔ میں نے عمر سے بھی بات کی ہے مگر ان کے خیال میں اتنے بڑے صدمے سے نکلنے کے لیے اسے تنہائی اور وقت درکار ہو گا۔ اس لیے کچھ عرصہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے۔" بھابھی آہستہ آہستہ بتا رہی تھیں۔

"تم کیا کہتے ہو سائیکاٹرسٹ صاحب!"

"ہوں۔" ان کی باتیں توجہ سے سنتا وہ چونکا، ذہن میں اداسی کی ردا اوڑھے کھوئی کھوئی گلاب سی لڑکی کی شبیہہ ابھری تھی۔ "یہ تو بالکل غلط کر رہے ہیں آپ لوگ، کوئی بھی فرد جو کسی بڑے صدمے سے گزرا ہو تنہائی اس کے لیے دلدل کا کام دیتی ہے، اسے جتنی زیادہ تنہائی میسر آتی ہے، وہ اس صدمے کے زیر اثر اتنا زیادہ غم کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جاتا ہے اور غم کا شدید احساس اس پر اتنا حاوی ہو جاتا ہے کہ اس کے شعور اور لاشعور دونوں کو متاثر کر کے اس کی قوت ارادی کو کمزور کر دیتا ہے، ایسے میں منفی سوچیں اور یاسیت اس کے ذہن و دل میں پنجے گاڑ لیتی ہیں، وہ زندگی کی رونقوں سے بے زار ہوتا چلا جاتا ہے، پہلے مرحلے پر ڈپریشن کا عارضہ لاحق ہوتا ہے، اگر یہی کیفیت مستقل رہے تو مریض یا تو نفسیاتی مریض بن جاتا ہے یا پھر زندگی سے اتنا بے زار ہو جاتا ہے کہ خودکشی جیسا انتہائی قدم اٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔" وہ بہت پروفیشنل انداز میں کہہ رہا تھا۔

"ارمان! تمہاری باتوں نے تو مجھے ہولا دیا ہے۔" بھابھی کی چائے رکھے رکھے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

"آپی! اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں میزاب کا مسئلہ ابھی گمبھیر نہیں ہے۔ اس کا سادہ سا حل ہے کہ جتنا ہو سکے اسے مصروف رکھیں، خواہ کام میں، بچوں کے ساتھ یا جس طرح بھی بس اسے تنہا بیٹھنے کا موقع کم سے کم دیں، باہر لے کر جائیں، بولنے پر مجبور کریں، وہ انشاءاللہ بہت جلد نارمل ہو جائے گی۔" اس نے تسلی دی۔

"کوئی میڈیسن وغیرہ؟"

"نہیں نہیں، اس کی یہ کیفیت صدمہ کے زیر اثر

ہے، وہ باقاعدہ نفسیاتی مریضہ نہیں ہے، اس لیے میرا نہیں خیال اسے باقاعدہ میڈیسن کی کوئی ضرورت ہے ہاں مگر آپ مجھے اس کی کنڈیشن بتاتی رہیے گا، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں اس کے لیے چند سکون آور ادویات تجویز کروں گا۔"

اس کا موبائل اچانک بجنے لگا تو وہ اٹھ گیا۔ پیچھے امینہ اور بھابھی کے چہرے پر تفکرات کا جال بکھرا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میزاب کیا کر رہی ہو؟" وہ ناشتے کے بعد چائے کا کپ کا خالی ہو چکا کپ لیے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

"کچھ نہیں بھابھی فارغ ہوں۔"

"تو پلیز یوں کرو، شادو آتی ہو گی، اس سے اپنی نگرانی میں صفائی کروا لو، میں ذرا مصروف ہوں۔" انہوں نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"سلام بی بی!" ابھی اس کا ذکر ہوا تھا کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں سلام کرتی آ پہنچی۔

"یاد کیا اور حاضر، شادو نہ ہوئی گویا......" بے ساختہ اُمڈتے خیال نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جگا دی۔

"بی بی! ایک بات کہوں؟" شادو اسے غور سے دیکھتی بولی۔

"ضرور۔"

"آپ کی اسمیل بڑی اچھی ہے۔" شادو انگریزی بولنے کی شوقین تھی۔

"Smell" اسے جھٹکا لگا، گڑبڑا کر اپنے صاف ستھرے سراپے کو دیکھنے لگی۔

"میرا مطبل ہے مسکراہٹ جسے انگریزی میں اسمیل (Smile) کہتے ہیں۔" اسے ہونق دیکھ کر وہ وضاحت کرنے لگی۔ "ویسے شکل سے تو بڑی پڑھی لکھی لگتی ہیں، کیا انگریزی نہیں آتی؟" وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر دوسرا نچاتے ہوئے بولی۔

میزاب بے ساختہ کھلکھلائی، بھابھی نے خوشگوار حیرت سے کچن سے جھانک کر دیکھا اور پُرسوچ انداز میں سر ہلانے لگیں۔

"جیسی انگریزی تمہیں آتی ہے ویسی تو مجھے قطعاً" نہیں آتی۔ اچھا باقی باتیں بعد میں پہلے کام کر لو۔"

شام کو بھابھی نے ٹیپو اور مونا کو پکڑ کر اس کے پاس پڑھنے بٹھا دیا۔ بچے بھی خوش تھے اور اس کا وقت بھی اچھا گزر گیا۔

"پھوپھو! اب ہم روز آپ سے پڑھیں گے، آپ بہت اچھی ہیں بالکل نہیں ڈانٹتیں" مونا بیگ بند کرتے ہوئے بولی، ٹیپو بھی اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگا۔

"بھلا آپ کی بات بھی ٹالی جا سکتی ہے۔" وہ ان کے سر تھپتھپا کر اٹھ گئی۔

اوپر کمرے میں وہی سناٹا تھا، اس سے پہلے کہ وہ اس ویرانی کو اپنے اندر اتارتی بھابھی چائے لے کر آ گئیں اسے حیرت ہوئی وہ عموماً" اگلی طرف لان میں امینہ لوگوں کے ساتھ چائے پیتی تھیں، اسے بھی بلاتی تھیں مگر اس کا جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

"باہر تو تم آتی نہیں اس لیے میں نے سوچا، آج شام کی چائے تمہارے ساتھ اوپر پی جائے" وہ اس کی حیرت بھانپ چکی تھیں، ٹیرس کا دروازہ کھولنے کا اشارہ کرتی وہ بیٹھ گئیں۔

میزاب آج روز کی نسبت کافی فریش لگ رہی تھی چائے کے دوران ان کی باتوں کو "ہوں ہاں" میں ٹالنے کی بجائے تفصیلی جواب دیتی رہی۔ ایک دن کی تھوڑی سی مصروفیت نے اس کی طبیعت میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کی تھی۔ وہ برتن سمیٹ کر گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے ارمان کے پاس جانے کا سوچ رہی تھیں، اس کا جاگنگ سے واپسی کا وقت تھا، اسے کامیابی کی اطلاع بھی تو دینا تھی۔

☼ ☼ ☼

پھر رفتہ رفتہ ارمان کی ہدایات کے مطابق وہ اسے کبھی اس کے لاکھ "نہ نہ" کرنے کے باوجود شاپنگ پر لے جاتیں، کبھی اپنی کسی سہیلی کی طرف، میزاب انکار کرتی رہ جاتی مگر وہ اس کی ایک نہیں سنتی تھیں، شادو

سے صفائی کروانے اور بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری مستقل طور پر اسے دے دی تھی، وہ کبھی اکیلی بیٹھی ہوتی تو خود اس کے پاس چلی جاتیں، کبھی بچوں کو بھیج دیتی تھیں یا لاؤنج میں بلا کر T.V دیکھنے پر اصرار کرتیں امینہ بھی اسے کمپنی دینے کے لیے اکثر آجاتی تھی بھابھی کو اگر کوئی ضروری کام ہوتا تو کچن بھی اسے سونپ کر چلی جاتیں، وہ سب خوش اسلوبی سے نبٹا لیتی تھی مگر ان کی زیادہ تر کوشش یہی ہوتی تھی کہ اس پر کام کا زیادہ بوجھ نہ پڑے۔

اس سب کے نتیجے میں میزاب کے مزاج اور رویے میں واضح طور پر تبدیلی آئی تھی، وہ جو ڈپریشن کا شکار ہو کر زندگی کی رونقوں سے منہ موڑنے لگی تھی، ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آئی۔ اس خوشگوار تبدیلی کو بھیا نے بھی محسوس کیا تھا ورنہ تو وہ ہر وقت یہ سوچ کر شرمندہ ہوتے رہتے تھے کہ وہ میزاب کا ٹھیک سے خیال نہیں رکھ پا رہے، اب بہتر اسے مطمئن دیکھ کر سب بہت خوش تھے۔

☼ ☼ ☼

اسے نیند نہیں آرہی تھی، چند کروٹیں بدلنے کے بعد وہ ٹیرس پر چلی آئی، ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی بہت بھلی لگ رہی تھی، وہ ریلنگ پر انگلیاں پھیرتے اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔ ہر بار کی طرح اس کی نظر گھوم پھر کر سامنے "قصر شاندار" کے لان پر جا ٹھہری۔ سامنے والی وائٹ اور گولڈن مرمر سے بنی کوٹھی اپنے نام کی طرح شاندار تھی، لان کی تو کیا ہی بات تھی، پھولوں کے تختے مخملیں گھاس پر اس خوب صورتی سے سجے تھے، دور سے دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا جیسے سبز قالین پر ڈیزائن کڑھا ہو۔

اس وقت سامنے لان کی روشنیاں بجھی تھیں، فوارے چل رہے تھے اور فواروں کے بیرونی کناروں میں لگے بالز جیسے آرائشی بلب روشن تھے جن کی دودھیا روشنی میں پانی پُراسرار انداز میں جھلملا رہا تھا، پھولوں کے تختوں اور باڑھ پر جگنو ہی جگنو تھے، وہ چمکتے تو یوں لگتا جیسے پھولوں پر چراغاں ہو رہا ہو اور ننھے ننھے دیے ٹمٹما رہے ہوں، وہ کتنی ہی دیر مسحور کھڑی یہ منظر دیکھتی رہی، اسے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ ٹیرس ایک دریچہ ہو اور وہ اس میں سے فیری لینڈ میں جھانک رہی ہو۔

سامنے والا ٹیرس بھی لان کی طرح بہت خوب صورت تھا، خصوصاً" بڑی سی گلاس ونڈو کے چاروں طرف سفید اور سیاہ گلابوں کے چھوٹے چھوٹے گملے جو ونڈو کے چاروں طرف ڈیکوریشن پیسز کی طرح نصب تھے، اتنے چمکیلے تھے لگتا تھا مٹی اور پارے سے بنے ہیں۔ چاندنی راتوں میں یوں چمکتے تھے کہ ان پہ نظر ٹھہرنا مشکل ہو جاتی تھی۔

"اس کوٹھی کا نام قصر شاندار بے جا نہیں۔" ٹیرس کی نیم تاریکی میں چہل قدمی کرتے ہیولے کو دیکھ کر اسے ہر بار کی طرح یہی خیال آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

فریج میں ہفتے بھر کی سبزیاں، گوشت سب موجود تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے بچوں کے لیے ان کا پسندیدہ نمکین چکن اور بھیا کے لیے گوبھی گوشت بنانے کا فیصلہ کیا اور تندہی سے جت گئی۔ تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا، چولہوں کی آنچ دھیمی کرتے ہوئے فون کان سے لگایا، دوسری طرف حنا تھی۔

"حنا پلیز! تم مائنڈ نہ کرو تو ہم کچھ دیر بعد بات کریں دراصل میں اس وقت کچن میں مصروف ہوں۔" وہ لجاجت سے بولی۔

"کوئی بات نہیں میں کچھ دیر بعد کال کرلوں گی۔" وہ خوش دلی سے بولی تھی۔

پھر کچن کا کام نبٹا کر وہ شاور لینے چلی گئی، بال سلجھاتے ہوئے حنا کو کال کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نیچے سے ٹیپو اور مونا کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سب بھول بھال کر نیچے آگئی، ان کو کپڑے بدلنے کے لیے بھیج کر کھانا لگا دیا۔

"پھپھو! کیا بنایا ہے؟"

"گوبھی گوشت۔"

"کیا؟" دونوں کے منہ بن گئے۔ وہ مسکرائی۔

"تم دونوں کے لیے نمکین چکن بنایا ہے، جلدی سے کھانا شروع کرو۔"

کھانے کے بعد انہیں جمائیاں لیتا دیکھ کر اس کی آنکھیں بھی بوجھل ہونے لگیں پھر میز سمیٹ کر انہیں سلاتے سلاتے وہ بھی سو گئی۔

بھرپور نیند لینے کے بعد اٹھی تو بچوں کے بستر خالی تھے۔ بال سمیٹتے ہوئے کھڑکی سے جھانکا تو وہ باہر کرکٹ کھیل رہے تھے، منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر وہ اپنے لیے چائے اور بچوں کے لیے ملک شیک بنانے لگی اور پھر معمول کی مصروفیات میں لگے لگے رات ہو گئی۔

رات کو سونے سے پہلے اس نے موبائل چیک کیا تو حنا کی کئی مس کالیں آئی ہوئی تھیں، وہ اٹینڈ نہ کرنے پر شرمندہ ہوتی کال کرنے لگی۔

"حنا! میں بہت شرمندہ ہوں، دراصل مصروفیت اتنی تھی میں چاہ کر بھی تمہاری کال اٹینڈ نہ کر سکی، تم ناراض تو نہیں ہو۔" سلام دعا کے بعد وہ معذرت کرنے لگی۔

"بھئی ناراض میں تب ہوتی جب تمہاری زندگی پر تمہارا کوئی حق ہوتا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے اچھنبے سے پوچھا۔

"بھیا، بھابھی کی خدمت، گھر کی دیکھ بھال، کچن کا انتظام، بچوں کی نگہداشت جیسے کئی ایک کام تمہارے ذمہ ہوتے ہوں گے، ایسے میں ـــ تمہارے پاس اپنی ذات کے لیے کتنا ٹائم بچتا ہوگا یہ میں اچھی طرح سے جان گئی ہوں۔" وہ طنز سے بولی۔

"نہیں حنا! ایسی کوئی بات نہیں، یہاں سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں، کوئی زبردستی نہیں ہے میں جو کرتی ہوں اپنی مرضی و خوشی سے کرتی ہوں، دراصل شروع شروع میں جب میں یہاں آئی تو بہت ڈسٹرب تھی، صدمہ ہی اتنا بڑا تھا، اوپر سے فراغت، خالی دماغ تو ہوتا ہی شیطان کا کارخانہ ہے، میں ڈپریشن کا شکار ہوتی جا رہی تھی، ایسے میں بھابھی نے میری بہت مدد کی مجھے میرے خول سے باہر نکالا، گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں اور بچوں کے ذریعے میرا دھیان بٹایا جس کی وجہ سے میں اب بہت حد تک سنبھل گئی ہوں ورنہ تو میں اب تک نفسیاتی مریضہ بن چکی ہوتی۔" وہ اسے بتانے لگی۔

"رہنے دو میزاب! تم بہت بھولی ہو، ذرا سوچو تو سہی اگر تمہیں مصروف کر کے تمہارا دھیان بٹانا مقصود تھا تو کیا صرف اس کے لیے گھر کے کام اور بچے ہی رہ گئے تھے؟ تمہاری بھابھی اگر چاہتیں تو تمہیں کوکنگ کورس لینگویج یا کمپیوٹر کورس میں مصروف کر دیتیں یا پھر تمہیں مزید تعلیم کے لیے آگے ایڈمیشن لینے پر بھی مجبور کر سکتی تھیں جس سے نہ صرف تمہیں مصروفیت میسر آتی بلکہ ڈگری اور مہارت بھی حاصل ہو جاتی، مگر نہیں انہوں نے اپنا فائدہ سوچا، انہیں تو بیٹھے بٹھائے کیئر ٹیکر مل گئی ہوگی۔"

"نہیں حنا! میری بھابھی ایسی نہیں ہیں۔" وہ فق ہوتے چہرے کے ساتھ بولی۔ پتا نہیں حنا کو یقین دلانا مقصود تھا یا خود کو۔

"چھوڑو یار! کیا تمہاری کیا میری بھابھی، یہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں، بڑی اچھی طرح جانتی ہوں میں ان بھابھیوں کی فطرت کو۔" اس کا لہجہ زہرخند تھا۔ "تمہارے سر پر تو والدین کا سایہ بھی نہیں، تم سے تو وہ سیدھے منہ بات کرلیں، یہی بڑی بات ہے۔" اس نے ہمدردی جتائی، وہ چپ رہی۔

"اچھا، ایک بات تو بتاؤ!" کچھ یاد آنے پر اس نے تجسس سے پوچھا "تمہارے بھیا نے جو گھر بیچا اس میں تمہارا بھی تو حصہ تھا، تمہیں دیا؟"

اس سوال نے تو بولتی ہی بند کر دی، اپنے حصے کے متعلق تو اسے بھولے سے بھی خیال نہیں آیا تھا اور نہ ہی بھیا نے اس بارے میں بات کی تھی۔

"ہاں بھئی آج کل کون کسی کو مفت میں کھلاتا ہے، تمہیں اپنے ساتھ رکھ رہے ہیں، پال رہے ہیں، اس سب پر ظاہر ہے اخراجات تو آئیں گے ناں، تمہارا حصہ شاید اسی صورت لوٹانے کا سوچا ہوگا۔" اس کی

چپ سے وہ جان گئی تھی۔ ”اچھا اب میں فون رکھتی ہوں‘ بہت رات ہو گئی ہے‘ تم اپنا خیال رکھنا‘ اللہ حافظ!“

اس کا سکون رخصت کر کے اس نے فون بند کر دیا اور میزاب اسے اللہ حافظ بھی نہ کہہ سکی۔

☼ ☼ ☼

”ٹیپو‘ مونا! جلدی سے اٹھ جاؤ بیٹا! اسکول سے دیر ہو جائے گی۔“

دونوں کو یکے بعد دیگرے واش روم میں دھکیلنے کے بعد بھابھی کچن کو بھاگیں۔ آج انہیں اٹھنے میں دیر ہو گئی تھی۔ ایک برنر پر چائے کا پانی چڑھا کر انہوں نے دوسرے پر جھٹ پٹ توا رکھ دیا‘ ساتھ ساتھ انڈے بھی پھینٹ رہی تھیں۔ اس وقت تک عموماً میزاب آ کر بچوں کے ٹفن بنانے میں ان کی مدد کر دیتی تھی مگر آج ابھی تک اس کا نام و نشان نہیں تھا۔

”مما! پھپھو کو بلا لاؤں؟“ انہیں پھرکی بنا دیکھ کر مونا نے پوچھا۔

”نہیں‘ اسے آرام کرنے دو‘ کل سارا گھر اکیلے سنبھالنا پڑا بے چاری کو۔ تھک گئی ہو گی‘ شاید سو رہی ہو۔“ انہوں نے نرمی سے منع کر دیا۔

”میزاب کہاں ہے؟“ ڈائننگ ٹیبل پر اسے نہ پا کر بھیا نے آتے ہی پوچھا۔

”پتا نہیں‘ صبح سے نیچے نہیں آئی‘ جاؤ ٹیپو بیٹا! میزاب کو بلا لاؤ‘ آپ ناشتہ شروع کریں ناں!“

”نہیں‘ میزاب کو آ لینے دو۔“ انہوں نے منع کر دیا۔

”مما! پھوپھو سو رہی ہیں‘ اٹھاؤں؟“ ٹیپو نے ریلنگ سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

”ابھی تک سو رہی ہے؟“ بھیا کو حیرت ہوئی‘ وہ تو صبح خیز تھی۔ ”نہیں سونے دو۔“ انہوں نے اسے واپس بلا لیا‘ آفس جانے سے پہلے خود اسے دیکھنے گئے‘ وہ تکیے میں منہ دیے سو رہی تھی۔ وہ دروازے سے ہی پلٹ گئے۔

میزاب کی آنکھ کھلی تو صبح کے دس بج رہے تھے۔ ساری رات رونے کی وجہ سے سر بھاری اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اندر آتی بھابھی اس کی حالت دیکھ کر ٹھٹھکیں

”میزاب تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟“ اس کا ماتھا چھو کر تشویش سے پوچھا‘ وہ بس خالی خالی نظروں سے انہیں دیکھے گئی ”اچھا یہ بتاؤ ناشتہ میں کیا لو گی؟ میں خود بنا کر لاتی ہوں۔“

”ہونہہ! دکھاوا۔“ سر جھٹکتے ہوئے اس نے سوچا۔ تھوڑی دیر بعد بھابھی اس کے لیے خود ہی چائے‘ آملیٹ اور پراٹھے پر مشتمل ناشتہ لے آئیں۔

”تم ناشتے کے بعد اپنے بھیا سے بات کر لینا‘ صبح بھی تمہیں دیکھنے آئے تھے مگر تم سو رہی تھیں۔“

اس نے جواب دینے کی بجائے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بہت الجھی سی الجھی تھی‘ انہوں نے بغور اسے دیکھا۔

”اچھا شاید آتی ہی ہو گی‘ تم ناشتہ کے بعد جلدی سے نیچے آ جاؤ۔“ وہ اس کا دھیان بٹانے کو بولیں اور خود برتن سمیٹ کر اٹھنے لگیں۔

”بھابھی!“ وہ اس کی آواز پر دروازے کے قریب رکیں‘ گردن موڑ کر دیکھا۔ ”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ اس نے صاف منع کر دیا۔

”کوئی بات نہیں۔ تم آرام کرو۔“ وہ مسکراتے ہوئے چلی گئیں اور پیچھے وہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”اچھی بھلی گزر رہی تھی‘ حنا! تم نے کس مصیبت میں پھنسا دیا مجھے۔“ وہ بال مٹھی میں جکڑتے بڑبڑائی‘ پھر سارا دن یاسیت‘ قنوطیت اور پراگندہ سوچوں کے درمیان اذیت میں گزرا۔

شام ہوئی تو بمشکل خود کو سمجھاتے ہوئے بچوں کو پڑھانے نیچے اتری‘ ادھر وہ بھی اپنی مما سے پھوپھو کے پاس جانے کی ضد کر رہے تھے جو وہ کسی صورت نہیں مان رہی تھیں۔

”مما! اب تو جانے دیں‘ اب تو ٹیوشن کا ٹائم بھی ہو گیا ہے۔“ ٹیپو منت کر رہا تھا۔

”پرامس! انہیں تنگ نہیں کریں گے۔“ مونا کیوں پیچھے رہتی‘ ان کی محبت پر وہ بے ساختہ مسکرا دی بلاشبہ اس گھر میں صرف ان بچوں کا پیار ہی تھا جو ہر طرح کے شک و شبہ سے بالاتر تھا۔

”کوئی ضرورت نہیں میزاب کے پاس جانے کی‘ اب اگر کسی نے ضد کی ناں تو اس کی خیر نہیں۔“ وہ غصہ سے بولیں۔

اس کے اٹھتے قدم ٹھٹھک گئے۔ بھابھی نے بچوں کو اس کے پاس آنے سے روک دیا صرف اس لیے کہ وہ آج ان کا ہاتھ بٹانے نیچے نہیں آئی تھی۔ یہ تھی ان کی اصلیت؟ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

”مگر ماما ٹیوشن؟“ ٹیپو ٹھنکا۔

”بھاڑ میں گیا ٹیوشن‘ بیگ اٹھاؤ اور جاؤ امینہ کے پاس۔ پڑھا دے گی وہ تم دونوں کو۔“ اس میں مزید سننے کی تاب نہیں تھی‘ وہ سیڑھیوں سے گھوم کر لاؤنج میں آنے کے بجائے سیدھا اترتی پچھلے صحن میں آئی بلا ارادہ دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔ وہ اس وقت صرف اور صرف فرار چاہتی تھی‘ اس گھر سے اپنی سوچوں سے‘ رویوں سے اور شاید خود سے بھی۔ ادھر بھابھی بچوں کو کچھ سمجھا رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

طویل ٹریک کے تین چکر لگا کر وہ قدرے ہانپ گیا تھا‘ سانس پر قابو پاتے اب وہ ایکسر سائز کر رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے پڑی تو وہ رک گیا وہ آج پھر اسی جگہ بیٹھی تھی۔

سرخ گلابوں کا کنج‘ اس پر منڈلاتی رنگ برنگی تتلیاں‘ پیچھے بہتا نیلگوں پانی اور زرد ہوتا آسمان کا کنارہ اس کی آنکھوں سے بہتی اداسی نے سب کو اپنے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ وہ بینچ سے ٹیک لگائے گم صم بیٹھی تھی۔ اس کی چپ توڑنے کی خواہش میں وہ بے ساختہ اس کے پاس چلا آیا۔

”سنا ہے حسن سوگوار ہو تو اس کی جاذبیت بڑھ جاتی ہے مگر اب ایسا بھی کیا کہ ہر وقت اداس رہا جائے یقین کیجیے! آپ ہنستے ہوئے بھی اتنی ہی حسین لگیں گی جتنی اداس ہو کر لگتی ہیں۔“

اس نے چونک کر سامنے دیکھا ارمان ہاتھ باندھے‘ لبوں میں مسکراہٹ دبائے کھڑا تھا‘ میزاب نے کوئی جواب دیے بغیر ناگواری سے منہ پھیر لیا وہ اس وقت کسی سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”کافی دنوں سے آپ پارک میں نظر نہیں آئیں۔“

”تو؟“ وہ رکھائی سے بولی تاکہ وہ مزید بات کیے بغیر چلا جائے۔

”تو یہ کہ..... خوش رہا کیجیے۔“ وہ جو اسے جما دیکھ کر اٹھنے کو پر تول رہی تھی‘ عجیب نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیا خوش رہنا اپنے اختیار میں ہوتا ہے؟“ اس کے لہجہ میں بے بسی تھی‘ وہ ٹھٹھکا۔

”خوش رہنا ہی تو وہ واحد چیز ہے‘ جو انسان کے اپنے اختیار میں ہوتی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”رجائیت کو دل کا مستقل مکین اور قناعت کو اپنا مزاج بنا کر۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا۔

”کتابی باتیں مت کریں‘ سیدھی طرح بتائیں۔“ وہ جھنجلائی۔

”دیکھیے میزاب! زندگی میں جو چیز‘ جو شخص‘ جو رویہ‘ جیسا آپ کے سامنے آتا ہے اسے ویسا ہی قبول کیجیے‘ ہر شے کی خوب صورتی کو محسوس کیجیے‘ اس کی بدصورتی کی کھوج میں مت رہیے۔ گمان ہمیشہ اچھا رکھیں اور ہر چیز کے مثبت پہلو تلاش کریں‘ آپ دیکھیں گی پھر آپ کا دل خود بخود خوش رہنے کو چاہے گا۔“ وہ اس کے چہرے کو نظروں کے حصار میں لیے نرم لہجے میں سمجھا رہا تھا۔

”کیا یہ مجھے پڑھ رہا ہے۔“ بغور اس کی بات سنتی وہ قدرے گھبرائی۔

”آپ کا مطلب ہے زندگی کی حقیقتوں سے نظریں چرا لی جائیں؟“

"اوں ہوں' زندگی کی حقیقتوں سے نظر چرانا خود فریبی ہے اور خود فریبی کبھی خوشی نہیں دیتی' حقیقتوں سے آگاہ ضرور رہنا چاہیے مگر ان کی کڑواہٹوں کو زندگی میں گھولنا نہیں چاہیے' آپ کو پتا ہے آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے فراغت؟" اسے اپنی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا پاکر وہ مسکرایا۔

"کچھ دن پہلے آپی نے آپ کی حالت کا ذکر کیا تھا میں نے انہیں یہی مشورہ دیا تھا کہ جتنا ہو سکے آپ کو مصروف رکھا جائے۔ اگر فوری طور پر کوئی بیرونی مصروفیت نہیں تو گھر کے کاموں اور بچوں میں مصروف کر دیں مگر جیسے بھی ہو سکے آپ کو فارغ نہ رہنے دیا جائے' وہ تو بتا رہی تھیں کہ گھریلو مصروفیات نے آپ کی طبیعت پر بہت اچھا اثر ڈالا ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ مصروفیات کچھ اتنی خاص نہیں کہ آپ کی سوچیں انہیں مرکز بنا کر انہی کے گرد گھومتی رہیں' آپ کے لیے بہتر ہوگا کہ آپ اپنی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں۔" وہ پروفیشنل انداز میں ہدایات دے رہا تھا مگر میزاب کی سوئی پیچھے اٹکی تھی۔

"یعنی آپ کے کہنے پر بھابھی نے مجھے گھریلو مصروفیات میں انوالو کیا؟"

"ہاں۔" اس نے سادگی سے کندھے اچکائے۔

"اف خدایا! حنا کے کہنے پر میں نے بھابھی کے بارے میں کتنا برا سوچ ڈالا۔"

"کیا ہوا میزاب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اسے سر ہاتھوں میں پکڑے دیکھ کر اسے تشویش ہوئی۔

"جی میں ٹھیک ہوں' دراصل میں سوچ رہی تھی بھابھی نے آپ سے مشورہ کیوں کیا؟" وہ خود کو سنبھالتی سیدھی ہو بیٹھی' مگر اس کی طرف دیکھنے سے دانستہ گریز کیا۔

"کیونکہ میں سائیکاٹرسٹ ہوں۔" وہ مسکرایا' میزاب چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر جانے کے لیے اٹھ گئی' دو قدم جانے کے بعد کچھ سوچ کر مڑی۔

"شکریہ سائیکاٹرسٹ صاحب! آپ کے ساتھ ہونے والی اس غیر ارادی میٹنگ سے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے اعتراف کیا۔

"مینشن ناٹ! آپ کی اس مسکراہٹ سے مجھے میری فیس وصول ہو گئی ہے۔"

وہ آنکھوں میں شرارت لیے کہہ رہا تھا' وہ گڑبڑاتے ہوئے انداز میں تیز تیز قدم اٹھاتی گھر کی طرف چل پڑی' ارمان کی پُرشوق نظروں نے تاحد نگاہ اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

گھر آکر اسے کمرے کی تنہائی ہولا رہی تھی۔ رہ رہ کر اپنی بدگمانیوں پر شرمندگی ہو رہی تھی۔

"حنا کی بچی' تم سے تو اللہ سمجھے' اچھی بھلی گزر رہی تھی' سارا اطمینان غارت کر دیا۔" بڑبڑاتے ہوئے اس نے SIM ہی نکال کر پھینک دی۔ پھر رات کو بھیا آفس سے سیدھے اس کے پاس اوپر آئے تھے اس کی طبیعت مضمحل دیکھی تو بھابھی پر ناراض ہونے لگے۔

"کم از کم آکر دیکھ تو لیا ہوتا' پتا بھی تھا اس کی طبیعت صبح سے ٹھیک نہیں۔"

وہ بغور بھیا کو دیکھنے لگی۔ تکان ان کے چہرے پر صاف نظر آرہی تھی مگر وہ آتے ہی آرام کرنے کے بجائے اس کے پاس چلے آئے تھے' اس کے لیے ازحد فکرمند ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے سامنے رکھی چائے کی پیالی کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔

"دراصل میں شام میں آئی تو میزاب شاید پارک گئی ہوئی تھی' میں سمجھی اب طبیعت ٹھیک ہو گئی ہوگی پھر میں کچن میں اتنی مصروف ہوئی' اوپر آنے کا خیال تک نہیں آیا۔ آئی ایم رئیلی سوری میزاب! واقعی غلطی میری ہے۔" بھابھی نے معذرت کی۔

"آجاؤ تم دونوں بھی۔" ٹیپو اور مونا کو دروازے سے جھانکتا دیکھ کر انہوں نے اندر بلایا "لو سنبھالو انہیں اسکول سے آتے ہی پھوپھو' پھوپھو کی رٹ لگا رکھی تھی۔ شام میں بھی بڑی مشکل سے ڈانٹ کر انہیں تمہارے پاس آنے سے روکا' لاکھ کہا تمہاری

طبیعت خراب ہے مگر یہ بیگ اٹھا کر تیار ہو گئے' زبردستی انہیں امینہ کے پاس بھیجا تاکہ تم آرام کر سکو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں اور میزاب بحرِ ندامت میں غرق ہوتی جا رہی تھی۔

"آپ نے صحیح کہا تھا ارمان! خوش ہونا واقعی ہمارے اختیار میں ہوتا ہے۔"

ٹیپو اور مونا کو گلے لگاتے ہوئے وہ پُرسکون تھی۔

☆ ☆ ☆

"بھیا میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔"

اگلے دن اس کی طبیعت بہت بہتر تھی' بہت سوچ بچار کے بعد اسے پڑھائی ہی ایسی مصروفیت نظر آئی تھی جو اسے فضول سوچوں اور بدگمانیوں سے بچا سکے۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" انہوں نے سراہا "مگر جہاں تک میرا اندازہ ہے' تقریباً تمام یونیورسٹیز میں داخلے کی تاریخ گزر چکی ہوگی۔"

"اچھا۔" وہ بجھ سی گئی۔

"آپ عبدالعالیشان سے بات کیوں نہیں کرتے؟ پرائیوٹ یونیورسٹیز میں داخلے کی تاریخ تو کافی زیادہ ہوتی ہے' ہو سکتا ہے اس کی یونیورسٹی میں داخلہ مل جائے" بھابھی نے آئیڈیا دیا۔

"ارے ہاں! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں' اس کی یونیورسٹی کا شمار تو شہر کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہوتا ہے' ریپوٹیشن بے حد اچھی ہے اور سب سے بڑی بات گھر سے زیادہ دور بھی نہیں یعنی آنے جانے کا مسئلہ بھی نہیں ہوگا' اگر یہاں بات بن جائے تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ میں یوں کرتا ہوں ابھی اس سے ملتا ہوا جاتا ہوں' گھر پر ہی ہوگا ابھی۔" وال کلاک کی طرف دیکھتے وہ ناشتہ ادھورا چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"ویسے کس سبجیکٹ میں M.A کا ارادہ ہے؟" انہوں نے گھڑی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"انگلش لٹریچر' دراصل ایف اے اور بی اے میں بھی یہی سبجیکٹ میرے پاس رہا ہے۔" اس نے وضاحت کی۔

پھر کچھ ہی دیر میں بھیا کا فون بھی آگیا۔ انہوں نے حسبِ توقع خوشخبری سنائی' اس کے نمبر چونکہ 80% سے بھی اوپر تھے اس لیے پرنسپل نے ان کی درخواست پر آخر میں بچ جانے والی محدود نشستوں پر اسے داخلہ دینے کی حامی بھر لی تھی۔ شام کو آتے ہوئے وہ داخلہ فارم لیتے آئے تھے۔ انہوں نے کپڑے وغیرہ بنوانے کے لیے ڈھیروں نیلے نوٹ اس کی مٹھی میں تھما دیے' وہ منع کرتی' رہ گئی مگر بھابھی نے امینہ کو بلا کر اس کے ساتھ اسے بازار بھیج کر دم لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

آج یونیورسٹی میں اس کا پہلا دن تھا' ابھی کافی وقت تھا' وہ آرام سے تیار ہو سکتی تھی مگر پہلے دن کی ایکسائٹمنٹ ہاتھ پاؤں پھلا رہی تھی' بہت سوچ بچار کے بعد اس نے گولڈن پرنٹ والا سفید سوٹ پہننے کے لیے منتخب کیا تھا۔ گولڈن بارڈر والا سفید دوپٹہ سر پر جماتے ہوئے آئینے میں سرسری نظر ڈالتی وہ نیچے آگئی۔

بھابھی ناشتہ بنا چکی تھیں' اس نے جلدی سے میز پر برتن لگا دیے۔ ناشتے کے بعد بھیا بریف کیس چیک کرنے لگے' وہ بھابھی کو اللہ حافظ کہتی پورچ میں چلی آئی۔ اپنی گاڑی کا دروازہ کھولتا ارمان ٹھٹکا۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں' وہ محسوس کر کے بھی نظر انداز کر گئی۔

"کہیں جا رہی ہیں آپ؟"

"یونیورسٹی۔" مختصر جواب دے کر وہ قد آدم سفیدے کے درختوں کو دیکھنے لگی' وہ دانستہ اس کی بولتی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"دیٹس گریٹ۔" اس نے سراہا "ویسے بہت اچھی لگ رہی ہیں آپ۔" اس کے اجلے سراپے کو ستائشی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس نے تعریف کی۔

"تو۔" میزاب نے جان بوجھ کر ساری مروت بالائے طاق رکھ دی۔

وہ اک ٹھنڈی آہ بھر کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں پنپتے جذبات اس کے لیے نئے تھے وہ نجانے کیوں انہیں پڑھنا نہیں چاہ رہی تھی۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے وہ دانستہ ارمان کے متعلق سوچنے سے گریز کرتی رہی۔

دس منٹ بعد گاڑی جھٹکے سے سفید رنگ کی وسیع و عریض عمارت کے آگے رک گئی' وہ بیگ سنبھالتی باہر نکلی' فائل کو سینے سے لگاتے ہوئے شیشے میں جھک کر بھیا کو اللہ حافظ کہا وہ اس کا سر تھپک کر گاڑی آگے بڑھا لے گئے۔

وہ ستائشی نظروں سے عمارت کو دیکھتی سفید دیو قامت گیٹ کے آگے رک گئی دل گھبرا رہا تھا' قدم ہولے ہولے لرز رہے تھے' خود پر قابو پاتی وہ اندر داخل ہوئی تو ٹھٹھک گئی۔

"زبردست" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا' یہ یونیورسٹی کا وسیع و عریض لان تھا یا کوئی نرسری' رنگ برنگے پھول تاحد نگاہ اپنی بہار دکھا رہے تھے۔

سامنے ہی تین منزلہ گول عمارت سر اٹھائے کھڑی تھی' وہ گلاس ڈور کے سامنے رکی' وہ آٹومیٹکلی کھل گیا' یہ بہت بڑا کوریڈور تھا جس کے اختتام پر اوپر جاتی سیڑھیاں تھیں' کوریڈور کے دائیں بائیں دو راستے نکلتے تھے' ایک طرف سائنس اور دوسری طرف آرٹس ڈیپارٹمنٹ لکھا تھا۔ وہ بغور ہر چیز کا جائزہ لیتی آگے بڑھ رہی تھی سیڑھیوں کے پاس نمایاں جگہ پر نوٹس بورڈ نصب تھا' جہاں کمرہ نمبر کے ساتھ ساتھ نئی کلاسز کا ٹائم ٹیبل تھا' اس کا کمرہ نمبر 20 تھا اور سیڑھیوں پر لگے بورڈ کے مطابق کمرہ نمبر بیس دوسری منزل پر تھا' وہ ریلنگ پر ہاتھ ٹکائے آرام آرام سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر آ گئی' ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں تھی' کمرہ سامنے تھا۔

وسیع کمرے میں اکا دکا لوگ موجود تھے' وہ درمیانی رو کی پہلی قطار میں بیٹھ گئی' کچھ سمجھ میں نہ آیا تو فائل کھول کر کاغذ پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنے لگی' ذرا ہی دیر میں کمرہ بھرنے لگا' زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی جینز شرٹ سے لے کر اسکارف اور عبایا میں ملبوس ہر طرح کی لڑکیاں تھیں لڑکے صرف پانچ تھے' آج چونکہ پہلا دن تھا سب ایک دوسرے سے تعارف کروا رہے تھے وہ بہت نروس ہو رہی تھی۔ اپنی کمزوری چھپانے کے لیے خود پر بے نیازی کا خول چڑھا کر فائل پر مزید جھک گئی' جب اچانک ایک سانولا سا نازک ہاتھ اس کے سامنے آیا' اس نے چونک کر اوپر دیکھا گندمی رنگت' بڑی بڑی آنکھیں اور تیکھے نقوش والی لڑکی ایک ہاتھ سے اپنے گول چہرے پر آئے اسٹیپ کٹنگ بالوں کو ہٹاتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔

"ہیلو!" آئی ایم علیشہ۔"

"میزاب۔" اس نے بھی مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" وہ اس کے ساتھ والی سیٹ کا پوچھ رہی تھی۔

"کیوں نہیں۔" اسے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

"ویسے B.A میں کیا مین سبجیکٹ تھا تمہارا؟" اس نے بیٹھتے ہی پوچھا۔

"انگلش لٹریچر۔"

"زبردست' میں نے بھی یہی رکھا تھا" بے تکلفی سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے وہ اب اپنے سابقہ کالج اور مارکس کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"بھئی میں بڑی بے تکلف سی بندی ہوں' مجھے چپ بیٹھنا نہیں آتا اب جب تمہیں میرے سیٹ فیلو ہونے کا اعزاز مل رہا ہے تو تمہیں عادت ڈال لینی چاہیے' یقین کرو اگر تم کم گو ہو تو میں چند دنوں میں تمہیں بھی بولنا سکھا دوں گی۔ اب تم بھی اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔"

میزاب جو حیرت سے اسے پٹر پٹر بولتا دیکھ رہی تھی' اس کے پوچھنے پر مسکراتے ہوئے اپنے بارے میں بتانے لگی' وہ کم گو ضرور تھی مگر آدم بیزار نہیں۔ اسے یہ باتونی سی لڑکی پہلی نظر میں اچھی لگی تھی۔ کلاس میں سب ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے' ایک شور سا مچا تھا' اچانک گونجتی آوازیں یوں بند ہو گئیں جیسے کسی نے ٹیپ کا بٹن بند کر دیا ہو۔ سب کی نظروں کے تعاقب میں اس کی نظر دروازے پر پڑی تو اس کا حال بھی باقیوں سے مختلف نہیں تھا۔

"وہ کون تھا؟ کوئی ساحر' سورج کی اولین کرنوں میں نہا کر آیا یونانی دیوتا' مجسم وجاہت یا نظر کا دھوکا؟"

سب یوں مبہوت ہو کر اسے دیکھ رہے تھے گویا سانس تک لینا بھولے ہوں۔ وہ آہستہ روی سے قدم بڑھاتے روسٹرم کے پیچھے جا کر رک گئے۔ اک شان بے نیازی سے طائرانہ نظر پوری کلاس پر ڈالی اور ہونٹ کے گوشوں میں خیر سگالی مسکراہٹ دبا کر قدرے آگے کو جھکے۔ "السلام علیکم!"

گمبھیر آواز کمرے میں گونجی' چھناکا ہوا' طلسم ٹوٹا اور سب اپنے حواسوں میں لوٹ آئے' مگر نظریں ابھی بھی اس پر جمی تھیں۔

"میں عبد عالیشان ہوں' اس یونیورسٹی کا اونر' آپ سب کو یہاں ویلکم کہتا ہوں' جیسا کہ آپ کو پتا ہو گا یہ پوئٹری کا پیریڈ ہے' میں آپ کو پوئٹری پڑھاؤں گا' آج چونکہ پہلا دن ہے اس لیے تعارف ہو جائے تو اچھا ہو گا' ایک دوسرے کو پہچاننے میں آسانی رہے گی جبکہ جاننے کے لیے تو دو سال پڑے ہیں۔"

انہوں نے کہتے ہوئے پہلی رو کی پہلی کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر بیٹھی لڑکی مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروانے لگی لڑکوں کا ٹولہ کافی شرارتی لگ رہا تھا کسی نہ کسی کی کوئی بات پکڑ کر ضرور کمنٹ پاس کرتا' سب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی' سب اپنا تفصیلی تعارف کروا رہے تھے اور وہ مسلسل وہ جملے سوچے جا رہی تھی جو اسے اپنے تعارف میں کہنے تھے یہاں تک کہ اس کے ساتھ بیٹھی علیشہ کی باری آ گئی وہ حسب عادت کھڑے ہوتے ہی نان اسٹاپ شروع ہو گئی۔

"میرا نام علیشہ نیازی ہے' میں نے 70% مارکس کے ساتھ گریجویشن کلیئر کیا ہے' میری سب سے بڑی ہابی باتیں کرنا ہے' مجھ سے چپ کسی صورت نہیں رہا جا سکتا۔"

پیچھے سے بے ساختہ آواز آئی' سب کے ہونٹوں پر دبی دبی مسکراہٹ دوڑ گئی' علیشہ نے آنکھیں سکیڑ کر پیچھے بیٹھے لڑکوں پر نظر ڈالی اور سر جھٹک کر پھر سے شروع ہو گئی۔

"ایک بات بتاتی چلوں جس کا جاننا آپ سب کے لیے بہت ضروری ہے' میں اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں بلکہ ماؤنٹ ایورسٹ سے دینے کی عادی ہوں' سو بی کیئر فل یو آل۔"

"اف ڈر ر ر ر ر گئے ہم تو۔"

اس کی وارننگ کے جواب میں پیچھے سے لڑکوں کی کپکپاتی آواز ابھری' پوری کلاس کشت زعفران بن گئی' علیشہ نے شکایتی نظروں سے سر کو دیکھا' جن کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ تھی' وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی اب میزاب کی باری تھی' اپنی گھبراہٹ پر قابو پا کر بمشکل کھڑی ہوئی تو ذہن سلیٹ کی طرح صاف تھا' سارے سوچے گئے جملے مٹ گئے تھے۔

"میں میزاب رحمت ہوں۔" اپنے سارے اعتماد کو یکجا کر کے آواز میں سموتے ہوئے وہ اپنے تعارف میں بس اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

"نائس نیم۔" سب کا تعارف خاموشی سے سنتے عالیشان کی زبان سے پہلی بار کچھ نکلا تھا' لمحہ بھر کو وہ ساکت رہ گئی' مگر فوراً خود کو اپنے ازلی بے نیازی کے خول میں سمیٹ لیا۔

"تھینک یو سر!" شان بے نیازی سے سر کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے' بیٹھتے ہی اس نے اپنی بے اختیار ہوتی نظریں سختی سے فائل پر گاڑ لیں۔

"نخریلی' مغرور' باوقار۔" اس کے ایک جملے کے رد عمل میں ان ہی تین لفظوں میں سے ایک نہ ایک پوری کلاس کے ذہنوں میں ابھرا تھا۔ پھر سب سے تعارف ہو جانے کے بعد عالیشان چلے گئے' مگر اپنا سحر پیچھے چھوڑ گئے۔

لڑکیاں تو لڑکیاں لڑکے تک ان کی شاندار پرسنالٹی سے بری طرح متاثر تھے' ان کی سحر انگیز شخصیت نے متاثر تو اسے بھی بہت کیا تھا مگر وہ منہ سے ایک لفظ

نہیں بولی تھی۔

"تھانکس نیم۔" سونے کی کوشش کرتے ہوئے رات دیر تک اس جملے کی بازگشت کانوں میں گونجتی رہی تھی۔

٭ ٭ ٭

یونیورسٹی کا ماحول بہت اچھا تھا، تمام ٹیچرز ینگ تھے، اس لیے اسٹوڈنٹس کے ساتھ ان کی ذہنی ہم آہنگی کمال کی تھی، کتاب کے لفظوں کو حرف آخر نہیں سمجھا جاتا تھا، ہر کسی کو مئوثر دلائل کے ساتھ اختلاف رائے کا حق تھا۔

میزاب کو پڑھائی کی صورت میں جہاں بہترین مصروفیت میسر آئی تھی، وہیں علیشہ جیسی بہترین دوست بھی ملی تھی۔ وہ جلد کسی سے بے تکلف نہیں ہوتی تھی اپنی اسی عادت کی وجہ سے وہ آج تک کوئی بیسٹ فرینڈ نہیں بناپائی تھی، مگر علیشہ نے کہاں اس کے بے تکلف ہونے کا انتظار کیا تھا وہ خود ہی اس کے اتنے قریب آگئی تھی کہ جس دن وہ چھٹی کرتی، میزاب کا بھی دل نہیں لگتا تھا۔ وہ بہت دلچسپ لڑکی تھی، اس کی آدھی سے زیادہ گفتگو اپنے بھائی کے متعلق ہوتی تھی۔ علیشہ نے اپنے تعارف میں کہا تھا کہ وہ اینٹ کا جواب ماؤنٹ ایورسٹ سے دینے کی عادی ہے، اس وقت تو لڑکوں نے خوب مذاق اڑایا تھا مگر چند دن بعد جب اس نے ان کے سر پر ماؤنٹ ایورسٹ بلاسٹ کیا تب انہیں ہوش آیا، مگر تب تک چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔ اس نے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا بس ساری اکیڈمی میں انہیں "بھائی" مشہور کر دیا تھا۔ بے چارے جہاں سے گزرتے بھائی بھائی کی صدائیں کانوں میں سوئیاں بن کر چبھتی تھیں۔

پڑھائی زور و شور سے شروع ہوچکی تھی، وہ سب جو ماسٹرز کو بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھے ہوئے تھے، صحیح معنوں میں چکرا گئے، وہ جب یونیورسٹی آئے تھے ان دنوں فائنل والوں کے ٹیسٹ چل رہے تھے، ویلکم پارٹی ان ہی کی نذر ہوگئی تھی، تھوڑا بہت زبانی کلامی احتجاج کے بعد اب جب وہ پڑھائی میں گم ہوچکے تھے تو تین ماہ بعد فائنل والوں کی طرف سے ویلکم پارٹی کا اعلان تازہ ہوا کے جھونکے سے کم نہیں تھا۔

٭ ٭ ٭

میزاب سفید فراک جس کے گلے اور بازوؤں پر سفید جھلملاتے نگینوں کا دلکش کام بنا تھا، چوڑی دار پاجامہ کے ساتھ چنا دوپٹہ گلے میں ڈالے، آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی، عین اسی وقت موبائل کی بپ بجی۔

"خبردار! اگر آج تم سادگی کا سمبل بنی نظر آئیں تو..."

علیشہ کا دھمکی آمیز میسج پڑھ کر وہ مسکراتے ہوئے تیار ہونے لگی آج اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اس نے سلکی بالوں کو سلجھانے کے بعد پنوں سے سیٹ کر کے کھلا چھوڑ دیا۔ آنکھوں میں کاجل کی گہری لکیریں کھینچ کر، ہونٹوں پر پنک لپ اسٹک جمائی اور جیولری کے نام پر سفید نگینوں سے مزین ایئر رنگز کانوں میں ڈالنے کے بعد اس کی تیاری مکمل تھی، وہ نیچے آئی تو بھابھی نے اس کی سونی کلائیاں دیکھ کر سفید نازک کنگن زبردستی اسے پہنا دیے۔

لاؤنج میں بھیا کا انتظار کرتے کرتے اسے آدھا گھنٹہ ہوگیا تھا، انہیں فون کیا تو پتا چلا وہ آفس سے نکل چکے ہیں مگر ٹریفک جام میں پھنس گئے ہیں اس لیے پتا نہیں کب تک پہنچ سکیں گے۔ وہ پریشان ہوگئی، فنکشن کا وقت 5 بجے کا تھا۔ علیشہ کے میسج پر میسج آرہے تھے وہ پہنچ چکی تھی اور بے صبری سے اس کا انتظار کررہی تھی۔

تب ہی پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی، وہ تیزی سے باہر آئی مگر گاڑی سے نکلتے ارمان کو دیکھ کر ٹھٹک گئی وہ بھی اسے دیکھ چکا تھا۔

"ارمان! تم پلیز میزاب کو یونیورسٹی چھوڑ آؤ، عمر نجانے کب آئیں، اسے دیر ہورہی ہے۔"

وہ پلٹنے کو تھی کہ بھابھی نے ارمان سے کہا۔ اس کی

تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔ اس نے جلدی سے فرنٹ ڈور کھول دیا، میزاب جھجکتے ہوئے بیٹھ گئی۔

سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ چینل فائیو کی خوشبو اور ارمان کی بولتی آنکھوں نے خاموشی کو فسوں خیز بنا دیا تھا۔ اس نے گھبرا کر شیشہ کھول دیا، آوارہ ہوا اس کے بالوں سے چھیڑ خانی کرنے لگی، اس نے دوڑتے درختوں پر نظر جمالی۔

"اسے آنکھوں کی زبان پڑھنا نہیں آتی تھی یا وہ پڑھنا نہیں چاہتی تھی؟" ارمان سمجھ نہیں سکا۔

"سنو! بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ اترنے لگی تو ارمان خود کو روک نہیں سکا۔

"تو؟"

جواب حسب توقع تھا، وہ اس "تو" سے چڑتا تھا اور ہر بات پر بے ساختہ اس کے منہ سے یہی نکل جاتا تھا۔ اپنی ازلی بے نیازی سے وہ دروازہ بند کر کے آگے بڑھ گئی۔

ٹھنڈی آہ بھر کر سیٹ بیک پر سر گراتے ہوئے وہ بے چارگی سے مسکرا دیا۔ اب دل ناداں کا کیا کرتا جسے اس کی بے رخی پر بھی پیار آتا تھا۔ گیٹ کراس کرنے سے پہلے میزاب نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا، وہ اپنی آنکھوں میں سچے موتیوں سے خالص جذبے لیے اسے ہی دیکھ رہا تھا، وہ تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ علیشہ اس کے انتظار میں گیٹ کے آس پاس منڈلا رہی تھی۔

"میزاب یہ تم ہو؟" اسے دیکھتے ہی وہ چیخ اٹھی۔ وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ علیشہ بھی گلابی بارڈر والے آسمانی دوپٹہ سوٹ میں بالوں کی اونچی پونی کیے، لٹیں آگے گرائے، بہت پیاری لگ رہی تھی وہ سراہے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ سوٹ بھائی نے گفٹ کیا ہے، ان کی پسند ہی اتنی اعلا ہے کیا بتاؤں۔"

علیشہ شروع ہوگئی "میرا بھائی" اس کا فیورٹ ٹاپک تھا جس پر وہ بلا تکان بول سکتی تھی۔ میزاب سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لینے لگی۔

پارٹی کا انتظام لان میں کیا گیا تھا، سب سے ہیلو ہائے کرتے علیشہ اسے لے کر جلدی سے اگلی سیٹوں پر آ بیٹھی۔

پچھلی سیٹوں پر بیٹھے لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے پر شگفتہ جملے کس رہے تھے، وہ ان شرارتوں سے خوب لطف اندوز ہو رہی تھی، تب ہی ہنستے ہوئے اس کی نظر سامنے پڑی تو ساکت رہ گئی۔ جس جس نے بھی سامنے سے آتے عالشان کو دیکھا ایک پل کو تھم سا گیا۔

"کوئی اس قدر شاندار کیسے ہو سکتا ہے۔" میزاب نے آنکھیں موند کر طویل سانس لیتے ہوئے گلابوں کی خوشبو اندر اتاری۔

"ارے، کیا ہوا۔" اس کی بند آنکھیں دیکھ کر علیشہ کو تشویش ہوئی۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" مدھم مسکراہٹ نے اس کے ہونٹوں پہ دم توڑا "کچھ ہونا بھی نہیں چاہیے۔" اس نے خود کو تنبیہہ کی۔

عالیشان کے آتے ہی فنکشن کا باقاعدہ آغاز ہوگیا تھا۔ سارے آئٹم بہت زبردست تھے، جہاں فائنل والوں نے جونیئرز کی ٹانگ خوب کھینچی وہاں ہوٹنگ بھی زور و شور سے جاری تھی، آخر میں اب ٹائٹل دیے جا رہے تھے، جو بھی اپنا ٹائٹل لینے اسٹیج پر جاتا اسے بمبو باسکٹ میں سے ایک پرچی اٹھا کر اس پر لکھی سزا پر عمل کرنا پڑتا ورنہ نیچے جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی، ان کی کلاس کی باری آئی تو سب کے دل متوقع گت سے لرز رہے تھے۔ مبارک جیسے سینک سلائی دھان پان سے لڑکے کو جب "مولا جٹ" کا ٹائٹل ملا تو سب کے قہقہے ابل پڑے۔ شہرام کو ماسٹر مائنڈ کے ٹائٹل سے نوازا گیا کہ مصدقہ اطلاع تھی، آج کل یونیورسٹی میں ہونے والی چھوٹی بڑی ہر شرارت کے پیچھے موصوف کا دماغ ہوتا ہے۔

علیشہ کو "مس پٹاخہ" کے ٹائٹل کے لیے بلایا گیا وہ جل کر خاک ہوگئی، اس پر مستزاد یہ کہ اس نے پرچی اٹھائی تو اس میں سلطان راہی کا ڈائیلاگ بولنے کی

فرمائش درج تھی، وہ بری پھنسی تھی، نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن، جیسے تیسے سلطان راہی اسٹائل کے ڈائیلاگ نما بڑھک مار کر وہ کھولتی ہوئی نیچے اتری، سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا۔ میزاب علیشہ کی ناراضی کے ڈر سے اپنی ہنسی روکنے کی کوشش میں بے حال ہوئی جا رہی تھی، وہ کچھ دیر تو اسے گھورتی رہی پھر خود بھی اس کے ساتھ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ میزاب آج جتنا ہنسی تھی، اتنا تو ساری زندگی میں نہیں ہنسی تھی۔

سب کو ٹائٹل مل چکے تھے، اب اس کی باری تھی اس کی ٹانگیں کانپ رہیں تھیں۔

مگر جب اسے "Olympia" (چاند کی دیوی) کا ٹائٹل لینے کے لیے بلایا گیا تو اس نے سکون کا سانس لیا، سب نے تالیاں بجا کر اس کے ٹائٹل کو خوب سراہا اسٹیج پر روشنیوں کے درمیان ٹائٹل لیتے ہوئے وہ واقعی "اولمپیا" لگ رہی تھی۔

پہلے مرحلے میں تو بخیر و خوبی سرخرو ہو گئی تھی، باسکٹ میں سے پرچی نکالتے ہوئے اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمک گئیں۔ پرچی میں گیت گانے کی فرمائش درج تھی، بول بھی لکھے تھے، وہ گھبرائی تو بہت مگر فرار ممکن نہیں تھا۔ وہ مائیک لے کر اسٹیج کے درمیان آ کھڑی ہوئی۔ سامنے ہی عالیشان اپنی تمام تر شان کے ساتھ براجمان تھے۔ اس کی ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔ نظریں اسے سامنے پا کر ہمیشہ کی طرح جھک گئیں۔

"میں تیرے سنگ کیسے چلوں سجناں....
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا۔"

اس نے سر چھیڑے لان میں سکوت چھا گیا، جس میں اس کی کھنکتی آواز گونج رہی تھی، جب وہ اسٹیج سے اتری تو تالیوں کے شور میں "ونس مور" کی آوازیں بھی تھیں۔

مگر وہ تیزی سے آ کر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی، ایسے میں اسے کچھ یاد تھا تو صرف عالیشان کے تالیاں بجاتے ہاتھ۔

☼ ☼ ☼

باہر لان میں سفیدے کی چھاؤں تلے امینہ کرسی پر پاؤں پسارے، بے زاری سے اخبار کے صفحے الٹ رہی تھی، وہ صبح جاب پر جاتی تھی اب اس نے شام میں ایم فل کی کلاسز جوائن کر لیں۔ کب سے میزاب کی اس سے ڈھنگ سے بات نہیں ہو سکی تھی، بس آتے جاتے حال احوال پوچھ لیا جاتا تھا۔ وہ دو کپ چائے ٹرے میں رکھے اس سے گپ شپ کرنے باہر چلی آئی، امینہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔

"کیسی ہو؟" میزاب نے کپ اس کی طرف بڑھایا۔

"کچھ مت پوچھو، صبح جاب شام میں کلاسز، رات کو ریسرچ مجھے تو اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔"

"تو جاب چھوڑ دو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"سوچا تو تھا، مگر پھر صبح کا وقت کیسے کٹے گا۔" اس نے آہ بھری۔

"ویسے تمہیں ایم فل کا خیال کیسے آیا؟" وہ بھی پاؤں اوپر کر کے ایزی ہو بیٹھی۔

"لو! مجھے کیا پڑی تھی یہ تو ارمان بھائی کا خواب ہے کہ میں P.H.D کروں، ویسے غالب امکان ہے، یہ خواب انہوں نے "کلیات اقبال" پڑھتے پڑھتے دیکھا ہو گا، اب تعبیر کے لیے محنت مجھے کرنا پڑ رہی ہے، میں تو راضی ہی نہیں ہو رہی تھی، مگر قائل کرنا تو کوئی ان سے سیکھے، اپنے سائیکاٹرسٹ ہونے کا خوب فائدہ اٹھاتے ہیں موصوف۔"

"یہ تو ہے۔" میزاب کو بھی اس کی بات سے اتفاق تھا، بہر حال جو بھی تھا ارمان نے اسے مایوسی کے فیز سے نکلنے میں بہت مدد دی تھی، اسے دل سے اعتراف تھا۔

"تم سناؤ، تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟"

"ایک دم زبردست" وہ بہت مطمئن تھی۔

"میزاب تمہیں پتا ہے شہر کی آدھی لڑکیاں M.A انگلش سر عالیشان کی یونیورسٹی سے صرف اور صرف ان کی وجہ سے کرتی ہیں، اب تو تم بھی ان سے مل چکی

ہو، کیا خیال ہے۔"

میزاب ہنس دی۔ اس کی نظروں میں عالیشان کا سراپا گھوم گیا تھا، امینہ کی بات درست تھی کیونکہ یونیورسٹی میں سب سے زیادہ لڑکیوں کی تعداد M.A انگلش کی کلاسز میں تھی کیونکہ عالیشان خود یہ سبجیکٹ پڑھاتے تھے۔ سب نہیں تو کم از کم آدھی لڑکیوں نے تو ان کی شخصیت سے متاثر ہو کر داخلہ لیا تھا، اس کا اعتراف تو وہ خود بھی کھلے عام کرتی تھیں۔

"مگر ایک بات ہے، سر کسی کو لفٹ نہیں کراتے، بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، ان کے پیچھے خواہ کوئی کتنا آہیں بھرے مگر ان کے سامنے پڑھائی سے ہٹ کر کوئی بات کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔" میزاب نے حقیقت بتائی۔

"خیر! ان کے کردار کی پختگی کا تو ایک عالم گواہ ہے، ویسے سچ سچ بتاؤ، انہیں دیکھ کر تمہیں کچھ کچھ ہوا؟" اس کی طرف جھکتے ہوئے امینہ نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں۔

"کچھ بھی تو نہیں۔" اس نے امینہ کو یقین دلایا تھا یا خود کو؟ مگر یہ سچ تھا اس نے جب پہلی بار عالیشان کو دیکھا تھا، وہ اسے ساحر لگے تھے، وہ سحر زدہ ہو گئی تھی، ان کے سامنے اگرچہ ہر وقت بے نیازی کے خول میں سمٹی رہتی مگر ان کے سحر سے آج تک نہیں نکل سکی تھی۔

"ہیلو گرلز! کیا چل رہا ہے؟" ارمان ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں بڑی سی قینچی لیے کھڑا تھا، میزاب نے چونک کر اسے دیکھا۔

بولتی آنکھیں، بکھرے بال، بلیو جینز پر سفید ٹی شرٹ پہنے، وہ کافی رف سے حلیے میں تھا مگر اس کے ہونٹوں پر کھیلتی مسکراہٹ ہمیشہ کی طرح بہت تازہ تھی۔ اس نے نظریں چرا لیں۔ ارمان پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف ہو گیا، باغبانی اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ چھٹی کا دن وہ اسی میں مصروف رہتا تھا، میزاب جو امینہ سے ڈھیروں باتیں کرنے کے ارادے سے آئی تھی، جلد ہی کام کا بہانہ کر کے اٹھ گئی۔

☼ ☼ ☼

ڈیٹ شیٹ کیا آئی، سب کی نیندیں اڑ گئیں۔ سب کچھ بھول بھال کر سب پڑھائی میں جت گئے تھے۔ ایسے میں عالیشان نے ایک دن بڑے اچھے موڈ میں اعلان کر دیا جس نے بھی 90% یا اس سے زیادہ نمبر لے کر ٹاپ کیا وہ اسے اپنا فیورٹ پین گفٹ کریں گے۔

"سر! لٹریچر میں 90% لینا تو ناممکن ہے کیا اس سے کم نمبر لے کر ٹاپ کرنے سے کام نہیں چلے گا؟" یہ علیشہ تھی۔

"نہیں۔" انہوں نے صاف جواب دے دیا۔

"میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھیے گا، دنیا میں بہت سے کام انتہائی مشکل ضرور ہوتے ہیں مگر کچھ بھی ImPossible (ناممکن) نہیں ہوتا، کیا کبھی آپ لوگوں نے غور کیا ہے لفظ ImPossible خود کہتا ہے I m Possible" انہوں نے بہت پتے کی بات کی تھی جسے بہت سوں نے ذہن نشین کر لیا تھا۔

وہ لوگ اب فری ہو چکے تھے۔ میزاب کو آدھی آدھی رات تک پڑھتا دیکھ کر بھابی کو تشویش ہونے لگتی تھی، اس لیے کبھی جوس تو کبھی فروٹ اور کبھی بادام کا حلوہ بنا کر اس کے کمرے میں بھجوا رہی ہوتی تھیں۔ میزاب کے بارے میں سوچتے ہوئے ہمیشہ ان کے دل میں مونا کا خیال آتا تھا وہ اس کا خیال نند کے بجائے بیٹی کی طرح رکھتی تھیں۔ بھیا کی بھی پوری کوشش ہوتی کہ اسے خوش رکھ سکیں۔ رات کو پڑھتے پڑھتے تھک کر جب وہ سونے کے لیے بتی بجھا کر نائٹ بلب جلاتی تو سامنے والی کوٹھی پر ٹہلتے وجود کا سایہ کھڑکی کے راستے، اس کے کمرے کی دیوار پر تیرنے لگتا اسے نیند نہیں آتی تھی، تنگ آ کر وہ کھڑکی بند کر دیتی تھی۔

ان دنوں جی بھر کر سونا اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بن چکی تھی، جونہی وہ گھڑی لیٹتی اسے عالیشان کے الفاظ یاد آ جاتے۔

"دنیا میں کچھ بھی ImPossible نہیں ہوتا۔"

وہ ساری تھکن بھول کر تندہی سے دوبارہ پڑھنے لگتی۔

اس کے پیپر حسب توقع بہت شاندار ہوئے تھے خصوصاً "پوئٹری کا تو لاجواب ہوا تھا" رزلٹ آنے میں ابھی دیر تھی مگر انہیں صرف ایک ہفتے کی چھٹیاں ملی تھیں۔ مونا اور ٹیپو کے ساتھ اس نے سات دن خوب مزے کیے 'نئی نئی ڈشز بنائیں' موسم بدل رہا تھا بھابھی اور امینہ کے ساتھ جا کر بہت دل سے شاپنگ کی۔

مونا اور ٹیپو تقریباً" روز اسے پارک لے جاتے' ارمان سے بھی سرسری ملاقات رہتی تھی' وہ جب بھی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا وہ بچوں کے ساتھ خود کو مصروف کر لیتی۔ وہ برا منائے بغیر سینے پر ہاتھ باندھے کچھ پل اسے دیکھتا رہتا پھر اس کی اس ادا پر مسکراتے ہوئے پلٹ جاتا۔

میزاب اپنے رویے پر کبھی تو شرمندہ ہوتی تو کبھی ارمان کی مستقل مزاجی اسے جھنجھلا دیتی' آخر تنگ آ کر اس نے پارک جانا چھوڑ دیا۔ ویسے بھی امینہ نے جتایا تھا وہ کورس کے سلسلے میں ایک سال کے لیے کینیڈا جانے والا ہے۔ اسے خوشی ہوئی تھی' ارمان کے ان کہے جذبوں کی شدتیں کبھی کبھی اسے بہت ڈسٹرب کر دیتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک بہت اجلی صبح تھی جب ان کا رزلٹ آیا۔ محنت کو ضائع جانے دینا قانون قدرت نہیں۔ میزاب نے حسب توقع پچھلے سارے ریکارڈ توڑتے ہوئے 90٪ کے ساتھ ٹاپ کیا تھا۔ علیشہ 80٪ کے ساتھ دوسرے اور شہرام 79٪ کے ساتھ تیسرے نمبر پر تھا۔

عالیشان نے حسب وعدہ اسے اپنا بہت قیمتی گولڈن پین گفٹ کیا تھا' جسے لیتے ہوئے اس نے پہلی بار عالیشان کی آنکھوں میں اپنے لیے ستائش دیکھی تھی۔ ان کی آنکھوں میں جو ہمیشہ دوسروں کی آنکھوں میں اپنے لیے ستائش دیکھنے کے عادی تھے۔

بھابھی نے گھر میں چھوٹی سی پارٹی کا اہتمام کیا تھا جس میں صرف گھر کے لوگ ہی مدعو تھے۔ ارمان البتہ کسی کاغذی کارروائی کے سلسلے میں اسلام آباد گیا ہوا تھا۔

اس نے بہت شوق سے گلابی ساڑھی پہنی تھی جو اسے بھابھی نے گفٹ کی تھی۔ امینہ نے اس کے لمبے بالوں کو خوب صورت سے جوڑے کی شکل دے کر' دو لٹیں کرل کر کے آگے ڈال دیں' ہلکے سے میک اپ کے بعد اس نے آئینہ دیکھا تو حیران رہ گئی۔

وہ نیچے آئی تو سب آ چکے تھے' سب نے اسے بہت سراہا' گفٹس کا ڈھیر جمع ہو گیا تھا۔ وہ ان کی محبتوں پر بس تشکر سے مسکراتی رہ گئی۔

کھانے کے بعد خواتین لاؤنج میں خوش گپیوں میں مصروف تھیں جبکہ مرد حضرات اپنے اپنے پورشنز میں واپس جا چکے تھے، صرف سہیل بھائی (بھابھی کے بڑے بھائی) بھیا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے سب کو چائے بنا کر دینے کے بعد وہ ان دونوں کے لیے کافی بنانے لگی۔ ٹرے میں کپ سیٹ کر کے وہ انہیں دینے آئی تو دروازے کے قریب ساڑھی کا پلو پھسل گیا' شکر تھا کافی چھلکنے سے بچ گئی' وہ کارنس پر ٹرے رکھ کر جلدی جلدی پلو سیٹ کرنے لگی' ڈرائنگ روم کا دروازہ ذرا سا کھلا ہونے کی وجہ سے اندر سے آتی آوازیں اسے صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"یار سہیل! میرا دل مطمئن ہے' پھر بھی نجانے کیوں کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ مجھے گھر نہیں بیچنا چاہیے تھا' دراصل اماں کے بیمار ہونے سے پہلے جب انکل نے یہ پورشن بیچنے کی بات کی تھی تو اماں نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں گھر بیچ کر شہر میں گھر لے لوں' انہیں اگرچہ اس گھر سے بے حد پیار تھا مگر میرے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر وہ شہر آ کر رہنے پر بھی رضامند ہو گئی تھیں۔ ان کی زندگی میں ہی میں نے گھر کے سودے کے لیے بات چیت شروع کر دی تھی' مگر اماں کو زندگی نے مہلت نہ دی۔ میں چونکہ سودا کر چکا تھا اس لیے ان کی وفات کے فوراً" بعد گھر بیچنا پڑ گیا۔ میزاب اس فیصلے سے بہت افسردہ تھی' مگر کیا کرتا مجبوری تھی ورنہ اپنی بہن کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی برداشت کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

بھیا کا لہجہ تھکا تھکا تھا۔

"تمہارا فیصلہ دانشمندانہ تھا عمر! تم خواہ مخواہ کا گلٹ مت پالو' خود سوچو آج مہنگائی کا یہ عالم ہے' آج سے دس پندرہ سال بعد کیا ہو گا؟ اگر تم شہر میں گھر نہ بنا پاتے تو کل کو پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد ٹیپو کیا خاک بنا پاتا۔"

"یہی سوچ کر تو اماں نے بھی اجازت دی اور میں نے بھی دل کڑا کیا تھا۔" انہوں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ویسے یہ پورشن اچھا خاصا بڑا ہے' تمہاری ضرورت سے بھی زیادہ' پھر تم پچھلی طرف صحن میں دوسرا پورشن کیوں بنوانا چاہتے ہو؟" سہیل بھائی حیرت سے پوچھ رہے تھے ابھی کچھ دیر پہلے عمر بھیا نے ان سے نقشہ بنانے کی بات کی تھی کہ وہ آرکیٹیکٹ تھے۔

"دراصل سہیل' میزاب بے شک کل کو رخصت ہو کر اس گھر سے چلی جائے گی' مگر میں نہیں چاہتا میرے بعد اس کا میکہ ختم ہو جائے' میں یہ چھوٹا سا پورشن بنوا کر اس کے نام کرنا چاہتا ہوں۔" بہن کے بارے میں بات کرتے ہوئے ان کے لہجے میں بے انتہا پیار تھا۔

"او' ہاں پچھلے گھر میں میزاب کا بھی تو حصہ تھا۔" سہیل بھائی نے سر ہلایا۔

"نہیں یار! اس کے حصے کے پیسے تو میں نے فوراً" اس کے نام سے بینک میں جمع کروا دیے تھے۔ اس کے لیے یہ پورشن بنوانا' اس کی دھوم دھام سے شادی کرنا یہ سب میری ذمہ داری ہے۔ شادی کے بعد وہ پیسے میں اس کے حوالے کر دوں گا' وہ جیسے چاہے استعمال کرے' وہ میرے پاس اس کی امانت ہیں۔" وہ متانت سے بولے۔

ندامت' شرمندگی' تشکر نجانے کس کس جذبے نے بیک وقت وارد ہو کر میزاب کی آنکھیں جھلملا دی تھیں۔ کافی ٹھنڈی ہو رہی تھی' بدقت خود پر قابو پاتی وہ اندر گئی۔ انہیں کافی سرو کر کے ڈرائنگ روم کا بیرونی دروازہ کھول کر اگلی طرف کھلی فضا میں آ گئی۔ وہ اس وقت تنہائی چاہتی تھی۔

"اف کتنی ناشکری ہوں میں' اگر اللہ تعالیٰ نے والدین جیسی نعمت سے محروم کیا تھا تو بھیا' بھابھی کی بے غرض محبت سے یہ محرومیاں بھی تو چھینی تھیں' مگر میں نے ہمیشہ ان کی محبت پر شک کیا' کتنا منفی سوچا میں نے بھیا کے بارے میں' یہ تو ارمان تھا جس کی وجہ سے میں زندگی کے روشن پہلو دیکھنے کے قابل ہوئی' نہیں تو کڑھ کڑھ کر کب کا خود ساختہ مفروضوں کی بھینٹ چڑھ چکی ہوتی۔" اسے اپنی ایک ایک سوچ یاد آ رہی تھی' پشیمانی کے بوجھ سے تھک کر اس نے آنکھیں موند کر سر کرسی پر گرا دیا۔

تب ہی گیٹ کھلنے کی آواز آئی' بھاری قدموں کی چاپ اس کے قریب آ کر معدوم ہو گئی۔ اس نے آہستگی سے آنکھیں کھولیں' سامنے ارمان کھڑا تھا۔ وہ قدرے حیران سی اس کے سلام کا جواب دیتی سیدھی ہو بیٹھی۔

"تم رو رہی ہو؟" اس کے گالوں پر آنسوؤں کی لکیریں دیکھ کر اسے حیرت سے زیادہ تشویش ہوئی تھی۔

"اگر غلطی کا احساس رونے پر مجبور کر دے تو؟" اس نے رندھی آواز میں جواب کے بجائے سوال کیا تھا۔

"بس اک شک ندامت نے صاف کر ڈالے
وہ سارے حساب جو ہم نے اٹھا رکھے تھے۔"

کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے ارمان نے بے ساختہ شعر پڑھا میزاب سُن سی رہ گئی۔ ان دو مصرعوں نے وہ کام کیا جو لمبی سے لمبی تقریر نہیں کر سکتی تھی اِس کی منفی سوچوں کا ہم راز اللہ تھا اور اشک ندامت جو وہ بہا رہی تھی' اس پاک ذات کے نزدیک بہت قیمتی تھے۔ اتنے قیمتی کہ اس کے بدگمانی کے گناہ دھونے کی صلاحیت رکھتے تھے' اس کے دل پر دھرا بوجھ جیسے ایک دم سے ہٹ گیا تھا۔ ارمان نے نادانستگی میں اسے بہت بڑے بوجھ سے آزاد کر دیا تھا۔ آنسو صاف کرتے ہوئے وہ ہلکی پھلکی ہو کر

بے ساختہ ہنس دی۔ اس کی نظر ارمان پر پڑی، وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"آپ نے تو غالباً "کل آنا تھا ناں۔" اس نے اس کا دھیان بٹایا۔

"ہاں، آنا تو کل تھا مگر میں تمہاری خوشی میں شریک ہونا چاہتا تھا، رہا نہیں گیا، فلائٹ تو ملی نہیں اس لیے ٹیکسی ہائر کر کے بائے روڈ آ گیا۔"

اس کے ہونٹوں پر وہی پُرخلوص مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھیں..... ان میں چمکتے جذبوں میں اتنی سچائی تھی اسے لگا کہ مزید کچھ دیر دیکھا تو اسیر ہو جائے گی، اس نے نظریں جھکا لیں۔

"یہ تمہارے لیے۔" اس نے کوٹ کی جیب سے چھوٹا سا کیس نکالا، میزاب نے کھولا تو اندر سفید خوب صورت سا پین رکھا تھا۔

"بہت اچھا ہے شکریہ۔" اس نے رسماً کہا۔ پھر خاموشی ان کے درمیان آ بیٹھی، ارمان بہت کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر لب کھولے تو صرف اتنا کہہ سکا۔

"پرسوں میری فلائٹ ہے، میں ایک سال کے لیے جا رہا ہوں، اگر میں یہ کہوں کہ میرا انتظار کرنا تو شاید میں یہ کہنے کا حق نہیں رکھتا اس لیے بس اتنا کہوں گا، اگر ہو سکے تو میری ان کہی باتوں کو ان سنا مت کرنا۔"

اس کے خوب صورت سراپے کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتا وہ اٹھ کھڑا ہوا، وہ سُن سی بیٹھی رہی اور پھر..... ارمان چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

وہ لائبریری میں بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی، اس کے ہاتھ میں موجود سفید پین تیزی سے حرکت کر رہا تھا۔ علیشہ اسے ڈھونڈتی ادھر چلی آئی۔

"لو جی! تم یہاں چھپی بیٹھی ہو، اور میں تمہیں ساری یونیورسٹی میں ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔" اس کے قریب بیٹھتے ہی اس نے کتاب اپنے آگے سرکا کر سر جھکا لیا، تاکہ دیکھنے پر یہی محسوس ہو وہ مطالعہ کر رہی ہے۔

"خیریت؟" میزاب نے سرگوشی میں پوچھا۔

"سر مرتضیٰ کی چھٹی ہے، آخری دو پیریڈ فری ہیں، میں گھر جا رہی ہوں، یہی بتانے کے لیے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔"

"میرا کام بھی ختم ہو گیا ہے، چلو اکٹھے نکلتے ہیں۔" میزاب پیپر سمیٹنے لگی۔

"تمہیں جو پین سر نے گفٹ کیا تھا وہ استعمال نہیں کرتیں؟" اسے پین بند کرتا دیکھ کر علیشہ نے ویسے ہی پوچھ لیا۔

"خراب نہ ہو جائے اس ڈر سے میں نے اسے کیس میں رکھ چھوڑا ہے۔" اس نے بیگ سے خوب صورت سا کیس نکال کر دکھایا جس میں سجا عالیشان کا گولڈن انتہائی نفیس پین کیس کی شان بڑھا رہا تھا۔ علیشہ مسکرا کر رہ گئی۔

دونوں اکٹھی گیٹ سے نکلیں، سڑک پر کچھ آگے جا کر علیشہ دائیں طرف گلی میں مڑ جاتی تھی جبکہ میزاب کا راستہ سیدھا تھا۔

"یہ دیکھو!" اچانک یاد آنے پر علیشہ نے بیگ سے خوب صورت سا مور پنکھ نکالا۔

"کتنا خوب صورت ہے، کہاں سے آیا؟" میزاب اسے ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"شانی بھائی نے مجھے موروں کی جوڑی گفٹ کی ہے۔" وہ خوشی خوشی بتانے لگی۔

"اور تم نے ان کے پنکھ نوچ ڈالے۔" میزاب نے بے ساختہ کہا اور خود ہی اپنی بات کا مزا لیتی ہنس دی۔

علیشہ نے اسے گھورتے ہوئے مکا اس کے بازو پر جڑا اور منہ پھلا کر پنکھ بھی اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا، اسی طرح نوک جھونک کرتی درختوں کی چھاؤں میں وہ دونوں دور نکل آئیں، جب تک علیشہ کو خیال آیا گلی پیچھے رہ گئی تھی۔

"چلو کوئی بات نہیں، دراصل اس طرف سے گھر کا بیک ڈور ہے، گلی سے شارٹ کٹ پڑتا ہے تو میں وہاں سے جاتی ہوں، ورنہ گھر کا مین ڈور تو اسی طرف ہے۔ ویسے میزاب! میں تمہیں کتنی بار انوائٹ کر چکی ہوں،

مجال ہے، جو تم ایک بار بھی میرے گھر آئی ہو۔" علیشہ نے قدرے اچک کر ہار سنگھار کے پھولوں کا گچھا توڑا۔

"تم جو روز آ جاتی ہو۔" میزاب نے طنز کرنا چاہا مگر لہجے میں تیکھا پن مفقود تھا۔

"بلے بھئی بلے، ہماری بلی اور ہمی کو میاؤں، کبھی تم نے اپنے گھر کا ایڈریس دیا؟"

"لو دیکھ لو یہ ہے میرا گھر۔" میزاب نے گیٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"او مائی گاڈ۔" علیشہ چلا اٹھی۔

"مانا کہ ہمارا گھر اچھا خاصا ہے مگر کوئی شیش محل نہیں جسے دیکھ کر تمہاری چیخیں نکل گئی ہیں۔" میزاب کو حیرت ہوئی تھی۔

"تم تم عمر بھائی کی بہن ہو، امی اکثر تمہارا ذکر کرتی ہیں اور میں بدھو کبھی جان ہی نہ پائی کہ تم ہی تم....." جوش میں اس سے صحیح سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"میں بھلا آنٹی سے کب ملی ہوں؟" میزاب کے چہرے پر الجھن واضح تھی۔

"بہت ڈفر ہیں ہم دونوں..... ایک دوسرے کے پڑوس میں رہ رہے ہیں مگر ایک دوسرے سے انجان، یہ سامنے والا میرا ہی تو گھر ہے۔" اس نے "قصر شاندار" کی طرف اشارہ کیا۔

اب حیران ہونے کی باری میزاب کی تھی۔

پھر یہ حیرت سارا دن اس پر سوار رہی، شام کی چائے پر اس نے بھابھی کو بھی بتایا، اپنی بیسٹ فرینڈ کی حیثیت سے علیشہ کا غائبانہ تعارف پہلے سے کروا رکھا تھا۔

"یہ دنیا ہے یہاں ہر طرح کے اتفاقات ہوتے ہیں دراصل علیشہ بچپن سے ہی سوشل نہیں ہے، تم بھی گھر سے یونیورسٹی کے علاوہ شاذونادر کہیں نکلی ہو۔ اسی لیے کبھی تم لوگوں کی یونیورسٹی سے باہر ملاقات نہیں ہوئی ورنہ آنٹی تو اکثر آتی رہتی ہیں، تم ان سے کافی دفعہ مل چکی ہو، میں بھی اکثر ان کی طرف چکر لگا لیتی ہوں۔"

"ہوں۔"

میزاب ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے برتن سمیٹنے لگی۔ علیشہ کی امی سے واقعی وہ کئی بار مل چکی تھی، بہت سوبر اور خوب صورت خاتون تھیں، ویسے اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ چلبلی سی علیشہ سوشل نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

اگلے دن اتوار تھا۔ صبح اس نے حسب معمول ناشتہ بنایا، شاداں آئی تو اس سے سارے گھر کی تفصیلی صفائی کروانے کے بعد اب وہ نہانے کے بعد بال سلجھا رہی تھی جب مونا اسے بلانے چلی آئی۔ نیچے مہمان آئے تھے۔ بھابھی نے اسے بلوایا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، حسب توقع سامنے علیشہ بیٹھی بھابھی سے باتیں کر رہی تھی۔ آنٹی بھی ساتھ تھیں، ان کے ہاں قرآن خوانی تھی، اسی پر مدعو کرنے آئی تھیں۔

"میں علیشہ سے کہہ کہہ تھک جاتی ہوں، مگر یہ گھر سے نکلنے کا نام نہیں لیتی، کل سارا دن اپنی بے خبری کو کوستی رہی، آج میرا تم لوگوں کی طرف آنے کا ارادہ تھا، اسے پتا چلا تو مجھ سے پہلے تیار ہو گئی۔" وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

کچھ دیر ان کے ساتھ بیٹھنے کے بعد وہ کچن میں چلی آئی، علیشہ بھی اس کے ساتھ تھی۔

"دیکھو کوئی تکلف کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے تنبیہہ کی۔

"تم چپ رہو۔"

میزاب نے آنکھیں دکھائیں اور فریج کھول کر جائزہ لینے لگی، پائن ایپل کیک اور گاجر کا حلوہ پہلے سے موجود تھا، بسکٹ اور نمکو تو ہر وقت ہوتے تھے، صبح اس نے شامی کباب بنا کر فریز کیے تھے۔ اس نے پھرتی سے ایک برنر پر چائے کا پین رکھا اور دوسرے پر کڑاہی رکھ دی۔ علیشہ ٹرالی میں برتن سیٹ کرنے لگی۔

خوشگوار ماحول میں چائے پینے کے بعد آنٹی تو بچی لوگوں کے پورشن میں انہیں انوائیٹ کرنے چلی گئیں،

علیشہ میزاب کے پاس رک گئی' وہ اسے اوپر اپنے کمرے میں لے آئی۔

"پتا ہے علیشہ! میں اکثر رات کو ٹیرس پر کھڑے ہو کر تمہارے گھر کا لان دیکھتی تھی' بہت خوب صورت ہے۔"

"یہ سب بھائی کا کمال ہے' انہیں پھول پودوں سے عشق ہے جبکہ فوارے مجھے بہت پسند ہیں' یہ سامنے ٹیرس والا کمرہ بھیا کا ہے' انہوں نے تو ٹیرس کو بھی نرسری بنا رکھا ہے۔" وہ بہت شوق سے البم دیکھ رہی تھی جس میں میزاب کی بچپن کی یادگار تصویریں تھیں۔

"اچھا تو وہ ہیں علیشہ کے بھائی۔" میزاب کے ذہن میں نیم اندھیرے میں ٹیرس پر حرکت کرتا ہیولہ آ گیا۔

پھر دونوں کافی دیر اپنی نہ ختم ہونے والی باتیں لے کر بیٹھی رہیں' آنٹی کا بلاوا آیا' تو وہ بھی علیشہ کو گیٹ تک چھوڑنے اس کے ساتھ نیچے چلی آئی۔

☼ ☼ ☼

میزاب قرآن خوانی کی مناسبت سے جدید تراش کے بنارسی لیس سے آراستہ سفید کرتا شلوار پر دھانی چنر یا اوڑھے جانے کے لیے تیار تھی لمبے بالوں کی ڈھیلی چٹیا باندھی تھی۔ وہ لوگ مقررہ وقت پر پہنچ گئے مگر' مہمان آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔

علیشہ اسے آتا دیکھ کر کھل اٹھی۔ وہ بھی تیار تھی اور اب انتظامات کا جائزہ لیتی پھر رہی تھی' جلدی فارغ ہو کر اسے اپنا گھر دکھانے لگی کہ مہمانوں کی آمد کے بعد فرصت نکالنا مشکل تھا۔

باہر کی طرح قصر شاندار اندر سے بھی اپنے نام کی مانند تھا' انتہائی آرٹسٹک انداز میں سجا' بقول علیشہ یہ سب بھائی کا کمال تھا۔ لاؤنج کے ساتھ خوب صورت سی اسٹڈی تھی' دیوار گیر الماریاں کتابوں سے کھچا کھچ بھری تھیں' ایک طرف الگ ریک میں نوبل پرائز یافتہ کتب سجی تھیں میزاب کا تو یہاں سے نکلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

"یہ بھی تمہارے بھائی کا کمال ہو گا۔" وہ علیشہ کو لب کھولتا دیکھ کر جلدی سے بولی۔

"ظاہر ہے۔" وہ کندھے اچکا کر ہنس دی۔

"آؤ تمہیں بھائی کا روم دکھاؤں۔" وہ اسے اوپر لے آئی۔

سفید در و دیوار والا وسیع و عریض کمرہ انتہائی نفیس اور قیمتی گولڈن فرنیچر سے سجا تھا' لائٹس کی فٹنگ اور ڈیکوریشن اتنی خوب صورت تھی کہ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اس نے اپنی زندگی میں حقیقتاً اتنا خوب صورت بیڈ روم کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہر چیز انتہائی منفرد اور نفیس تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی شہزادے کی خواب گاہ میں آ گئی ہو۔ بیڈ کے عین اوپر سفید زرقون جڑے گولڈن فریم میں بڑی سی تصویر آویزاں تھی' جس پر نظر پڑتے ہی اسے جھٹکا لگا تھا۔

پھولوں سے گھرے سرسبز پہاڑی ٹیلے کے دامن میں سفید براق عربی النسل گھوڑے پر ایک ہاتھ رکھے وہ شخص بڑی شان سے نکلتے سورج کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا' اس کی گولڈن آنکھیں چمک رہی تھیں' سورج کی کرنیں اس کی سنہری جلد سے یوں لپٹی تھیں کہ اس کا وجود جگمگا سا رہا تھا یوں لگتا تھا یہ روشنی اس کے وجود سے خارج ہو رہی ہو "اپالو" تصویر دیکھ کر اس کے ذہن میں بے ساختہ یہی نام آیا۔

"تمہیں سکتہ ہو گیا ہے کیا؟"

وہ دم سادھے یک ٹک سامنے دیکھ رہی تھی' علیشہ نے اس کا کندھا ہلایا' اس نے ایک نظر علیشہ پر ڈال کر پھر سے تصویر کو دیکھا' وہ عالیشان مرد کوئی اور نہیں واقعی' عبد عالیشان تھے یعنی علیشہ کے شانی بھائی۔ ہمیشہ ان کو دیکھ کر آنکھیں جھکا لینے والی میزاب نے پہلی بار انہیں اتنے غور سے دیکھا تھا' اول روز سے اس پر چھایا ان کی ذات کا سحر مزید مضبوط ہو گیا تھا۔

"تم نے کبھی بتایا نہیں سر عالیشان تمہارے بھائی ہیں۔" ٹیرس پر آکر نیچے اٹکھیلیاں کرتے موروں کو دیکھتے ہوئے اس نے عام سے لہجہ میں پوچھا۔

"ہوں' بس۔" اس نے کندھے اچکائے "ویسے تمہیں برا تو نہیں لگا؟"

"نہیں اس میں بھلا برا منانے والی کیا بات ہے' تم تو ہر وقت شانی بھائی' شانی بھائی کی رٹ لگائے رکھتی تھیں' میں نے خود ہی کبھی ان کے بارے میں تفصیل نہیں پوچھی' مگر سر عالیشان تمہارے شانی بھائی ہوں گے یہ میرے وہم و گمان میں نہیں تھا۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی تو علیشہ کے ستے ہوئے چہرے پر بھی مسکراہٹ دوڑ گئی جو اس کی ناراضی کے خیال سے پریشان تھی۔

"ویسے تمہیں یہ دیکھ کر حیرت نہیں ہوئی؟" اپنا کمرہ دکھاتے ہوئے علیشہ نے کارنس پر رکھے اپنی فیملی فوٹو کی طرف اشارہ کیا' جس میں اس کے والد نے اسے اور عالیشان نے اپنی والدہ کو بازوؤں کے حلقے میں لے رکھا تھا۔

"حیرت کیسی؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"مجھے دیکھو اور ان سب کو۔" وہ کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

اس کے پپا بہت ہینڈسم تھے' مما بھی حسین تھیں جبکہ عالیشان...... وہ تو اسم با مسمیٰ تھے اور علیشہ' میزاب نے غور سے اسے دیکھا' گول چہرہ' دبتی گندمی رنگت' تیکھے نقوش' بڑی بڑی آنکھوں والی پُرکشش علیشہ مجموعی طور پر خوش شکل تھی۔ بن سنور کر خوب صورت لگتی تھی' مگر اس کے باوجود اپنے باقی فیملی ممبرز کے حسن کے آگے ماند پڑ جاتی تھی۔

"بچپن سے لے کر آج تک مجھے قدم قدم پر دنیا والوں نے احساس دلانے کی کوشش کی ہے' میں مما پپا اور بھائی کی طرح حسین نہیں ہوں' یہ آپ کی بیٹی ہے؟ یہ آپ کی بہن ہے؟ جب بھی میں مما' پپا یا بھائی کے ساتھ کہیں جاؤں' حیرت بھری آوازوں میں اس طرح کے سوال ضرور سننے کو ملتے ہیں' اس کے باوجود مجھے کوئی کامپلیکس نہیں ہے' مجھے اپنا آپ اچھا لگتا ہے بھلا کیا کمی ہے مجھ میں؟ اگر اللہ پاک نے مجھے ان سب کی طرح حسین نہیں بنایا تو کم رو بھی تو نہیں بنایا' کوئی معذوری بھی تو نہیں دی' سب سے بڑی بات مجھے اللہ تعالیٰ نے خود بنایا ہے' میں حقیر مٹی کا ڈھیر تھی' جسے رب کائنات نے اپنے ہاتھوں سے سانچے میں ڈھالا' اپنے حسب منشا روپ دیا' یہ سوچوں تو خود پر ناز ہونے لگتا ہے کہ میرا رنگ و روپ رب تعالیٰ کی پسند کا ہے' تو بھلا میں خود سے اوپر دیکھ کر ناشکری کیوں کروں مگر دنیا والے......" اس نے طویل سانس کھینچ کر کھڑکی کا پردہ برابر کیا "بہر حال مجھے نہ ان کی پروا تھی' نہ ہے اور انشاء اللہ ہو گی بھی نہیں۔ کہیں لوگوں کی باتیں مجھے ناشکری پر مجبور نہ کر دیں' بس اسی خیال سے میں کم ہی کہیں آتی جاتی ہوں۔"

"تم بہت خوب صورت ہو علیشہ!" اس کی باتیں سن کر رشک سے اسے دیکھتے ہوئے میزاب بس اتنا کہہ سکی تھی' اس کی اعلا سوچ نے اسے نہایت متاثر کیا تھا۔ نٹ کھٹ علیشہ کا یہ روپ اس کے لیے نیا تھا۔

"وہ تو میں ہوں۔" آنکھیں مٹکا کر فرضی کالر اکڑاتے ہوئے اس کی شوخی لوٹ آئی۔ ہنستے ہوئے دونوں لاؤنج میں آگئیں جہاں مہمان آنا شروع ہو چکے تھے۔

رات کو وہ سونے لیٹی تو نائٹ بلب روشن ہوتے ہی کھڑکی کے راستے ایک سایہ دیوار پر تیرنے لگا' اس نے ہمیشہ کی طرح کھڑکی بند نہیں کی' آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی' سامنے والے ٹیرس پر بلاشبہ عالیشان ہی تھے' کچھ دیر اسے دیکھنے کے بعد کھڑکی بند کیے بغیر آکر لیٹ گئی' دیوار پر متحرک سائے کو دیکھتے دیکھتے اسے نیند آ گئی پھر...... وہ اکثر کھڑکی بند کرنا بھول جاتی تھی۔

☼ ☼ ☼

تیزی سے گزرتا یہ وقت بلاشبہ میزاب کا گولڈن پیریڈ تھا۔ پڑھائی کی مصروفیت بے حد و حساب تھیں' سب کو اس سے بہت توقعات تھیں' وہ ان پر پورا اترنے کے لیے ٹوٹ کر محنت کر رہی تھی "اعزاز

حاصل کرنا آسان ہوتا ہے' اسے قائم رکھنا بہت مشکل۔" اس بات کی حقیقت اس پر اب کھل رہی تھی۔ وہ تو الوداعی پارٹی میں بھی نہیں جا رہی تھی کہ ایک دن ضائع ہو جائے گا' مگر علیشہ اسے زبردستی گھسیٹ لے گئی۔

وہ دن بھی بہت یادگار گزرا' پارٹی کے بعد انہوں نے فری ہو جانا تھا' سب پرانے شکوے شکایتیں بھول کر ایک دوسرے سے معافی مانگ رہے تھے' حیرت تو سب کو تب ہوئی جب علیشہ نے لڑکوں سے اپنی شرارتوں کے لیے ایکسکیوز کیا تھا' انہوں نے بھی اعلا ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے معذرت کی تھی' مگر پارٹی کے اختتام پر جب شہرام نے علیشہ سے اس کے گھر کا پتا مانگا تو اسے ایک بار پھر پتنگے لگ گئے تھے' اس نے اسے پولیس اسٹیشن کا پتا اچھے سے سمجھانا شروع کر دیا' وہ جو بڑے غور سے سن رہا تھا' جب آخر میں پتا چلا یہ پولیس اسٹیشن کا ایڈریس ہے تو ناراض ہو گیا مگر یہاں پروا کسے تھی۔

"کیا برائی تھی بھلا ایڈریس دینے میں؟"

واپسی پر میزاب بہت خوش تھی۔ مس ماریا کی شادی ہونے والی تھی' ان کی خالی سیٹ پُر کرنے کے لیے عالیشان نے اس کا انتخاب کیا تھا۔ یہ اس کے لیے بہت بڑے اعزاز اور خوشی کی بات تھی۔

"ارے واہ! میری زندگی نہ ہو گئی' فلم ہو گئی۔" وہ تنک اٹھی۔

"دیکھو میزاب! ایک بار ملنے والی زندگی کوئی کھیل تماشا نہیں۔ شادی کا فیصلہ ایسا فیصلہ ہوتا ہے' جو ہماری ساری زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے **ہمسفر** کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے' وقتی اٹریکشن کے تحت نہیں' کیونکہ جب زندگی کی حقیقتوں سے پالا پڑتا ہے تو اٹریکشن خواہ کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو سب سے پہلے مرتی ہے' زندہ رہ جاتی ہے تو صرف حالات کی تلخی' جو زندگی کو زہر بنا دیتی ہے اور مرتے دم تک اس زہر کو قطرہ قطرہ پینا انتہائی اذیت ناک ہوتا ہے۔" اس کے اندر کا بقراط جاگ اٹھا تھا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو۔" میزاب نے جھرجھری لی۔

"حقیقت کی باتیں کر رہی ہوں' مجھے تو ایسا ہمسفر چاہیے' جو زندگی کی دوڑ میں مجھے اپنے ہم قدم لے کر چلے' اگر سست پڑوں تو رک کر میرا انتظار کرے' مجھے گرنے نہ دے' میری کامیابی پر فخر کرے' مجھے جھکانے کا خواہاں نہ ہو' میری شکست اس سے برداشت نہ ہو۔"

"شہرام بھی تو بڑے بڑے دعوے کر رہا تھا۔"

"جہاں تک دعوؤں کی بات ہے تو۔
ضروری نہیں جو ساحل کی خنک ریت پر
ہاتھوں میں ہاتھ دے کر
سفر اور تلاطم کے قصے سنائے
وہ ان وارداتوں سے گزرا بھی ہو
کہ
سمندر میں تم اس کو ڈھونڈو تو وہ
ساحل پہ کھڑا مسکرا رہا ہے۔"

علیشہ نے مسکراتے ہوئے قطعی انداز میں بات ختم کر دی' میزاب پُرسوچ انداز میں اسے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میری ان کہی باتوں کو ان سنا مت کرنا۔"

وہ لکھتے لکھتے ٹھٹکی۔ اکثر رات کی تنہائی میں' کبھی دن کے ہنگاموں میں' کبھی شام کی اداسی میں تو کبھی ترو تازہ صبح میں یہ جملہ اس کے کانوں میں گونجتا تو وہ جھنجلا جاتی تھی۔

سفید پین بند کر کے اس نے پرچہ نگران کو پکڑایا اور باہر آ گئی' یہ اس کا آخری پیپر تھا۔

باہر آ کر اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے کی کوشش کی تھی' ایگزامز کا بار تو اتر گیا تھا مگر کندھوں پر اب بھی کوئی بوجھ دھرا تھا' ایک جملے کا بوجھ' اس پل اسے ادراک ہوا' یہ بوجھ تو وہ ایک سال سے لیے پھر رہی ہے۔

"اگر واقعی بوجھ ہے تو اتار کر پھینک کیوں نہیں دیتیں؟" اس نے خود سے سوال کیا' مگر لاکھ کوشش کے باوجود وہ خود کو اس بار سے آزاد نہیں کروا پا رہی تھی۔

وہ گھر آئی تو ارمان اس کا منتظر تھا' اسے ٹھٹکتا دیکھ کر خود اس کے پاس چلا آیا۔

"کہو پسند آیا میرا سرپرائز؟"

وہ ہلکے سے مسکرا دی' وہ سمجھتی تھی روشنیوں کی چکاچوند اس کی نظروں سے بہت کچھ محو کر دے گی' مگر وہ تو بالکل بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی مسکراہٹ' وہی بولتی آنکھیں اور ان میں سجے..... پہلے سے زیادہ شدید جذبے' وہ زیادہ دیر اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ پائی' رسمی انداز میں خیر خیریت پوچھ کر آگے بڑھ گئی۔

"جانے سے پہلے میں نے ایک گزارش کی تھی۔"

ارمان کے سوال نے اس کے قدم جکڑ لیے' وہ کچھ بھی تو نہیں بھولا تھا' وہ کیا جواب دیتی۔

"میزاب! کھانا تیار ہے' جلدی سے آ جاؤ۔" دور سے آتی بھابھی کی آواز کو اس نے غنیمت جانا اور تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔ ارمان..... منتظر کھڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

امتحانات کے بعد ایک ماہ کے وقفے سے اس نے یونیورسٹی جوائن کر لی تھی۔ بھیا نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ چچی نے البتہ دبے لفظوں میں تھوڑا اعتراض کیا تھا۔ انہیں لوگوں کا ڈر تھا کیا کہیں گے ان کا داماد بہن کو بٹھا کر کھلا نہیں سکتا مگر عمر بھیا نے پروا نہیں کی تھی۔

"جو حقیقت ہے وہ آپ کو اور ہمیں معلوم ہے پھر لوگوں کی پروا کیوں کریں' میں اپنی انا کی تسکین کے لیے میزاب کو علم بانٹنے جیسے مقدس فریضے سے نہیں روکوں گا۔"

بھابھی بھی ان سے متفق تھیں۔ یوں آج آفس جاتے ہوئے حسب سابق بھیا اسے یونیورسٹی ڈراپ کرتے گئے تھے۔

سفید در و دیوار والی عمارت کے بلند قامت گیٹ کے آگے دو سال پہلے کی طرح آج بھی اس کے قدم لرزے تھے، دل گھبرایا تھا مگر آج اندر داخل ہونے کی نوعیت مختلف تھی۔ پہلے وہ طالبہ کی حیثیت سے آئی تھی، آج معلم کی حیثیت سے جا رہی تھی۔ اپنی گھبراہٹ پر قابو پاتی وہ گراؤنڈ فلور پر واقع عالیشان کے آفس میں چلی آئی، وہ بھی ابھی ابھی آئے تھے، کوٹ اتار رہے تھے۔

"مے آئی کم ان سر!" وہ اسے دیکھ کر خوشدلی سے مسکرائے۔

"ویلکم مس میزاب رحمت!" وہ ہمیشہ اسے اس کے پورے نام سے بلاتے تھے۔

وہ مسکراتی ہوئی اندر آگئی۔ انہوں نے چائے منگوائی اور چائے پینے کے دوران پروفیشنل گفتگو ہوتی رہی، اس کی ہمیشہ کی طرح پوری کوشش تھی ان کے سامنے خود کو بااعتماد ظاہر کرے پھر کچھ دیر بعد وہ ان کے ساتھ اسٹاف روم میں گئی تھی، سب ٹیچرز نے خوشدلی سے اس کا استقبال کیا، آخر کو وہ یونیورسٹی کی موسٹ بریلینٹ اسٹوڈنٹ رہ چکی تھی مگر اس سب کے باوجود وہ سارا وقت نروس رہی مگر اگلے دن جب علیشہ نے بھی اسے جوائن کیا تو اس کی خوشی دوبالا ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

ٹیپو اور مونا روز اسے پارک لے جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہ ان کے ساتھ کھیل میں شریک ہو جاتی مگر زیادہ تر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی رہتی تھی۔ ارمان ان دنوں اپنا ذاتی کلینک سیٹ کر رہا تھا سو بہت مصروف تھا، اپنی مصروفیت کے باعث نہ پارک جا سکتا تھا اور نہ ہی گھر پر ٹکتا تھا، میزاب پُرسکون تھی۔

پڑھانے کا تجربہ بہت اچھا جا رہا تھا اپنی نرم مزاجی اور ذہانت کی وجہ سے وہ اسٹوڈنٹس کے دلوں میں بھی گھر کر چکی تھی۔ عالیشان اس کی کارکردگی سے بہت مطمئن تھے، میٹنگ میں اسے کئی بار سراہ بھی چکے تھے۔

وہ اس وقت پولیس والوں کا پیریڈ لے کر اپنے ہی خیالوں میں نیچے آ رہی تھی جب سیڑھیوں کا موڑ مڑتے ہی عالیشان ایک دم سے اس کے سامنے آگئے، وہ تھم سی گئی۔ اسے لگا جیسے کائنات کی گردش رک گئی ہو، مگر صرف ایک پل کو، اگلے لمحے وہ اس سے ایکسکیوز کرتے سائیڈ میں سے ہو کر مضبوط قدموں سے اوپر چلے گئے۔ اسے اپنے دل کی دھڑکن کو معمول پر لانے میں کافی وقت لگا تھا۔

جب اس کا پیریڈ آف ہوتا تھا اگلا پیریڈ لینے عالیشان کو اوپر جانا ہوتا تھا۔ پھر سیڑھیوں کا یہ سامنا معمول بن گیا۔

وہ ایک سرد ترین دن تھا جب اس نے روز کے اس ایک پل کے سامنے میں عالیشان کی سحر بھری مقناطیسی آنکھوں میں اپنے لیے نرم گرم جذبات دیکھے تھے۔ ان کے ہونٹوں پر بہت دلکش مسکراہٹ تھی جو صرف اور صرف اس کے لیے تھی۔ میزاب کا دل زور سے دھڑکا، یہ حقیقت تھی یا اس کی نظر کا دھوکا؟ وہ اتنا گھبرائی اور کچھ سمجھ نہ آیا تو بظاہر عالیشان کو نظرانداز کر کے اپنی ازلی خودساختہ بے نیازی سے سیڑھیاں اتر گئی، ان کے جذبات کی پذیرائی کیے بغیر۔

تیز تیز سیڑھیاں اتر کر جب وہ نیچے آئی تو سخت سردی کے باوجود سرتاپا پسینے میں نہائی ہوئی تھی، یہ سب بہت غیر متوقع تھا۔ عالیشان کی آنکھوں میں اپنے لیے محبت کی تحریر، یہ تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا، بے یقینی سی بے یقینی تھی۔ جو کچھ ابھی دیکھ کر آئی تھی کیا واقعی سچ تھا؟ وہ اسی کشمکش و پیچ میں تھی جبکہ اوپر کھڑے عالیشان کا چہرہ خفت سے سرخ ہو چکا تھا لب بری طرح بھنچے تھے، وہ تو جس طرف دیکھتے، تسخیر کر لیا کرتے تھے پھر یہ میزاب کیا چیز تھی، میزاب نے ان کی نگاہ التفات کو اس طرح نظرانداز کر کے اس کے پندار کو سخت ٹھیس پہنچائی تھی۔

☼ ☼ ☼

میزاب بہت الجھن میں تھی، ارمان اپنے سوال کا جواب چاہتا تھا اور دوسری طرف عالیشان تھے۔

ویسے وہ حیران تھی کہ اس دن کے بعد سے عالیشان یوں ہو گئے تھے جیسے وہ ایک خاص پل کبھی ان کی آنکھوں میں اترا ہی نہ ہو۔

دوسری طرف ارمان تھا، جس کی آنکھوں میں سدا کے لیے محبت کا موسم جیسے ٹھہر سا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے جذبے اتنے شدید تھے کہ وہ زیادہ دیر ان میں دیکھنے کی تاب نہیں لا سکتی تھی، اس لیے اس سے کتراتی پھرتی تھی۔

کئی دنوں سے وہ علیشہ کی طرف نہیں گئی تھی، اسے ہمیشہ شکوہ رہتا تھا کہ میزاب کبھی بلائے بغیر نہیں آتی۔

"چلو آج علیشہ بی بی کے شکوے دور کیے دیتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بھابھی کو بتا کر باہر نکل آئی۔ آنٹی اسے دیکھ کر کھل اٹھیں، وہ آسٹریلین طوطوں کے پنجرے کے پاس کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔

"آؤ، میزاب بیٹا! بہت دن بعد چکر لگایا، علیشہ سے تو روز مل لیتی ہو، کبھی مجھ سے ملنے بھی آجایا کرو۔" اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے پیار بھرا شکوہ کرنے لگیں۔

"سوری آنٹی! آئندہ جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر شرمندہ ہوتے یقین دلایا۔

"علیشہ کہاں ہے آنٹی؟" وہ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"وہ شانی کے ساتھ شاپنگ پر گئی ہے، مگر تم جانے کی مت کرنا، وہ ابھی کچھ ہی دیر میں آتی ہو گی۔"

وہ جو جلدی اٹھنے کا سوچ رہی تھی، ان کے اصرار پر ان کے ساتھ بیٹھی باتیں کرتی رہی، تب ہی آنٹی کے مہمان آگئے، وہ مصروف ہو گئیں۔ میزاب ان کی اجازت سے لاؤنج سے ملحقہ اسٹڈی میں چلی آئی۔ یہاں اتنا کچھ پڑھنے کو تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کیا پڑھے اور کیا رہنے دے، دلچسپی سے کتب کو دیکھتی الماریوں کے ساتھ ساتھ چلتی "Oh life" کے سامنے رک گئی، یہ ناول اس نے بہت سال پہلے پڑھا تھا مگر اینڈ نہیں پڑھ پائی تھی، وہ نکال کر ایزی چیئر پر آ بیٹھی۔

"زری، زری کہاں ہو تم، پلیز جلدی سے پانی پلا دو، میرا تھکن سے برا حال ہے۔"

اسے پڑھتے ہوئے نجانے کتنی دیر گزری تھی جب لاؤنج سے علیشہ کی آوازیں آنے لگیں۔ ناول کے تین چار صفحے بچے تھے، وہ جلدی جلدی پڑھنے لگی تاکہ مکمل کر کے ہی اٹھے۔

"ارے واہ، دوڑیں مفت میں میری لگوائیں اور تھکن تمہیں ہو رہی ہے، میری توبہ جو آئندہ کبھی تمہارے ساتھ شاپنگ پر گیا۔"

دونوں ہاتھوں میں پکڑے ڈھیر سارے شاپنگ بیگز اس کے پاس ڈھیر کر کے، عالیشان صوفے پر بیٹھ گئے۔

"چلیں، جب آپ اپنی بیگم کو ساتھ لے جایا کریں گے تب میں بھی آپ کے ساتھ ہو لیا کروں گی۔" زری کے ہاتھ سے پانی کا جگ لے کر ایک گلاس عالیشان کو تھمایا اور دوسرا اپنے لیے بھرا۔

"اگر تمہاری بھابھی کو تمہارا کباب میں ہڈی بننا پسند نہ آیا تو؟" عالیشان نے اسے چھیڑا، وہ آج بڑے موڈ میں تھے۔

"میں بھابھی ہی ایسی لاؤں گی جسے مجھ سمیت میری ساری عادات پسند ہوں۔" وہ اٹھلائی "ویسے بھائی! میں نے اور مما نے تو آپ کے لیے لڑکی پسند بھی کر لی ہے اور جہاں تک میرا اندازہ بلکہ یقین ہے آپ کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہو گا" وہ اچانک سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔

"اچھا کون ہے وہ؟" گلاس میز پر رکھتے ہوئے انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"میزاب رحمت۔" وہ بغور عالیشان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ اس نے ان آنکھوں میں اپنی عزیز از جان دوست کا عکس دیکھا تھا، تبھی تو اتنی پر یقین تھی۔

میزاب کے کتاب بند کرتے ہاتھ تھم گئے۔ لاؤنج میں ہونے والی گفتگو اسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ عالیشان خاموش تھے، خاموشی کا یہ وقفہ میزاب کے

اعصاب پر گراں گزر رہا تھا' دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔

"بتائیں ناں بھائی؟" ان کے چہرے کے ناقابل فہم تاثرات اور خاموشی سے گھبرا کر علیشہ نے اصرار کیا۔

"اگر میزاب رحمت خود یہ تمنا کرے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" بہت سوچ کر ٹھہر ٹھہر کر کہتے ہوئے انہوں نے صوفے کی پشت پر سر گرا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"میں آپ کی بات سمجھی نہیں بھائی! آپ کو دیکھنے کے بعد تو ہر لڑکی آپ کی تمنا کرتی ہے' شاید میزاب نے بھی کی ہوگی۔" علیشہ نے کندھے اچکائے۔

عالیشان کی بند آنکھوں کے پیچھے وہ ایک پل اپنی پوری جزئیات کے ساتھ گھوم گیا۔ کتنی آسانی سے میزاب انہیں نظر انداز کر کے چلی گئی تھی۔ نادانستگی میں ہی سہی مگر میزاب نے ان کی انا کو کاری ضرب لگائی تھی جسے وہ چاہ کر بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔

"اگر اسے واقعی میرے ساتھ کی تمنا ہے' تو اسے خود میرے پاس آکر اقرار کرنا ہو گا۔" وہ سیدھے ہوتے ہوئے بولے' ان کا لہجہ بہت مضبوط تھا' ناول الماری میں رکھتے ہوئے میزاب کے ہاتھ لرز گئے۔

"مگر بھائی یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ لڑکی ہو کر اظہار کرے؟ ایسا تو نہیں ہوتا۔" علیشہ الجھ کر بولی' اسے بھائی کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"مگر ایسا ہی ہو گا۔" عالیشان کے لہجہ میں ضد تھی' غرور تھا' یقین تھا۔ میزاب کو اپنا آپ ٹوٹتا محسوس ہوا' وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "یقین کرو' جس دن وہ آکر خود مجھ سے اظہار کرے گی' میں پوری عزت و احترام کے ساتھ اسے اپنانے میں ایک دن کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔" اٹل انداز میں کہتے ہوئے وہ ایک شان سے سیڑھیاں چڑھ گئے۔

علیشہ نے سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ عالیشان کی ضدی طبیعت سے واقف تھی' ضد میں تو اپنا نقصان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ "دلوں کے معاملے میں ضد نہیں چلتی" وہ انہیں سمجھانا چاہتی تھی مگر جانتی تھی وہ کبھی نہیں سمجھیں گے تا آنکہ وقت انہیں سمجھائے۔

میزاب کے لیے اپنے قدموں پر کھڑے رہنا دشوار ہو گیا تھا' بڑی مشکل سے خود پر قابو پاتے ہوئے وہ اسٹڈی کے دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی' اس وقت وہ صرف تنہائی چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

آسمان پر تیرتے براق سفید بادلوں کے قافلے منزل کھو چکے تھے۔ اب آوارہ بھٹکتے بھر رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف آدھے سے زیادہ سفر طے کر چکا تھا۔ موسم کی ساری ٹھنڈک ہوا نے سنبھال رکھی تھی۔ میزاب ٹھنڈی ہوا سے بے نیاز پارک میں گلابوں کے کنج کے پاس گم صم بیٹھی تھی۔ سفید قمیص پر سیاہ سلیولیس سویٹر اسے موسم کی شدت سے بچانے کو ناکافی تھا' مگر وہ بے پروا تھی' جس دن سے علیشہ کے گھر سے لوٹی تھی یونہی گم صم تھی۔

"کیوں عالیشان! آخر کیوں آپ میری خودداری کو کرچی کرچی کرنا چاہتے ہیں؟"

بہت سوچنے پر بھی وہ اس سوال کا جواب تلاش نہیں کر پائی تھی' اس نے تھک کر بینچ سے سر ٹکا دیا۔

"اور ارمان' وہ کہاں ہے میری زندگی میں؟"

اس نے الجھ کر اوپر دیکھا آسمان کے پرلے کنارے سے کالی گھٹا اٹھ رہی تھی' اس نے توجہ نہ دی' وہ اپنے اندر جھانک کر پورے انصاف سے تجزیہ کرنے بیٹھی تو اس پر انکشاف ہوا' اس کا دل تو بالکل کورا تھا صاف سلیٹ کی طرح' جس کے باہر عالیشان کے سحر کا مضبوط ہالہ تھا اور اس سے باہر ارمان کی محبت اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس کے دل پر اترنے کو بے تاب مگر عالیشان کا سحر اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔

ارمان پارک میں داخل ہوا تو میزاب اپنی مخصوص جگہ بیٹھی گہری سوچوں میں گم تھی۔ شفاف چہرے پر الجھن واضح تھی۔ لمبے بالوں کو لپیٹ کر ڈھیلا سا جوڑا بنایا ہوا تھا جو اب کھل کر دائیں شانے پر بکھرا تھا۔ بائیں طرف آوارہ لٹیں ہوا کی لے پر ہوتے ہوئے لہرا رہی تھیں۔ ارمان پر شوق نظروں سے اسے دیکھتا' چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے بڑھ کر املتاس کے چوڑے تنے سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

کافی دیر بعد اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کر کے چونکی۔ وہ سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں محبتوں کا جہاں آباد تھا' وہ جب بھی کسی الجھن کا شکار ہوتی وہ اس کی مدد کو ضرور آتا تھا۔ کیا یہ صرف ایک اتفاق تھا؟ وہ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرا بھی نہ سکی۔

"اگر لاکھ چاہنے کے باوجود کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکیں تو؟" وہ کچھ دیر بعد بولی تو اس کی آواز سرگوشی نما تھی۔

"اللہ پر چھوڑ دو' وہ تم پر ضرور ایک ایسا پل اتارے گا جو تم سے صحیح فیصلہ کروائے گا۔"

اس کی بات ہمیشہ کی طرح میزاب کے دل کو لگی تھی۔ اس نے پھولوں سے مہکی سرد ہوا اپنے اندر اتارتے ہوئے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا اور بے خیالی میں اسے دیکھے گئی۔ وہ کریم کلر کے شلوار سوٹ پر کیمل کلر کی شال اوڑھے کھڑا تھا' آج اس نے شیو بھی نہیں بنائی تھی' چہرے پر سبز سبز رواں سا بکھرا تھا' وہ ہینڈسم مگر عام سا نوجوان تھا' عالیشان کے مقابلے میں تو عشر عشیر بھی نہیں' وہ بے خیالی میں اس کا اور عالیشان کا موازنہ کر رہی تھی۔

"سنو!"

"ہوں۔" وہ چونکی۔

"بہت اچھی لگ رہی ہو۔" وہ اسے چڑانے کو شرارت سے بولا۔

"تو؟" حسب عادت وہ تنک اٹھی۔

ارمان کے ہونٹوں میں دبی مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں پھیل گئی۔ اس کی یہ بے نیازی دل کو بہت بھاتی تھی۔ کالی گھٹا بہت تیزی سے سفید براق بادلوں کو اپنے اندر گھولتی آسمان پر پھیلتی جا رہی تھی' وہ موسم کے تیور دیکھ کر اٹھ کر جانے لگی۔

"تو یہ کب۔ مجھ سے شادی کرو گی؟"

اس کے اٹھتے قدم ٹھٹکے' ارمان اس سے یہ سوال کر رہا تھا اور عالیشان اس کے اسی سوال کے منتظر تھے' اس کا دل زور سے دھڑکا۔ مگر شاید یہ فیصلے کا پل نہیں تھا' وہ چپ چاپ آگے بڑھ گئی۔

ارمان اسے جاتا دیکھتا رہا' دل بہت بوجھل ہو گیا تھا۔

"اقرار نہیں کیا تو انکار بھی تو نہیں کیا۔"

اس نے خود کو تسلی دی' وہ ہمیشہ مثبت پہلو سوچنے کا عادی تھا۔

"اک طرز تغافل ہے' سو وہ تم کو مبارک ہو
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے"

ٹھنڈی بوند اس کے چہرے پر ٹھہری' وہ چونک کر خیالوں سے باہر آیا' میزاب پارک سے نکل چکی تھی'

وہ تیزی سے اس کے پیچھے گیا۔

بارش شروع ہو چکی تھی' موٹی موٹی بوندوں نے زمین کا راستہ تلاش کرلیا تھا جو لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جارہی تھیں۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی موڑ مڑ کر گھر والی سڑک پر آگئی۔ ابھی وہ سڑک کے درمیان میں تھی جب "قصر شاندار" کے سامنے عالیشان کی گاڑی آکر رکی' اسے آتا دیکھا وہ گاڑی اندر لے جانے کے بجائے دروازہ کھول کر باہر نکلے اور گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوگئے۔ میزاب کی نظر سامنے اٹھی' وہ منتظر نظروں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

کشادہ پیشانی' گھنے ابرو تلے مقناطیسیت بھری چمکتی سنہری آنکھیں' کھڑی مغرور ناک' بھرے بھرے ہونٹ' ٹھوڑی میں ہلکا سا گڑھا' سیاہ شلوار سوٹ میں ان کا دراز قد نمایاں تھا' کندھوں پر پڑی قیمتی گرم براؤن شال ان کے وقار میں اضافہ کررہی تھی۔

میزاب کے قدم رک گئے۔ یہ شاندار بندہ اس کی دسترس میں تھا بس درمیان میں اس کی خودداری کی خلیج حائل تھی' جس پر صرف ایک پل تھا' اس کی عزت نفس کا پل' جسے اپنے قدموں سے روند کر اس تک جانے کی ہمت وہ چاہ کر بھی خود میں نہیں لاسکتی تھی شاید کبھی بھی نہیں۔

اچانک بادل زور سے گرجے' وہ چونک کر ہوش میں آئی۔ آسمان سے بہتا پانی پل بھر میں یوں بے قابو ہوگیا جیسے ایک پل میں ہزاروں شاور کھل گئے ہوں' سڑک کے بیچوں بیچ وہ لمحوں میں سرتاپا بھیگ گئی' سفید کپڑے بازوؤں سے چپک گئے' وہ دوپٹہ عریاں ہوتے بازوؤں کے گرد لپیٹ کر خود کو ڈھکنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی تھی۔ اسی پل ارمان تیز تیز قدم اٹھاتا موڑ مڑ کر سڑک پر آیا۔

آگے عالیشان کھڑے تھے اور پیچھے ارمان۔ وہ دونوں سے ایک برابر فاصلے پر درمیان میں تھی۔

سامنے کھڑے عالیشان اب بھی چپ چاپ کھڑے رہے' آگے بڑھنا خواہ مدد کے لیے ہی سہی' ان کی شان کے خلاف تھا شاید۔

ارمان نے جو اسے یوں مشکل میں دیکھا' ایک پل ضائع کیے بغیر بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور جلدی سے اپنی شال اتار کر اس کے کندھوں پر پھیلا دی۔ میزاب نے چونک کر اسے دیکھا' اس کی تمام تر بے رخی کے باوجود ارمان کے ہونٹوں پر پُرخلوص مسکراہٹ تھی۔

وہ یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھے گئی۔

"اٹریکشن خواہ کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو' جب زندگی کی حقیقتوں سے پالا پڑتا ہے تو سب سے پہلے مرتی ہے۔" علیشہ کی کہی کب کی بات اس کے کانوں میں گونجی اور..... فیصلہ ہوگیا۔

ارمان کے قدموں سے قدم ملا کر عالیشان کے پاس سے گزرتے ہوئے دو موتی اس کی آنکھوں سے ٹوٹ کر بارش کے پانی میں گھلے اور دل کے گرد بنا عالیشان کے سحر کا ہالہ ان میں بہتا چلا گیا۔ ارمان کی چاہتوں کو دل میں اترنے کا راستہ مل گیا تھا۔

گھر کا دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے پورے خلوص اور سچائی سے ارمان کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

میزاب کے چہرے پر حیا آلود مسکراہٹ اسے اپنی خوش بختی کا یقین دلا رہی تھی۔ اپنے مضبوط ہاتھوں میں اس کا نازک ہاتھ دباتے ہوئے اس عام سے شخص کی آنکھوں کی جگمگاہٹ ہی نرالی تھی۔

پیچھے کھڑے عالیشان اپنی تمام تر شان و شوکت کے باوجود تہی داماں تھے' غرور کے ہاتھوں محبت ہارنے کی اذیت وجود میں گھل رہی تھی' بے یقینی سے یہ منظر دیکھتے ہوئے ان کی آنکھیں دھواں دھواں تھیں۔

عالیشان کی آنکھوں میں پچھتاوا دیکھنے کی خواہش کو زور سے کچلتے ہوئے میزاب نے سختی سے آنکھیں میچ لیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والے کبھی کبھی پتھر بھی ہو جاتے ہیں اور وہ..... پتھر نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اندر کی ساری کثافت کو طویل سانس کے ذریعے ہوا کے سپرد کر کے وہ ارمان کے ہمراہ گھر میں داخل ہوگئی۔

✲

کرچیاں

ثریا نگار انجم

پتا نہیں اس کی آواز میں ایسا کیا تھا کہ سب ہی اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"زندگی کے سفر میں اگر ہمسفر اچھا مل جائے تو انسان ہر اچھے برے وقت کا سامنا بڑی آسانی سے کرلیتا ہے اور میں اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہوں' میری بیوی نے پہلے دن سے ہی میری عادتوں اور مزاج کو سمجھتے ہوئے ہر معاملے میں میرا ساتھ نبھایا' اس طرح کہ آج میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ نہ ہوتی تو میں اس قدر خوش اور مطمئن نہ ہوتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مجھے اپنی تقدیر پر ناز کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے رب کا ہر دم شکر گزار ہونا چاہیے کہ اس نے میری زندگی کے راستوں کو آسان اور خوشگوار بنانے کے لیے مجھے ایسا شریک زندگی عطا کیا جو نہ صرف خوبصورت ہے بلکہ خوب سیرت بھی اور جہاں تک محبت کی بات ہے تو اصل محبت تو شادی کے بعد ہی ہوتی ہے' اس سے پہلے تو سب وقتی جذبات ہوتے ہیں آتے جاتے موسموں جیسے..... مجھے تو شادی کے بعد ہی یہ احساس ہوا کہ کسی کی محبت میں مبتلا ہونا کس قدر

کیف آگیں تجربہ ہے۔ ایسی محبت جو نوجوانی کے طوفانی عشق کی طرح اچانک آپ کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیتی بلکہ آہستہ آہستہ آپ کے جسم و جان کے ہر حصے میں سماتی چلی جاتی ہے۔"

عروبہ کی شادی کے بعد پھپھو نے ایک بڑی دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ ان کے گھر کے وسیع ہال میں تمام قریبی رشتہ دار جمع تھے۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد سب چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ کسی کے ہاتھ میں کولڈ ڈرنک تھی تو کوئی بھاپ اڑاتی چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ ایسے میں نجانے کس نے شادی کے لڈو کا ذکر چھیڑ دیا' جسے کھانے والا بھی پچھتاتا ہے اور نہ کھانے والا بھی۔ اور جب شادی کر کے پچھتانے والے ڈھکے چھپے انداز میں اپنی گھریلو زندگی کا رونا رو رہے تھے تو اس نے بڑے فخریہ انداز میں اپنی بیوی کی خوبیوں کا اعتراف کیا۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسی سچائی تھی کہ کئی نظریں رشک بھرے انداز میں اس ہستی پر ٹھہر گئیں جس کے چہرے پر ان پُرستائش جملوں نے سرخیاں بکھیر دی تھیں جبکہ کئی چہروں کے زاویے حسد نے بگاڑ دیے' مگر وہ ان سب باتوں سے بے نیاز اب کسی اور طرف متوجہ ہو چکا تھا' اس بات سے قطعی ناآشنا کہ اس کے کہے ہوئے جملے کسی کی سماعتوں کو کس طرح زخمی کر گئے تھے۔

پل بھر میں کسی کا دل ایک ایسے صحرا میں بدل گیا تھا جس سے اڑتی ہوئی ریت نے آس پاس کے سارے منظر کو دھندلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

نصف شب کا بھید بھرا سناٹا ہر سو طاری تھا۔

آنکھوں کے گرد نرم ہاتھوں سے نائٹ کریم کا مساج کرتے ہوئے اس کا دھیمے سُروں میں گنگنانے کو دل چاہ رہا تھا مگر احسن کی نیند خراب نہ ہو' اس خیال سے وہ اپنے دل پر جبر کر کے خاموشی سے اپنے کام میں مگن تھی لیکن آنکھوں کی جگمگاہٹ اور لبوں پر پھیلتی سمٹتی مسکراہٹ اس کی خوشیوں بھری زندگی کی غماز تھی۔

قدرت نے اسے اپنی تمام تر رحمتوں سے نوازا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس کے دل کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی۔ میکہ ہو یا سسرال اسے ہر جگہ سراہا جاتا تھا۔ احسن جیسا محبت کرنے والا شوہر' خوبصورت اور ذہین بچے اور ضروریات اور خواہشات کو پورا کرنے کے لیے تمام تر سہولتیں۔ اس کے دل کا ہر گوشہ خوشیوں کی آماجگاہ تھا۔

دل کے گوشے گوشے میں آباد ان خوشیوں میں ایک خوشی ایسی بھی تھی جس سے اس کی ذات کے سوا کوئی اور واقف نہ تھا۔ ایسی خوشی جیسے سونے چاندی کے زیورات سے بھرے ہوئے جیولری باکس میں ایک ننھا سا ہیرا۔ جس کی قیمت اور اہمیت ان تمام زیورات سے بڑھ کر ہوتی ہے اور جسے سب سے زیادہ سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ فخر کے ساتھ دوسروں کو دکھایا جاتا ہے مگر اس نے اپنی اس خوشی کو کبھی کسی اور کے ساتھ شیئر نہیں کیا تھا۔ تنہائی کے لمحوں میں بس اس کی شخصیت بدل سی جاتی تھی۔ ایک سمجھ دار گھر گرہست عورت کے بجائے وہ الھڑ سی نوجوان لڑکی کے روپ میں ڈھل جاتی جس کی اٹھتی جھکتی پلکیں ہزاروں ان کہی کہانیاں سناتی تھیں۔ جس کا نرم و ملائم ہاتھ تھام کر کوئی سرسبز و شاداب مرغزاروں میں کبھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اور کبھی کسی گھنے پیڑ کے سائے میں رک کر اپنی محبت بھری باتوں کا شہد کچھ اس انداز میں اس کے کانوں میں ٹپکاتا تھا کہ اس کی روح تک سرشار ہو جاتی تھی۔

آنکھ مچولی کا یہ کھیل اسے بہت پسند تھا۔ روز مرہ کے معمولات میں سے کچھ لمحے چرا کر اگر تھوڑے سے پل وہ اپنی ذات کی تسکین کے لیے الگ کر لیتی تھی تو اس سے نہ اس کا گھر ڈسٹرب ہوتا تھا اور نہ ہی بچوں اور شوہر کی حق تلفی ہوتی تھی۔ بس اس کا اپنا وجود کن من برستی پھواروں میں بھیگ جاتا تھا اور وہ پہروں ایک نشے کی سی کیفیت میں ڈوبی رہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج میں نے اسے پورے گیارہ سال بعد دیکھا تھا۔ نیوی بلیو ساڑھی میں اس کی صاف رنگت کچھ اور دمک رہی تھی۔ لمبی گردن سے لپٹا ہوا نیکلس یقیناً اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ دراز گھنی پلکوں سے سجی چمک دار آنکھیں چھوٹی سی ناک اور بھرے بھرے لبوں کی دلکشی' نہ صرف اس کا چہرہ بلکہ اس کا سراپا بھی اتنا ہی خوبصورت تھا جتنا کہ میں گیارہ برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ گزرے ہوئے وقت نے اس پر اپنا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا سوائے اس کے کہ اس کا وہ الھڑ انداز اب ایک پُرغرور سی تمکنت میں بدل گیا تھا۔ مگر گاہے بگاہے سب سے نظریں بچا کر اس کا میری طرف دیکھنے کا انداز بالکل ایسا ہی تھا' جیسے کالج میں پڑھنے والی نادان سی دوشیزہ اس لڑکے کی طرف دیکھتی ہے جس نے پہلی پہلی بار اس سے اظہار محبت کیا ہو۔ وہ محفل میں موجود تقریباً تمام لوگوں سے ہی ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کر رہی تھی مگر جب جب وہ مجھ سے مخاطب ہوئی' اس کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ سی آگئی۔ الفاظ جیسے کم پڑ گئے اور وہ آدھی ادھوری بات کہہ کر میری طرف سے رخ پھیر گئی۔ اس کی یہ کیفیت میرے لیے کس قدر اطمینان کا باعث بن رہی تھی' یہ صرف میں ہی جان سکتا تھا۔ مجھ پر ایک سرور سا طاری تھا۔

آس پاس بہت سے لوگ تھے مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی اور تھا ہی نہیں۔ گیارہ سالوں کی جدائی کے باوجود میں نے کبھی اپنے اور اس کے تعلق کو ٹوٹنے نہیں دیا تھا اور آج اسے دیکھ کر تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ تعلق پہلے سے کہیں زیادہ مضبوط ہو چکا تھا۔ ایک ایسا رشتہ جس کی خبر صرف مجھے تھی۔ صرف مجھے۔۔۔

☼ ☼ ☼

"مریم! تم اس شادی سے انکار کر دو۔"

اس نے نہ اس التجا آمیز لہجے پر غور کیا نہ ہی اس کے کہے ہوئے جملے کو سنجیدگی سے سنا' وہ تو بس کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

وہ عمر کے اس حصے میں تھی' جب لڑکیاں ایسے ہی بات بے بات ہنستی رہتی ہیں۔ وہ اسی ہنسی پر تو فدا ہوا تھا مگر اس وقت اسے اس کا ہنسنا بالکل اچھا نہیں لگا۔

"مریم! پلیز میری بات سنو۔" اس نے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

پتا نہیں اس مرتبہ اس کا لہجہ اثر کر گیا تھا یا پھر گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔ تھوڑا سا کسمسا کر اس نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی مگر اس کی انگلیاں اسی سختی سے اس کے کندھوں پر جمی رہیں۔

"میری بات سنو۔ تم بس ایک بار ماموں جان سے کہہ دو کہ تم احسن سے شادی نہیں کرنا چاہتیں۔ وہ تمہاری بات کبھی نہیں ٹالتے بس' اس کے بعد باقی سب میں سنبھال لوں گا۔" وہ نجانے کیا کہہ رہا تھا۔

ابھی دو دن پہلے ہی تو احسن سے اس کا رشتہ طے پایا تھا اور اپنے پرائے سب اس رشتے سے خوش تھے کیونکہ احسن ہر لحاظ سے بہت اچھا تھا اب وہ محض اس کے کہنے پر شادی سے انکار کیوں کرتی۔

"مریم! تم سمجھتی کیوں نہیں۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔" وہ جیسے بے بسی کی انتہا پر تھا۔

اس نے اپنی دراز پلکوں سے سجی آنکھیں جھپک کر اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر ہنس پڑی۔

"آذر بھائی! مذاق نہ کریں۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ میں واقعی تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے تو سوچا تھا' ابھی تم پڑھ رہی ہو اور میری بھی نئی نئی جاب لگی ہے۔ کچھ دنوں بعد میں امی سے کہنے والا تھا کہ وہ ماموں جان سے بات کریں مگر اچانک یہ سب کچھ ہو گیا۔"

اس کے چہرے پر وحشت سی چھا گئی۔ مریم نے کچھ خوفزدہ ہو کر اپنے آپ کو ایک جھٹکے سے اس کی گرفت

سے آزاد کرایا۔

"مجھے نہیں پتا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے وہ دو قدم پیچھے ہٹی اور پھر تیزی سے مڑ کر کمرے سے نکلتی چلی گئی۔

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا مگر اتنی نا سمجھ بھی نہیں تھی۔ اسے اچھی طرح سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا تھا اور یہ احساس اس کے دل میں ایک گدگدی سی کر رہا تھا کہ اس کی ذات اتنی اہم ہو گئی ہے کہ ابھی دو روز پہلے اس کا اتنی اچھی جگہ رشتہ طے پایا ہے اور اب خاندان کا ایک ایسا لڑکا اسے حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہوا جا رہا ہے جس کی خوبیوں کا چرچا بھی کم نہیں تھا۔

اپنا آپ اسے پہلی بار اتنا اچھا لگ رہا تھا۔ ہنسی اس کے لبوں پر ٹھہر سی گئی تھی اور آنکھوں میں دیے سے روشن ہو گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ہائے بے چارے آذر بھائی کیا حالت بنالی انہوں نے اپنی۔"

اسٹیج سے ذرا ہٹ کر نسبتاً کم روشنی والے ایک گوشے میں کھڑے ہوئے آذر پر اس کی نظر پڑی تو لمحے بھر کو تو اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"بے رونق چہرہ، بے ترتیب بال اور آنکھوں میں گہری اداسی۔ وہ ایک مکمل طور پر ہارا ہوا انسان لگ رہا تھا۔

دلہن بنی مریم کچھ دیر کے لیے تو گم صم سی ہو گئی مگر یہ ایک لمحاتی کیفیت تھی پل بھر میں ہی اس کی توجہ مووی میکر کی جانب مبذول ہو گئی جو اسے اپنی طرف دیکھنے اور مسکرانے کو کہہ رہا تھا۔

رنگ و نور سے سجے اس ماحول میں جہاں اہم ترین شخصیت خود اس کی ذات تھی وہ کیسے ایک ایسی ہستی کی طرف متوجہ رہ سکتی تھی جو سراپا بربادی کی تصویر بنا اس سارے ماحول میں کہیں بھی فٹ نہیں ہو رہا تھا۔

وہ ولیمہ کی دلہن تھی۔ نئی محبت، نئی خوشیاں، کم عمری کا بانکپن اور دلہناپے کا روپ.... سب نے مل کر اسے ایسا نکھار بخشا تھا کہ کوئی نظر اس پر زیادہ دیر تک ٹھہر نہیں پا رہی تھی، سوائے اس کے جو بس ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا جیسے آنکھوں کے رستے اسے اپنے اندر اتار لینا چاہتا ہو۔

وہ ایک پڑھا لکھا باشعور نوجوان تھا۔ زندگی جینے کے لیے اس نے ایک بڑی صاف اور سیدھی راہ چن رکھی تھی پھر نجانے کب اور کیسے اپنی عم زاد کو الگش پڑھاتے پڑھاتے وہ اس کی چاندی کے سکوں کی جھنکار جیسی ہنسی کا اسیر ہو گیا۔ ہر وقت اسے سوچتے رہنا۔ ہر بات میں اس کا تذکرہ نکال لینا، کتنا اچھا لگنے لگا تھا۔ اور پھر اس وقت اسے حاصل کر لینا بھی تو بہت آسان لگا تھا، اسی لیے تو اس نے اپنے جذبوں کو بڑی احتیاط سے اپنے دل میں چھپا رکھا تھا کہ وقت آنے پر اپنی خواہش کا اظہار کرے گا تو کسی قسم کی مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، اور پھر سب کچھ اتنا اچانک ہو گیا کہ وہ کسی سے کچھ کہہ بھی نہ سکا۔

وہ احسن سے کسی بھی حیثیت میں کم نہیں تھا مگر جب اسے پتا چلا تو وہ اس سے منسوب ہو چکی تھی۔ شادی کی تاریخ تک طے پا گئی تھی۔ ایسے میں وہ کسی سے کیا کہتا۔ اور وہ واحد ہستی جس کے سامنے آخری امید سمجھ کر اس نے ایک بار التجا کی تھی، وہ تو اس کی بات سنتے ہی کھلکھلا کر ہنس دی تھی۔ اور یہ ہنسی اس کے دل میں نیزے کی انی کی طرح گڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

"کیا تمہیں کبھی میرا خیال نہیں آتا۔"

جذبوں سے چور بھاری آواز ٹیلیفون ریسیور کے سہارے اس کی وجود میں برقی رو کی طرح ہلچل مچا گئی۔

نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر وہ لمحے بھر کو خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔ "آتا تو ہے۔" یہ کہہ کر چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی حالانکہ دن کے ان اوقات میں اس کی چوری پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔

وقت اور جذبوں میں خیانت کا یہ سلسلہ کچھ دنوں پہلے ہی شروع ہوا تھا۔ شادی کے بعد تین چار مہینوں تک تو پتا ہی نہ چلا کہ وقت کیسے گزرا۔ احسن کی محبت، اس کے مزاج کی جولانی اسے کچھ سوچنے کا وقت ہی کہاں دیتی تھی۔ ہر روز کا گھومنا پھرنا یا شاپنگ اور ہوٹلنگ کے بعد میٹھی نیند اور رنگین خوابوں میں شب و روز گزرتے جا رہے تھے کہ اچانک احسن کے آفس میں ایک بہت بڑے غبن نے سارے عملے کو ہلا کر رکھ دیا۔ احسن کی مصروفیت اس درجہ بڑھ گئی کہ ان کا ہنی مون پیریڈ یکدم ہی اختتام پذیر ہو گیا اور اسے ان فون کالز پر دھیان دینے کے لیے فارغ وقت ملنے لگا، جو پہلے پہل تو صرف اس کی آواز سن کر بند ہو جایا کرتی تھیں مگر اب چھوٹے چھوٹے جملے اس کے احساسات کی جھیل میں دائرے بنانے لگے تھے اور یہ پھیلتے سمٹتے دائرے اس کے لیے ایک انجانی خوشی کا سبب بن رہے تھے۔

زندگی میں کوئی کمی نہ ہو پھر بھی کچھ اور پا لینے کی خواہش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔

اس کی زندگی میں بھی کوئی کمی نہیں تھی، مگر چور راستے سے ملنے والی اس خوشی میں کوئی ایسا انوکھا پن تھا کہ وہ نہ چاہ کر بھی اس ریشمی جال میں الجھتی چلی گئی۔ آذر کا یاس بھرا لہجہ، ڈھکے چھپے لفظوں میں اپنی بے قراری کا اظہار، اسے حاصل نہ کر سکنے کا پچھتاوا، یہ سب باتیں اسے اپنے اہم ہونے کا احساس دلاتیں اور اپنی پرسکون گھریلو زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے خیالوں کی دنیا میں اپنی مرضی کے رنگ بھرنا اسے بہت اچھا لگتا اور جب وہ بڑے تردد سے یہ پوچھتا کہ "تم خوش تو ہو نا؟"

تو وہ بے اختیار ہنس دیتی، وہ اسے اور کیسے یقین دلاتی کہ وہ بہت خوش ہے اور بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں دھرے بڑے آرام سے زندگی کے سبک خرام دریا میں بہتی جا رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

"میں اب اور یہ اذیت نہیں سہہ سکتا۔"

جب اس نے مریم کو اپنے کینیڈا شفٹ ہونے کے بارے میں بتایا تو وہ کتنی دیر تک تو کچھ بول ہی نہ سکی تھی، اسے ایسا لگا تھا جیسے کوئی اس کی بہت قیمتی چیز چھینے لیے جا رہا ہو۔

"مگر آذر! یوں اچانک آپ کیسے جا سکتے ہیں؟" اس کے اصرار پر وہ اسے آذر بھائی کے بجائے صرف آذر کہنے لگی تھی۔ اس کے بے قراری سے کیے گئے سوال کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔

"میرا جانا تو اسی روز طے پا گیا تھا جب تمہاری شادی احسن سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد ہر دن میرے لیے کسی امتحان سے کم نہیں تھا۔ کبھی کسی محفل میں تو کبھی کسی راہ میں تمہیں اس کے ساتھ دیکھنا میرے لیے کس قدر صبر آزما ہوتا تھا۔ اس کا اندازہ کوئی نہیں کر سکتا۔ میں تم سے دور چلے جانا چاہتا تھا، مگر یہ بھی کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ اب کچھ اسباب بنے ہیں تو تم مجھے روکنے کے لیے نہ کہنا۔ نارسائی کا دکھ اب مجھ سے سہا نہیں جاتا، میرا یہاں سے چلے جانا ہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہو گا، ورنہ تم بھی آخر کار میری لاحاصل تمناؤں کے اظہار سے اکتا کر مجھے دھتکار دو گی اور میں ..." ادھورا جملہ اسے بے چین کر گیا۔

"میں آپ سے کیسے اکتا سکتی ہوں، مجھے تو آپ کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ اگر ایک دن آپ کا فون نہ آئے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرا کچھ کھو گیا ہے۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی در آئی تھی۔

"میں کہیں بھی چلا جاؤں تم ہمیشہ مجھے اپنے قریب پاؤ گی، تم آزما کر دیکھ لینا، بس تمہارے پکارنے کی دیر ہو گی، مگر اب میں یہاں رہ کر پل پل مرنے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا۔ میں جا رہا ہوں، مگر ہمیشہ تم سے رابطے میں رہوں گا، بالکل اسی طرح جیسے اب رہتا ہوں۔"

اور سچ تو یہ ہے کہ اس نے دور جا کر بھی اس ڈور کو ٹوٹنے نہیں دیا جو امر بیل کی طرح اس کے حواسوں سے

لپٹ گئی تھی۔

کینیڈا جانے کے چند ماہ بعد ہی اس نے شادی کرلی۔

"کیا کرتا۔۔۔ طارق اپنی بہن کی طرف سے اتنا پریشان تھا' پاکستان سے کئی لوگوں نے رشتہ دیا' مگر ان سب کو یہ ہی لالچ تھا کہ عائشہ سے شادی کے بعد انہیں کینیڈین پاسپورٹ آسانی سے مل جائے گا اور یہاں پر جو پاکستانی فیملیز ہیں' عائشہ ان کے معیار پر پوری نہیں اتری' طارق کے مجھ پر بہت احسانات ہیں۔ اس نے اس وقت میرا ساتھ دیا' جب میں بالکل بکھر چکا تھا' یوں بھی زندگی تمہارے بغیر رائیگاں ہی ہے۔ دل مر چکا ہے' جذبات اور احساسات برف ہو چکے ہیں' مگر زندہ تو رہنا ہے تو میں نے سوچا یہ بے مقصد زندگی کسی کے کام ہی آجائے۔"

آذر کی شادی کا سن کر اسے شدید دھچکا لگا تھا' مگر اس سے بات کرکے وہ پل بھر میں ہی اس کیفیت سے باہر نکل آئی۔

"ناراض ہو؟" لہجے میں کچھ ایسی بے قراری تھی کہ وہ فوراً" ہی پگھل گئی۔

"نہیں آذر! میں آپ سے کیسے ناراض ہوسکتی ہوں۔"

"بس میرے زندہ رہنے کے لیے اتنا ہی بہت ہے۔" اس نے اطمینان بھری سانس لے کر کہا تو اس کے بھرے بھرے لبوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ کھل اٹھی۔ دل کی بے سکونی ایک بار پھر کیف بھرے سکون میں ڈھل گئی۔

زخم گہرا ضرور تھا' مگر اتنا بھی نہیں کہ بھر نہ سکے۔

ایسا تو کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے کہ اچانک کوئی اس طرح دل و دماغ پر چھا جائے کہ زندگی کی ہر خوشی اس کی ذات سے وابستہ ہو کر رہ جائے۔ عمر کے اس حصے میں تقریباً" ہر دل ایسی بے قراری میں مبتلا ہوتا ہے تو اگر میرے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا تو کیا انوکھا ہوا اور یہ حادثہ میری زندگی میں ہونا ہی تھا۔ ورنہ میں تو اسے بچپن سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی خوب صورتی اور شوخ طبیعت سے بھی آگاہ تھا' پھر نہ جانے وہ کون سا لمحہ تھا کہ جس کے بعد اس کی نقرئی گھنٹیوں جیسی ہنسی میرے حواسوں پر اس طرح مسلط ہوگئی کہ میں پل بھر کے لیے بھی اس کے خیال سے باہر نہیں نکل پاتا تھا۔

کسی کو میری حالت کا اندازہ نہیں تھا' کیونکہ بظاہر تو میں بڑے نارمل انداز میں اس سے ملتا تھا' مگر اسے پانے کی خواہش میرے اندر شدید سے شدید تر ہوتی جارہی تھی' بالکل اسی طرح جیسے بعض درخت جو بظاہر ایسے چھتنار نہیں ہوتے' مگر ان کی جڑیں زمین کے اندر دور تک چلی جاتی ہیں۔ وہ بھی میری روح کی گہرائیوں میں اتر گئی تھی۔

پھر اچانک پتا چلا کہ وہ میری دسترس سے بہت دور جانے والی ہے۔ مجھے ایسا لگا جیسے دنیا میرے لیے ختم ہوگئی ہو' شاید میرے ساتھ ایسے ہی ہونا تھا۔ ورنہ اتنے قریبی رشتے میں ایسی باتوں کی کچھ نہ کچھ خبر پہلے سے مل ہی جاتی ہے' مگر مجھے جب پتا چلا تو تمام معاملات طے پاچکے تھے۔ جس کے بعد میرا کسی سے کچھ کہنا حماقت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اگر کوئی امید باقی تھی تو وہ مریم کی ذات تھی' مگر وہ تو میری بات سن کر ہنس پڑی۔ اس کی یہ ظالم ہنسی خنجر کی طرح میرے دل کے آرپار ہوگئی۔۔۔ میری حالت دیوانوں جیسی تھی اور میں کسی کے سامنے اپنی اس دیوانگی کا اظہار بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس کی شادی ہوگئی اور وہ احسن کے ساتھ کتنی خوش تھی' اس کا اندازہ کوئی بھی کرسکتا تھا۔

چاہتا تو میں بھی یہ ہی تھا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے' مگر میرے دل کے تقاضے کچھ اور تھے۔

میرا دل چاہتا تھا صرف ایک بار تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی اس کے دل میں بھی وہ تڑپ جاگے' جس نے میرے لیے دن اور رات کا فرق مٹا دیا تھا۔ کبھی وہ بھی درد کی اس راہ سے گزرے' جس پر آبلہ پائی کرتے میرا سارا وجود زخم زخم ہوتا جارہا تھا' مگر اسے تو ذرا بھی احساس نہ تھا۔

میرے اظہار کے بعد اور میری بے قراریوں کو جان کر بھی وہ اسی مگن انداز میں مجھ سے بات کرتی' جیسے میرے جذبات اور احساسات کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت ہی نہ ہو۔ اس کا مجھ سے بات کرتے کرتے بڑے آرام سے احسن کا ذکر چھیڑ دینا مجھے اپنی حیثیت کا احساس دلا دیتا' مگر میں پھر بھی ایک بھکاری کی طرح ان چند لمحوں کی بھیک کی آس لگائے رہتا جو فون پر بات کرکے میرے حصے میں آتے تھے۔ جب میں نے اسے اپنے کینیڈا جانے کا بتایا تو پہلی بار اس کے لہجے میں بے چینی سی در آئی تھی۔

"آپ یوں اچانک کیسے جاسکتے ہیں؟"

اس کے بے قراری سے کیے گئے سوال پر میری پیاسی روح پر شبنم سی برس گئی۔ میری دیوانگی آخرکار اس پر کچھ نہ کچھ اثر کر گئی تھی' یہ خیال مجھے سرشار کرنے لگا تھا' مگر دوسرے ہی پل اس کا یہ کہنا کہ "مجھے آپ کی عادت ہوگئی ہے۔" میرے سارے وجود کو سلگا گیا' میرے اندر ایک ایسا الاؤ روشن ہوگیا' جس نے لمحہ بھر میں میرے دل میں موجود اس سے وابستہ ہر جذبے کو جلا ڈالا۔ اب تک اس کی بے اعتنائی کو نظرانداز کیے جارہا تھا۔ اپنی وحشتوں کے جواب میں اس کی ظالم ہنسی کے وار سہے جارہا تھا' مگر وہ میری انتہاؤں کو چھوتی محبت کے بدلے میں صرف میری "عادی" ہوسکی تھی' جیسے میں کوئی بے جان چیز تھا' جس کی عادت تو پڑسکتی ہے' مگر جس کے لیے کسی نرم و نازک جذبے کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اس ایک لمحے میں' میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں واقعی اسے اس حد تک اپنا عادی بنادوں گا کہ میرے بغیر اسے اپنا آپ ادھورا لگنے لگے۔ اس ایک پل میں میری محبت انتقامی جذبے میں ڈھل گئی۔

میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ اس سے رابطے میں رہوں گا اور گیارہ سال تک میں نے اپنا یہ وعدہ نبھایا۔ گیارہ سال تک میں اپنی نفرت کا زہر محبت کی شیرینی میں لپیٹ کر اس کی رگوں میں اتارتا رہا۔

وہ احسن کی بیوی تھی۔ اس کے دو بچوں کی ماں تھی' مگر اس کے دل و دماغ پر پوری طرح میرا تسلط قائم تھا۔

میں ہمیشہ اسے یہ یقین دلاتا رہا کہ عائشہ سے میری شادی محض ایک کاغذی رشتہ ہے اور یہ بات اسے کیسی خوشی دیتی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے تمام تر فاصلوں کے باوجود اس کے لہجے کی کھنک سے بخوبی ہوجاتا تھا۔

وہ ایک خودپرست عورت تھی اور اپنے اس جذبے کی تسکین کے لیے اپنے گھر' اپنے شوہر اور اپنے بچوں کی امانت میں خیانت کررہی تھی۔ ورنہ وہ چاہتی تو احسن جیسا شریک زندگی پاکر مجھے سختی سے دھتکار سکتی تھی۔ کچھ دنوں میں' میں اپنی ناکام محبت کا ماتم کرنے کے بعد نارمل ہو ہی جاتا اور وہ پوری ایمان داری سے احسن کے ہمراہ ایک خوش گوار ازدواجی زندگی بسر کرتی' مگر اسے اپنی ذات کی تسکین کے لیے اور بھی بہت کچھ چاہیے تھا۔ جس کا ذریعہ میرے علاوہ ہوسکتا ہے' کوئی اور بھی ہو کیونکہ جس عورت کو سراہے جانے کی عادت پڑ جائے' اس کی طلب بڑھتی ہی جاتی ہے۔ میرا یہ گمان کبھی کبھی یقین میں ڈھل جاتا اور اسے آئینہ دکھانے کی خواہش شدید تر ہوجاتی۔

اور اب گیارہ سال بعد مجھے یہ موقع ملا تھا۔

جب میں اپنی اور عائشہ کی خوش گوار زندگی کی بات کررہا تھا تو اس کے خوب صورت چہرے کے رنگ اڑتے جارہے تھے۔

"شادی سے پہلے تو سب وقتی جذبات ہوتے ہیں' آتے جاتے موسموں جیسے۔" یہ کہتے وقت میں غیر محسوس انداز میں اس کے بہت قریب چلا گیا تھا' تاکہ وہ میرا کہا ہوا ہر' ہر لفظ بخوبی سن لے' اس لمحے میں نے اس کی گھنی پلکوں کے بیچ جلتی شمعوں کو دھواں ہوتے دیکھا۔

اس نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا اور پھر نڈھال ہو کر قریبی صوفے پر ٹک گئی تھی۔

محفل میں ہر ایک کا ردعمل مختلف تھا' کسی چہرے پر مسکراہٹ تھی تو کسی پر حیرت' عائشہ کا چہرہ خوشی سے جگمگا اٹھا تھا۔

اور مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے صدیوں سے جلتے بلتے صحرا پر رم جھم کی موسیقی بکھر گئی ہو۔ ☼

ناولٹ

زندگی اتنی پیاری ہے

عائشہ فیاض

"پھر بھی یار! کچھ پتا تو چلے، اب پرانے دوستوں سے ایسی بھی کیا پردہ داری۔"

"بائی دی وے، آپ کب سے میرے دوست ہو گئے۔" وہ غصے سے بولا۔ "آپ صرف اور صرف پرانے ہیں اور بس۔" اس کا غصہ ہنوز قائم تھا۔

"اچھا یار یونہی سہی۔ اب کچھ بتاؤ تو۔" دادا صاحب نے صلح کا جھنڈا اٹھا رکھا تھا۔

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں آپ کو کیوں بتاؤں۔" اب وہ بے مروت بھی تھا۔

"ہاں تو نہ بتاؤ، میں کون سا مرا جا رہا ہوں۔ گدھے کو نمک دو، وہ کہتا ہے میرے کان کھینچے ہیں۔ تمہارا تو وہ حال ہو گیا ہے۔" اب تو دادا صاحب کو بھی غصہ آنے لگا تھا۔

"ہاں تو کس نے کہا ہے گدھے کو نمک دیں۔" وہ بھی جھٹ سے کہہ گیا تھا۔

"کیا کریں صاحب، یہ گدھا ہمارا پیارا پوتا بھی تو ہے ناں۔" اب کے وہ اور بھی پیار بھرے لہجے میں کہہ رہے تھے۔ "اور اس کی پریشانی مجھ سے تو دیکھی نہیں جاتی۔" انہوں نے اس کی چھوٹی سی ناک بھی کھینچ ڈالی تھی۔

"پہلی بات تو یہ کہ میں پریشان نہیں غصے میں ہوں اور دوسری بات یہ کہ آپ مجھے نہیں بلکہ اس اینکر کو دیکھ رہے ہیں، جو پچھلے چالیس منٹ سے اپنے سامنے بیٹھے سیاست دان کی ٹانگ کھینچ رہی ہے۔" اس نے ٹی وی کا ریموٹ اٹھا کر صوفے پر دے مارا تھا۔

"او میرے یار! ہر لو اسٹوری میں ایسا ہی ہوتا ہے۔" انہوں نے ٹی وی آف کر دیا تھا۔

"I Hate love stories۔" وہ ناک چڑھا کر بولا تھا۔

"ہاں اچھی فلم ہے۔ میں نے ابھی پرسوں شام ہی دیکھی تھی۔ جب تیری دادی اسٹور میں سے رضائیاں نکلوا رہی تھی۔" انہوں نے بچوں کی سی معصومیت سے "اعتراف جرم" کیا تھا اور وہ اپنی بے ساختہ ہنسی کو روک نہ پایا تھا۔

"تجھے پتا ہے' میری اور تیری دادی کی لو اسٹوری بھی بڑی زبردست ہے۔ آج میں سناتا ہوں تجھے۔" انہیں اس کی ہنسی نے بڑا حوصلہ دیا تھا۔

"جب تیری دادی اسلامیہ کالج سے بی اے کر رہی تھی تو میری یونیورسٹی کی بس' روز اس کے کالج کے سامنے سے گزرتی تھی۔ میں روز وہیں اتر جاتا اور تیری دادی کو دیکھ کر پھر اپنی یونیورسٹی جاتا تھا اور اگر کسی دن ......"

"او پلیز دادا صاحب! اتنے سارے جھوٹ ایک ہی سانس میں نہ بولیں۔ کارڈیک ہارٹ اٹیک کا خطرہ ہے۔"

دادا صاحب جو ماضی کی "خوشگوار" یادوں میں بہہ چلے تھے' پوتے نے انہیں بری طرح سے "روک" لگا دی تھی۔

"دادی نے خود بتایا ہے مجھے کہ وہ صرف پانچ جماعتیں پڑھی ہیں اور وہ بھی گھر میں اپنے بھائیوں کی کتابیں پڑھ کر اور آپ انہیں بی اے کرا رہے ہیں۔ آپ کی اپنی تعلیمی قابلیت بھی صرف میٹرک پاس ہے۔ اب یہ میٹرک آپ نے پتا نہیں کون سی یونیورسٹی سے کیا ہوگا جس کی بس روزانہ ......"

اس نے ان کے بیان کا شروع میں ہی اچھا خاصا پوسٹ مارٹم کر کے انہیں غصہ دلا دیا تھا۔

"تجھے کیا پتا گدھے! تو کون سا اس وقت پیدا ہوا تھا — تیری دادی بی اے پاس تو ہے اور پتا ہے وہ اپنے کالج میں این سی سی کی بٹالین کمانڈر بھی رہی ہے۔" دادا صاحب اپنے بیان پر ڈٹے ہوئے تھے۔

"اچھا جی' تو یہ بتائیں بھلا کس سن میں میری دادی صاحبہ اس کالج میں زیر تعلیم تھیں؟" اب وہ بڑے آرام سے پوچھ رہا تھا۔

"سن کون سا تھا بھلا ...." دادا بڑے انہماک سے اپنے سید قائم علی شاہ جیسے "ہیر اسٹائل" میں انگلیاں پھیرتے ہوئے واقعی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ "ہاں یاد آیا' جس سال اپنی مدھوبالا اور کشور کمار کی شادی ہوئی' بس اس کا اگلا پچھلا ہی کوئی سال تھا۔" وہ بڑے فخر سے بولے۔

"ہاں جی' جیسے میں تو ان کے ولیمہ میں گیا تھا ناں۔" وہ جل کر بولا تھا۔ "مجھے کیا پتا کس سال ہوئی تھی ان کی شادی۔"

"اچھا تو یوں سمجھو یہی کوئی 57ء یا 58ء' بلکہ نہیں 1956ء کا سال تھا' جب ان کی شادی ہوئی۔" ان کا سکون ابھی قائم تھا۔

"اچھا تو 1956ء یا 57ء میں میری پیاری دادی صاحبہ اسلامیہ کالج میں زیر تعلیم تھیں۔" اس کا "اچھا" کافی لمبا اور معنی خیز تھا اور آنکھوں میں ایسی چمک' جو چند لمحوں میں دادا صاحب کا سارا سکون درہم برہم کرنے والی تھی۔

"ڈیئر دادا! وہ اسلامیہ کالج تو قائم ہی 1967ء میں ہوا تھا اور رہی این سی سی کی بٹالین کمانڈر والی بات تو شاید آپ کو پتا نہیں کہ پاکستانی کالجوں میں این سی سی کا آغاز 1971ء کی جنگ کے بعد ہوا تھا۔ اس سے پہلے اس کا کوئی وجود تک نہیں تھا۔" دونوں ہاتھوں کے انگوٹھے' دادا صاحب کی طرف لہراتے ہوئے وہ انہیں زچ کر چکا تھا۔

"وے در فٹے منہ' تمہاری اس انفارمیشن ٹیکنالوجی کا۔ اب بڈھا بندہ بچارا تھوڑی سی دل پشوری بھی نہ کرے۔" وہ سچ مچ برا مان گئے تھے۔ اسے دل ہی دل میں خوشی محسوس ہو رہی تھی۔

"یہ لو پکڑو' اپنے سردیوں کے کپڑے اور لے جا کر اپنی الماری میں سیٹ کر لو۔ رات کو میں دیکھوں گی آ کر۔" دادی اماں نے رضیہ کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کپڑے کا بڑا سا گٹھڑ اس کے عین سامنے رکھواتے ہوئے آرڈر دیا۔

"پلیز دادو! کل کر لوں گا ناں' ابھی مجھے کچھ کام ہے۔" ابھی وہ ٹھیک سے ہنس بھی نہیں پایا تھا کہ دادو آ گئی تھیں۔

"ٹھیک ہے رضیہ! وہاں سے دوسری گٹھڑی اٹھا کر برہان صاحب کے کمرے میں رکھ آؤ۔" اپنی عینک کے پیچھے سے ایک زبردست گھوری اس پر ڈالتے ہوئے وہ

رضیہ سے مخاطب ہوئیں اور اس گھوری کا مطلب وہ بخوبی سمجھتا تھا سو اسے بھی اٹھنا ہی پڑا تھا......

☼ ☼ ☼

رات کے کھانے کے بعد سب ہی حسب معمول ٹی وی لاؤنج میں جمع تھے اور گرما گرم چائے کا دور چل رہا تھا۔ اس دوران ٹی وی جیسی کسی قسم کی دخل در معقولات کو پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ دادی اماں کا حکم اور ان سب کی مجبوری تھی۔ جس کا اظہار ان کی شکلوں کے بنتے بگڑتے زاویوں سے وقتاً "فوقتاً" ہوتا رہتا تھا۔

"چلو برہان! یہ کپ اٹھاؤ اور کچن میں رکھ آؤ۔" دادا جی نے سب سے پہلے چائے ختم کر کے کپ اسے پکڑا دیا تھا۔

"ایک منٹ بھائی! ذرا میں بھی پی لوں تو میرا کپ بھی لے جانا۔" ہادی نے اسے پیچھے سے آواز دے کر روکا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بھی "فوراً" رک گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ہادی رکھ آئے گا جا کر' تم ذرا آ کر میری کمر تو دباؤ' ہائے اللہ لگتا ہے' ساتھ ہی نہیں ہے۔" دادی اماں نے دونوں ہاتھوں سے کمر دباتے ہوئے کہا تھا۔

"صبح آپ میرے ساتھ چلیے گا۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے آپ کا چیک اپ کرواؤں گا۔" برہان نے سعادت مندی سے کہا تھا۔

"ارے چھوڑو میاں! گرم دودھ میں دیسی انڈا اور گھی ڈال کر پی لوں گی تو آرام آ جائے گا کچھ دن کے لیے۔ اب اس عمر میں پورا آرام کہاں آنا ہے۔ کمر ٹھیک ہو گی تو گھٹنے جان کو آ جائیں گے۔ بس یہ درد تو لگتا ہے اب مرنے کے بعد ہی جان چھوڑیں گے۔"

پوتے کی ہمدردی پاتے ہی انہوں نے اپنے نادیدہ دکھڑے سنانے شروع کر دیے تھے۔

"مرنے کے بعد.... حق ہا' ہماری ایسی قسمت کہاں۔" دادا ابا نے باآواز بلند — تبصرہ کیا تھا۔

"ہاں ہاں' تم تو چاہو گے' جلد از جلد اس بڑھیا سے جان چھوٹے اور تمہیں اپنی حسرتیں پوری کرنے کا موقع ملے۔"

دادو کو ان کے تبصرے نے غصہ دلا دیا تھا اور اب جو کچھ ہونے والا تھا وہ کسی بھی سیاسی ٹاک شو سے زیادہ گرم اور مزے دار تھا' اسی چسکے میں ہادی بڑے سکون سے صوفے سے ٹیک لگا کر اور فلور کشن کو سینے سے لگا کر بیٹھ گیا تھا' یوں جیسے اس کی پسندیدہ فلم کا کوئی زبردست سین چلنے والا ہو۔ برہان اس دوران چائے کے کپ اٹھا کر کچن میں جا چکا تھا۔

"مگر سن لو اچھی طرح سے نمبردار صاحب کہ میرا نام بھی جنت بی بی ہے۔ اللہ کے فضل سے ایسے ہی تمہارے سینے پر مونگ دلتی رہوں گی۔"

"ہاں جی بی بی! وہ تو آپ پچھلے باون برس سے دل ہی رہی ہیں۔" دادا جی نے بڑے آرام سے صوفے پر پیر پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔

"دادی پتا ہے' ہم دادا جی کی قبر پر وہ والا کتبہ ضرور لگوائیں گے جس پر لکھا ہوگا۔

"حسرت ان غنچوں پہ ہے' جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

ہادی نے اس دو طرفہ جنگ میں' دادی کو کمک پہنچانا ضروری سمجھا تھا' جس پر انہوں نے اسے بھرپور تعریفی نگاہ سے بھی نوازا تھا' جبکہ دادا صاحب کی اسے پھاڑ کھا جانے والی نظر اس کے علاوہ تھی' جسے اس نے پوری ڈھٹائی سے نظرانداز بھی کر دیا تھا۔

"تم نہیں جانتے بیٹا! اس بڈھے طوطے کو اس عمر میں بھی دوسری شادی کا ارمان ہے دل میں۔" دادی نے اسے اپنا سچا ہمدرد سمجھ کر دوسرا شکوہ نکالا تھا۔ جس پر دادا صاحب کی خفگی بھری خاموشی' ایک طرح کا اعتراف جرم ہی تو تھی۔

"ہائے اللہ کیا سچ مچ دادو؟" ہادی نے چالاک عورتوں کی طرح چہرے پر کمینہ سادکھی تاثر لاتے ہوئے حیرت کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اب کیا فائدہ' جنت بی بی' فضلاں کو تو مرے ہوئے بھی پندرہ برس ہو گئے۔" دادا صاحب نے بالآخر

ڈھیٹ ہو کر اقرار کیا تھا، جس پر ہادی کو واقعی حیرت کا جھٹکا لگا تھا، جبکہ دادو ایک لمحے کو تو بھونچکی رہ گئی تھیں۔ بہرحال کچھ ہی دیر میں وہ بھرپور جوابی حملے کے لیے پھر تیار تھیں۔

"ہاں تو پھر کیا ہوا، اقبال بیگم تو زندہ سلامت ہے ناں ابھی تک، پچیس تیس پوتے پوتیاں اور نواسے نواسیاں ہیں تو کیا ہوا۔ ان کی آخر اتنی پرانی محبوبہ رہی ہے وہ بھی۔" جوابی حملہ واقعی تابڑ توڑ تھا۔ دادا کے مورچے میں مکمل خاموشی تھی اور چہرے پر حد درجہ بیزاری۔

"بھلا آپ کو کہاں ملیں وہ دادو!" ہادی نے بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں دخل دیا تھا۔

"میں نے کہاں ملنا تھا اس کم بخت کو، ویسے ہی ایک روز بازار میں ٹکرا گئی تھی۔ ملتے ہی سب سے پہلے تمہارے دادا کو پوچھا، بے شرم نہ ہو تو، کہنے لگی، نمبردار صاحب کا کیا حال ہے، آپا جی کیسی ہیں آپ۔ ہونہہ! آپا جی، بڑی آئی خود کاکی نہ ہو تو۔" وہ دادا جی کی طرف دیکھ کر ہادی سے بات کر رہی تھیں۔

"اچھا پھر تم نے کیا جواب دیا تھا۔" دادا صاحب نے اپنے پرانے سکون بھرے انداز میں پوچھا تھا۔

"تو میں نے کیا کہنا تھا، میں نے تو صاف سیدھی بات کہی۔ میں نے کہا بہت اچھے ہیں بہن جی، اب تو اور بھی زیادہ پیارے ہو گئے ہیں، جس دن سے باقی تین دانت بھی نکلوائے ہیں اور سر بالکل ہی گنجا ہوا ہے تو۔ آپ آنا کسی دن ملنے۔" دادی کے لہجے میں طنز آمیز سکون تھا جس نے دادا کے ماتھے پر گہرے بل ڈال دیے تھے، جبکہ ہادی ہنسی کے مارے فرش پر ہی لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لیں بھائی! آپ کے تازہ تازہ گرما گرم استری شدہ کپڑے۔" ہادی سات آٹھ مختلف ڈریسز کو ہینگرز پہ اٹھائے برہان کے کمرے میں کھڑا تھا۔

"تھینک یو سو مچ ہادی! تم میرا کتنا خیال رکھتے ہو ناں۔" لیپ ٹاپ پر اپنے کام میں بے حد مصروف برہان نے سر اٹھایا تھا۔

"اٹس او کے بھائی! یہ تو میرا فرض ہے ویسے بھی آپ تو دادو کے فیورٹ ہیں، آئیڈیل ہیں۔ ہم جیسے اونگے بونگے لوگ تو آپ جیسے عظیم لوگوں کے کام کرنے اور پھر ان سے ٹپ (TIP) وصول کرنے کے لیے ہی ہوتے ہیں ناں۔" اس کی الماری میں سارے کپڑے ہینگ کر کے وہ مسکین صورت بنائے اس کے سر پر آکھڑا ہوا۔

اچھا وہ ذرا میرا والٹ تو لانا۔" برہان نے آخر اس کے دل کا حال جان ہی لیا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" برہان نے اسے پیسے دے کر والٹ کو وہیں اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

"سوچ رہا ہوں بھیا کہ اپنے قائداعظم جی آپ پر کتنے مہربان ہیں ناں۔ آپ کا تو سارا بٹوہ ہی، ان کی تصویر والے کاغذوں سے بھرا ہوا ہے اور ایک ہم جیسے ہیں جی کہ جو سارے مہینے میں بس ایک آدھ بار ہی، اپنے پیارے قائد کا چہرہ دیکھ پاتے ہیں۔" ہادی کا مصنوعی حسرت بھرا لہجہ سن کر برہان کو اپنی ساری تھکن اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ مسکرایا۔

"یہ تو بہت آسان ہے بھئی "کام، کام اور صرف کام" ان کے صرف ایک ہی قول پہ عمل کر لو، پھر دیکھنا، تمہارا اپنا بٹوہ بھی ان کی تصویر والے کاغذوں سے بھر جائے گا۔" برہان نے لیپ ٹاپ آف کر کے اس کی طرف بڑھایا تھا۔

"پلیز بھائی! نو مور، ابھی ابھی تو دادو کا اتنا بڑا سارا لیکچر سن کر آیا ہوں۔" ہادی نے منہ بنایا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے اب جلدی سو جاؤ مجھے بھی نیند آ رہی ہے۔" برہان نے اس کی مشکل آسان کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں کیا کروں تمہارا، پھر سے سوال غلط کر ڈالا

ہے۔" ہادی نے راجا کی کاپی کو میز پہ پٹخا تھا۔

"سوری سر جی! میں پھر سے کرتا ہوں۔" وہ فوراً شرمندہ ہوا تھا۔

"ہاں ٹھیک ہے، مگر ذرا جلدی۔" ہادی نے لہجے کو ابھی تک اتنا ہی سخت رکھا تھا۔

"اے ہادی ذرا میری ہیلپ تو کرنا پلیز!" وہ بھی راجا کے ساتھ ہی بیٹھ گئی تھی۔

"کیا مسئلہ ہے مائرہ!" ہادی کو اس اونگی بونگی لڑکی سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔

"فرشتے اور مخمل، ان دونوں میں سے اپنے لیے میں کون سا نام رکھوں؟" وہ بہت سنجیدہ تھی۔

"مگر تمہارا نام تو کئی سال پہلے رکھ دیا گیا تھا ناں۔ پھر دوبارہ نام کیوں؟"

"تمہیں پتا ہے ناں مجھے رسالے میں سے جو بھی نام پسند آئے، میں اپنا وہ ہی نام رکھ لیتی ہوں۔" لہجے میں بہت سا خوشی بھرا استحقاق سمویا ہوا تھا۔

"ہاں پتا ہے مجھے۔ ابھی کچھ ماہ پہلے بھی تم کو دورہ پڑا تھا۔ وہ کیا تھا..." بیزار لہجے میں وہ واقعی سوچنے لگا تھا۔

"شاید پریچے وغیرہ۔"

"خبردار ہادی کے بچے، اتنا پیارا نام ہے پریشے، میری فیورٹ رائٹر کی کہانی کی ہیروئین کا نام تھا۔ میں نے رکھ لیا۔ تمہیں کیا تکلیف... اچھا اب بتاؤ ناں ان دونوں میں سے کون سا نام مجھ پر زیادہ سوٹ کرے گا۔ فرشتے کتنا الی گینٹ نام ہے۔ ہے ناں اور..."

"مگر فرشتے تو مردانہ سا نام لگتا ہے۔ تم ایسا کرو فرشتی رکھ لو۔ ہاں، راجا کی پھوپھو فرشتی۔" ہادی اسے ستانے لگا تھا۔

"اچھا اور مخمل؟" مائرہ کا لہجہ بجھ سا گیا تھا۔

"اس سے تو اچھا ہے مخمل رکھ لو۔ سنا ہے مخمل کا کپڑا بہت اچھا ہوتا ہے اور اس کی رضائی تو اتنی نرم ہوتی ہے کہ۔"

"دفع دور ہو تم جا کر، ہادی کے بچے، تم LEO ہوتے ہی ایسے ہو، مغرور، گھٹیا، فضول۔" وہ پیر پٹختی چلی گئی اور ہادی نے سر جھٹک دیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے آپ اس وقت کچن میں، ابھی جا کر دادو کو بتاتا ہوں، فریج میں سے کسٹرڈ چوری کر رہے تھے ناں۔" وہ انہیں رنگے ہاتھوں پکڑنے پر بڑا خوش تھا۔

"دفع دور، بے ہدایتاں نہ ہو تو... بڑا آیا دادی کا سگا۔ میں تو انڈے ڈھونڈ رہا تھا۔ دودھ میں ڈال کر دیتے ہیں ناں اس کریاں والی کو۔" انہوں نے پھر سے اپنا سر فریج میں گھسیڑ لیا تھا۔

"مگر انڈے تو فریج کے دروازے میں ہی رکھے ہیں۔ تو پھر آپ نے اٹھایا یہ کسٹرڈ کا باؤل۔" اس نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھوں سے پیالے کو لے کر واپس فریج میں رکھا اور دو انڈے اٹھا کر ان کے سامنے لہرائے۔ ان کے چہرے پہ کھسیانی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"ویسے یار تم خود سوچو ذرا۔ یہ اتنا سا تو کسٹرڈ بچا ہے اور وہ بھی تیری دادی نے سنبھال کر رکھ لیا ہے اپنی لاڈلی نوکرانی کو دینے کے لیے، کوئی بات ہے بھلا۔ اب اتنے سے کسٹرڈ سے اس کی تو داڑھ بھی گیلی نہیں ہو گی۔ ہے ناں۔"

کسٹرڈ سے "تقریباً" آدھے بھرے ہوئے پیالے کو حسرت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے ٹٹولا تھا۔

"اگر میرا حصہ ففٹی پرسنٹ رکھتے ہیں تو مجھے منظور ہے۔"

اس نے فوراً "سودا" کر ڈالا تھا۔

"اچھا اب یہ باؤل بہت اچھی طرح دھو کر رکھو۔ میں ذرا گرم دودھ میں انڈا مکس کر لوں۔" باؤل خالی ہوتے ہی انہوں نے ___ سختی سے کہا تھا، جسے اس نے ہمیشہ کی طرح کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔

"میں کر لوں گا خود ہی جو کرنا ہے۔ آپ اپنی بیگم کی خدمت کریں جا کر... زن مرید نہ ہوں تو۔" اس نے بھی فوراً "بدلہ" لے ڈالا تھا۔ دادا بس اسے گھور کر ہی رہ

گئے۔

✡ ✡ ✡

”ہادی یار! ذرا برہان کو فون تو کر۔ اسے کہنا آج ذرا جلدی گھر آجائے‘ مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا ہے۔“ دادا جی نے دونوں ہاتھ اپنے پیٹ پہ رکھے ہوئے تھے اور وقتاً ”فوقتاً“ ہائے ہائے کر رہے تھے۔

”چلیں میرے ساتھ بائیک پہ بیٹھ جائیں ناں۔“ وہ بہت کم اتنا مہربان ہوا کرتا تھا۔

”ناں بھائی میں تو گاڑی پر ہی جاؤں گا۔ یاد ہے پچھلی بار بھی تو نے مجھے بائیک سے نیچے گرا دیا تھا اور خود زن سے آگے نکل گیا۔ ہائے ربا بڑا درد ہو رہا ہے۔“ اب وہ اپنا پیٹ دبانے بھی لگے تھے۔

”میں نے کیوں گرانا تھا جی! وہاں کون سا کوئی نہر تھی جو آپ کو گرانے کا مجھے کوئی فائدہ ہوتا۔“ اس کا پرانا موڈ لوٹ آیا۔

”چل اوئے‘ دادا کے ساتھ مخول کرتا ہے‘ میراثی کا پتر نہ ہو تو۔“

”ہاں کوئی فرق پڑا یا نہیں۔“ دادی نے ان کے ہاتھ میں قہوے کا مگ پکڑایا تھا۔

”لے پھر یہ مصیبت لے آئی ہے۔ ابھی گھنٹہ پہلے تو پیا تھا۔“ انہوں نے منہ بنایا تھا۔

”اچھا یوں کرو دوپہر کے لیے تو رات کا سالن ہے۔ تم مارکیٹ سے کوئی سبزی لے آؤ۔ میں رات کے کھانے کا بھی انتظام کر لوں۔“ دادی نے دادا کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویوں کو قطعاً ”نظر انداز کرتے ہوئے ہادی کو مخاطب کیا تھا۔

”ناں بھئی ناں میں تو نہیں کھاؤں گا وہ رات کا سالن۔ تم ایسا کرو‘ مسور کی دال کی پتلی سی کھچڑی اور ساتھ ہی ہری مرچ پودینے کی چٹنی بنا دو میرے لیے‘ مزا ہی آجائے۔“ دادا نے اپنا فرمائشی پروگرام شروع کر دیا تھا۔

”ہاں ضرور کیوں نہیں۔ بلکہ میٹھے میں تو کسٹرڈ بنا لیتی ہوں ناں‘ بہت سارے سیب‘ کیلے اور آم ڈال کر۔“

وہ اتنا میٹھا لہجہ کب اختیار کرتی تھیں‘ جب انہیں دادا کو کلین بولڈ کرنا ہوتا تھا۔ ہادی تو فوراً ”ہی کھسکنے لگا تھا۔

”دفع کرو کسٹرڈ کو‘ ابھی کل تو بنایا تھا تم نے‘ مجھے تو ذرا اچھا نہیں لگا۔ دیکھا بس دو چمچ ہی کھائے تھے رات کو‘ اتنا خراب ہو گیا میرا پیٹ۔۔۔ ہائے بڑا درد ہو رہا ہے۔“ وہ بھرپور کراہے تھے۔

”ہاں میرے سامنے تو دو ہی چمچ لیے تھے تم نے‘ مگر رات کو وہ کسٹرڈ کا باؤل بھی تو خالی کیا تھا ناں۔“ دادی نے بلی کھول ہی ڈالی تھی۔

”نہیں۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ تو۔۔۔ وہ تو بلی نہیں کھا گئی تھی شاید ہے ناں ہادی۔“ دادا جی نے ملتجی لہجے میں اس سے امداد مانگی تھی‘ مگر وہ بھی اس لمحے پوری آئی ایم ایف (IMF) بنا ہوا تھا۔

”مجھے کیا پتا جی‘ میں تو رات کو جلدی سو گیا تھا۔ ویسے بھی کتنی مہنگائی ہو گئی ہے‘ سو روپے کا کارڈ ڈلواؤ موبائل میں تو بس 84 روپے ہی آتے ہیں۔ اب بندہ کتنے کارڈ ڈلوائے۔“ خوامخواہ ہی اپنے سر کے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے وہ دادا کے سامنے جھکا تھا۔

”اوکے دادو! میں بس ابھی آتا ہوں‘ آپ کی پسند کی سبزی لے کر اور اپنے لیے چکن بریالیس کولڈ ڈرنک۔“ آدھا جملہ صرف دادا کو سنایا گیا تھا‘ جو اس کی طوطا چشمی پر سچ مچ بہت حیران رہ گئے تھے۔

”چلو مان لیا کہ میں رات کو وہ باؤل فریج میں رکھنا بھول گئی ہوں گی‘ مگر اتنی سیانی بلی کہاں سے ملتی ہے‘ جو کسٹرڈ کھانے کے بعد برتن کو اچھی طرح دھو سنوار کر بھی رکھے۔ ہاں بولو بڑے میاں! اب کیوں چپ کر گئے۔“ دادی کی طرف سے ہونے والی بمباری اتنی شدید نوعیت کی تھی کہ انہیں بچوں کی طرح سر جھکا کر اپنی غلطی مانتے ہی بنی تھی۔

”حق ہا‘ میں کہتی ہوں بڑھاپا آگیا‘ مگر زبان کا چسکا نہ گیا۔ پتا بھی ہے اچھی طرح کہ پیٹ خراب ہو جاتا ہے تمہارا۔

بیٹھے رہو اب غسل خانے کے دروازے سے

لگ کر۔ بھوکے ندیدہ نہ ہو تو۔“ ان کے سارے جملوں کے جواب میں وہ یکدم اٹھے اور باتھ روم کی طرف بھاگے تو دادی کو بھی ہنسی آگئی تھی۔

”دادا جی! آپ جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میں نے ڈاکٹر جاوید سے آپ کے لیے وقت لے رکھا ہے۔“ وہ باتھ روم سے باہر نکلے تو برہان تیار کھڑا تھا۔

”ارے تم اتنی جلدی کیسے آگئے؟ ابھی تو میں نے ہادی سے تمہیں فون کرنے کا کہا تھا۔“ دادا واقعی حیران ہوئے تھے۔

”ارے نہیں دادا جی! مجھے تو دادی جان نے فون کیا تھا کوئی دو گھنٹے پہلے۔ سوری مجھے پھر بھی ذرا دیر ہو گئی۔“ وہ اپنے مخصوص نرم لہجے میں وضاحت دے رہا تھا۔

”ہیں واقعی۔ تیری دادی نے فون کیا تھا؟“ ابھی کچھ دیر پہلے ہونے والی پیشی کے بعد ان کی حیرت تو بجا تھی۔ برہان مسکرا دیا تھا۔

”اچھا اب چھوڑو یہ نخرے‘ جلدی سے یہ کپڑے پہن کر تیار ہو جاؤ۔ بچہ اتنی دور سے تمہاری خاطر اپنا سارا کام کاج چھوڑ کر آیا ہے۔ اس نے واپس بھی جانا ہے۔“ ان کے پیچھے کھڑی دادی جان نے استری شدہ جوڑا ان کی طرف بڑھایا تھا۔

”اچھا نیک بخت جاتا ہوں۔“ بہت کچھ کہتے کہتے وہ بس اتنا ہی کہہ کر آگے بڑھ گئے تھے۔

”بیگم دادا جلدی آئیں۔ مس جلیبلی آگئی۔“ ریموٹ کنٹرول ہاتھ میں پکڑے‘ ہادی انہیں آواز دے رہا تھا‘ وہ اکثر انہیں لاڈ سے بیگم دادا ہی کہا کرتا تھا۔ ”کیا ہے یار‘ ایک تو آپ بوڑھے لوگ بُرا‘ بڑی جلدی مان جاتے ہو۔“ ہادی نے اس دوران اپنے پاس منہ پھلا کر بیٹھے دادا کو چھیڑا تھا۔

”بڈھا ہو گا تیرا باپ۔“ دادا نے ہاتھ میں پکڑا اخبار اسے دے مارا تھا۔

”بکواس فلم ہے دادا‘ میں نے ابھی پرسوں ہی دیکھی ہے۔“ بڑی ڈھٹائی سے اخبار کو پھر سے رول کر کے اس نے اپنے سرہانے ہی رکھ لیا تھا۔

”اس وقت تو بڑا میرا یار بنا ہوا تھا‘ چلو دادا مل جل کر کسٹرڈ ختم کرتے ہیں‘ اتفاق میں برکت ہے وغیرہ وغیرہ۔ تو جب تیری وہ ظالم دادی مجھ پہ فرد جرم عائد کر رہی تھی‘ تب نہیں خیال آیا تجھے مل جل کر ڈانٹ کھانے کا۔“ وہ منہ بگاڑ کر بولے تھے۔

”ایزی دادا ایزی! ویسے بھی آپ تو یوں بگڑ رہے ہیں جیسے یہ آپ کی پہلی پہلی عزت افزائی ہو۔“ اس نے اپنے جملے کا خود ہی مزا لیا تھا۔ ”یہ تو روز کی بات ہے‘ ہے ناں میری پیاری دادی اماں جان!“ اس نے کچن سے باہر نکلتی ہوئی دادو کو بھی گھسیٹا تھا۔

”کیا روز کی بات ہے‘ ہادی!“ وہ اس کے برابر میں ہی آبیٹھی تھیں۔

”کچھ نہیں دادی‘ میں تو کہہ رہا تھا کہ یہ پروگرام جو آپ دیکھتی ہیں ناں‘ تو یہ روز کی بات ہے۔ اس کا کیا برا منانا۔“

”ہاں تو کیوں نہ دیکھوں‘ یہ جو بڑے میاں ہر روز سیاستوں والے گندے مندے پروگرام سنتے رہتے ہیں تو اب میری باری۔ انہیں کیا تکلیف ہے۔“ ہادی! انہیں تپانے میں کامیاب ہو چکا تھا سو بڑے سکون سے اپنے موبائل پہ جھک گیا تھا۔

پورے پندرہ Recieved messages تھے اور سب کے سب ایک ہی نمبر سے پتا نہیں کیوں وہ اب اسے زبانی یاد ہو گیا تھا‘ حالانکہ وہ اسے کبھی نہیں پڑھتا تھا۔ (صرف نمبر کو) بہت خوب صورت شاعری‘ نصیحت نما بھاری سی باتیں اور چند ایک لطیفے۔ وہ ہمیشہ یہی سب کچھ تو میسج کرتی تھی اور بہرحال اس کے ذوق کا وہ معترف ہو چکا تھا۔ شروع میں چہرے پہ آنے والا ناگواری کا تاثر ایک پرسکون مسکراہٹ میں بدل گیا تھا اور اس تبدیلی کا واضح جائزہ‘ دادا جی کی تجربہ کار نگاہیں بخوبی لے چکی تھیں۔ ہادی کو کچھ بھی پتا چلے بغیر۔

✡ ✡ ✡

چھوٹے سے گھر میں وہ چاروں اتنے خوش اور پرسکون تھے جیسے آسمان پہ ستارے دادا‘ دادی اور وہ

دونوں، محمد برہان بڑے ہیں اور بقول دادی 'ان کے فیورٹ بھی' جبکہ ہادی اور دادا کے خیال میں وہ مراۃ العروس والی اصغری کا مردانہ روپ ہیں۔ ہر قدم پر اچھے، ہر لمحہ نیک، ہر آن خدمت کو تیار۔ عقل اور سمجھ، شعور میں یوں ڈوبے ہوئے ہیں جیسے ...... ہاں جیسے شیرے میں گلاب جامن۔

محمد ہادی یوں تو چھوٹے ہیں کیونکہ ابھی کالج جاتے ہیں، مگر اپنی مخصوص عادات کے سبب وہ بڑوں کے بھی بڑے ہیں۔ اس کے واحد گواہ دادا جی ہیں جو اکثر اس کی وجہ سے مالی و ازدواجی نقصان اٹھاتے ہیں۔

دادی کو گھر میں خاطر خواہ شہرت و پسندیدگی حاصل نہیں، ظاہر ہے، جو بندہ ہر لمحہ گھر کو گھر بنائے رکھنے کے لیے کمربستہ (ہادی کے بقول جھاڑو بستہ) رہے، اسے بھلا کون پسند کرے گا۔ صوفے کی گدیاں فرش پر کیوں ہیں، ہادی کے موزے، برہان کی الماری میں کیسے پہنچے اور دادا کی دوائی آج پورے چودہ منٹ دیر سے کیوں کھائی گئی..... ان کا تو سارا دن ایسے ہی گزر جاتا ہے۔

ایسے میں ان کی اور دادا کی، کبھی کبھی ہونے والی کھٹ پٹ ہی تو ہادی کا واحد ذریعہ تفریح ہوتا ہے اور اکثر اس کھٹ پٹ کا خالق وہ خود ہی ہوتا ہے، جس پر اسے برہان کی ڈانٹ سننے کو ملتی ہے۔ جسے امریکی امداد کی طرح اپنا حق سمجھ کر وہ بالکل اپنے حکمرانوں کی طرح بغیر ڈکارے ہضم کر لیتا ہے۔

☼ ☼ ☼

"ٹھیک ہے راجا، کل مجھے یہ والی ایکسر سائز حل کر کے دکھانا۔" ہادی نے ہاتھ میں پکڑے قلم سے، اس کی کتاب پہ نشان لگایا۔

"او کے سر! اس کے ہاتھ سے اپنی کتاب لیتے ہوئے راجا مسکرایا تھا۔

"اچھا یار! اب یہ ٹیچر سٹوڈنٹ والا بورنگ کام ختم۔ ذرا بھاگ کر اپنی مما کو تو بلاؤ، آج پہلی تاریخ ہے۔" ہادی کا لہجہ اور بھی شوخ ہوا تھا۔

"تو یہ بات ہے، جو تم اتنی جلدی جلدی پڑھا رہے تھے مجھے آج، میں بھی کہوں بڑی تیز گاڑی چل رہی ہے۔" راجا کو اس کے خوشگوار موڈ نے کچھ اور بھی شہہ دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسے تھے۔

"کیا کروں یار! دادا جی کی ناراضی اس دفعہ کچھ لمبی ہو گئی ہے، اپنا خرچا پانی بھی ذرا جلدی ختم ہو گیا تھا، سو اسی لیے سمجھا کرو ناں۔" اس نے راجا کے بستے کی زپ کو بند کیا تھا۔

"السلام علیکم بھابھی!" راجا کی امی کو آتا دیکھ کر وہ فوراً" مؤدب ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام! کیسے ہو ہادی، انکل اور آنٹی کا سناؤ، اب کیسے ہیں وہ۔" راجا کی امی سے ان کی پرانی دعا سلام تھی۔ آخر محلے داری جو تھی۔

"اللہ کا شکر ہے بھابھی، سب ٹھیک ٹھاک ہیں، آپ سنائیں حیدر بھائی تو ٹھیک ہیں ناں۔" وہ مہذب بننے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"یہ لو بھائی تمہاری اس ماہ کی فیس۔" آخر انہیں یاد آ ہی گیا تھا۔

ہزار روپے کا کڑکتا ہوا نوٹ ابھی اس کی انگلیوں سے مس بھی نہیں ہوا تھا کہ اچک لیا گیا۔

"ارے بھابھی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔" وہی نوٹ اپنے ہاتھ میں پکڑے وہ اس کے سر پر سوار تھی۔ "اس مہینے پورے ایک ہفتے کی چھٹیاں کی ہیں جناب نے۔"

"جھوٹ۔ میں نے تو صرف دو چھٹیاں کی تھیں، وہ بھی پہلے سے بتا کر۔ ہے ناں بھابھی!" ہادی نے اپنی گھبراہٹ کو بڑی خوبی سے چھپایا تھا۔

"ہاں مجھے پتا ہے مائرہ! دادا جی کو ہسپتال لے کر جانا تھا اور ایک دن شاید تمہیں کالج میں ہی دیر تک رکنا پڑا تھا، پریکٹیکل وغیرہ کے لیے۔" بھابھی کی بروقت امداد پر ہادی کا دل خوشی سے اچھل ہی پڑا تھا۔ چور نظریں کھڑکھڑاتے نوٹ پر لگی تھیں۔

"یہ تو وہ چھٹیاں ہیں جن کا آپ کو پتا ہے۔ اس کے علاوہ چھ اور چھٹیاں بھی ہوئیں۔ جن کی خبر آپ کو اس ٹیچر اور اسٹوڈنٹ کی ملی بھگت کی وجہ سے نہیں ہوئی۔" اب وہ بڑے آرام سے بھابھی کے برابر بیٹھی، تفصیل

بتا رہی تھی۔ ہادی کا دل ڈوب گیا تھا۔ آج شام کے شاندار کھانے کا پلان مکمل طور پر فیل ہوتا نظر آ رہا تھا۔

"بہت بری بات ہے، راجا! آپ تو مجھے بتا دیتے کہ ٹیچر نے اتنی چھٹیاں کی ہیں۔" اسے مکمل نظر انداز کیے ہوئے وہ صرف اپنے بیٹے سے مخاطب تھیں، یعنی معاملہ گڑبڑ تھا۔ ہادی کا دماغ بیک وقت دو مختلف معاملات پر غور کر رہا تھا۔ ایک تو بھابھی کے غصے کو ٹھنڈا کرنا اور دوسرا کوئی ایسا جادوئی لفظ جسے ادا کرتے ہی وہ منحوس، کم بخت لڑکی پلک جھپکتے ہی وہاں سے غائب ہو جاتی۔

"یہی نہیں بھابھی، اس مہینے تین بار یہ بھی ہوا کہ یہ جناب مقرر کردہ وقت سے پہلے ہی چھٹی کر گئے۔ ہزار کے نوٹ کو بڑے سلیقے سے تعویذ کی شکل میں لپیٹ کر وہ اپنے موبائل کے کور میں رکھ چکی تھی۔

"گھر میں جانے سے پہلے راجا کو سارا ہوم ورک کروا کر گیا تھا، بس زبانی سننے والا کام رہ گیا تھا، مگر وہ بھی میں نے اگلے دن آ کر سن لیا تھا۔ چاہے آپ خود راجا سے پوچھ لیں۔ بتاؤ ناں راجا۔" کھڑکھڑاتے نوٹ کو اپنی دسترس سے بہت زیادہ دور جاتا دیکھ کر ہادی نے فوراً" صفائی پیش کی تھی۔

"ہاں جی مما! سر بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" راجا کو بھی اپنا یہ 'یار نما استاد' بہت پیارا تھا۔

"یہ لو پکڑو اپنی اس مہینے کی فیس اور اب نکلو یہاں سے۔" مائرہ نے پیسے اسے پکڑائے تھے۔

"یہ کیا، صرف چھ سو دس روپے" ہادی کا منہ بن گیا تھا۔

"دیکھا، کیسی زبردست کیلکولیشن ہے میری۔ آفٹر آل میتھس کی اسٹوڈنٹ ہوں۔"

اس نے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے، ہادی سے داد چاہی تھی جو وہ کم سے کم اس وقت تو بالکل نہیں دے سکتا تھا۔ "تمہاری فالتو چھٹیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے، میں نے ہی تو فیس میں سے پیسوں کی یہ کٹوتی کی ہے۔ دیکھو ہادی! یہ پیسے تمہاری حلال کی کمائی ہے۔ تمہیں تو میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے ناں کہ میری وجہ سے تم حرام کمائی کے عذاب سے بچ گئے ہو۔ ہے ناں ڈیئر۔"

"کوئی بات نہیں مائرہ کی بچی، دیکھ لینا تم، میں بھی تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ آخر کو لیو (leo) ہوں تمہارے جیسے کینہ پرور جوزا (Gemine) سے بدلہ تو لینا ہی پڑے گا ناں۔" وہ غصے میں تنتناتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

"ہاں ہاں جاؤ۔ میں نے بھی آخر بدلہ لے ہی ڈالا ناں۔ فرشتی رکھ لو۔ مخمل رکھ لو، یہی کہہ رہے تھے ناں اس دن۔" مائرہ نے پیچھے سے آواز دے کر اسے مزید چڑایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو تمہاری چائے فضل الٰہی صاحب! پتا نہیں اتنے پرانے برتنوں میں چائے پی کر کیا ملتا ہے تمہیں۔" وہ ٹرے ان کے سامنے رکھ کر، دوسری کرسی پہ بیٹھ گئی تھیں۔

"یہ کپ اور پرچیں کوئی عام تھوڑی ہیں۔ میری دلہن کے جہیز کی ہیں۔"

چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے انہوں نے والہانہ نظروں سے دادی کو یوں دیکھا تھا کہ وہ سچ مچ شرما سی گئی تھیں۔

"دونوں بچے گھر میں نہیں ہوتے تو کتنا عجیب لگتا ہے ناں۔" انہوں نے فوراً" بات بدلی تھی۔

"عجیب؟ ارے میں تو کہتا ہوں یہ گھر ہی نہیں لگتا کہ۔" دادا نے اپنے دل کا حال بتایا تھا۔

"کبھی کبھی سوچتی ہوں، اگر ہمارے بیٹے کے جانے کے بعد، یہ دونوں ہمارے پاس نہ آتے، تو میں تو شاید کب کی مر گئی ہوتی۔ بے مقصد بے جواز، تنہا زندگی بھلا کون کب تک جیے۔"

انہوں نے دوپٹے کے پلّو سے آنسو صاف کیے تھے۔

"مر تو ہم چکے تھے بیگم! ہمارے اپنے جوان بیٹے کے غم نے مار ہی تو ڈالا تھا ہمیں۔ نئی زندگی تو ان دونوں نے دی ہمیں۔" چائے کا کپ ابھی تک ان کے ہاتھوں

میں ویسے ہی پکڑا ہوا تھا۔

”چائے تو پی لو‘ پھر کہو گے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ میں دوبارہ گرم کر کے نہیں لانے والی۔“ سامنے دروازے سے اندر داخل ہوتے برہان کو دیکھ کر دادی ایک لمحے میں اپنی وہی پرانی جون میں لوٹ گئی تھیں۔

”السلام علیکم دادا جی‘ السلام علیکم دادی جی!“

”وعلیکم السلام! جیتے رہو میری جان۔“ انہوں نے اپنے آگے جھکے اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے چھوا تھا۔ ”آج کچھ پہلے نہیں آ گئے تم؟“ دادا نے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر پوچھا۔

”ہاں جی دادا جی! وہ میرا سر بہت درد کر رہا ہے‘ اسی لیے ذرا پہلے نکل آیا۔ ابھی چائے بنا کر پی لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بہت ادب سے بول کر اب اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تھا کہ دادی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم فریش ہو جاؤ۔ تمہارے لیے گرما گرم چائے میں خود بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی تھیں۔

”ارے نہیں دادو! آپ کو زحمت ہو گی۔ میں خود ہی بنا لوں گا۔“ برہان نے انہیں پھر سے ان کی جگہ پر بٹھا دیا تھا۔

”ہمارے لیے تو چائے تک گرم نہیں کر سکتی ہو اور اپنے پیارے پوتے کے لیے تازہ چائے بنانے کو تیار۔ واہ بی بی واہ! اچھا سلوک کر رہی ہو میرے ساتھ۔“ دادا نے فوراً ”شکوہ کر ڈالا۔

”ہاں تو کیوں نہ کروں‘ میرا بیٹا اتنی محنت کرتا ہے‘ سارا دن وہاں دفتر میں سر کھپاتا ہے اپنا اور تم ہو کہ ویلے بیٹھے دن سے رات کرتے رہتے ہو۔“ دادی کی کھری بات نے دادا کو بغلیں جھانکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

”ایسے نہیں کہتے دادی! بری بات ہے۔ آپ یہیں بیٹھیں اور دادا جی میں آپ کے لیے بھی چائے بنا کر لاتا ہوں۔ آپ دادی کی باتوں کا برا مت مانیے گا پلیز۔“ اس نے بڑی لجاجت سے درخواست کی تھی۔

”السلام علیکم ایوری باڈی! دیکھیں تو میں کیا لایا ہوں۔“ ہادی کی آمد ہمیشہ کی طرح دھماکہ خیز تھی۔

”گرما گرم چکن پزا اور گورے والوں کی برفی۔“ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑے شاپرز اوپر اٹھا کر اس نے بطور خاص دادا جی کو مخاطب کیا تھا۔

”مگر یہ ساری فضول خرچی کس خوشی میں؟“ دادی نے اس کے جوش کو نظر انداز کیا تھا۔

”ہمارے پیارے دادا جی کی سالگرہ کی خوشی میں ہپ ہپ ہرے!“ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوشی سے چہکتے ہوئے دادا جی کے گلے لگ گیا تھا۔

”میری طرف سے بھی آپ کو سالگرہ بہت بہت مبارک ہو۔“ برہان نے بھی اپنا بازو ان کے کندھے پر پھیلاتے ہوئے دھیرے سے ان کے کان میں کہا تھا۔ دادا‘ دادی کے چہرے بہت خوش گوار حیرت میں دمک رہے تھے۔

”اوئے بے ہدایتا‘ جھوٹیا‘ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میری سالگرہ تو بارہ تیرہ دن پہلے گزر گئی۔“ دادا نے خود سے چپکے ہوئے ہادی کو پرے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔

”دل وچ ہونا چائی دا پیار
یار یخاں وچ کی رکھیا جی
یار یخاں وچ کی رکھیا او بلے بلے“

جگنی اسٹائل میں یہ عجیب سا گانا سنا کر فوراً ”ہی ہادی نے دادا کے کمزور سے اعتراض کو بھی اپنی پر خلوص میں لپیٹ دیا تھا۔

برہان نے آگے بڑھ کر‘ چپکے چپکے روتی ہوئی دادی کو اپنی مضبوط بانہوں کے حصار میں لیا تھا۔ ”میرا خیال ہے اب تو مجھے جا کر سب کے لیے بہت اچھی سی چائے بنا کر بھیجنی چاہیے۔ کیوں دادی؟“ وہ ان کی رائے لے رہا تھا یا شاید انہیں اپنے اردگرد پھیلی ان بے شمار خوشیوں کا احساس دلا رہا تھا جن کی چمک نے ان کے گھر آنگن کو روشن کر دیا تھا۔ ”میں ابھی آیا۔“ انہیں مسکراتا چھوڑ کر وہ کچن کی طرف چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

”بال دیکھ ذرا اس کے‘ جیسے منجھی کی بائی‘ ٹوٹ

جائے اور سارا بان درمیان میں پھنس جائے۔“ دادو نے اپنا قیمتی تبصرہ شروع کر دیا تھا۔

اس وقت ان کا فیورٹ کوکنگ شو ٹی وی پر چل رہا تھا۔ ”کھانا میرے محلے کا“ نامی اس شو میں ان کی دلچسپی نہ تو روز بننے والے بڑے بڑے کھانوں میں تھی اور نہ ہی انہیں پکانے والے تین سو کلو وزن کے شیف میں بلکہ شیف کہاں‘ وہ تو اسے چھیدا نائی کہتی تھیں۔ نائی اس لیے کہ ان کے گاؤں میں نائی ہی ایسی واحد شخصیت ہے‘ جو نہ صرف یہ کہ ہر چھوٹے بڑے کی حجامت بنا سکتا ہے‘ بلکہ ہر طرح کا اعلیٰ معیار کا حامل کھانا پکا بھی سکتا ہے۔ ہاں اسے چھیدا کہنے کی اصل وجہ وہ ہمیشہ گول کر دیتی ہیں۔

بات ہو رہی تھی‘ شو میں دادو کی دلچسپی کا سبب اور وہ تھی مس چلبلی۔ ویسے تو اس کا نام کافی بھلا تھا‘ ڈاکٹر صوفیہ نعمانی مگر ہادی اور دادی نے مل کر اسے مس چلبلی کا نام دیا تھا۔ ظاہر ہے اس کی حرکتوں کی وجہ سے۔

”ارے واہ مس صوفیہ! آج تو آپ بہت خوب صورت لگ رہی ہیں۔“ چھیدے نائی نے پروگرام شروع ہوتے ہی اس کی تعریف کی تھی۔ ”اور خاص طور پر آپ کا یہ ہیر اسٹائل‘ اف! اتنا زبردست ہے کہ میں کیا کہوں...... آیئے! خود ہی ناظرین سے پوچھ لیتے ہیں۔“ اپنے دیگ کے سائز جتنے بڑے منہ پر اس سے بھی زیادہ بڑی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجا کر چھیدے نائی نے فوراً ”ہی بات کا رخ ٹی وی ناظرین کی طرف موڑ دیا تھا۔

”فٹے منہ تیرا‘ کالے تیل کا ڈرم نہ ہو تو۔ کیسے ٹی وی پہ کھڑا ہو کے لائیو بھونڈی اداکاری کر رہا ہے۔“ دادو نے بڑے ہی غور سے اس کی ساری بات سن کر اپنا تبصرہ جاری کیا تھا۔

”بالکل دادو جی‘ حیا رہی نہیں زمانے میں۔“ ہادی نے اسائنمنٹ لکھتے لکھتے بھی ان کو اپنے موجود ہونے کا احساس دلایا تھا۔

”کہتا ہے آپ کا ہیر اسٹائل بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں بال دیکھو ذرا اس کے جیسے......“

”کیا کہنے آپ کی عقل کے دادو‘ واہ جی واہ۔“ ہادی نے داد دی تھی۔

”جی ناظرین تو آج ہم بنانے جا رہے ہیں کھچڑی‘ کریلے اور دال مسور کا مزیدار سوپ‘ آپ تیار ہیں ناں! تو پھر لکھیے سب سے پہلے Ingredients (اجزا)۔“ چھیدے نائی کی طرف سے ہونے والی تعریف کے بعد‘ مس چلبلی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا‘ جس کا اندازہ اس وقت اس کی آواز کی کھنک سے بخوبی لگایا جا سکتا تھا۔

”ہاں بی بی! جو مرضی پکاؤ‘ مگر یہ اپنا ہاتھ کیوں سر کے اوپر رکھا ہوا ہے۔ لگتا ہے بالوں کی رسیاں ادھڑنے لگی ہیں۔ کیوں ہادی!“ دادو نے پھر اسے گھسیٹا تھا۔

☼ ☼ ☼

”اور سناؤ کیسی ہو مس Geminei۔“ ہادی نے اسے سامنے دیکھا تو بلائے بغیر نہ رہ سکا۔

”اگر میرا اسٹار Geminei ہے تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ تم میرا نام بھی یہی رکھ لو‘ مسٹر LEO۔“ اپنے سامنے کھلے رسالے پر سے نظریں اٹھائے بغیر وہ بولی تھی۔

”نام کا کیا کروں۔ ہر مہینے تو تم بدل لیتی ہو۔ ویسے اس مہینے کے لیے آپ کو کس نام سے لکھا اور پکارا جائے مس مائرہ!“ ہادی نے کھلے رسالے کو ٹھپ سے بند کر دیا تھا۔

”مس فرشتے محمل‘ آج سے برائے مہربانی مجھے اسی نام سے لکھا اور پکارا جائے۔“ مائرہ نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تھی۔

”ویسے اس نام کی ایکسپائری ڈیٹ تو دیتی جاؤ۔“ ہادی بھی کہاں باز آنے والا تھا۔

”مرو پرے جا کر تم۔“ مائرہ رسالہ ہاتھ میں پکڑے‘ تن فن کرتی اس کے پاس سے گزر کر اندر کی طرف چلی گئی تھی۔

”لگتا ہے آج ان کے گھر بھی کریلے پکے ہیں۔“

ہادی زیرِ لب مسکرایا تھا اور پھر کندھے اچکاتا ہوا راجا کے کمرے کی طرف بڑھا۔

☼ ☼ ☼

"کچھ پتا بھی ہے آپ کو یہ ہادی کے بچے نے حیدر کے گھر میں کیا گل کھلائے ہیں۔" دادی نے انہیں مخاطب کیا۔

"ہادی نے تو کبھی نہیں بتایا کہ وہ حیدر کے ہاں باغبانی کرنے جاتا ہے۔ وہ تو میرے خیال میں راجا کو پڑھانے جاتا ہے ناں وہاں۔" دادا نے بغور ان کی بات سن کر جواب دیا تھا۔

"بس کرو تم بھی' یہ ہر وقت کا مذاق۔ اور اچھی طرح پتا ہے تمہیں یہ گل کھلانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔" پہلے سے غصے میں آئی ہوئی دادی کو تو اور بھی تاؤ آگیا تھا۔ "حیدر کی طرف گئی تھی' مجھے وہیں سے پتا چلے تمہارے لاڈلے کے کرتوت......

"اس نے حیدر کی بہن کو لو لیٹر لکھا۔

اللہ تیرا شکر' میرے پوتے نے آخر کوئی تو جوانوں والا کام کیا۔" دادا جی نے ان کی بات بیچ میں ہی کاٹ کر فوراً" خود سے پوری کردی تھی۔

"تمہارے منہ میں سات چولہوں کی سواہ (راکھ) پڑے۔ اللہ نہ کرے جو کبھی میرا کوئی پوتا ایسی گھٹیا حرکت کرے۔" دادی نے دہل کر انہیں فوراً" ہی روکا تھا۔

"مجھے پہلے ہی پتا تھا۔ ان دونوں میں مردوں والی کوئی بات ہے ہی نہیں۔" اپنا اندازہ غلط ہونے پر دادا نے "دل برداشتہ" ہو کر اپنے وسوسوں کا اظہار کیا تھا۔

"تمہارے خیال میں اگر ایسی حرکتیں مردانگی میں آتی ہیں تو اللہ میرے بچوں کو اس سے بچا کے ہی رکھے۔ توبہ ہے اتنا ٹھرکی بندہ' قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں اور دل میں ارمان دیکھو منڈوں کھنڈوں والے۔"

"اچھا نیک بخت' ہمارے ارمانوں کو نہ چھیڑ۔" دادا نے بہت ٹھنڈی سانس بھری تھی۔ "یہ بتا کہ ہادی نے آخر کیا کیا حیدر کے ہاں؟؟"

"ہاں یاد آیا... وہ حیدر کی بہن ہی بتا رہی تھی کہ پچھلے ماہ ہادی نے راجا کی ٹیوشن سے بہت سی چھٹیاں کی تھیں اور وہ بھی ان کو بغیر بتائے۔ حیدر کی بیوی تو بہت غصے میں تھی۔ راجا اپنی کلاس کے ٹیسٹوں میں بس مر کے ہی پاس ہوا ہے۔ کہنے لگی' ہمیں تو بس آپ دونوں کا لحاظ ہے ورنہ شہر میں ٹیوٹر تو رُلتے پھرتے ہیں۔" دادی نے جلدی جلدی بات پوری کی تھی۔

"لے دس! اتنی چھوٹی سی گل کے لیے اتنا شور۔ ان سے کہنا تھا' ہمیں بھی پڑھنے والے لڑکے بہت۔ دو چار چھٹیاں کیا کرلیں میرے شیر جوان نے' انھیں تو وخت ہی پڑ گیا' جیسے ان کے منڈے کا کوئی پی ایچ ڈی کا پرچہ رہ گیا ہو۔ ہے کیا وہ راجا' چوہے جیسا' تیری چوتھی میں تو پڑھتا ہے ابھی اور نخرہ دیکھو اس کی ماں کا۔"

"تم سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" دادی جو حیرت سے ان کا تفصیلی تبصرہ سن رہی تھیں' آخر بیزار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اچھا اب اٹھ ہی گئی ہو تو ذرا میرے لیے نمکین لسی بنالا' ٹھنڈی ٹھار' پتلی سی ہو۔" دادا نے فوراً" ہی ٹریک بدلا تھا۔ دادی انہیں گھورتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی تھیں' خلافِ معمول کچھ بھی کہے بغیر۔

☼ ☼ ☼

"جی تو ناظرین! سب کام چھوڑ کر آئیں اور ہمارے سامنے بیٹھ جائیں' کیونکہ آج کا دن ہے' بہت' بہت' بہت خاص

جس رات کے خواب آئے
خوابوں کی وہ رات آئی"

چھیدے تائی نے اپنی پھٹے ڈھول جیسی آواز میں شعر کا حشر نشر کردیا تھا۔ "جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں پچھلے دو ماہ سے ہم آپ کو بتا رہے ہیں' ایک ویری اسپیشل ویک کا جس میں ہم آپ کو بتائیں گے ایسے کھانے جو آج تک نہ کسی نے بنائے ہیں اور نہ ہی کھائے ہیں....

جی! آج سے شروع ہو رہا ہے' ہمارا اور آپ سب کا "بھنڈی ویک" یعنی ہفتہ بھنڈی۔ ہو گئے ناں حیران' میری جان یہ ہے وہ بڑا سرپرائز' جس کا آپ کو تھا انتظار۔"

"وے در فٹے منہ تیرا..." دادی اس دوران چار بار کہہ چکی تھیں۔

"اور بھنڈی ویک کے لیے ہماری ہوسٹ (میزبان) ون اینڈ اونلی "مس بھنڈی' ہاہا' تالیاں۔"

دادی جو اچار کے لیے مرچوں میں نمک ہلدی بھر رہی تھیں' پھر سے سر اٹھا کر ٹی وی اسکرین کی طرف دیکھنے لگیں۔ دادا اخبار پڑھنا بھول گئے اور ہادی نے ہاتھ میں پکڑا قلم' لکھتے لکھتے روک کر وہیں کاغذ پر رکھ دیا تھا۔ اچانک ہی سب کو مس بھنڈی کے دیدار کا شوق اٹھا تھا۔

اور یہ تھا آج مس چلبلی کا ایک نیا روپ' بھنڈی کے رنگ کے عجیب وضع کے کپڑے' کانوں میں بندوں کی جگہ لٹکتی بھنڈیاں۔ گلے میں ان کا ہی نیکلس اور سب سے بڑھ کر..... اس کے بال جن میں جگہ جگہ بھنڈیاں یوں ایڈجسٹ کردی گئی تھیں' جیسے وہ بال نہ ہوں' بھنڈیوں کی بیل ہو۔ اس منظر کو دیکھ کر جہاں دادا اور ہادی کے قہقہوں نے اگلے پچھلے گھروں تک صدا دی تھی' وہیں دادو نے دونوں ہاتھوں سے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا تھا' یہ سوچے بغیر کہ ان کے ہاتھ مرچوں والے ہیں اور پھر اگلے دو گھنٹوں تک ان کا سارا چہرہ' جلن کے مارے لالوں لال رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ہائے اللہ بھائی' تم سے کس نے کہا تھا۔ اتنے سارے ٹاپک Save کرنے کو۔ میری چھوٹی سی تو اسائنمنٹ تھی۔" ہادی منہ بنا کر کمپیوٹر پر اپنا کام کر رہا تھا۔ پاس ہی برہان صوفے پہ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر ہادی کو اور بھی غصہ آیا تھا۔

"نواب زادے خود تو مزے کر رہے ہیں اور مجھے اس فضول کام پہ لگایا ہوا ہے۔" اس کی بڑبڑاہٹ خاصی بلند تھی مگر پھر بھی برہان نے جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا۔

جیسے تیسے اپنا کام ختم کر کے ہادی نے پرنٹ آؤٹ نکالے' کمپیوٹر کو آف کیا اور پھر بغیر کوئی کھٹکا کیے کمرے سے باہر نکلنے ہی لگا تھا کہ واپس پلٹ آیا۔ برہان نے اسے پیچھے سے آواز جو دی تھی۔

"آپ سوئے نہیں ابھی تک' میں تو سمجھا...."

ہادی کو سچ مچ حیرت ہو رہی تھی۔

"نہیں' میں تو جاگ رہا تھا۔" برہان کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا جو روز سے ہٹ کے تھا۔ ہادی نے فوراً" محسوس کیا تھا۔ "کیا بات ہے بھائی' خیریت تو ہے ناں۔" وہ جھٹ سے فکرمند ہوا تھا۔

"تمہیں پتا ہے ہادی' آج ہمارے دفتر میں کون آیا تھا۔" سرخ مخملیں کشن کو دونوں بازوؤں میں دبوچ کر سینے سے لگائے برہان کے چہرے پہ انوکھا ہی روپ تھا۔

"نہیں' بلکہ میں تمہیں بتاؤں کہ آج میں کس سے مل کے آ رہا ہوں۔"

"ہائے ربا! یہ آج اصغری کو کیا ہو گیا۔ کہیں ٹوٹا لگا کر تو نہیں آیا۔" چپ چاپ حیران کھڑا ہادی سوچ رہا تھا۔

"میں آج تمہاری اور دادو کی مس چلبلی سے مل کر آ رہا ہوں اور پتا ہے کیا' مجھے لگتا ہے۔

I am in Love with her (مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے۔)"

ہادی کو یوں لگا جیسے امریکی طیاروں نے خود ہی وائٹ ہاؤس پر ڈرون حملہ کر دیا ہو۔

☼ ☼ ☼

"ایک تو نئی نسل کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ مانتے نہیں ہیں۔" دادا نے بحث میں ہار کر نقطۂ اعتراض اٹھایا تھا۔

"آپ کو تو اللہ موقع دے ہمارے خلاف بولنے کا' دی اولڈ مین۔" ہادی کہاں چپ رہنے والوں میں سے تھا۔

"تو پھر سچ سچ بتا دے ناں کہ اتنی چھٹیاں کرنے کی

وجہ کیا تھی۔ مجھے تو جس دن سے تیری دادی نے بتایا ہے یقین کر، رات کو نیند تک نہیں آئی۔"

"جو بندہ سارا دن ٹی وی لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھ کر صرف سوتا ہی رہے، اسے ویسے بھی رات کو نیند آ ہی نہیں سکتی بابا جی!"

"چل بتا دے شاباش، میرا سوہنا پوتا نہیں ہے۔ بتا دے ناں میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ جلدی سے بتا دے میرے کان میں آ کر۔" وہ اسے ننھے بچوں کی طرح پچکارنے لگے۔ ہادی انہیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو "آپ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔"

"بابا جی وہ میرا دوست ہے ناں عالیان....."

"کون؟ وہی لمبے سے منہ والا، وہی جس کی دادی بالکل پٹھانوں جیسی گوری چٹی لگتی ہے۔" دادا جی نے فوراً "لقمہ" دیا تھا اور ہادی کے پاس اپنا ماتھا پیٹنے کے علاوہ اور کچھ تھا ہی نہیں۔

"ہاں جی وہی، مگر اس کی دادی کو فوت ہوئے پورا سال بھی ہو گیا ہے۔" وہ ایک ایک حرف چبا چبا کر بولا تھا۔ دادا جی بس ایک لمحے کو شرمندہ سے ہوئے اور بس۔

"نیک عورت تھی بے چاری۔ اللہ جنت نصیب کرے۔ تم مجھے اصل بات بتاؤ۔"

"عالیان کے ابو بہت سخت بیمار ہو گئے تھے۔ بس سمجھیے ڈاکٹرز نے بھی جواب ہی دے دیا تھا۔ پورے سترہ دن ہسپتال میں داخل رہے وہ۔ عالیان ان کی اکلوتی اولاد ہے۔ وہ اور اس کی امی چوبیس گھنٹے وہیں ہوتے تھے۔ ایسے میں جب بھی وہ زیادہ پریشان ہوتا، مجھے فون کر کے ہسپتال ہی بلوا لیتا، پتا ہے دادا! کئی بار تو عالیان پریشانی کے مارے رو ہی پڑتا تھا۔ پورے چھ فٹ کا جوان ہو کر بھی، میرے ان کندھوں پہ سر رکھ کر جانے کتنی بار رویا تھا وہ۔" پتھر کی طرح ساکت اور گم صم بیٹھے دادا کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے ہوئے، ہادی نے اپنے ہاتھ ان کی گود میں جیسے چھپا لیے تھے۔

"اور جب بھی اس کے ابو کو ہوش آتا۔ ان کے ہونٹوں سے سب سے پہلا نام....." جھکے سر والے ہادی نے ایک لمحہ کو رک کر اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرا تھا۔

"وہ بس عالیان کا ہی نام لیتے تھے۔ کیا سارے باپ اپنے بچوں سے..... اپنے بیٹوں سے اتنا ہی پیار کرتے ہیں، دادا جی! بتائیں ناں، کیا میرے ابو بھی....." وہ ان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

کمی محبت کی ہو یا پھر رشتوں کی، کبھی نہ کبھی پوری ہو ہی جاتی ہے، جیسے مرنے والوں کا صبر کر ہی لیا جاتا ہے مگر زندوں کا رونا تو ساری زندگی ساتھ رہتا ہے۔ وہ جو ہوتے ہوئے بھی، اتنے دور ہوں کہ احساس بھی چھو نہ سکے۔ ان کی کمی کبھی بھی، کوئی بھی پوری نہیں کر سکتا۔ ہادی اور برہان کے ابو کی کمی بھی کچھ ایسی ہی تھی۔

ان کی امی کی اچانک موت سے دل برداشتہ ہو کر وہ یہ ملک چھوڑ کر ہی چلے گئے۔ اپنے بوڑھے والدین تو ایک طرف، انہیں دو برس کے برہان اور گیارہ دن کے ہادی کا بھی خیال نہیں آیا۔ سنگدلی کی انتہا تو یہ تھی کہ اس کے بعد پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی، نہ کوئی خط، نہ کبھی فون۔ گھر میں پڑی چند ایک پرانی تصویریں ہی تھیں، جن میں دکھائی دیتے چہرے کو وہ دونوں اپنے باپ کی حیثیت سے جانتے تھے۔

اور یہ ایسی کمی تھی جسے دادا دادی کی انمول محبتوں نے کہیں دور چھپا تو دیا تھا، ہاں پورا نہیں کر پائے تھے۔ برہان تو اپنے دل کا حال کسی کو بتانے والا کہاں تھا، البتہ ہادی کبھی کبھی دادا کی گود میں سر رکھ کر، بہت سے خاموش آنسو بہا لیا کرتا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ وہ دونوں بوڑھے تو ہر رات یونہی بسر کرتے جا رہے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ لو، سویٹر کا نمونہ، دے دینا بھابھی کو، بیگم دادا کہہ رہی تھیں باقی نمونے ذرا اندر رکھے ہیں، جب پیٹی کھولی تو نکال دیں گی۔" مائرہ کے ہاتھ میں شاپر تھما کر وہ پلٹ رہا تھا۔

"بیگم دادا..... یہ کیا نام ہوا بھئی۔" مائرہ نے اس کی سنجیدہ شکل کو غور سے دیکھا تھا۔ "میں نے کچھ پوچھا ہے ہادی۔" خلاف معمول، اسے خاموش پا کر اس نے

اپنا سوال دہرا لیا تھا۔

"بیگم دادا، یعنی میرے دادا کی بیگم۔" وہ جیسے چڑ کر بولا تھا۔

"اوہ! یعنی تمہاری پیاری دادی اماں جی، اب سمجھی۔" اس کی جیسے کوئی بڑی مشکل آسان ہوئی تھی۔

"اچھا تم بیٹھو ذرا میں راجا کو بھجواتی ہوں۔"

"مائرہ، پلیز آج رہنے دو۔ میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے، میں اسے ٹھیک سے پڑھا نہیں سکوں گا۔" وہ جان بوجھ کر نظریں جھکائے ہوئے تھا کہ کہیں مائرہ اس کی روئی روئی آنکھیں نہ دیکھ لے۔

☼ ☼ ☼

"یہ لیں دادا! آئس کریم اور عیش کریں اپنے پیارے سے ہادی کے سر پر۔" اس نے آئس کریم ان کے ہاتھ میں تھمائی تھی۔

"لا بھئی جواناں! یہ بڑا نیک کام کیا تو نے۔" پھر سے پہلے جیسے بے فکرے سے ہادی کو دیکھ کر انہیں بہت سی ٹھنڈک اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"اتنے غور سے کیا دیکھ رہے ہیں؟" اپنی آئس کریم کا ریپر اتار کر اس نے بڑی شان سے عین کمرے کے بیچ میں پھینک دیا تھا۔ "کہیں نظر نہ لگا دیجیے گا۔"

"سوچ رہا ہوں، کیا فائدہ تیرے اتنے حسین چہرے کا۔ چلو چھوڑو پرے۔ تم دونوں بھائیوں نے کون سا میری بات مان لینی ہے۔" دادا جی نے جان بوجھ کر ادھوری بات کر کے اس کے تجسس کو ابھارا تھا۔

"برہان بھائی کو تو رہنے ہی دیں، میں ہوں ناں آپ کی ہر بات آنکھ بند کر کے مان جانے والا۔ آپ مجھے بتائیں، کیا بات ہے۔" اس نے بھی جیسے ضد ہی شروع کر دی تھی۔

"گل تو وہی پرانی ہے یار! تم لوگ پتا نہیں کیسی نسل ہو۔ عشق عاشقی والا کوئی چکر ہی نہیں۔ فٹے منہ ایسی جوانی کا، جو کبھی کسی نے ریشمی رومال پہ تیرا نام کڑھائی کر کے تجھے تحفہ نہ دیا۔" دادا جی کو اس وقت یہ

تک یاد نہیں رہا تھا کہ ان کے ہاتھوں میں پکڑی آئس کریم پگھل رہی ہے۔

ہادی تو ان کے یہ "روشن خیال فرمودات" بہت بار سن کر بے حد تنگ آیا ہوا تھا۔ سو چپ چاپ اپنی آئس کریم کھانے میں مصروف رہا۔

"تجھے پتا ہی نہیں جھلے! میں نے تیرے لیے کتنے اونچے اونچے خواب دیکھے تھے۔" انہوں نے ہادی کے اشارے پر بھی اپنی آئس کریم پر دھیان دیے بغیر ٹھنڈی سی آہ بھری تھی۔

"اچھا جی! ذرا میں بھی تو سنوں آپ کے خواب، میرے نام۔" کچن سے خالی پلیٹ اور چمچ لا کر اس نے، ان کی آئس کریم اس میں ڈال دی تھی، جسے دادا جی نے بچوں کی طرح خوشی سے تھام لیا تھا۔

"میرا بڑا ہی دل کرتا تھا کہ جب تو کالج میں داخل ہو ناں تو پھر پورے کالج کی لڑکیاں بس تیرے ہی پیچھے ہوں۔ جدھر سے بھی گزرے، لوگ کہیں وہ جا رہا ہے، ابراہیم صاحب کا حسین و جمیل پوتا۔" دادا تو شاید آئس کریم کے "نشے" میں بہہ نکلے تھے "مگر تو نے سواہ اڑا دی میرے ارمانوں کی مزے سے، صرف لڑکوں کے کالج میں داخل ہو کر۔" انہوں نے منہ بنایا تھا۔

"اور پھر کریلے پہ نیم تو نے یوں چڑھایا کہ ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ اتنی اوکھی، اتنی لمبی پڑھائی، دفع دور، منہ کالا، نیلے پیر ایسی پڑھائیوں کے۔" سڑپ سڑپ کر کے انہوں نے، بری طرح پگھل چکی آئس کریم کا سوٹا لگایا تھا۔

انہوں نے کن اکھیوں سے ہادی کی بیزار ہوتی شکل دیکھی تھی۔

"نہیں نہیں آپ رکیے مت، میں بڑے غور سے ہمہ تن گوش ہوں۔" اس کا لہجہ واقعی نیم کریلے جیسا تھا۔

دادا جی برا مان کر خاموش ہو گئے تھے۔

"ویسے آپ یہ عشق محبت کی باتیں، برہان بھائی سے کیوں نہیں کرتے۔" چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد ہی ہادی سے رہا نہیں گیا تھا۔

"برہان کو کیا پتا ان باتوں کا۔ وہ بندہ تھوڑی ہے' کوئی مشین ہے۔۔۔ مشین۔" دادا ساری ناراضگی بھلا چکے تھے۔

"اوئے برہان جو ہے ناں اپنا' یہ پیار محبت اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔ وہ نہیں کر سکتا۔ اس کا عشق کرنا تو ایسا ہے جیسے۔۔۔ جیسے اپنے وہ بابر اعوان اور رانا ثناء اللہ کی صلح ہو جائے۔" ہادی کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی۔ "یا پھر پتا ہے' برہان کو عشق ہونا ایسے ہی ہے' جیسے مینڈکی کو زکام ہو گیا ہو۔" وہ دونوں ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنسے تھے۔

"ویسے آپس کی بات ہے دادا جی! اب آپ سمجھ لیں کہ مینڈکی کو زکام ہو گیا۔" ہادی نے ان کے پاس جھک کر سرگوشی کی تھی اور پھر ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں انہیں برہان سے سنی ساری باتیں من و عن بتا ڈالی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ارے میں کہتی ہوں' تم لوگوں کو جرأت بھی کیسے ہوئی' اتنی فضول بات مجھ سے کرنے کی۔ توبہ استغفار وہ مس چلبلی اور ہمارے گھر کی بہو' میرے برہان کی بیوی' ہرگز نہیں' ناممکن' ایسا تو سوچنا بھی گناہ ہے۔" دادی کی گرج چمک جاری تھی اور وہ تینوں' مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھے تھے۔

اگلے ہی دن' جب وہ سب بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ دادا جی نے' بہت سنبھل کر ان سے' بہت خوش گوار لہجے میں بات کی تھی مگر وہ تو سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ چکی تھیں۔

"سب پتا ہے مجھے' یہ فضول خیال تمہارے ہی دماغ میں آیا ہو گا۔" انہوں نے ہادی کو گھورا تھا۔

"اللہ کی قسم دادو! میرے تو فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے۔" وہ ہمیشہ ہی ان کے غصے سے خائف رہتا تھا۔

دادی جان کا رخ ابھی دادا جان کی طرف ہوا بھی نہیں تھا کہ برہان اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے پاس آ گیا تھا۔

"اتنا زیادہ غصہ کرنا آپ کی صحت کے لیے بالکل بھی ٹھیک نہیں ہے دادی جان! آپ پلیز بیٹھ جائیں اور سکون سے میری بات سنیں۔" وہ اونچا لمبا جوان انہیں کسی بچے کی طرح دونوں کندھوں سے تھامے' بہت نرمی سے کہہ رہا تھا۔ "لیکن سب سے پہلے آپ کو ایک گلاس ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں۔" وہ ایک ہی قدم میں کچن سے باہر بھی آ گیا تھا۔

"آپ کو ڈاکٹر صوفیہ سے نہیں بلکہ مس چلبلی سے نفرت ہے اور آپ کے پاس ایسا کرنے کی ڈھیروں وجوہات ہوں گی لیکن میرے پاس ان سے محبت کرنے کی صرف ایک وجہ ہے' میرا یہ دھڑکتا ہوا دل' جو ہمیشہ انہیں میرے ساتھ دیکھنا چاہتا ہے۔ آپ میری ماں سے کہیں زیادہ محترم ہیں میرے لیے اور عزیز تر بھی۔ سو میں آپ کے ساتھ کسی بحث و لڑائی کا تصور تک نہیں کر سکتا ہوں۔ میں تو بس دونوں ہاتھ جوڑ کر' گھٹنوں کے بل آپ کے سامنے جھک کر' صرف یہ درخواست کر سکتا ہوں کہ' پلیز دادی جی' آپ صرف ایک بار ڈاکٹر صوفیہ سے مل لیں۔ اس کے بعد جو آپ کی مرضی ہو گی' میں وہی کروں گا۔"

چھوٹے سے قد کی' اس بوڑھی عورت کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا' وہ چھ فٹ کا جوان' کتنی عقیدت سے ان سے سوال کر رہا تھا۔ دادی نے آگے بڑھ کر اس کے دونوں بندھے اور جڑے ہوئے ہاتھ کھولے' انہیں چوما' اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے لگایا اور پھر۔۔۔ اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوہپ ہپ ہرے۔ ہپ ہپ ہرے۔" پاس ہی کھڑے ہادی نے زوردار نعرہ لگا کر' دادا کو جپھی ڈالی تھی اور برہان نے دادی کو بازوؤں میں اٹھا کر پورے کمرے کا چکر لگایا تھا۔

☼ ☼ ☼

دادا باہر صحن میں' پیڑھے پہ چڑھے بیٹھے تھے۔ ہاتھوں میں گول آئینہ تھامے' وہ اپنے سر کا عمیق

مطالعہ کرنے میں مگن تھے' جب کہ ان کے عین پیچھے چینی کا پیالہ اور برش تھامے ہادی کھڑا تھا۔ پورے گھر میں' کوفتہ' چائنیز رائس اور لوکی کے حلوے کی خوشبو کا بسیرا تھا۔ دادا نے ایک لمبی سی سانس لی تھی۔

"میں کہتا ہوں ہادی! تیری دادی پکی بہشتن ہے۔ پوری کی پوری جنتی۔ زبان کی چاہے بری ہے' مگر دل تو نرا سونا ہے سونا۔ واہ جی واہ کیا کھانے بنائے ہیں ہونے والی بہو کے لیے مزا آ گیا۔"

"خبردار جو تم نے اس فتنی' مس چلبلی کو' میری بہو کہا تو۔" حلوہ بھونتے بھونتے دادی کفگیر ہاتھ میں لہراتی ہوئی' کچن کی باہر کھلنے والی کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی تھیں۔

"تم برا نہ مانو' میں تو ہادی کے سامنے تمہارے ہاتھ کے بنے مزیدار کھانوں کی تعریف کر رہا تھا۔ ہے ناں ہادی!" وہ شاید واقعی ان کے ہاتھ میں پکڑے کفگیر سے ڈر گئے تھے۔

"ہاں جانتی ہوں میں تمہاری تعریفیں' اور یہ سارے کھانے' میرے برہان کی پسند کے ہیں۔ خاص فرمائش کر کے گیا تھا آج وہ۔ اس لیے بنائے ہیں۔ تم لوگ اپنے فضول اندازے لگانا بند کرو۔ یہ مس چلبلی کے لیے ہرگز نہیں ہیں۔"

"ہاں ہاں دیکھا ناں تمہارے دل کا چور خود ہی بول پڑا۔ ہم نے تو ابھی بہو کا نام بھی نہیں لیا تھا' تم نے خود ہی لیا ہے۔" دادا جی نے اپنے طور پر انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔

"ناں' تم جو یہ صبح سے اپنا منہ سر کالا کرنے میں لگے ہوئے ہو۔ یہ سب بھلا کس خوشی میں ہو رہا ہے؟" دادی نے کچن سے باہر آ کر ان کے خضاب والے پیالے کو نشانہ بنایا تھا۔ ہادی نے اپنے ہاتھ میں پکڑا وہ پیالہ فوراً" ہی نیچے زمین پہ رکھ دیا تھا۔

"تو پھر کیا ہوا جو میں نے اپنے بالوں کو رنگ لیا تو۔" دادا جی نے آئینہ' اپنی ہی گود میں پٹخ ڈالا تھا۔

"بال؟ یہ جو تمہارے سر پہ ہلکی سی جھالر بچی باقی رہ گئی ہے۔ اسے بال نہ کہا کرو۔" وہ بھی انہیں تپانے لگیں۔

"اور اپنے بال دیکھے ہیں تم نے' میرے سر پر اگر چار بال ہیں تو' تم کون سا شیمپو کے اشتہار میں آتی ہو' شادی سے لے کر آج تک وہی چوہیا کی دم جیسے بال ہیں تمہارے۔" دادا جی انہیں اتنا کھرا جواب کم ہی دیتے تھے اور ان دونوں کی نوک جھونک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہادی اندر کچن میں مزے سے تین کوفتے پار بھی کر چکا تھا۔ "سی۔۔۔ اف اللہ" اس نے ندیدوں کی طرح دونوں انگلیاں حلوے والی پلیٹ میں ڈالی تھیں اور حلوہ چونکہ ابھی تک بہت گرم تھا سو وہ اپنے ہاتھ جلا بیٹھا تھا' مگر دادی کے ڈر سے اس نے اپنی چیخ فوراً" ہی روکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم سچ بتاؤ مجھے' ٹی وی پر تم خود ہی آتی ہو یا تمہاری سب سے بڑی بہن۔" اسے آئے ہوئے آدھا گھنٹہ ہو چکا تھا اور دادو کوئی پانچویں بار یہ سوال کر رہی تھیں۔

"آپ یقین کر لیں بی بی جان! کہ میں ہی ہوں' ڈاکٹر صوفیہ' جو کوکنگ شو کو ہوسٹ کرتی ہے۔" وہ برہان سے بھی زیادہ نرم لہجے میں بولی تھی تو سب کو ہی بے حد اچھا لگا تھا۔

ہلکے فیروزی کاٹن کے شلوار قمیص پر سفید کڑھائی تھی اور سفید' بہت اجلا بڑا سا دوپٹا اس نے خوب پھیلا کر کندھوں پہ ڈال رکھا تھا۔ کندھوں تک ہی آتے ہوئے بال جنہیں ہیئر بینڈ ڈال کر' ڈھیلی سی پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ بائیں ہاتھ میں' فیروزی اور سفید چوڑیوں کا سیٹ تھا۔ کانوں میں بس سادہ سی گول چھوٹی چھوٹی سونے کی بالیاں' پتلی سی ناک کے نچلے کونے میں ایک چھوٹا سا نگ تھا یعنی وہ لونگ پہنتی ہے۔

دادی کو یک گونہ سکون ہوا۔

گہری' سیاہ آنکھیں' اس کی گندمی سی رنگت پہ یوں

چ رہی تھیں جیسے وہ سونے کی بنی ہو۔ مجموعی طور پر اس کی ساری شخصیت بے حد نرم، بہت معصوم اور بہت ہی خوب صورت تھی۔ ہادی اور دادا تو ایک طرف، دادی کی نظروں میں بھی بار بار اس سے متاثر ہو جانے کی جھلک نظر آتی تھی، جسے وہ چھپانے کی پوری کوشش کر رہی تھیں۔

"اگر تم ڈاکٹر ہو بی بی تو پھر اپنا کوئی کلینک کھولو۔ مریض دیکھو، اس چھیدے نائی کے ساتھ کہاں پھنس گئی ہو جا کر۔" دادی نے چھوٹا سا دھماکہ تو کر ہی دیا تھا۔

"چھید انائی؟ یہ کون ہے؟"

اس لمحے سکون سے کولڈ ڈرنک کا سپ لیتے ہادی کو بڑے زور کا اچھو لگا تھا۔ اگر اسے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ وہ یوں بے دھڑک صوفیہ کے سامنے یہ بات کہہ دیں گی تو وہ اس وقت دادی کو بولنے سے روکنے کے لیے خود ہی بولنا شروع کر دیتا۔ مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

دادا، برہان اور ڈاکٹر صوفیہ کی سوالیہ نگاہیں بیک وقت اس کی بے وقت "کھانسی" کی طرف اٹھی تھیں جبکہ دادی اس بچے کی طرح معصومیت سے ایک طرف بیٹھی تھیں، جس نے ہاتھ مار کر چاولوں کا تھال، ریت کی ڈھیری پہ گرا دیا ہو۔

"وہ اصل میں ہماری دادی کو...... وہ...... وہ جو آپ کے شیف ہیں ناں، شیف سرفراز...... انہیں دادی ...... بہت پیار سے چھید انائی کہتی ہیں۔" رک رک کر آخر اس نے وضاحتی بیان دے دیا تھا۔

"ہاں ہاں...... بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے ہادی۔" دادا جی نے اس کی بروقت ذہانت کو سراہا تھا۔

"وہ ٹھیک کہہ رہا ہے یا کر رہا ہے۔" ڈاکٹر صوفیہ کا اگلا سوال اور بھی پیچیدہ تھا۔

"اچھا چلیں کوئی بات نہیں، ویسے میں جا کر، سر سے کہوں گی ضرور کہ ایک بہت ہی کیوٹ سی بی بی جان نے آپ کا اتنا ہی پیارا سا نام رکھا ہے۔ چھید انائی سو کیوٹ۔" اس نے بڑے مزے سے خود ہی یہ نام

دہرایا تھا اور پھر ایک مترنم سی ہنسی کا مدھم سا فوارہ اس کے ہونٹوں سے نکل کر پورے کمرے میں پھیل گیا۔

"واؤ، زبردست آپ کی ہنسی کتنی خوب صورت ہے ڈاکٹر صوفیہ۔" ہادی کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"تھینک یو۔" وہ کہنا نہیں بھولی اور نہ ہی مسکرانا۔

دادی کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ہادی کو دو ہتھڑ لگا دیں۔ "یہ مخول بازی بند کرو اور میرے سوال کا جواب دو لڑکی تم سیدھی طرح سے۔" وہ کڑے تیوروں سے اس سے مخاطب تھیں۔

"دراصل میں وہ والی ڈاکٹر نہیں ہوں بی بی جان، وہ ہسپتال والی۔" وہ بڑی متانت سے ان سے مخاطب تھی۔ "میں پیشے کے اعتبار سے Nutritionist ہوں۔ ماہر غذائیات۔"

"یہ کیا بلا ہوتی ہے لڑکی۔" دادی کا لہجہ کچھ اور بھی اکھڑا سا تھا۔

"میں لوگوں کو یہ بتاتی ہوں کہ جو چیز بھی وہ کھا رہے ہیں، اس میں کتنی غذائیت موجود ہے۔" وہ اور بھی نرمی سے انہیں بتانے لگی تھی۔

"ارے بی بی! ہم نے تو آج تک یہی سنا تھا کہ کھانے میں ذائقہ ہوتا ہے، برکت ہوتی ہے، میں کہتی ہوں یہ موئی غذائیت کیا چیز ہے اب۔" دادی نے اس کی بات پوری سنے بغیر ہی کاٹ دی تھی۔

"آپ بالکل ٹھیک کہتی ہیں۔ ذائقہ اور برکت تو کھانے میں ہمیشہ ہوتی ہے۔ غذائیت بھی ایسی ہی کوئی چیز ہے۔ آپ نے بتایا ناں آپ ہمارا کوکنگ شو بہت شوق سے دیکھتی ہیں تو اس میں آپ نے میرا کام بھی دیکھا ہو گا۔ سر جو کچھ بھی پکاتے ہیں، میں اپنے ناظرین کو اس کھانے کے تمام تر فائدے اور نقصان بھی بتاتی ہوں۔" اپنے طور پر وہ بہت ہی سادہ طریقے سے وضاحت کر رہی تھی۔

"بیگم دادا یہ لوگوں کو بتاتی ہیں کہ کون سی چیز انہیں

کھانا چاہیے اور کون سی نہیں۔ کس عمر کے لوگوں کو کون سی چیزیں کھانا ہے اور کون سی نہیں۔ ہے ناں ڈاکٹر صوفیہ۔" ہادی نے پھر ایک بار اس کی مدد کی تھی۔

"اچھا بیگم، اب باتیں ہی کرتی رہو گی یا پھر کھانے کا موقع بھی دو گی ہمیں۔" دادا نے ماحول کا رخ بدلنا چاہا تھا۔

"کھا لیں گے، جلدی کس بات کی ہے۔" دادی نے بے نیازی دکھائی تھی۔

"اچھا بی بی جان، دادا جان، آپ سب کا بے حد شکریہ۔ اب مجھے اجازت دیں۔" وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"ارے نہیں بیٹا اب کھانا کھا کر ہی جانا، پہلی بار تو ہمارے گھر آئی ہو تم۔" دادا نے اسے روکا تھا۔

"تھینک یو دادا جی، لیکن میرے انکل انتظار کر رہے ہوں گے۔ ہم دونوں کھانا اکٹھے ہی کھاتے ہیں۔" اس نے خوش دلی سے منع کیا تھا۔

"جانے دیں ناں۔ ویسے بھی لڑکیوں کو زیادہ دیر گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔" دادی نے وہیں بیٹھے بیٹھے دادا اور ہادی کی گھوری نظر انداز کر کے کہہ دیا تھا۔

"جی ہاں آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے دادی جان۔ اچھا جی، سب کو خدا حافظ۔" وہ باقاعدہ ہاتھ ہلاتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔

"بندے کو اتنا سنگ دل اور بے مروت بھی نہیں ہونا چاہیے شادو بی۔ گھر آئے مہمان کے ساتھ اتنا برا سلوک...... کیا تھا جو تم اسے خود کھانے کے لیے روک لیتیں۔" دادا جی اس کے جاتے ہی، دادو پہ برس پڑے تھے۔

"ہادی تم میرے ساتھ کچن میں چلو ذرا، کھانا میز پر لگانے میں میری مدد کرو۔" دادا جی کی بات کو مکمل طور نظر انداز کرتے ہوئے وہ اٹھ کر ہادی سے مخاطب ہوئی تھیں۔ دادا جی بس ہونہہ کر کے ہی رہ گئے تھے اور ہادی تیزی سے دادی کے پیچھے بھاگا تھا۔

رات گئے جب دادا کمرے میں آئے تو دادی نماز پڑھ کر جائے نماز سمیٹ رہی تھیں۔ طویل دعا کے بعد انہیں حسب معمول نیند ہو چکی تھیں، دادا جی نے جیسے ایک لمحے کو رک کر سوچا تھا۔

"پھر تم نے کیا سوچا، کیا فیصلہ کیا۔ بچے انتظار میں ہیں۔" وہ ان کے پاس ہی صوفے پہ بیٹھ گئے۔

"کر لوں گی فیصلہ۔ تمہیں جلدی کس بات کی ہے، ابھی ایک بار ہی تو دیکھا ہے لڑکی کو، دو چار ملاقاتیں اور ہوں گی تو ہی جان سکوں گی ناں۔" نماز کے لیے لپیٹی گئی چادر کو وہ اپنے سر سے اتار رہی تھیں۔

"کیا جان سکو گی بھلا؟" دادا جی کو کچھ شک سا ہوا۔

"یہی کہ وہ میرے برہان کی بیوی بن سکتی ہے یا پھر نہیں۔" ان کی گیلی آنکھوں کے کناروں میں کہیں کہیں، مسکراہٹ کے جگنو چمکے تھے۔ اب دادا جی کو ان سے کچھ اور پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اچھا یہ بتاؤ کوئی کام وام بھی کر لیتی ہو یا بس ویلی ہی رہتی ہو سارا دن۔" دادی کے تیور آج بھی کڑے تھے۔

"جی بس، تھوڑا بہت۔" ڈاکٹر صوفیہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی تھی۔

"ہاں بالکل انڈا ابال لیا، چائے بنا لی اور روٹی کے نام پر یہ موٹی ڈبل روٹی لا کر سامنے رکھ دی۔ بس اتنا ہی کام کر سکتی ہیں آج کل کی لڑکیاں۔" دادی ابھی کچھ اور بھی کہنے کو تھیں کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور انہیں جانا پڑا۔ پورے دس منٹ بعد وہ لوٹیں تو صوفیہ آٹا گوندھ کر سبزی بنانے میں لگی تھی۔

"ارے واہ تم نے تو بہت اچھی طرح آٹا گوندھا ہے، کہاں سے سیکھا۔"

"جی وہ اپنے انکل سے۔" انہیں دیکھتے ہوئے وہ فوراً اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی تھی۔

"ہیں ہیں انکل سے؟" دادی کو حیرت اور غصہ ایک ساتھ ہی آ گیا۔

"جی جی، وہ اصل میں ان کی لکھائی بہت زیادہ اچھی ہے۔ انہوں نے ہی مجھے کہا تھا کہ جو لڑکیاں اپنے ہاتھ

سے بہت اچھی طرح آٹے کو گوندھیں تو پھر ان کی لکھائی بھی بہت اچھی ہو جاتی ہے۔ تو اس طرح مجھے آٹا گوندھنا بھی آگیا اور لکھائی بھی۔"

"ویسے یہ انکل تمہارا لگتا کیا ہے۔" دوسری چھری لے کر وہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئیں۔ "میرا مطلب ہے اس کا رشتہ کیا ہے تم سے' چاچا' ماما' تایا' پھوپھا' ماشر.... ؟ کیا ہے وہ تمہارا۔"

"جی وہ میرے ماموں جی ہیں۔" اب وہ ان کا سوال سمجھ گئی تھی۔

"اور باقی تمہارا نانا کا دادا کا' میرا مطلب ہے وہ ددھیال اور ننھیال کہاں ہے سارا۔" دادی اپنے ہاتھ میں پکڑے آلو کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صوفیہ کا شجرہ نسب بھی چھیل رہی تھیں۔

"ان کے بارے میں تو کچھ نہیں پتا' کبھی دیکھا نہیں کسی کو گھر آتے جاتے' شاید کہیں دور رہتے ہوں گے۔"

اس کے بے نیاز انداز پر دادی نے بہت غور سے اسے دیکھتے ہوئے ایک لمبا سا ہنکارہ بھرا تھا۔

"ویسے دیکھنے میں تو تم کافی معقول نظر آتی ہو' پھر ٹی وی پر یوں.... یوں عجیب و غریب حرکتیں کیوں کرتی ہو۔"

"چھوڑیں دادی وہ سب تو بس ہماری کوشش ہوتی ہے۔ چینل کی Viewer ship بڑھانے کے لیے اپنے پروگرام کو پروموٹ کرنے کے لیے' ٹی وی کیمرہ کا میک اپ بھی کافی زیادہ گہرا ہوتا ہے عام میک اپ سے۔ پھر باقاعدہ اسکرپٹ تک لکھا جاتا ہے' جس کے مطابق ہمیں بولنا ہوتا ہے۔"

وہ سلیب پر سے فالتو برتن اٹھاتے ہوئے انہیں بتا رہی تھی اور دادو واقعی حیران ہوتی جا رہی تھیں "یعنی چھید اناڑی جو کچھ بھی کہتا ہے' وہ اسے لکھا ہوا ملتا ہے' خود سے وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چھری وہیں ٹوکری میں ڈال دی تھی۔

"جی بی بی جان! ایسا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب مسالے ہی تو پروگرام کو چار چاند لگاتے ہیں' ورنہ کھانا پکانا تو بس بورنگ کام ہی لگے گا سب کو' جب تک اس میں ہم دونوں کی ہلکی پھلکی سی کھٹ پٹ دکھائی نہ دے۔ یہ سب پروفیشنل اسکلز ہیں۔ انہیں تو اختیار کرنا ہی پڑتا ہے' مجبوری ہے۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ ذرا بالوں کا حشر' کبھی تو بھولے سے تیل بھی لگایا کر۔" برہان کے سر پہ تیل کی مالش کرتے ہوئے وہ اسے ڈانٹ بھی رہی تھیں۔

"بس کریں دادو مجھے تو نیند آ رہی ہے۔" وہ لاڈ سے ان کی گود میں سر رکھ کے بولا۔

"لو دیکھو! ہے کوئی حال' پچھلے تین گھنٹے سے پنکھا تمہیں میں جھل رہا ہوں اور نیند تمہیں آ رہی ہے۔" دادو کی مالش کی وجہ سے ہادی نے ہاتھ میں پکڑے پنکھے کی ڈنڈی سے اس کے کندھے کو نشانہ بنایا تھا۔

پچھلے تین چار گھنٹوں سے بجلی بند تھی اور وہ سب گھر کے پچھلے حصے میں چھٹی کا دن ذرا بہتر انداز میں گزارنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اچھا یار میں تو چلا نہانے۔" دادا جی نے اٹھتے اٹھتے ہادی کا کندھا دبایا تھا جو اصل میں ایک خفیہ اشارہ تھا۔

"دادی جان وہ پھر آپ نے کیا سوچا' ڈاکٹر صوفیہ چلبلی کے بارے میں۔" ہادی نے کھنکارتے ہوئے بات شروع کی تھی۔

"میں نہیں.... وہ تو بھائی نے خود کہا تھا کہ میں آپ سے پوچھوں۔" ہادی نے جھٹ سے کہہ ڈالا تھا۔

"ہادی! پلیز میرا نام لے کر اتنا بڑا جھوٹ مت بولو۔ مجھے جو بھی پوچھنا ہو گا ناں' دادو سے خود پوچھ لوں گا ڈائریکٹ۔" برہان نے فوراً" انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تھی۔

"چلیں جی! آپ کی مرضی' ہمیں کیا' ہم نے تو آپ کا بھلا ہی سوچا تھا۔" ہادی خفگی سے بولا تھا' برہان وہیں دادی کے پاس ہی ٹاہلی کے پیڑ کے نیچے رکھے تخت پہ دراز ہو گیا تھا۔

"چلو آؤ ہادی اب تمہاری باری ہے۔" دادی جو ابھی تک بس خاموش بیٹھی تھیں' اسے خفا خفا سا دیکھ کر اپنے پاس بلانے لگیں۔

"لڑکی تو ٹھیک ہے ہادی' مگر.... اب تم خود ہی سوچو ناں ذرا' ماں باپ مر گئے ہیں اور کوئی خاص رشتہ' آگے نہ پیچھے۔ ایسی بچپن سے تنہا رہنے والی لڑکی بھلا خاک سمجھے گی رشتوں ناتوں کی اہمیت' بس اسی بات سے ڈرتی ہوں' کہیں وہ ہمارے برہان کو لے کر ہم سے دور نہ چلی جائے۔" دھیرے دھیرے اس کے سر میں مساج کرتے ہوئے وہ اپنے دل کا حال بتانے لگی تھیں۔

پاس ہی لیٹا ہوا برہان بظاہر تو آنکھیں بند کیے سو ہی رہا تھا' مگر لفظ بہ لفظ ان کی باتیں سن بھی رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں دادو کی سمجھ کا اعتراف بھی کر رہا تھا۔

"میری اچھی سی بیگم دادا' اسی بات کو دوبارہ سے دیکھیں ناں۔ اس نے یہ سب رشتے ناتے کبھی نہیں دیکھے کیونکہ وہ بچپن ہی سے تنہا رہی ہے.... تو پھر وہ ان سب کو ترستی بھی ہو گی ناں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ہو سکتا ہے وہ عام لڑکیوں کی نسبت زیادہ کوشش کرے۔ ہم سب کے لیے زیادہ حساس ہو اور ہمیشہ برہان بھائی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی اپنے پاس رکھنا چاہے۔"

ہادی کی بات اتنی زبردست تھی کہ اگر برہان سونے کا ڈرامہ نہ کر رہا ہوتا تو اٹھ کر اسے گلے سے ضرور لگا لیتا۔

"تیرے دادا صحیح کہتے ہیں ہادی! تو سچ میں بڑا سیانا ہو گیا ہے۔" دادی نے تیل لگے ہاتھوں سے ہی اس کا دایاں کان مروڑا تھا' تب ہی کسی نے گیٹ پر بڑے زور کی دستک دی تھی۔

"بیٹا میں جاوید ہوں' ابراہیم صاحب کا بیٹا' کینیڈا سے آیا ہوں۔"

ہادی کے "کون ہے" کے جواب میں' آنے والے نے اپنا تفصیلی تعارف کروا دیا تھا۔

"جاوید ابراہیم' میرے ابو جی۔" ہادی نے زیر لب یہ نام دہرایا تھا اور پھر مارے خوشی کے اس کے کانپتے لرزتے ہاتھوں سے گیٹ تک کھولنا مشکل ہو گیا تھا۔

اتنی بڑی خوشی' یوں چپکے سے اس حبس زدہ دوپہر میں اس کے دروازے کے باہر آ کھڑی ہوئی تھی کہ ہادی کو اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

"دادی' دادا جلدی آئیں' دیکھیں وہ آ گئے' وہ آ گئے۔ میرے ابو جی آ گئے۔" ہادی نے گیٹ کھولنے اور گھر والوں کو آوازیں دینے کا کام ایک ساتھ ہی کیا تھا۔

"ابو جی میں ہادی.... ہادی آپ کا بیٹا ابو جی.... آپ کا بیٹا۔" وہ دروازہ کھولتے ہی اندر آنے والے شخص سے کسی چھوٹے بچے کی طرح لپٹ گیا تھا۔ بالکل ان جانے نقوش اور اجنبی لمس والے اس شخص نے بہت نرمی سے اسے خود سے الگ کیا تھا۔

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے لڑکے' میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔" اس کا لہجہ سپاٹ اور لفظ نوکیلے تھے۔

"پلیز ابو جی ایسے تو نہ کہیں۔ بیس اکیس سال کی دوری بھی آپ کے دل کو....."

"پرے ہو لڑکے! میں نے کہا ناں' میرا کوئی بیٹا نہیں۔ ویسے بھی آج سے بیس برس پہلے جب میں نے ملک چھوڑا تھا تو میری شادی تک نہیں ہوئی تھی۔ تو پھر میرا بیٹا کہاں سے آ گیا۔ آپ لوگ کچھ بولتے کیوں نہیں' یہ کیا فضولیات ہے۔" اس نے اور بھی درشت لہجے میں ہادی کے پیچھے کھڑے کسی شخص سے کہا تھا۔

حیرت کے پہاڑ نے ہادی کی آنکھوں کے آنسو تک خشک کر دیے تھے۔ اس نے اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا۔

دادا اور دادی دونوں ہی کھڑے تھے ہادی کی ان کی طرف اٹھی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں' ان دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے' شاید سچ کے بوجھ سے۔

☼ ☼ ☼

جاوید ابراہیم' اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہی نہیں' ان کے جینے کا سہارا بھی تھا۔ بہت زیادہ لاڈ پیار سے بگڑا ہوا ایک نوجوان' جسے صرف اور صرف اپنی ذات اور اپنی خواہش سے غرض تھی۔ اسی کی ضد اور خواہش کے لیے ابراہیم صاحب نے گاؤں میں اپنا مکان اور

آبائی زمین فروخت کردی تاکہ وہ اپنے بیٹے کی پسند کا مکان شہر میں خرید سکیں۔

کسی نہ کسی طرح ایف اے پاس کرکے وہ ایک معمولی سی ملازمت پہ لگ چکا تھا جب اس کی ماں نے اس کے لیے ایک چاند سی لڑکی کی تلاش شروع کی۔ مگر انھی دنوں جاوید پر بیرون ملک جانے کا جنون سوار ہوا۔

مگر اس بار بوڑھے والدین کے پاس اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے پیسے تھے اور نہ ہی حوصلہ۔ اس کے بار بار اصرار پر بھی جب بات نہیں بنی تو جاوید نے خاموشی سے اپنے مکان کا سودا کیا' پیسے اپنی جیب میں ڈالے اور ملک سے باہر چلا گیا۔

"میں نے تو مان لیا ہے کہ آج سے میرے ماں باپ میرے لیے مر گئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آپ دونوں بھی میرے لیے ایسا ہی سوچ لیں۔ کیونکہ اب میں کبھی بھی لوٹ کر نہیں آؤں گا۔" جانے سے پہلے اس نے اپنے والدین کے نام خط میں یہی لکھا تھا۔

دادا جی نے وہ پرانا سا خط نکال کر ہادی کے ہاتھ میں پکڑایا تھا۔

"مجھے آپ کی اس روتی بسورتی کہانی اور کاغذ کے اس ٹکڑے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ بس ایک سوال' میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ اگر ہم دونوں آپ کے بیٹے کی اولاد نہیں ہیں تو پھر ہم کون ہیں' کہاں سے آئے' ہمارے ماں باپ کون ہیں۔" سرخ آنکھیں' متوحش چہرہ' بکھرے' تیل سے چپڑے بال اور معمول سے کہیں اونچی آواز وہ برہان تو ہرگز نہیں تھا۔

"کیا ہو گیا ہے برہان تمہیں۔" دادا نے اسے ٹوکا تھا۔

"پاگل ہو گیا ہوں۔ ہاں میں پاگل ہوں۔ کس کی اولاد ہوں۔ کس کا خون ہوں' مجھے بتا دیں ورنہ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔" تیز تیز چلتی ہوئی بے ترتیب سانسیں' زندگی میں پہلی بار اس نے کمرے کا دروازہ پاؤں کی ٹھوکر سے کھولا تھا۔

بہت دیر سے خاموش بیٹھی دادی' اس کے باہر جاتے ہی' فرش پہ لڑھک گئی تھیں۔ دادا اور ہادی فوراً ہی ان کی طرف بھاگے تھے۔

✲ ✲ ✲

"یہ ناشتہ کر لیں آپ۔" ہادی نے لفظ ابو جی کو سسکی کی طرح روکا تھا۔ "دادی جان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ وہ ذرا دیر سے سو کر اٹھیں گی۔"

"ٹھیک ہے' رکھ دو۔" گویا اس پر احسان کیا گیا تھا۔

"اگر کسی اور چیز کی ضرورت ہو تو مجھے آواز دے دیں' میں ادھر کچن میں ہی ہوں۔" ہادی کے لہجے میں ان سے بات کرتے وقت ایک عجیب سی بے چارگی تھی۔

"کیا کہہ کر بلاؤں تمہیں۔" وہی غیریت بھرا لہجہ۔

"میرا نام ہادی ہے۔" وہ پلٹے بغیر بولا تھا۔

"ویسے تم کچن میں کیا کر رہے ہو؟" پتا نہیں سرسری سا یہ سوال ہادی کے دل میں پھر سے امید کا اک استعارہ کیوں بن گیا تھا۔

"وہ میں دادو کے لیے یخنی بنا رہا ہوں۔" اسے لگا وہ یہ سن کر خوش ہوں گے۔

"بہت لکی ہے بھئی میرا باپ' جسے تمہارے جیسا ایکٹو اور اسمارٹ نوکر مل گیا ہے۔" ہادی کی امید کی کونپل پہ جیسے آسمانی بجلی گری تھی۔ وہ چپ چاپ کچن کی طرف بڑھ گیا۔

"ہادی سے کیا کہا تم نے؟" اسی وقت دادا جی اندر داخل ہوئے تھے۔

"ذائقہ تو ہے' آپ کے نوکر کے ہاتھ میں۔" ان کے سوال کا جواب دیا گیا تھا۔

"خبردار جو اسے نوکر کہا تو۔" دادا جی کو غصہ آگیا تھا۔

"اچھا تو پھر کیا کہوں؟ آپ کا پوتا۔" اس کا قہقہہ کان پھاڑنے والا تھا۔

"میں پوچھتا ہوں' آخر تم یہاں آئے کیوں ہو؟" وہ بے بسی سے بولے تھے۔

"اکیس بائیس برس کے بعد لوٹا ہوں ابا جی! صرف اور صرف اپنے ماں باپ کے لیے۔ انہیں دیکھنے' ان سے ملنے اور ان کی خدمت کرنے کے لیے۔" وہ پھر سے ہنسا تھا۔

"مجھے آج بھی وہ رات نہیں بھولی جاوید جو ہم میاں بیوی نے کھلے آسمان کے نیچے اپنے بکھرے ہوئے' ٹوٹے پھوٹے سامان کے ساتھ گزاری تھی۔ صرف اور صرف تیری وجہ سے۔" ان کی آنکھوں میں گزرا ہوا وقت ریت بن کر چبھنے لگا۔

"جن لوگوں کو میں نے مکان بیچا تھا۔ انہیں بہت جلدی تھی خالی کروانے کی۔ ویسے بھی اس وقت جولائی اگست کا مہینہ تھا اور راتیں اتنی ٹھنڈی نہیں ہوتیں ان دنوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں اپنے پہلے سے بھی زیادہ سنگ دل ہو جانے کا ذکر کر رہا تھا۔ "اچھا مجھے کہیں جانا ہے' اپنے پوتا کم سرونٹ کو میری طرف سے تھینکس کہیے گا۔ بائے بائے ڈیڈی۔"

✲ ✲ ✲

برہان کا ردعمل اس قدر شدید ہوگا' کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ صبح جلدی دفتر کے لیے نکل جاتا اور رات گئے لوٹتا۔ گھر میں کچھ بھی کھانا پینا تو شاید اس نے خود پر حرام ہی کر لیا تھا اور گھر والوں سے بول چال نہ ہونے کے برابر۔ دادی' دادا تو یوں چپ تھے' جیسے وہ خود ہی مجرم ہوں۔ ایسے میں ایک ہادی ہی تو تھا جو بکھرا ہوا شیرازہ پھر سے سمیٹنے میں لگا ہوا تھا۔ آخر اس نے برہان ہی کو سمجھانے کا سوچا۔

"آپ تو بہت اچھے اور سمجھ دار انسان ہیں بھائی۔" رات گئے وہ لوٹا تو ہادی نے اسے جا لیا تھا۔

"ہونہہ' میں بھی آج تک خود کو ایسا ہی سمجھتا تھا...... تمہیں پتا ہے ہادی! آج میرے پیروں تلے زمین ہے اور نہ ہی سر پر آسمان' بے شناخت' بے نام ایک ایسا وجود' جس کی کوئی پہچان نہیں۔ تم سمجھ اور شعور کی بات کرتے ہو اور میں کہتا ہوں' میرا تو کوئی چہرہ ہی نہیں باقی بچا ہے۔ درد' تکلیف اور اذیت کی سولی پہ چڑھا ہوا ہوں۔ تمہیں نہیں پتا' میں کون ہوں' کہاں سے ہوں...... کیوں ہوں اور کیسے ہوں۔ یہ سوال نہیں زہریلے ناگ ہیں جو ہر لمحہ مجھے ڈستے ہیں۔"

ہادی نے زندگی میں پہلی بار اس مسکراتے چہرے والے ڈیسنٹ سے شخص کو زمین پہ بیٹھ کر دھاڑیں مار کر روتے دیکھا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر برہان کا سر اپنے بازوؤں میں لے لیا تھا۔

"آپ کو پتا ہے بھائی! جاوید ابراہیم کے آنے سے بھی بہت پہلے میں نے کسی چینل پہ ایک پروگرام دیکھا تھا' ایدھی سینٹر کے ان بچوں کے مسائل پر جو اٹھارہ سال کے ہو چکے ہیں اور ابھی تک شناختی کارڈ نہیں بنوا سکے۔ پتا ہے کیوں بھائی' کیونکہ ان کی اپنی کوئی شناخت جو نہیں ہے۔ اس لیے کیونکہ وہ...... وہ ایدھی سینٹر کی جھولا اسکیم کے تحت وہاں تک پہنچے۔ رات کے اندھیرے میں' منہ چھپائے' پتا نہیں کون انہیں اس جھولے میں پھینک کر' ساری زندگی بے شناخت رہنے کی سزا دے کر چلا گیا بھائی۔"

برہان نے کسی خدشے کے تحت اپنا سر اوپر اٹھایا اور ہادی کو خود سے الگ کیا تھا۔ "ہاں بھائی ہاں۔ ان بچوں میں اور ہم دونوں میں صرف ایک فرق ہے۔ اور وہ فرق ہے' دادا دادی کا وجود۔ یہ دونوں بوڑھے جنہوں نے ہم جیسوں کو اپنا نام دیا' شناخت دی اور معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کا حوصلہ بھی۔ تو کیا اب ہمیں کوئی حق ہے کہ اپنے محسنوں کو اتنی تکلیف دیں بھائی؟" برہان ابھی تک اس تکلیف دہ انکشاف پر ساکت تھا۔

"تو کیا تم بھی میرے سگے بھائی نہیں ہو؟ ہمارا خون کا کوئی رشتہ نہیں؟" برہان کے ہونٹوں سے بمشکل نکلا تھا۔

"خون کے رشتے یا خونی رشتے بھائی! جاوید ابراہیم کا دادا' دادی سے رویہ دیکھتا ہوں تو نفرت ہوتی ہے مجھے۔ اگر یہی ہوتا ہے سگا پن اور اپنائیت تو خدا ہمیں اس سے بچائے۔ سب سے بڑا رشتہ صرف انسانیت اور ہمدردی کا ہی ہوتا ہے بھائی! وہی رشتہ جس کی بنیاد پر ابراہیم صاحب ہمیں باری باری یہاں لائے۔ اتنی ساری نفرت کو ایک طرف رکھ کر لمحہ بھر کو سوچیں تو۔" برہان کے کندھے پہ ذرا سا دباؤ ڈال کر وہ کمرے سے باہر آگیا تھا۔

✵ ✵ ✵

”اتنے سالوں بعد بھی تیرے پاس اپنی ماں کے ساتھ بیٹھنے کا وقت نہیں ہوتا جاوید! دو تین دن بعد تھوڑی سی دیر کے لیے آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔“ آخر کار ماں نے شکوہ کر ہی ڈالا تھا۔ پاس ہی بیٹھے دادا جی نے بس ایک نظر ہی ان پہ ڈالی اور پھر سے اخبار میں کھو گئے۔

”شادی کب کی تو نے؟“ ماں نے روایتی سوال پوچھا تھا۔

”ارے اماں وہ تو میں نے تین تین بار کی تھی، کونسی والی کا بتاؤں۔“ وہ آنکھ دبا کر مسکرایا تھا۔

”اور بچے؟“ اماں کچھ اور بے تاب ہوئیں۔

”ہیں ناں‘ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ چھوٹی بیٹی تو کولمبیا یونیورسٹی میں کچھ پڑھتی ہے شاید اور بڑی لڑکی لڑکا جو کرتے ہیں‘ وہ مجھے نہیں پتا کیونکہ وہ دونوں ہی دو سال پہلے گھر چھوڑ کر چلے گئے۔“ اتنی بڑی بات وہ کتنے آرام سے کہہ گیا تھا۔

”ہائے ربا۔ وہ تیرے بچے ہیں جاوید! تیرا خون۔ انہیں ایسے تو نہ رول۔“ دادی کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

”وہاں کوئی نہیں رُلتا ماں۔ وہ بھی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ رہتے ہیں اور عیش کرتے ہیں‘ پھر فکر کاہے کی۔ تم یہ سب چھوڑو۔ یہ بتاؤ میرا کام کب کر رہی ہو؟“

دادی نے فوراً ہی نظریں چرائی تھیں۔

”میں نے کہا ناں یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ مکان میں کبھی بھی تیرے نام نہیں کروں گا۔“ دادا جی کو بھی جلال آ گیا تھا۔

”ویسے بھی بیٹا یہ مکان تو ہادی اور برہان کے نام ہے۔“ دادی نے اپنے تئیں معاملہ نبٹایا تھا۔

”کیوں؟ ان کے ماں باپ ایدھی کے جھولے میں ان کے ساتھ اس مکان کے کاغذات بھی ڈال گئے تھے کیا؟“ اس کی طنز بھری ہنسی نے ان کے کانوں میں زہر گھول دیا تھا۔

”گویا تم سب کچھ جانتے ہو۔ دادا جی کی آواز پہلے سے بہت کمزور تھی۔

”مگر شاید تم یہ نہیں جانتے کہ وہ دونوں بھی اپنی حقیقت سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس لیے تمہاری دھمکیوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو گا۔“ وہ پھر سے مضبوط ہو کے اٹھے تھے۔

”لیکن یہ دنیا تو نہیں جانتی ناں کہ میرے محترم امی ابا نے دو ناجائز بچوں کو بڑی محنت سے پالا پوسا‘ پڑھایا لکھایا‘ معاشرے کا کار آمد شہری بنایا‘ اپنے پوتے بنا کر پیش کیا اور.....“ جاوید کی مکروہ ہنسی‘ اس ادھورے جملے میں چھپی ہوئی شدید دھمکی کا اظہار تھی۔ وہ دونوں بوڑھے بیچ میں بہت خوف زدہ ہو گئے تھے۔“ اچھی طرح سوچ لیں..... ورنہ میں یہ سچ دنیا والوں کو بتا دوں گا اور پھر۔“

✵ ✵ ✵

”کتنے دن ہو گئے‘ جاوید خود آیا اور نہ ہی کوئی فون کیا‘ خیریت تو ہے ناں!“ ماں تو آخر ماں ہی تھی۔

”جب اتنے سال اس کا انتظار کیا ہے تو چار دن اور کر لو۔“ دادا جی بھی ان کی ماں تا کی مجبوری کو سمجھ گئے تھے۔

”وہ جس ہوٹل میں رہتا ہے۔ وہیں فون کر کے پتا کر لو ناں۔ خدا خیر کرے‘ میرے دل میں بہت بُرے بُرے خیال آ رہے ہیں۔

آپ یہ مکان اسے دے کیوں نہیں دیتے آخر؟“ وہ سٹپٹائی تھیں۔

”ہو گئیں ناں خود غرض‘ آخر بن گئیں ناں صرف جاوید کی ماں۔ پہلے اس نے ہم دونوں کے سر سے چھت چھینی تھی اور اب آیا ہے تو میرے دونوں بیٹوں کو بے آسرا کرنا چاہتی ہو تم۔“ دادا جھنجلائے تھے۔

”شاید آپ کو ٹھیک سے یاد نہیں صاحب! جب ہم نے ان دونوں کو اپنایا تھا تو صرف ایک مقصد بنایا تھا۔ انہیں اس معاشرے میں باوقار‘ با حوصلہ زندگی فراہم کرنا اپنا گھر‘ رشتے دار‘ شہر سب کچھ چھوڑ دیا ہم

نے صرف اس لیے کہ یہ دونوں لوگوں کے چبھتے ہوئے سوالوں سے بچ سکیں تو پھر اب یہ آخری قربانی دینے میں ہچکچاہٹ کیوں بھلا.....؟ جاوید کو میں نے جنا ہے۔ اس کی خصلت سے واقف ہوں۔ اگر اس کی بات نہ مانی تو وہ یہ راز ساری دنیا کو بتا دے گا۔ ہماری بیس سالوں کی محنت لمحے بھر میں پانی کی طرح بہہ جائے گی۔ میں آپ کی منت کرتی ہوں اس کی بات کو مان لیں۔“ دادی جان دونوں ہاتھ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی تھیں۔

”تم پریشان مت ہو‘ شاد! میں کل ہی کسی اچھے سے وکیل سے مل کر مکان کے کاغذات دکھاتا ہوں۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر دادو کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لیے تھے۔

✵ ✵ ✵

ٹی وی پہ چلتی ہوئی بریکنگ نیوز نے ان دونوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کی تھی۔

”امریکی ایجنٹ گرفتار۔ سی آئی اے کی طرف سے پاکستان کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے ایک عدد مہرہ جو ہے تو پاکستانی مگر خود کو امریکی شہری بتاتا ہے۔“

وہ تصویر جاوید ابراہیم کی تھی‘ وہ دونوں کیسے نہ پہچان سکتے اور پہچان کے بعد ایک دوسرے سے نظریں چرانے لگے تھے۔

دادا جی نے تو فوراً ٹی وی کو ہی بند کر دیا تھا اور چپ چاپ جا کر صوفے پر لیٹ گئے۔ کچھ دیر بعد ہی انہیں اپنے گالوں پر ایک مانوس سے لمس کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔

”کیا ہوا؟“ دادی جان نے ان کی آنکھوں سے بہہ کر‘ کانوں کے پیچھے کہیں کھو جانے والے آنسوؤں کو اپنے ہاتھ سے صاف کیا تھا۔

”شادو بی بی! آج میں ہار گیا ہوں۔ بری طرح سے ہارا ہوں۔

ہماری اولاد بری ہے‘ ناخلف ہے‘ نافرمان ہے۔ ہمیں پتا تھا‘ لیکن وہ ملک دشمن بھی ہو گی‘ یہ تو میرے

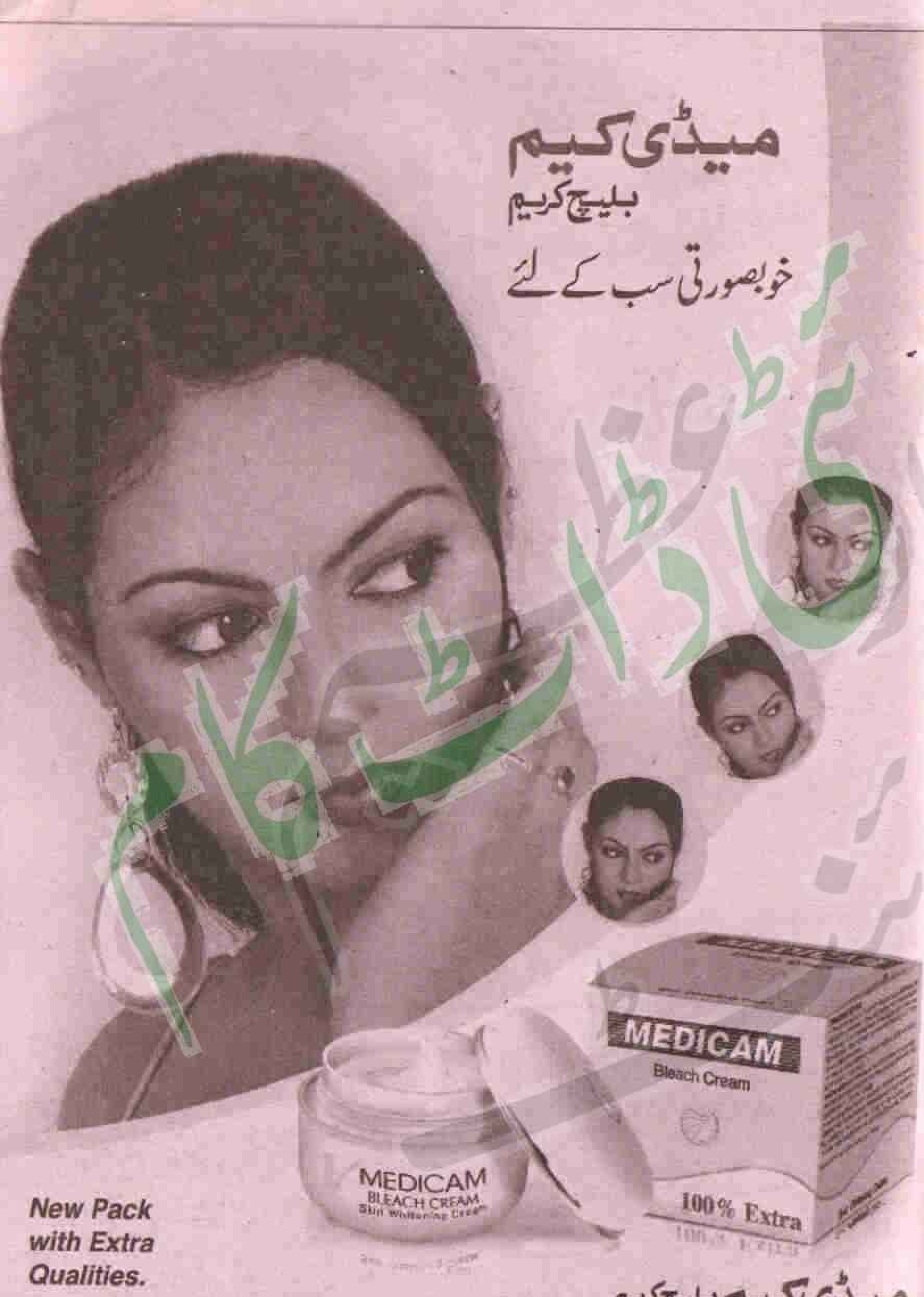

میڈی کیم بلیچ کریم
آپ کے چہرے پہ لائے ایسا نکھار کہ آپ کو خود سے ہو جائے پیار۔

وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ کیسے بدبخت والدین ہیں ہم دونوں، اپنے ایک بیٹے کی ٹھیک سے تربیت بھی نہ کر سکے۔ ہماری تو ساری زندگی ہی اکارت گئی ناں، ہادی اور برہان نے بھی ہمیں چھوڑ دیا، وہ بھی چلے گئے۔ ہم پھر سے صفر پہ کھڑے ہو گئے۔ اب ہمارے ہاتھ میں کیا ہے۔ عمر کے اس آخری دور میں بھی ہم صرف اور صرف خالی ہاتھ ہیں۔ دیکھو ذرا، دیکھو ہمارے ہاتھ خالی ہیں بالکل خالی۔" انہوں نے پاگلوں کی طرح اپنے دونوں ہاتھ ان کے سامنے پھیلا دیے تھے۔

"کون کہتا ہے کہ آپ کے ہاتھ خالی ہیں۔ آپ کے ہاتھ میں تو میرے ہاتھ ہیں، ہم دونوں کے ہاتھ ہیں، آپ کبھی بھی مایوس نہیں ہو سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔" برہان ان کے دونوں ہاتھ تھامے، آنکھوں سے لگائے بڑی عقیدت سے کہہ رہا تھا۔

اور ہادی نے دادی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ رکھا تھا۔

"کہاں تھے تم دونوں۔" دادا جی روتے روتے ہنس دیے تھے۔ "ہم سمجھے تم لوگ بھی ہمیں چھوڑ کر....." ان سے بات بھی پوری نہیں کی گئی تھی۔

"ہم تو پچھلے تین دن سے نیا مکان ڈھونڈ رہے تھے۔" ہادی نے فوراً ہی جواب دیا تھا۔

"دادا جی آپ یہ مکان جاوید صاحب کو دیں اور یہاں سے چلیں، ہم سب اپنے نئے گھر میں اکٹھے رہیں گے، بالکل پہلے کی طرح۔ ہے ناں ہادی۔" برہان نے اس سے تصدیق چاہی تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔" وہ بھی جھٹ سے بولا۔

"نہیں بیٹا! اب ہمیں یہ گھر چھوڑ کر کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ جس سے خطرہ تھا، وہ ..... وہ دوبارہ ہم سے دور چلا گیا ہے اور شائد ہمیشہ کے لیے۔" دادو کا ہاتھ برہان کے سر پر اور لہجہ گلوگیر تھا۔ دادا جی نے ایک اچٹتی ہوئی نظر ان پہ ڈالی اور پھر سے سر جھکا لیا تھا۔

"ادھر دیکھیں، میری طرف دادا جان!" برہان نے ان کا چہرہ اپنے ہاتھوں سے اوپر اٹھایا تھا۔ "نہ تو آپ ناکام ہیں اور نہ ہی آپ کی تربیت ناقص۔ ارے آپ دونوں تو آئیڈیل ہیں۔ میرا اور برہان کا آئیڈیل کیونکہ آپ نے ہم جیسے بے چہرہ، بے شناخت لوگوں کو اپنا نام دیا۔ بہترین تربیت فراہم کی اور اس معاشرے کو دو بیمار ذہن لوگوں کے بجائے تعمیری سوچ رکھنے والے مضبوط لوگ دیے ہیں۔ آپ ہمارے ہی نہیں اس معاشرے کے بھی محسن ہیں۔ آپ تو میرے پاکستان کے محسن ہیں۔ دادا جی!" اس نے آگے بڑھ کر اس روتے ہوئے بوڑھے کو بانہوں میں بھر لیا تھا۔

کمرے میں موجود ہر نفس کی آنکھ بھیگی ہوئی تھی، کسی بارش کے پانی سے بھیگے درخت کی شاخوں کی طرح۔

"اچھا اب آتے ہیں کام کی بات پر۔ آپ سیدھی طرح یہ بتائیں دادی جان کہ آپ "مس چلبلی" کے گھر رشتہ لے کر کب جا رہی ہیں؟" ہادی نے اسی پرانے لہجے میں زور سے سوال پوچھا تھا۔

"ان شاء اللہ، کل شام کو۔" انہوں نے بے اختیار آگے بڑھ کر اس کا ماتھا چوم لیا تھا۔

"اوئے بے ہدایتا! تو شرما رہا ہے۔ جی۔" ہادی نے آواز لگائی تھی اور دادا جی کو ساتھ ہی بڑے زور کی چھینک بھی ڈالی۔

"او بس کر بے ہدایتا، کھوتیا، میری کوئی پسلی نہ نکل جائے۔" دادا جی واویلا ہی کرتے رہ گئے۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی سنہری کرنوں نے اس منظر کو بہت غور سے دیکھا، اسے بہت سی دعائیں دیں اور ساتھ ہی گواہی بھی کہ وقت اور حالات خواہ کیسے بھی ہوں، زندگی سے بڑھ کر اور کیا ہوگا بھلا کیونکہ زندگی تو پیاری ہے۔

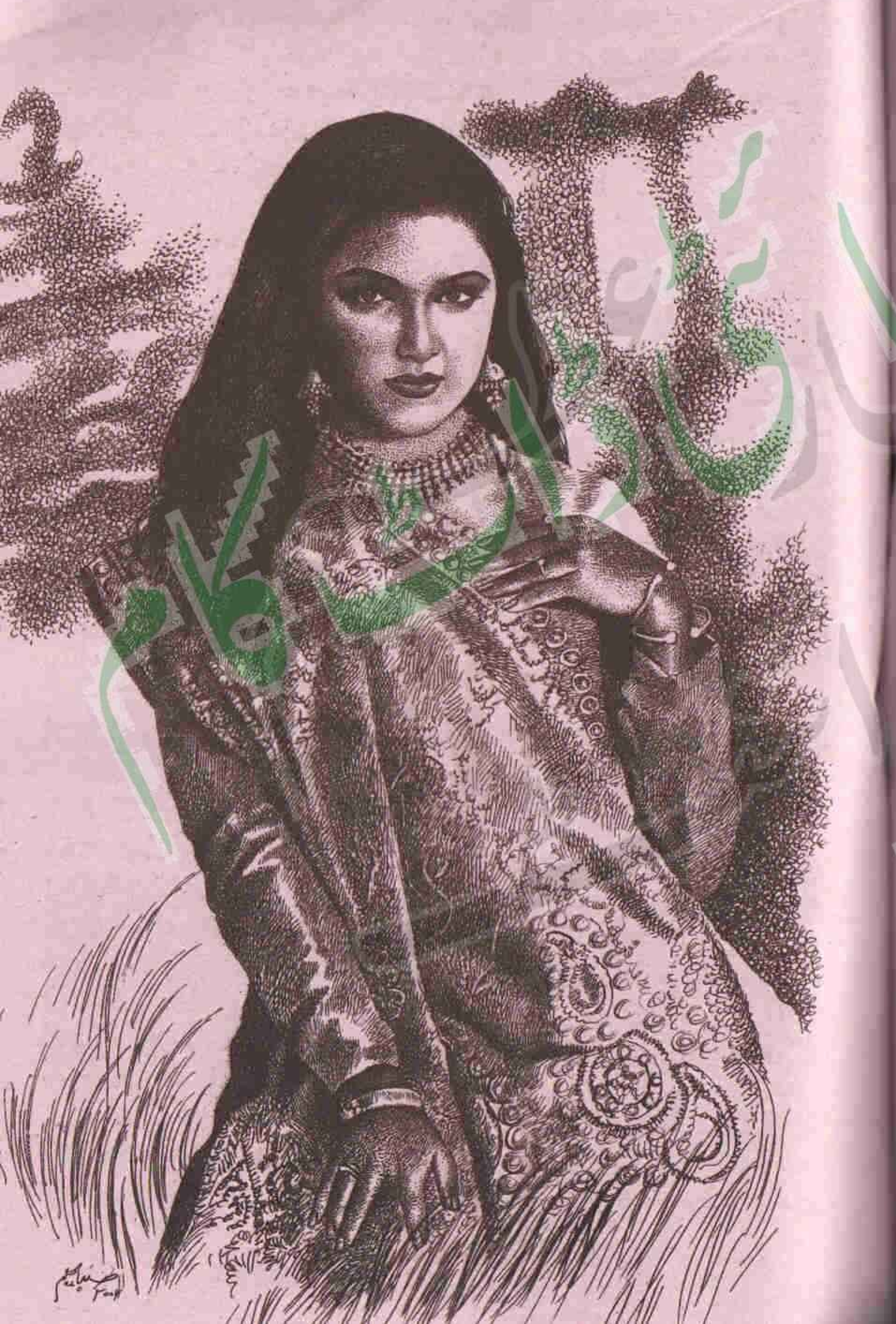

فائزہ افتخار

مان جاؤ نا

مکمل ناول

لاہور کے علاقے رنگ محل میں مقیم اس گھرانے کی بودوباش آج بھی ستر کی دہائی کے حصار میں ہے۔ زمانے کے بدلتے رواجوں نے ان پر کوئی اثرات مرتب نہیں کیے۔ دادا، دادی، تایا، تائی، چاچا، چاچی اور ان کی اولادوں کی بھی اولادوں پر مشتمل یہ گھرانہ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت مل جل کر رہتا ہے۔

تایا اشرف کی اعظم کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی جبکہ سہیل چاچا کی مال روڈ پر پرانی مشینوں کی دکان ہے۔

تایا اشرف کے دو بیٹے اکمل اور اجمل شادی شدہ ہیں۔ روبینہ، اکمل کی اور مسرت، اجمل کی بیوی ہے۔ تایا کی اکلوتی بیٹی ارم غیر شادی شدہ ہے۔

سہیل چاچا کی تین بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ جبکہ ان کے اکلوتے بیٹے ندیم اور ایک بیٹی فریحہ کی شادی نہیں ہوئی ہے۔

تایا اشرف اور سہیل چاچا سے چھوٹا سرفراز ہے۔ سرفراز کافی عرصے سے جرمنی میں مقیم ہے۔ اس نے وہاں شادی کرلی ہے۔ وہ کافی عرصے بعد پاکستان آرہا ہے۔

ندیم اور ارم کی توقع ہے کہ سرفراز چاچا اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی ان سے کردیں گے۔

سرفراز اس مرتبہ کافی عرصہ بعد پاکستان آرہا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ پاکستان آیا تھا تو ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ نئی نسل، سرفراز چاچا کی ناراضی کی وجوہات سے لاعلم تھی۔ دادی انہیں بتاتی ہیں کہ سرفراز نے اپنی بیوی جوڈی کو مغربی لباس پہننے سے منع کیا ہوا تھا۔ مگر سہیل، جوڈی کو اپنی پینٹ شرٹ پہننے کو دیتا ہے اور پھر بعد امیک اپ کر کے اس کی تصویر کھینچتا ہے۔ سہیل، جوڈی کو گالیاں بھی سکھا دیتا ہے اور انہیں مہذب الفاظ بتاتا ہے۔ جب جوڈی سب کے سامنے وہ بے ہودہ گالیاں دہراتی ہے تو سب سہیل کے اس "کارنامے" سے واقف ہو جاتے ہیں۔ سرفراز ناراض ہو کر واپس چلا جاتا ہے۔ اب وہ ایک طویل عرصے کے سب بعد وطن آیا ہے۔

۳

تیسری اور آخری قسط

"اباجی میں نے بکواس کی تھی نا کہ ادھر دیر لگتی ہے۔ تسی نہ آؤ۔" اشرف نے چیں بہ جبیں ہوتے ہوئے کہا۔

دادا جی نے بھی تو پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ کبھی انہیں باتھ روم جانا ہوتا۔۔۔ کبھی پانی پینا ہوتا کبھی پھر سے باتھ روم جانا ہوتا۔ کبھی ٹانگیں لٹکا کے بیٹھنے سے پیروں میں سوئیاں چبھنے لگتیں۔ کبھی ایک بار اور باتھ روم جانا ہوتا۔ کبھی کمر پر خارش شروع ہو جاتی اور ہاتھ کھجانے کے لیے وہاں نہ پہنچ پا رہا ہوتا۔ کبھی پھر سے باتھ روم جانا ہوتا اور کبھی۔۔۔ کبھی بس باتھ روم ہی جانا ہوتا۔

"اوئے ہوئے۔ کی مصیبت اے غیر سے۔"

اباجی کے ایک گھنٹے میں آٹھویں بار باتھ روم جانے کی فرمائش سن کے تاؤ جی اشرف بھنا کے رہ گئے۔

"منع بھی کیا تھا نہ جوس پہ جوس چڑھاؤ۔ پہلے انار کا جوس، پھر سیب کا جوس اب سنگترے کا جوس۔ جوس پہ جوس ڈالے جا رہے ہو اندر اور میری دوڑیں لگائی ہوئی ہیں۔ اب میں آپ کو لیٹرین لے کر جاؤں یا سامنے نظر رکھوں جہاز اتر گیا ہے۔ سرفراز سامان لے کے باہر نکلے گا تو پریشان ہو جائے گا کسی کو نہ دیکھ کر۔"

"سیدھی گل کر۔ تو پریشان ہو جائے گا کہ وہ سامان ادھر ہی نہ بانٹ دے لوگوں میں تھوڑے جو بھی لایا ہے ولایت سے وہ۔۔۔ لے کر گھر ہی آئے گا۔"

دادا جی نے زہر اگلا۔ ان سے کھڑا ہی نہ ہوا جا رہا تھا۔ کبھی ایک ٹانگ پہ وزن ڈالتے، کبھی دوسری ٹانگ پہ۔

"چل۔۔۔ لے چل مجھے، فیر کہیں اگر ادھر ہی خطا ہو گیا تو؟"

"اوئے ہوئے۔" تاؤ جی اس دھمکی یا وارننگ پہ تڑپ اٹھے۔ "چلو فیر۔۔۔" اور احسان جتانے کے انداز میں انہیں لے کے نویں بار واش روم کی جانب بڑھے۔

"اتنی دفعہ لے کے گیا ہوں۔ ابھی تک راستہ یاد نہیں ہوا۔ جہاں ہم کھلوتے تھے وہاں سے سیدھا آگے جا کے دوسرا موڑ لو تو یہ سامنے غسل خانے ہیں۔"

انہوں نے دور سے ہی اشارہ کر کے دکھایا۔

"وہ دیکھو سامنے۔۔۔ جہاں چائے کا اسٹال لگا ہے۔"

اتنے میں سرفراز کی فلائٹ آنے کی اناؤنسمنٹ ہونے لگی۔

"چلو آگیا جہاز۔ ادھر لیٹرین کے دورے ہی نہیں مک رہے۔"

"او چل اوئے۔۔۔ بوہتی گلاں نہ سنا۔۔۔ تو تو جیسے کبھی گیا ہی نہیں۔ تیرا تے سسٹم ہی ہور ہے۔ چل جا، میں آپے چلا جاؤں گا۔ وہ سامنے ہی تو ہے چار قدم پہ۔"

اشرف باپ کو اکیلا چھوڑنے کے خیال سے ہچکچا سا گیا۔ واش روم اگرچہ واقعی چار قدم کے فاصلے پہ تھے مگر واپسی کا رستہ چار قدم کا نہیں تھا۔

"تسی واپس کیسے آؤ گے؟"

"چار بندوں کے کاندھوں پہ۔" دادا جی نے جل کے کہا۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔ امی صحیح کہتی ہیں۔ آپ نے ہمیشہ منحوس باتیں کرنی ہوتی ہیں۔۔۔ خیر ادھر دیکھو وہ جو سامنے کتابوں رسالوں کا اسٹال ہے، ادھر سے کھبے پاسے مڑنا ہے وہاں پہ رنگ گورا کرنے والی کریم کا بڑا سا اشتہار لگا ہے۔"

"وہ جو اونچے منداں والی لڑکی ہے، اس کا؟"

بڑا پتا تھا بھئی دادا جی کو اس عمر میں بھی ماڈل گرلز کا کہ کس کے دانت اونچے ہیں، کس کا ماتھا چوڑا ہے۔

"ہاں جی۔۔۔ وہی۔"

"بھلا دسو۔۔۔ رنگ چٹا کرنے سے کیا ہو گا۔۔۔ بیڑہ (جبڑا) تو سارا اس کا باہر ہے۔ کوجی (بدصورت)۔"

"او ہو، اباجی کوجی ہو یا سوہنی، بس اس اشتہار کے سامنے ہی میں کھڑا ہوں گا۔"

"سرفراز اور اس کے ٹبر کے ساتھ؟"

"پتا نہیں تب تک شاید نکلا ہو، شاید نہ نکلا ہو۔ تسی جاؤ وی۔ ابھی تو آپ سے منٹ صبر نہیں ہو رہا تھا۔"

تاؤ جی کے یاد دلانے پہ دادا جی جلدی سے واش روم کی طرف بڑھے۔

☼ ☼ ☼

"کڑیو! روٹی تیار ہے؟"

ساری ماؤں کی طرح دادی کی محبت بھی بیٹے کے پسندیدہ کھانے سے شروع ہو کے وہیں ختم ہوتی تھی۔

"ہاں جی۔ پلاؤ دم پہ رکھ دیا ہے۔ فریحہ! تم ذرا شاہی کباب تل دو اور ارم سے کہو، کھیر کے لیے بادام پستے کاٹ دے۔"

مسرت کے ہدایت نامے پہ دادی بگڑ گئیں۔

"سارا کچھ میری پوتریوں نے ہی کرنا ہے تو تو نے کیا کرنا ہے کھرک (خارش)۔"

"ہا۔۔۔ ہائے میں نے پلاؤ بنایا۔ کڑاہی گوشت بنایا، سلاد بنایا کھیر بنائی۔"

"شروع ہو گئی تو اپنی تعریفیں کرنے؟" روبینہ اچانک کہیں سے ٹپک پڑی۔

"جیسے میں نے تو کچھ کیا ہی نہیں قورمہ کس نے بنایا؟ میں نے۔۔۔ کریلے گوشت کس نے بنایا؟ میں نے سرہانوں کے اچھاڑے (غلاف) کس نے بدلے؟ میں نے۔ پردے کس نے دھوئے؟ میں نے۔ فرش کس نے دھویا؟ میں نے۔ کرسیاں کس نے جھاڑیں؟ میں نے۔ مسٹر سرفراز تاؤ کے لیے کپڑے کس نے استری کیے، میں نے۔"

"نی گل دس نی، تو نے چن چن کے سارے کام ایسے ہی کرنے تھے جس میں رج کے "ر" آتا ہو۔ قورمہ، کریلے گوشت، سرہانے، پردے، فرش کرسیاں کرتے توبہ توبہ۔"

دادی نے کانوں کے اندر انگلیوں سے خلال کیا جیسے سارے "ر" اور "ڑ" کانوں میں پھنس گئے ہوں۔

"فریحہ! شاہی کباب تل دو ارم کھیر سجا دو۔" مسرت نے روبینہ کی عزت افزائی ہونے پہ مسکراہٹ دبا کے

نندوں کو آوازیں لگائیں۔

وہ دونوں اندر اپنی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھیں۔

فریحہ ڈائجسٹ میں غرق..... وہ ناول پڑھ رہی تھی جس کی ہیروئن سب کر کرا کے بھی صاف پاک بی بی تھی اور مظلوم بن کے تیسرا عاشق پھنسا رہی تھی۔

ارم اپنی نوک پلک سنوار رہی تھی۔

اس نے وہ تمام بیوٹی پراڈکٹس — آزما ڈالی تھیں جن جن کے اشتہار اب تک اس کی نظر سے گزرے تھے۔

رنگ گورا کرنے والی مہنگی کریم بھی

جلد ملائم کرنے والے بدبودار ابٹن بھی

بال گھنے کرنے والا نایاب تیل بھی

امپورٹڈ شیمپو اور کنڈیشنر بھی

اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے تمام حکیمی ٹوٹکے اور حسن نکھارنے کے دیسی نسخے بھی برت لیے تھے۔

لیموں کے چھلکے سے رگڑ کے منہ پہ ملائی کا لیپ.....

پیٹ اندر کرنے کے لیے نہار منہ مولی کے عرق کا ناشتہ۔ یہ الگ بات کہ سارا دن پھر کوئی اس کے پاس بیٹھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

کھٹی چھاچھ سے بال بھی دھوئے۔

چاہے تائی جی سے جی بھر کے گالیاں ملی ہوں کیونکہ یہ لسی انہوں نے کھٹی ہونے کے لیے رکھ چھوڑی تھی کڑھی بنانے کے لیے۔

اس وقت وہ جارجٹ کے سرخ سوٹ میں ملبوس کاندھوں پہ اپنے ڈائی بال بکھرائے، دھاگا ہاتھ میں پکڑے بندروالی تھوتھنی بنائے مونچھوں کے اکا دکا بال نوچ رہی تھی۔ جب تائی جی اندر چھاپا مارنے کے انداز میں داخل ہوئیں۔

"تجھے آواز نہیں آ رہی... جا کے بادام پستے کاٹ کے دے مسرت کو۔ اس نے چیخ چیخ کر سارا محلہ سر پہ اٹھایا ہوا ہے۔ آنڈ گوانڈ (آس پڑوس) کو سنا رہی ہے کہ تو ذرا سے کام کے لیے بھی کسی کے ہاتھ نہیں آتی۔"

"مجھ سے نہیں کٹتے بادام پستے، میرے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔"

"نہیں، تیرا جھاٹا خراب ہو جائے گا۔ اگر میں نے اسے پکڑ کے دو چار جھٹکے دیے تو۔"

تائی نے خطرناک تیوروں کے ساتھ دھمکی دی۔ جس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور ارم اپنے ان ہاتھوں کو حسرت سے دیکھتی سرد آہ بھرتی باہر نکل گئی جن کو رات بھر عرق گلاب، گلیسرین اور لیموں کا عرق رگڑ کر چٹا دودھ کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ندیم! گل سن۔"

چاچا سہیل نے ندیم کو اس وقت پکارا جب وہ جیل لگا کے بالوں کی سپائکیس بنانے کی کوشش میں تھا..... مگر چونکہ پہلا پہلا موقع تھا اس لیے بن کے ہی نہیں دے رہے تھے۔

"جی ابا جی!" وہ برے برے منہ بناتا باپ کے پاس آیا جو اس سے بھی برے برے منہ بنا رہے تھے۔

"ذرا شاہ عالمی تو جا۔"

"نہیں جی؟! اس وقت۔" وہ ہڑبڑا گیا۔

"سنا ہے، چائنا کے مال کی بڑی اچھی لاٹ آئی ہے۔"

"ابا جی! چائنا کا مال بھی کبھی اچھا ہوا ہے؟"

"ہم نے کوئی استعمال نہیں کرنا..... بیچنا ہے۔ جا دیکھ کے آ کام کا ہے تو ساٹھ ہزار کا سامان اٹھا لا۔"

"اتنی رات کو کیا پتا چلتا ہے۔ مال کام کا ہے یا نہیں، سویرے دیکھیں گے۔"

"کبھی کمانے کی فکر نہ کرنا۔ تو کون سی جوان جہان لڑکی ہے جو رات کے وقت باہر نکلنے سے تجھے خطرہ ہو گا۔ جا شاباش۔"

"میری موٹر سائیکل پنکچر ہے۔" اس نے تازہ بہانہ گھڑا۔

"تو مال کون سا تیرے اس چھکڑے پہ آ جانا ہے۔ یہاں سے اکتالیس نمبر کی ویگن پکڑ، وہاں سے مال لے کر چنگ چی سالم کرا لے۔"

"ایسا کون سا مال ہے جو ابھی کے ابھی نہ لیا تو آفت آ جائے گی۔" وہ تپ کے رہ گیا۔

کتنی محنت اور دل لگا کے اپنی پرسنالٹی بنائی تھی۔ امریکہ والے چاچے اور ان کی گرین کارڈ ہولڈر بیٹی کو امپریس کرنے کے لیے۔

"وہ کیا ہوتے ہیں..... پلاسٹک کے پوتڑے۔ ہاں پیمپر، پیمپروں کی بڑی نئی ورائٹی آئی ہے۔ لے آ ساٹھ ہزار کے۔ اچھرے میں بڑے بکیں گے..... ساٹھ کے مال پہ پچاس ہزار تو بچیں گے۔"

"کیا؟ اب میں پیمپر بیچوں گا؟" ندیم کا میٹر گھوم گیا۔

"بیچنے ہی ہیں، کوئی دھونے تو نہیں جو تڑپ رہا ہے۔"

"میں یہ واہیات کام نہیں کر سکتا۔"

"او..... چل نہ سہی، نہ بیچنا مگر لا تو دے۔ میں اپنی دکان کے باہر ہی رکھ لوں گا۔"

"میں نہیں لا سکتا۔ کم از کم اس وقت تو نہیں لا سکتا۔ کل صبح لا دوں گا۔"

ندیم نے جان چھڑانا چاہی۔

"کیوں؟ اس وقت تو کون سا ضروری کام کر رہا ہے علاوہ "بودے" (زلفیں) بنانے کے۔"

وہ بھی پھر اس کے باپ تھے۔ گھور کے اس کا جائزہ لیا۔

"یہ بالوں کی چونچیں کیوں کھڑی کی ہوئی ہیں، لڑا کے ککڑ کی طرح۔"

"فیشن ہے ابا جی!"

"بڑا لعنتی فیشن ہے۔"

"تو وہ آپ کے زمانے کا فیشن کون سا کم لعنتی تھا جس میں آپ کی تصویریں ابھی تک بیٹھک میں لگی ہیں۔ لمبی لمبی قلمیں..... جیسے گالوں پہ کسی نے بوٹ سجا دیے ہوں۔"

"بوٹ؟ واہیاتا، باپ کے منہ پہ جوتا سجایا ہے؟"

"سیدھی بات ہے جی..... مجھ سے نہیں جایا جاتا اس وقت شاہ عالمی کی گلیوں میں خجل خوار ہونے.....

آپ ہی جاؤ۔"

وہ بدلحاظی میں باپ سے چھ ہاتھ آگے تھا۔ صاف انکار کر کے چلتا بنا اور سہیل پیچ و تاب کھا کے رہ گئے۔

دراصل بیٹے کو منظر سے غائب کرنے کا بھی ایک مقصد تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سب لوگ مل بیٹھیں..... سرفراز سے آمنا سامنا ہو..... پرانے ذکر نکلیں اور بیٹے کے سامنے ان کے جوانی کے کارنامے کھلیں..... مگر بیٹا بھی انہی کا تھا، اصل مقصد سے واقف ہو یا نہ ہو۔ قابو تو نہ آنا تھا اس نے..... ویسے بھی اتنے دن سے بھرپور تیاریاں ہو رہی تھیں سرفراز انکل کی بیٹی کے استقبال کی..... وہ کیسے ہاتھ سے جانے دیتا یہ سنہری موقع۔

☼ ☼ ☼

سرفراز کے گلے لگتے ہی اشرف کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی..... اتنے سال اپنے خون سے الگ رہنے کی کسک اب جاگی تھی..... اتنا عرصہ ڈھیٹ بن کے گزار لیا اب احساس ہو رہا تھا کہ اندر کتنی ہڑک تھی اک دوجے کے لیے۔

سرفراز تو باقاعدہ رو رہا تھا۔

ایک تو سالوں بعد وطن لوٹنے کی سرشاری۔

اپنی مٹی کی مہک۔

اور اس پہ اپنے خون کی قربت۔

"لے جھلا۔ جوان اولاد کے سامنے رو رہا ہے۔"

تاؤ جی اشرف نے رندھے ہوئے گلے کے ساتھ جھڑکا پھر بھائی کا جائزہ لیا۔

ویسا ہی چھریرا بدن..... ذرا سا بھر ضرور گیا تھا مگر فربہ نہیں تھا..... کاندھے ابھی بھی سیدھے۔ کمر ابھی تک اکڑی ہوئی۔

رنگ پہلے سے زیادہ سفید ہو گیا تھا۔ نظر کے چشمے کا اضافہ اسے سوبر بنا رہا تھا۔ ہلکی بڑھی شیو سے اندازہ ہوتا تھا عمر کا..... ورنہ سر کے بال تو ایسے مہارت سے ڈائی کیے ہوئے تھے کہ ایک سفید بال بھی نظر نہ آتا تھا۔ بس داڑھی میں ہی برف گری ہوئی تھی اور سر کے بال آگے سے جھڑ کے کافی کم بھی ہو چکے تھے۔

سفر کی تھکن ذرا سی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہشاش بشاش..... بھینی بھینی مہک سے رچا وہ اپنی عمر سے سات آٹھ سال کم عمر نظر آ رہا تھا جبکہ تاؤ جی اپنی اصلی عمر سے دُگنے لگ رہے تھے۔ آپ تو دادا جی ساتھ بیٹھے ہوتے تو چار چھ سال چھوٹے بھائی لگتے ان کے۔

"بچے کدھر ہیں؟" تاؤ جی نے بھائی کے سراپے سے نظر چرا کے پوچھا۔ مبادا ان کی نظر ہی نہ لگ جائے۔

"سامان کلیئر کروا رہے ہیں' آپ اکیلے آئے ہیں؟"

"ہاں' وہ سہیل تو دکان ہی دیر سے بند کرتا ہے۔ اکمل نے بھی کام سے جانا تھا اجمل جماعت کے ساتھ نکلا ہوا ہے۔ ہاں' ابا جی آئے ہیں میرے ساتھ۔"

"کدھر ہیں؟" سرفراز نے بے تابی سے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

"ہیں؟" تاؤ جی اشرف کا بھی ماتھا ٹھنکا..... پندرہ بیس منٹ تو ہو چکے تھے انہیں سرفراز کے ساتھ حال چال پوچھتے اور اس سے بھی پندرہ بیس منٹ پہلے تک وہ اس کا انتظار کرتے رہے تھے یہاں کھڑے۔

"ہاں یار..... باتھ روم تک گئے تھے۔ دیر ہی لگا دی ہے انہوں نے۔ میں دیکھتا ہوں۔"

"میں بھی چلتا ہوں ساتھ۔"

"نہیں نہیں تو کھلو۔ بچے باہر نکلے تو پریشان ہوں گے۔ میں ابھی لے کے آیا۔"

دینے کو انہوں نے تسلی دے تو دی تھی مگر اندر ہی اندر سخت پریشان بھی تھے کہ آدھے پونے گھنٹے سے دادا جی باتھ روم میں تو ہوں گے نہیں۔ باہر نکلے ہوں گے اس طرف آئے بھی ہوں گے۔ اللہ جانے راستہ بھول کے کسی اور طرف نکل گئے..... یا..... یا پھر باہر۔

وہ بوکھلاہٹ کے عالم میں ایک ایک واش روم میں جھانک رہے تھے..... جو اندر سے لاک تھے ان کے دروازے بجا بجا کے باآواز بلند دریافت کر رہے تھے۔

"ابا جی..... تسی او؟"

جواب میں لعنتیں ملنے پہ اگلا در کھٹکھٹایا جاتا.....

باتھ رومز سے اچھی طرح مایوس ہونے کے بعد ایئرپورٹ کے باقی مقامات کو کھنگالا گیا۔ اتنے میں کسی انجان نمبر سے مسلسل کال آنے لگی۔ گھبراہٹ اور پریشانی کے مارے فون سننے کا بھی وقت نہ تھا۔ وہاں سے نکل کے ایئرپورٹ میں موجود ہر اس شخص کو جا جا کے دبوچا اور اس کی گردن اپنی جانب گھما کے اس کا جائزہ لیا جس جس نے دادا جی کے جیسا لباس پہنا ہوا تھا اور جس جس کا رنگ بھی پکا سیاہ تھا۔ اس کے چکر میں ایک بے حد سڑیل سے بندے سے تو تو میں میں بھی ہو گئی۔

"اشرف بھائی!" آخر سرفراز نے انہیں جا لیا۔

"کیا ہوا..... کہاں ہیں ابا جی؟..... اور آپ میرا فون کیوں نہیں اٹھا رہے تھے؟"

"تمہارا فون..... اچھا وہ تم فون کر رہے تھے؟"

"ہاں' پی سی او سے کر رہا تھا..... فکر ہو رہی تھی مجھے اور بچوں کو۔"

"ابا جی گواچ گئے ہیں سرفراز!"

تاؤ جی اشرف نے بوکھلا کے اطلاع دی اور سرفراز کو غش سا آ گیا۔

"یا اللہ..... کتنی دعائیں مانگی تھیں کہ اتنے سالوں بعد وطن واپس جا رہا ہوں۔ بچوں کے سامنے عزت رکھ لینا۔ کوئی نیا سیاپا جاتے ہی گلے نہ پڑ جائے' چلو کچھ دن بعد ہوتا تو اور بات تھی ابھی تو....."

"آپ نے اچھی طرح دیکھا؟" اس نے مرے مرے لہجے میں پوچھا۔

"او یار..... ابا جی ہیں کوئی سوئی نہیں جو چارے کے ڈھیر میں گر جائے۔ لیٹرینوں میں بھی دیکھ آیا ہوں۔ باہر پارکنگ چھان ماری ہے۔"

"اناؤنسمنٹ کرائی؟"

"کی؟"

"اعلان کروا دیں۔ سُن کے خود یہاں آ جائیں گے یا کسی کو پتا ہو گا تو ان کو پہنچا دے گا۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے ابھی لبھتا (ڈھونڈتا) ہوں کوئی میست (مسجد)۔"

"میست؟ مگر مسجد میں کیوں اعلان کرانا ہے۔ ابا جی گم تو ایئرپورٹ میں ہوئے ہیں۔"

"مگر گواچے لوگوں کا اعلان تو میست میں ہوتا ہے' تجھے یاد ہے۔ محلے کی مسجد میں ہر ہفتے دو واری تیرے گواچنے کا اعلان ہوتا تھا اور دو واری تیرے ملنے کا۔ کئی دفعہ تو تو ملتا نہیں تھا تو پھوپھی کے پوچھنے پہ اماں بے فکری سے کہہ دیتی تھی کہ ابھی محلے کی میست سے اعلان ہو گا تو پتا چل جائے گا۔ سرفراز کتھے اے۔"

"او ہو! یہ وقت بچپن کی یادیں تازہ کرنے کا نہیں' ابا جی کو ڈھونڈنے کا ہے۔ آئیں میرے ساتھ۔"

"بچے کتھے نیں؟" (بچے کدھر ہیں۔)

"اویس فریش ہو رہا ہے صبا اور لولو اسنیکس لے رہی ہیں۔ ان کو چھوڑیں۔ آئیں میرے ساتھ۔"

اب تاؤ جی اشرف کی جانے بلا..... کہ اویس فریش کیسے ہو رہا ہے اور صبا اور لولو کیا لے رہی ہیں۔ ان کے تو سر سے یہ بیان گزر گیا۔ بہرحال سرفراز کے پیچھے پیچھے ایسے ہو لیے جیسے وہ خود اس شہر میں نئے ہوں یا عرصے بعد آئے ہوں۔ اور سرفراز یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو۔

☼ ☼ ☼

اجمل جماعت کے ساتھ تبلیغ کر کے واپس لوٹ آیا۔

اکمل نرگس کی فلم کا شو دیکھ کے لکشمی سے بٹ کڑاہی والوں کی کڑاہی کھا ٹھونس کے آ گیا۔

مسرت اور روبینہ نے اپنے ان بچوں کو فنرگن دے کر سلا دیا..... جو رات کے دو بجے تک ناک میں دھواں دیتے تھے۔

دادی ایک طویل اونگھ لے کے اٹھ بھی گئیں۔ نئے سرے سے تازہ دم ہو کے۔

تائی امی جوڑوں کا مرہم لگا کے..... بلڈ پریشر کی گولی کھا کے..... شوگر کا ٹیکا لگوا کے اور کھانسی کا سیرپ پی کے رضائی میں دبکی بس انتظار میں تھیں کہ سرفراز آئے تو وہ اس کے سر احسان تھوپیں کہ اتنی بیماریوں اور تکلیفوں کے ساتھ بھی وہ اس کے انتظار میں جاگ رہی ہیں اور بس پھر غڑاپ سے رضائی کے اندر گھس جائیں۔

چاچی نیا چائنا کا ڈنر سیٹ دو بار گیلی صافی سے چمکا چکی تھیں۔

ارم نے پتا نہیں کتنی بار اپنے چہرے کا ہلکا ہلکا میک اپ ترو تازہ کیا تھا۔

فریحہ ایف ایم پہ کوئی دو چار سو گانے سن چکی تھی اور ندیم خیالوں ہی خیالوں میں چچا سرفراز کی بیٹی سے شادی کر کے نہ صرف گرین کارڈ لے چکا تھا بلکہ اب تو باپ بھی بننے والا تھا۔ تھوڑی دیر تک اور وہ سب لوگ ایئرپورٹ سے واپس نہ آتے تو اس کے بچے بھی جوان ہو جانے تھے۔

"فریحہ! فون کرا اپنے تاؤ کو۔"

چاچی کو سب سے زیادہ فکر تھی' کیونکہ کچن کا انتظام اس وقت ان کے سپرد تھا اور بھوک کے ہاتھوں بے تاب ہو کر کبھی کوئی تو کبھی کوئی پلیٹ میں دو چار نوالے یہ کہہ کر لے جاتا کہ ذرا تسلی کے لیے منہ چلانا ہے اور چاچی کو ڈر تھا۔ یونہی تسلی تسلی میں منہ چلاتے ساری ہانڈیاں بوٹیوں سے خالی نہ ہو جائیں۔

"میرا بیلنس ختم ہونے والا ہے۔"

فریحہ اپنے فون کے معاملے میں صرف کنجوس نہیں تھی..... کمینی بھی تھی۔

"دفع ہو..... ندیم سے کہہ کر بیس روپے کا لاڈ کروا دوں گی۔ ملا فون۔"

"لاڈ نہیں امی۔ لوڈ..... لوڈ کرواتے ہیں بیلنس۔"

"نمبر ملا۔ انگریزیاں نہ پڑھا۔"

اور فریحہ برے برے منہ بناتی نمبر ملانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"چلو..... بیڑا ہی تر گیا۔"

تاؤ جی نے ہاتھ میں بجتے سیل فون پہ فریحہ کا نمبر دیکھ کے کہا۔

اناؤنسمنٹ ہوئے بھی بارہ منٹ ہو چکے تھے۔ کوئی

فائدہ ہوتا نہ نظر آرہا تھا کھڑے کھڑے ٹانگیں الگ شل ہو چکی تھیں۔

"اب کیا ہوا؟"

"گھر سے فون آنے شروع ہو گئے ہیں۔ اب ان کو کیا بتاؤں؟ ذرا ابا جی والی بات میرے منہ سے نکلنی ہے' پورا کا پورا رنگ محل ایئر پورٹ اٹھ آنا ہے۔"

"لوبو کے میسج بھی آرہے ہیں' کیا خیال ہے۔ ان کو گاڑی میں نہ بٹھا آئیں..... پھر آکے ابا جی کو ڈھونڈتے ہیں۔"

"اب اور کتنا ڈھونڈیں...... میرا خیال ہے ابا جی ایئر پورٹ سے نکل گئے ہوں گے۔"

"گھر نہ چلے گئے ہوں۔ فون کر کے پوچھ لیں۔"

"پچھلے دس سالوں سے وہ رنگ محل سے سوائے باغبان پورے' کرشن نگر' شاہ عالمی' پریم گلی اور کشمیری محلے کے اور کہیں نہیں گئے۔ یہ والا لاہور تو انہوں نے کبھی دیکھا ہی نہیں۔ ایئر پورٹ تو بنا بھی لاہور کے دوجے کونے میں ہے میرا خیال ہے پلس میں رپورٹ لکھوانی پڑے گی۔"

یہ سن کے سرفراز فکر مند ہو گیا۔

"مگر میں آدھی رات کو بچوں کو اور اتنے ڈھیر سارے سامان کو ساتھ لے کے کہاں پھروں حالات بھی تو ٹھیک نہیں یہاں کے اور ہمارے پاس تو امریکن پاسپورٹ اور ڈالرز بھی ہیں۔ بہت خطرے والی بات ہے۔"

"امریکن پاسپورٹ اور ڈالر کا نہ ہونا خطرے والی بات ہے۔"

تاؤ جی نے ایک حسرت بھری آہ آزاد کی۔

"یہ پاسپورٹ اور ڈالر ڈال کے تو لاہور شہر میں انے (اندھے) سانڈ کی طرح پیروں میں بندے رول سکتا ہے جیسے تیرے امریکن یار رے منڈے (ریمنڈ) نے کیا تھا۔ اسے کسی نے کچھ کہا؟"

ریمنڈ ڈیوس کا حوالہ سنتے ہی سرفراز کچھ گھبرا سا گیا۔ چہرے کا رنگ تک اڑ گیا۔

"پلیز بھائی جان! ایسی متنازعہ باتیں نہ کریں اور بچوں کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ در اصل میں صرف شہر کے حالات کی وجہ سے کہہ رہا تھا۔"

"اکمل گھر سے باہر ہی نکلا ہوا تھا..... اسے فون کر کے دیکھتا ہوں' ہو سکتا ہے آلے دوالے ہی ہو ایئر پورٹ کے۔ اس کو بچوں کے اور سامان کے ساتھ گھر بھیج کر ہم دونوں پلس میں رپورٹ کرانے چلتے ہیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ میں بچوں کو بلاتا ہوں۔"

وہ میسج ٹائپ کرنے لگا اور تاؤ جی اشرف اپنا موبائل فون نکال کے اکمل کا نمبر تلاش کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

اکمل بستر پہ نیم دراز ماچس کی تیلی سے دانتوں میں خلال کر رہا تھا۔ روبینہ بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ اس نے وہی ہوش ربا پرنٹ والا سلک کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کی پشت پہ ایک نشیلی آنکھ بھی تھی۔ دو تین رنگ برنگی تتلیاں' کچھ پھول' کچھ سنگترے' کچھ انگور اور نجانے کیا کیا الا بلا بنا ہوا تھا۔

"روبینہ! مجھے دودھ پتی بنا کے دے۔" اس نے زور ہی سے پیر مار کے اسے ٹہوکا دیا۔

"ماڑ کیوں رہے ہو پیر سے' منہ سے بات کرو۔" وہ غرائی۔

"جس کی جو اوقات ہو' اس سے اسی طرح پیش آتے ہیں۔" وہ جواباً" دھاڑا۔

"آپے جا کے بناؤ دودھ پتیاں یا بے بے سے کہو جو ڈھیر دوائیوں کا پی کے ٹن بیٹھی ہے تاکہ کوئی کام نہ کرنا پڑے..... یا پھر ڈرامہ سے کہو جسے نیا نیا شوق چڑھا ہے صنم بلوچ بننے کا ہونہہ..... منہ سعدیہ امام ورگا..... عمر ناہید شبیہ جتنی..... تے چاہ صنم بلوچ والے۔"

"اٹھ کے مر..... دودھ پتی بنا کے لا۔ نئیں تے میں نے پشاوری چپل اتار لینی ہے۔"

وہ جس دن شان کی فلم دیکھ کے آتا تھا۔ اس دن تیور ہی اور ہوتے تھے روبینہ پہ خاطر خواہ اثر ہوا۔ ٹسوے بہاتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہم عورتوں کی تقدیر میں رونا ہی رونا لکھا ہے..... ہائے او! میڑیا ربا..... مڑدوں کا ہی راج کرانا تھا تو نے۔"

"او بس او ئے۔" اکمل نے گھبرا کے چیخ ماری۔

"کتنی بار ساروں نے ٹوکا ہے تجھے کہ سارے جملے بول لا کر..... یہ "ر" اور "ڑ" نے بھرے ہوئے جملے بول کے کیوں دوسروں کا صبر آزماتی ہے اور بات سن..... دودھ پتی کے ساتھ تھوڑی سی کھیر لے آ اور پلاؤ میں سے دو کو چٹھی کی بوٹیاں نکال کے لا دے۔"

"گھر سے بھی کھا کے گئے۔ باہر سے بھی کھا کے آ رہے ہو..... ناں یہ کیسی بھوک ہے جو مٹتی ہی نہیں۔"

"تو میرے نوالے نہ گن' اپنے ڑ گن۔"

ادھر روبینہ نکلی' ادھر اس نے سگریٹ سلگائی اور ادھر تائی اندر داخل ہوئیں۔

"اکمل..... وے' اپنے پیو کو فون کر۔"

"آجائیں گے امی! ایئر پورٹ کوئی نزدیک تو نہیں' ڈیڑھ گھنٹہ آنے کا' ڈیڑھ گھنٹہ جانے کا لگتا ہے۔"

"پر اب تو چھ گھنٹے ہونے والے ہیں' کر فون' فریحہ نے کہا ہے' اس کا نمبر اٹھا ہی نہیں رہے۔"

"میرے پاس فون نہیں ہے۔"

"ہیں' کتھے گیا' چوری ہو گیا۔"

"نہیں نہیں' چوری نہیں ہوا' ایسے ہی میں نے ذرا۔"

مگر تائی امی نے اس کی پوری بات سننے کی زحمت ہی نہ کی۔

"اچھا..... بیچ آیا' بیڑا تریا' فلم دیکھنے اور تکے کباب کھانے کے لیے فون بیچ دیا؟ کب عقل آئے گی تجھے؟ بیوی بچوں والا ہو گیا ہے' مگر کرتوت' پورا اپنے چاچے پہ گیا ہے' سہیل بھی بڈھے وارے تک ایسے ہی کرتوت گھولتا رہا ہے۔"

"اوہو' کوئی تکے کباب کھانے کے لیے نہیں بیچا فون' وہ تو میں نے۔"

"آہو..... روبینہ کے چاہ پورے کرنے کے لیے بیچا ہو گا۔ پرسوں لگا تھا اس کا انار کلی کا پھیرا' اس کی شاپنگوں کے لیے تو تو گدے بھی بیچ دے' موبائل فون کی چیز اے۔"

"او کوئی میری وی سنے گا؟"

اب ہوا وہ آپے سے باہر' اور اب لگی ماں کو چپ۔

"بیچا نہیں ہے فون دیا ہے' بلکہ دیا بھی کیا' دادا جی نے بدو بدی (زبردستی) لے لیا۔"

"ابا جی نے؟"

"تے ہور کی؟ میں بھونکتا جا رہا ہوں' بھونکتا جا رہا ہوں' تن بھی لو کتے کی' اپنے ہی اندازے مارے جا رہے ہو' دادا جی کو شوق چڑھا تھا کہ ایئر پرٹ جا رہا ہوں تو کیمرے والا موبائل ساتھ لے کے جانا ہے' ضد کر کے لے لیا۔"

☼ ☼ ☼

کوئی پانچویں بیل پہ دوسری جانب سے کال ریسیو کی گئی تو تاؤ جی نے رعب بھری بے تابی سے پوچھا۔

"اوئے' کھوتیا' فون جلدی کیوں نہیں چکتا۔"

"تمیز نال۔"

دوسری جانب سے دادی جی نے گھر کا' تو تاؤ جی لمحہ بھر کے لیے ٹھٹک' مگر پھر اور بھی اشتعال کے ساتھ للکارا۔

"بے غیرتا' نامانیا' ابا جی کی آواز نکال کے مجھے جھڑکتا ہے۔"

"او تو ہے کتھے؟ مجھے نکال' میں پھنس گیا ہوں' کھوتے دے گھر' میں تیرا پیو ہی ہوں' میرے پاس ہے اکمل کا فون۔"

"ہیں؟ ابا جی؟" تاؤ جی کے دیدے پھٹ گئے' سرفراز بھی متوجہ ہو گیا۔

"کیا ہوا؟ پتا چلا ابا جی کا' کہاں ہیں؟"

"کیا؟ لیٹرین میں؟" دوسری جانب سے کچھ سن کے تاؤ جی نے بڑے اچنبھے سے پوچھا۔

"مگر واش رومز تو آپ نے چیک کیے تھے۔"

سرفراز کے اس سوال کو تاؤ جی نے ہو بہو پنجابی میں

دہرا دیا۔ دوسری جانب سے جو جواب ملا اسے سنتے ہوئے ان کے دیدے صرف پھٹ ہی نہیں رہے تھے بلکہ باہر کو ابل بھی رہے تھے۔ مرے مرے انداز میں فون جیب میں ڈالتے ہوئے اس سے بھی مرے مرے لہجے میں کہنے لگے۔

"چل پھر... لیٹرین میں بند ہیں وہ۔"

"مگر آپ تو چیک کر آئے تھے۔"

"میں نے مردوں والے چیک کیے تھے، زنانیوں والے نہیں کیے تھے۔"

"زنانیوں والے؟ مطلب وہ لیڈیز واش روم میں ہیں؟"

"آہو وہاں جانے کے بعد باہر سے عورتوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں تو ڈر کے مارے باہر ہی نہ نکلے کہ زنانیوں سے لتر نہ پڑ جائیں، اب بھی ڈر کے مارے اندر ہی چھپے ہوئے ہیں کہ کسی نے یہاں سے نکلتے دیکھ لیا تو پلس کے حوالے نہ کر دے۔"

"حد ہو گئی۔"

☼ ☼ ☼

یوں فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں، جب وہ سب گھر پہنچے، دادی اور سرفراز چاچا کے ملن کے جذباتی منظر، سب آل اولاد کے آپس کے تعارف، اور پھر ایک دوسرے کے ساتھ "اوئے تم کتنے بدل گئے ہو" جیسے جملوں کے تبادلے کے بعد بڑے اہتمام کے ساتھ دادا جی کا تازہ کارنامہ سنایا گیا۔ جسے سننے سے بچنے کے لیے بلکہ اس پہ تبصروں کو سننے سے بچنے کے لیے دادا جی فجر کی نماز ادا کرنے مسجد تک چلے گئے۔ حالانکہ وہ جمعے کے جمعے مسجد کو درشن دیا کرتے تھے۔

خوب مزے لے لے کے اس قصے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے چائے باقرخانی کا ہلکا پھلکا ناشتا کرنے کے بعد سب نے بستروں کی راہ لی۔

پلاؤ... جس میں سے بوٹیاں ویسے بھی ایک ایک کر کے اڑ چکی تھیں اور کھیر، جس کے اوپر سے بادام پستے کی ساری ہوائیاں چن لی گئی تھیں۔ وہ پڑے کا پڑا رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

ندیم کبھی ایک طرف کروٹ بدل رہا تھا۔ کبھی دوسری طرف، سرفراز چچا کی بیٹی تو اس کے اندازوں سے بڑھ کے حسین تھی۔ بلکہ دونوں ہی۔ صبا بھی اور لوبو بھی... بس لوبو کچھ عجیب سی تھی اور اس سے کافی چھوٹی بھی... پکی امریکن لگتی تھی۔ ایک لفظ اردو کا نہیں آتا تھا۔ پہنتی بھی جینز شرٹ تھی اور جینز بھی گھٹنوں سے ذرا نیچے اور شرٹ ایسے پھنسی ہوئی کہ سانس بھی مشکل سے آتا ہو گا۔ البتہ صبا کافی حد تک اپنی اپنی سی لگ رہی تھی۔ نہ تو اس نے لوبو کی طرح بالوں کی اگلی لٹیں سفید اور سرخ رنگی ہوئی تھیں۔ نہ دونوں نتھنوں کے درمیان بالی اٹکائی ہوئی تھی۔

شانوں سے نیچے آتے بھورے بال... جو بے شک زیادہ گھنے نہیں تھے۔ مگر سیدھے اور ریشمی ضرور تھے۔ صاف گندمی رنگت، ناک سرفراز چچا کی طرح موٹی اور ہونٹ بھی ان کی طرح قدرے باہر کو لٹکے ہوئے تھے۔ مگر ہنستے ہوئے اچھی لگتی تھی، آنکھیں بالکل چنی منی ہو جاتی تھیں ہنستے سے اور گال گول مول سے... بالکل چینی گڑیا لگتی، اچھی خاصی اردو بھی بول لیتی تھی اور انگلش لب و لہجے میں اردو بولتی کتنی میم سی لگتی تھی۔ خاصی گھریلو بھی تھی۔ سب کے ساتھ مل کے چائے کے برتن بھی اٹھائے، اپنا بستر بھی کسی کو نہ بچھانے دیا۔ خود بڑھ بڑھ کے کام کر رہی تھی۔

"چلو... یہ قصہ تو ختم ہوا۔ جیسے ارم کی مسرت بھابھی اور روبینہ بھابھی سے کام کے معاملے میں چخ چخ ہوتی رہتی ہے ویسے فریحہ کی میری صبا سے نہیں ہو گی۔"

صبا فوراً "میری صبا" ہو گئی۔

اچھی خاصی ہے بے چاری، چلے گی۔

خود ہی فیصلہ دے دیا گیا اور پھر اطمینان بھری انگڑائی کے ساتھ آنکھیں موند کے اگلے خواب بننے گئے۔

☼ ☼ ☼

"تمہیں کیسے لگے چچا کے بچے۔"

چونکہ ایک کمرا سرفراز اور اس کے بچوں کے لیے خالی کر دیا گیا تھا۔ اس لیے باقی گھر والے اوپر نیچے ہو کے ایک دوسرے پہ چڑھے سو رہے تھے۔ اوپر والے برآمدے میں فریحہ اور ارم ایک ہی گدے پہ چڑھی، ایک ہی رضائی میں دبکی سرگوشیوں میں بات کر رہی تھیں۔ سرگوشیوں میں اس لیے کہ اسی برآمدے میں اس کمرے کا دروازہ کھلتا تھا جہاں امریکہ والے سو رہے تھے۔

"چچا کے بچے ہی لگ رہے ہیں اور کیا لگنا ہے۔"

فریحہ نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"ہائے ہائے تو میں کب کہہ رہی ہوں کہ اوباما کے بچے لگ رہے ہیں۔ مطلب کیسے لگ رہے ہیں۔"

"صاف بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے بچے ہی نہیں لگ رہے۔ کب سے شور مچا ہوا تھا کہ سرفراز انکل بچوں کے ساتھ آ رہے ہیں، بچوں کے ساتھ آ رہے ہیں، ذہن میں ایک خاکہ سا بن گیا تھا کہ وہ واقعی کچھ شریر سے، کچھ کھلنڈرے سے بچوں کے ساتھ آ رہے ہوں گے، یہ تو اچھی خاصی عمروں کے ہیں، بیٹا پورا "پائی" لگ رہا ہے۔ سنا ہے ندیم بھائی سے بھی چھوٹا ہے۔ دیکھنے میں تو اتنا بڑا لگتا ہے اور صبا کہنے کو میری ہم عمر ہے، مگر آپا لگ رہی ہے، موٹی بھی اتنی ہے، فٹنگ والی قمیص میں تین، تین پیٹ بنے ہوئے تھے اس کے، اور وہ بولو۔"

"بولو... نہیں لوبو۔"

"ارم نے تصحیح کی۔"

"اوہو...! ایک نقطہ ہی ہے نا، چاہے پہلے لگا دو، چاہے بعد میں، وہ کہاں سے چودہ سال کی لگتی ہے، اتنی اونچی لمبی، چوڑی، تگڑی۔"

"باہر کی خوراکیں سنا ہے اچھی ہوتی ہیں، بچے جلدی بڑھتے اور پھولتے پھلتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی ارم تصور میں چلی گئی، اپنے گل گوتھنے موٹے تازے انگریز نظر آتے بچوں کے ساتھ۔

"یا اللہ... سرفراز چچا کے بچوں میں سے تو کوئی میم ماں پہ نہیں گیا۔ اب پوتے، پوتیاں ضرور دادی پہ چلے جائیں۔ چٹے دودھ رنگ سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے۔"

اس نے چپکے سے دعا کی۔

"ویسے مجھے ان سے مل کے ذرا مزا نہیں آیا۔"

فریحہ نے سر کھجاتے ہوئے دل کی بات کی۔

"لے... مجھے تو اتنا آیا۔" ارم نے آنکھیں میچ کے اس سین کا مزا لیا جب اس نے جھجکتے شرماتے اویس کو سلام کیا اور اویس نے جھٹ ہاتھ آگے کر دیا، ملانے کے لیے، تب ارم نے بھی ساری شرم و جھجک بالائے طاق رکھتے ہوئے فٹ ہاتھ ملا لیا، کہ پتا نہیں موقع دوبارہ ملے نہ ملے۔

"خاک مزا آیا... بالکل عام سے تو ہیں تینوں کے تینوں، کوئی باہر سے آنے والوں جیسی بات ہی نہیں۔"

"مثلاً؟ کون سی بات؟"

"دیکھو نا، باہر سے دو طرح کے لوگ آتے ہیں۔ ایک تو بالکل ماڈرن، پکے امریکی، لڑکیوں نے آدھے کپڑے پہنے ہوں، لڑکوں نے لمبے لمبے بال رکھے ہوں، نیکریں پہنی ہوں، منہ ٹیڑھا کر کے بولتے ہوں، سگریٹیں اور شراب پیتے ہوں۔"

"توبہ توبہ، استغفار..." ارم نے جھرجھری لی۔

"یا پھر دوسری طرح کے... ان کا بھی آج کل بڑا فیشن ہے، آتے امریکہ، لندن یا فرانس سے ہیں، دیکھ کے لگتا ہے سیدھے رائے ونڈ سے آ رہے ہیں۔ عورت نقاب، حجاب اور برقعہ میں، مرد داڑھی کے ساتھ اونچی شلوار میں... مجھے بھی لگ رہا تھا کہ اگر تو جوڈی آنٹی کا رنگ چڑھا ہوا تو پہلی والی بات صحیح ہو گی اور اگر انکل نے بازی ماری ہوئی تو بڑی اسلامی سواری اترے گی۔ مگر یہ تو بالکل پھیکے ہیں، نارمل سے... عام سے، جیسے باقی سارے لوگ ہیں، ہونہہ، کوئی تو نئی... سب سے الگ بات ہوتی۔"

☼ ☼ ☼

سرفراز کو سارے ہی بڑے بدلے بدلے۔۔۔ عجیب سے لگ رہے تھے۔ دادا جی' دادی جی تو ظاہر ہے عمر کے اثرات کی وجہ سے بدلے ہوئے لگ رہے تھے' مگر باقی سب بھی کئی ایک کو تو وہ پہچان بھی نہ پایا۔ جیسا کہ تائی امی' یعنی اس کی بڑی بھابھی' جو کئی من وزن بڑھا چکی تھیں۔ ان گنت بیماریاں پال چکی تھیں۔ بلا مبالغہ وہ اشرف تاؤ جی سے کوئی دس' پندرہ سال بڑی لگتی تھیں اور سہیل۔۔۔ جس کے مزاج سرفراز کو خاصے سدھرے ہوئے لگے اور یہ واحد مثبت تبدیلی تھی جو اس نے نوٹ کی۔۔۔ ورنہ آوے کا آوا وہی تھا۔ اکمل سے مل کے لگا سہیل کی جوانی سامنے آگئی ہو۔ وہی اکھڑ لہجہ' وہی بے دید' بے مروت اطوار' وہی جنگلی پن' وہی سستی' وہی کاہلی' اور وہی ہر کسی سے ہر وقت کی منہ ماری۔

اجمل کی بالکل ہی لٹیا ڈوب چکی تھی۔ جیسے نیم حکیم خطرہ جان ہوا کرتا ہے ایسے ہی مذہب کا آدھا علم بندے کو درندہ بنا دیتا ہے۔ الو طوطے کی طرح اس نے نیم خواندہ ملاؤں سے کچھ سبق رٹ تو لیے تھے۔ مگر دین کی روح میں اترنا تو دور کی بات' اس نے سطح تک کو نہ چھیڑا تھا' اس لیے انتہائی تکلیف دہ شخصیت بن کے سامنے آیا تھا۔

اشرف تاؤ جی اتنے ہی کنجوس۔۔۔

چھوٹی بھاوج' یعنی چاچی جی اتنی ہی خطرناک حد تک سگھڑ اور چپ چاپ۔

ندیم گود میں تھا جب وہ پاکستان سے گئے تھے اور اب بھی ایسا ہی لگ رہا تھا کہ نہ وہ خود ماں کی گود سے اترنے کو تیار تھا' نہ ہی ماں کا موڈ تھا اسے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونے کا موقع دینے کا۔

مگر ابھی اتفاق سے اسے وہی ملا تھا جو عرصہ پہلے جوڈی کے ساتھ آنے پہ ملا تھا اور غالباً" تب کے بعد اسے اب قلعی نصیب ہوئی تھی۔ مگر قلعی ہونے کے باوجود وہ اپنی خستہ حالی کی گواہی دے رہا تھا۔ چیں چیں پاں پاں کرتے دروازے۔۔۔ وہی چھلانگ مار کے واش روم میں جانے کا رستہ۔۔۔ وہی نیلا واش بیسن۔۔۔ جس کے سب نل اب ٹپک رہے تھے۔

"یا اللہ۔۔۔ کوئی اتنا مستقل مزاج کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے سالوں میں یہ لوگ گھر میں اک نئی کرسی تک کا اضافہ نہیں کر سکے۔ پردے تک نہیں بدل سکے' جہاں جہاں سے فرش اکھڑا تھا' اسے بھروا تک نہیں سکے' حتیٰ کہ جن پیالیوں میں چائے لائی گئی وہ وہی بڑی بھابھی کے جہیز کا مشہور و معروف سیٹ ہے' جو خاص مہمانوں کی آمد پہ جھاڑ پونچھ کے نکالا جاتا ہے' اف۔۔۔"

☼ ☼ ☼

صبح کا آغاز ویسا ہی ہوا جیسا کہ پچھلے چار عشروں سے اس گھر میں ہوتا آرہا تھا' معمولی تبدیلی کے ساتھ۔

کبھی ریڈیو پہ مالا بیگم اور احمد رشدی کے گانوں کے ساتھ ہوتا تھا۔

کبھی پی ٹی وی پہ چاچا جی تارڑ صاحب کی گپ شپ کے ساتھ۔

اور اب شائستہ واحدی کی بک بک کے ساتھ۔

"یہ لیڈی اتنی ان کمفرٹیبل کیوں ہیں؟"

لوبو نے شائستہ واحدی کو غور سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا جو اپنی جگہ پہ بیٹھے بیٹھے بار بار اچھل رہی تھی' ہتھیلیاں مسل رہی تھی اور بغلیں بجا رہی تھی۔

"اوہ۔۔۔ آئی سی' ان کو سردی لگ رہی ہے۔"

وہ اپنے طور پہ اندازے لگاتی جارہی تھی اور فریحہ بار بار جواب دینے کے لیے منہ کھولتی' مگر اس کے دوبارہ بولنے پہ بے بسی سے بند کر لیتی۔

"صدقے جاواں۔۔۔ سویرے سویرے جاگ گئی میری پوتری' نی فریحہ' شرم کر۔"

دادی نے لوبو کو صبح کے ساڑھے نو بجے ہی ٹی وی کے آگے ڈٹا دیکھا تو نثار ہو گئیں اور لگیں فریحہ کو سنانے جو ساتھ بیٹھی جمائیوں پہ جمائیاں لے رہی تھی۔

"تجھے تو چھٹی والے دن سونے کے علاوہ کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔ اسے دیکھ' اتنا لمبا سفر کر کے آئی ہے' مگر جاگ گئی' کتنی دیر سے میں اس کی آواز سن رہی

تھی۔"

"اوکے گرینڈ مام' اوکے ایلڈر سسٹر"

اس نے باری باری فریحہ اور دادی کے گالوں سے اپنے پھولے ہوئے گال مس کیے۔

" im going to sleep now "

(میں اب سونے کے لیے جارہی ہوں۔)

"ہاں ہاں پرونٹھے پکا رہی ہوں۔"

دادی نے سمجھا شاید وہ ناشتے کی ڈیمانڈ کر رہی ہے۔

وہ ہاتھ ہلاتی اوپر کی جانب جانے لگی تو دادی نے گھبرا کے فریحہ کے کاندھے کا جوڑ ہی ہلا دیا۔

"نی۔۔۔ روک اسے۔۔۔ ناراض ہو گئی؟ ہور پرونٹھے نہ کھانا ہوں اس نے۔۔۔ اسے انگریزی میں روک۔۔۔ بتا ڈبل روٹی اور انڈے بھی منگائے ہیں۔"

"جانے دیں اسے دادی۔۔۔ اسے نہ پراٹھے کھانے ہیں' نہ انڈا بریڈ' رات بھر کی جاگی ہے' اب سونے جارہی ہے۔"

فریحہ نے بے زاری سے کہا تو دادی کا پوپلا ہوتا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"ہیں! سونے جارہی ہے؟ تو ساری رات کیا کرتی رہی ہے؟"

"اس سے پوچھیں جا کے۔۔۔ میرا کاندھا ہلا کے رکھ دیا ہے۔" وہ شانہ سہلاتے ہوئے بدمزاجی سے بولی۔

"بھارے پہلوان جیسے مونڈھے (کاندھے) ہیں تیرے' مجھ بڈھی کے ہتھ لگانے سے ہلتے ہیں' بکواس کرتی ہے۔"

دادی نے پہلے اسے گھر کا' اس کے بعد دوبارہ اپنی تشویش کا اظہار کیا۔

"پر ایہہ سوئی کیوں نہیں راتی؟"

"اف۔۔۔" فریحہ اٹھ کے ہی چلی گئی۔

اس کے بعد اس تشویش کا اظہار فرداً" فرداً" سب نے ہی کیا۔ کیونکہ صرف لوبو ہی نہیں بلکہ صبا اور اویس بھی دن چڑھے ہی سوئے اور ظاہر ہے ان کے رات بھر جاگنے کی گواہی بھی کئی ایک نے دی۔

"مسٹر فراز چاچو نے اولاد کی تربیت ٹھیک نہیں کی' ان کے طریقے شریفوں والے نہیں ہیں' رات کو جاگنا' سویرے سونا۔"

روبینہ کے خیال کی تائید مسرت نے زور و شور سے کی۔

"آہو۔۔۔ باہر سے جو آئے ہیں' چلو اچھا ہے' ہمیں سارا وقت طعنے دینے والوں کے منہ تو بند ہوں۔"

"نہ جی' منہ کتھوں بند ہونے ہیں' اپنے سکوں کے عیب کوئی نہیں دیکھتا۔"

ادھر روبینہ نے بڑے سیانے پن کے ساتھ یہ بات کی' ادھر مسرت نے بڑے اپنے پن کے ساتھ اس کی بلائیں لینا شروع کیں۔

"صدقے۔۔۔ میں قربان۔۔۔ میں واری۔"

"ہیں' کی ہویا؟"

وہ اچانک اس عقیدت کے اظہار پہ ہکا بکا رہ گئی۔

"پہلی دفعہ تو نے کوئی ایسا جملہ پورا بولا ہے' جس میں نہ ر' ہے نہ ڑ' شاباش' ایسی ہی باتیں کیا کر۔"

"اوہو' آپ لوگوں کو اتنا بھی نہیں پتا' وہاں سے آنے والوں کی نیند ایسے ہی کتنے کتنے دن خراب رہتی ہے' بھئی وہاں اس وقت رات ہوتی ہے' اور جب ہماری رات ہوتی ہے' ان کا دن چڑھا ہوتا ہے۔"

"کچھی مت ہے ان لوگوں کی۔"

مسرت کو ارم کی وضاحت ذرا پسند نہ آئی' بالکل ایسے ہی جیسے ارم کو اپنے متوقع سسرال والوں کے بارے میں ان کی ہرزہ سرائی قطعاً" پسند نہ آرہی تھی۔ اس کا تو بس نہ چل رہا تھا' سرفراز انکل کے پورے کنبے کے سامنے بچھ بچھ جائے۔

یہی حال ندیم کا تھا۔ جب چاچی جی نے بس یوں ہی ذرا سی تنقید صبا کے بے ڈھنگے پن سے ہنسنے پہ کر ڈالی۔

"توبہ' کیسا بھگیاڑ جتنا منہ کھول کے ہنستی ہے' بھلا لڑکی ذات بھی ایسے قہقہے لگاتی ہے۔"

تو وہ تڑپ گیا۔

"کیا ہو گیا ہے امی! مہمانوں کو تو بخش دو' اور مجھے پورے لہور میں کوئی ایسی لڑکی دکھا دو جو منہ پھاڑ کے نہ ہنستی ہو' کئی ایک کی تو آخری داڑھ تک' بلکہ کوا تک

نظر آتا ہے۔"

"تو بڑے غور سے کڑیوں کو دیکھتا ہے؟؟"

چاچی جی کو الگ صدمہ لاحق ہو گیا۔ ویسے بھی ملنے جلنے والیاں ان کو اکثر یہ دھڑکا لگائے رکھتی تھیں کہ جوان بیٹے کو کسی کھونٹے سے نہ باندھا تو وہ اِدھر اُدھر منہ ماری کرنے لگے گا۔

"انسان ہوں' کولہو کا بیل نہیں ہوں' جس کی آنکھوں پہ کھوپے چڑھا کے چھوڑا ہو کہ بس چکر لگائے جاؤ' نظر کچھ نہیں آتا۔"

"پر مجھے بڑا کچھ نظر آرہا ہے۔" چاچی نے شک بھری نظروں سے اسے گھورا۔

آج کل تیار بھی بڑا رہنے لگا تھا۔

نئے نئے اسٹائل کے بال۔

ٹانگوں سے چپٹی پتلونیں۔

آدھے بازوؤں کی شرٹیں۔

خوشبو والی کریمیں۔

اوپر سے کھرچ کھرچ کے شیو بنانا۔

"تیرے رنگ ڈھنگ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتے ندیم!" اس کو اوپر جاتے دیکھ کے وہ تشویش سے بڑبڑائیں۔

☼ ☼ ☼

"ہور سنا پتر' کیسے گزرے پردیس کے دن۔"

دادا جی کی ایئرپورٹ والی شرمندگی ذرا کم ہوئی تو رات کو سارے گھر والوں کے جمگھٹے میں اس سے پوچھا' دن تو سرفراز کی فیملی کا سوتے گزرا تھا۔ ان کے جاگنے کے انتظار میں باقی سب بھی اونگھتے ہی رہے۔

کسی کو سوٹ کیس کے کھلنے کا انتظار تھا۔

کسی کو سرفراز انکل کے خود کھلنے کا انتظار تھا۔

اور ارم اور ندیم کو اپنی اپنی قسمت کے کھلنے کا انتظار تھا۔

"بس ابا جی... !شکر ہے اللہ کا' بڑی عزت دی ہے اس کی ذات نے۔"

تاؤ جی اشرف اور چاچا جی سہیل کے منہ ذرا سے لٹک گئے۔ انہیں تو کچھ اور سننے کی چاہ تھی' مثلاً

"بس جی... پردیس کی زندگی بھی کوئی زندگی ہوتی ہے' کچھ نہ پوچھو' بڑی کتے والی ہوئی ہے میرے ساتھ' وغیرہ وغیرہ۔"

اور تب وہ جواب میں اس کے ولایت جانے کے نقصانات اور مضمرات پہ روشنی ڈالتے' بلکہ کچرے کا ڈھیر ڈالتے اور اپنے ہوش مندانہ فیصلے کی داد اس سے زبردستی وصولتے کہ انہوں نے نامساعد حالات کے باوجود ملک کی مٹی نہ چھوڑی' یہیں رہ کے بم دھماکوں' مہنگائی' ڈینگی' برڈ فلو' سیلاب اور کالے چوروں سے بڑھ کے حکمرانوں کا یکے بعد دیگرے سامنا کیا۔

"اتنی اچھی گزری ہوتی تو پھر وطن واپس کیوں آتا تو؟" دادا جی نے بیٹوں کے دل کی بات کی۔

وہ دونوں کھل اٹھے۔

"ابا جی... بری گزری ہوتی تو اتنے سال پہلے ہی واپس آگیا ہوتا۔ دراصل میں نے بتایا تو تھا کہ بچوں کی شادی اور ان کے رشتے کے سلسلے میں واپس آنا ہوا ہے۔"

"بچوں کے؟" دادی چونکیں۔

"پہلے تو تم نے صبا کے رشتے کی بات کی تھی۔"

"ہاں... مگر پھر سوچا تو یہ ہی فیصلہ کیا کہ بہو بھی یہاں سے ہی لے جاؤں' روز' روز کہاں پاکستان آنا ہوتا ہے۔"

ارم تو شرمانے کے بہانے دوپٹہ دانتوں میں دبائے وہاں سے اٹھ کے چلی گئی' مگر فریحہ باوجود چاچی کے ٹھوکوں کے ٹس سے مس نہ ہوئی' وہ ان خیالات کی تہہ تو کیا' سطح تک بھی پہنچنے کی اہلیت نہیں رکھتی تھی جو چاچی کے دل میں پیدا ہو رہے تھے۔ اس کی ساری دلچسپی تو بس بند سوٹ کیس تک محدود تھی جو کھلنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

سرفراز انکل البتہ تھوڑا سا اور کھلے۔

"حالانکہ جوڈی ذرا ہچکچا رہی تھی' اصل میں اس نے اپنی کچھ انڈین اور پاکستانی فیمیلز سے وٹے سٹے کی شادیوں کے بارے میں بہت کچھ غلط سن رکھا ہے'

اسے ڈر تھا اس شادی' بلکہ شادیوں کا نتیجہ بھی یہ ہی کچھ نہ ہو' مگر میں نے اسے تسلی دی کہ اب وہ دور نہیں رہا۔ اب کہاں یہ سب ہوتا ہے اور پھر نئی نسل تو بہت سمجھ دار اور باشعور ہے' وہ ان باتوں کو اہمیت نہیں دے گی' کیوں سہیل! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ ہے نا اشرف بھائی جان؟"

"ہاں ہاں' بالکل۔"

"اور کی؟ آج کل ان باتوں کو کون پوچھتا ہے؟؟"

دونوں زور و شور سے سر ہلا ہلا کے تائید کر رہے تھے۔ چاچی سے اگرچہ کسی نے دریافت نہیں کیا تھا مگر ان کا بھی مٹکے جیسا سر ایک ردھم سے ہل رہا تھا۔

ہونٹوں پہ بڑی میدان مار لینے والی مسکراہٹ تھی۔ لفظ وٹے سٹے نے ان کے اندر پھول ہی پھول کھلا ڈالے تھے۔ ظاہر ہے ان کا ندیم' اور ان ہی کی فریحہ' ندیم کی بھی باچھیں کھل اٹھیں۔ البتہ فریحہ ابھی تک حریصانہ نظریں سوٹ کیس پہ گاڑے بیٹھی تھی۔

اس بار چاچی نے صرف ٹھوکے پہ بس نہیں کیا۔ پورے کا پورا ہلا ہی ڈالا بے چاری کو' اور دبی آواز میں گھر کا بھی۔

"جا... دفع بھی ہو اندر' تیرے سامنے وہ کھل کے بات کیسے کرے گا' اندر مر۔" وہ برے برے منہ بناتی اٹھ گئی۔

ندیم مگر اور بھی پھیل کے بیٹھ گیا۔ ان کی امیدیں جو بر آنے والی تھیں۔

"مگر سرفراز... وٹہ سٹہ پھر وٹہ سٹہ ہوتا ہے' اونچ نیچ تو ہو ہی جاتی ہے۔"

دادا جی کے بلاوجہ نکتہ اٹھانے پہ چاچی جی اور ندیم دونوں نے انہیں سخت نظروں سے گھورا۔

"نہیں ابا جی... جب ہم کسی کی بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھیں گے تو وہ بھی ہماری بیٹی کو اپنی بیٹی سمجھے گا' بس انسان کو خود ٹھیک ہونا چاہیے' ہے نا بھابھی۔"

اس بار چاچی جی کو عزت بخشی گئی۔

"ہاں ہاں... بیاہ کے آنے والی بھی بیٹی' رخصت ہو کے جانے والی بھی بیٹی' بلکہ دہرے رشتے سے تو اور بھی تعلق مضبوط ہوتا ہے۔"

بڑھ چڑھ کے حمایت انہوں نے نہیں کرنا تھی تو اور کس نے کرنا تھی۔

"اور ویسے بھی... ابھی میں نے کون سا طے کیا ہے کہ میں وٹہ سٹہ پراپر کروں گا' یا۔"

"پراپڑ؟ وہ کیا ہوتا ہے انکل جی؟"

روبینہ نے بھی گفتگو ر گیدنے کے لیے ہی منہ کھولنا تھا۔

"میرا مطلب ہے' ایک وٹہ سٹہ تو وہ ہوتا ہے جو دو سگے بہن بھائیوں کی دوسرے سگے بہن بھائیوں سے شادی کو کہتے ہیں۔ لیکن اگر دو سگے بہن بھائیوں کی شادی دو کزنز کے ساتھ ہو تو اسے تو وٹہ سٹہ نہیں کہیں گے نا؟"

اس پہ جہاں تائی امی کا مرجھایا ہوا چہرہ پھر سے اصل تب و تاب میں آگیا' وہیں چاچی ذرا الجھ سی گئیں' ندیم البتہ اب بھی پرامید تھا' بلکہ پریقین۔

کیونکہ صبا کے لیے تو وہ پورے گھر میں اکلوتا امیدوار تھا۔ وہ مسلسل مسکرائے گیا۔

☼ ☼ ☼

"بھلا کیا تھا جو سرفراز میری فریحہ کو پسند کر لیتا' اسے بھی اپنے اچھے بھلے لڑکے کے لیے وہ ارم ہی نظر آئی تھی' چھچھوباندری۔"

چاچی جی کا پارہ ہائی تھا۔

"چلو... فریحہ نہ سہی' ارم سہی' وہ بھی اپنی بچی ہے۔" مگر سہیل چاچا جی کا یہ اعلا ظرفی کا مظاہرہ ان کی بیگم کو ذرا پسند نہ آیا۔

"ایویں اپنی ہے' اپنی اپنی ہوتی ہے' میں تو کہتی ہوں چاہے وہ ندیم کو جوائی بنانے کا فیصلہ نہ کرتے' فریحہ کو بہو ضرور بنا لیتے' اگر ہمارے دونوں بچوں سے رشتہ کرتے ہوئے انہیں وٹے سٹے کا وہم تھا تو۔"

"پاگل ہوئی ہے؟ ناشکری نہ کر' ندیم کے دن پھر گئے ہیں۔ زندگی بن جائے گی اس کی' سرفراز کا جوائی بن کے۔"

"اس نے تو کسی نہ کسی کا جوائی آسانی سے بن ہی جانا تھا۔ لڑکوں کا کیا ہے... مگر بیٹی ٹھکانے لگانا بڑا مشکل ہے آج کے زمانے میں۔"

"اب وہ وقت نہیں رہا' مردوں کو بھی قدم جمانے کے لیے اتنے ہی ہاتھ پیر مارنے پڑتے ہیں جتنے بیٹی کے لیے رشتہ تلاش کرنے میں' ادھر اس نے کیا کرنا تھا' چائنا کے آئے پوتڑے ہی تھڑے پہ بیٹھ کے بیچنے ہیں۔ ولایت جائے گا تو سرفراز کی طرح باؤ بنے گا۔ پیسے کمائے گا' اس کے بچے فرفر انگریزی بولیں گے۔"

"ہاں... مگر فریحہ۔"

ان کی سوئی اب تک اسی پہاڑ تلے دبی تھی۔

"باہر کی کمائیاں آئیں گی تو رشتے بھی تگڑے آئیں گے' جس کا اکلوتا بھائی ولایت سے جہیز بنا بنا کے بھیج رہا ہو' اس بہن کا رشتہ دیکھنا کتنی اونچی جگہ ہوتا ہے۔"

آخر کار چاچا جی انہیں تسلی دینے اور امید دلانے میں کامیاب ہو ہی گئے۔

☼ ☼ ☼

ادھر دوسرے کمرے میں ارم اترا رہی تھی اور تائی امی اس کی بلائیں لے رہی تھیں۔

"دیکھا اجمل کے ابا' کیسے دن رات تم مجھے طعنے دیتے تھے کہ میں نے بیٹی کا کچھ نہیں سوچا' بیٹے بیاہ دیے' لو اب دیکھو کیا ہے کہ نہیں بیٹی کا رشتہ' وہ بھی ایسی اچھی جگہ پہ۔"

"نہ اس میں تیرا کیا کمال ہے؟"

تاؤ جی اشرف بیوی کے اس سیانے پن پہ چیں بہ جبیں ہوگئے کہ کیا سب کچھ اپنے کھاتے میں ڈال لیا۔

"آخر میری تربیت ہے یہ' جو سرفراز نے فریحہ کو چھوڑ کے ارم کو پسند کیا ہے اویس کے لیے' حالانکہ دیکھا جائے تو فریحہ کی شکل اپنی ارم سے لاکھ درجے اچھی ہے۔"

وہ اپنی سادگی میں بیٹی کی دم پہ پاؤں رکھ بیٹھیں۔

"امی جی۔" وہ شرمانا بھول کے بلبلا اٹھی' تو تائی امی گڑبڑا سی گئیں اور اس گڑبڑاہٹ میں مزید گل افشانی کر گئیں۔

"میرا مطلب ہے شکل تو اس کی ایویں سی ہے' مگر عمر کافی کم ہے نا ارم سے' مگر دیکھ لو' اتنی پکی عمر کی ہونے کے باوجود میری ارم ہی بازی مار گئی۔"

"امی جی۔" اس بار وہ احتجاجاً پیر پٹختی وہاں سے نکل گئی۔

"لے... رس گئی۔"

"جی نہیں' شرما رہی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"سرفراز کتنا سیانا نکلا' میں نے کہا جی۔"

دادی نے گھٹنوں پہ بام ملتے ہوئے کہا۔

"کھے تے سواہ سیانا... میرے لیے کھٹے رنگ کی بوشرٹ لے آیا ہے' اب میں اس عمر میں پتلون شرٹ پہنتا اچھا لگتا ہوں' وہ بھی کھٹے رنگ کی بوسکی کا سوٹ لے آتا۔"

"ہائے ہائے' میں اس کے رشتے والی بات کا کہہ رہی ہوں' سہیل سے کتنا آڑا لگا کے گیا تھا' مگر آیا ہے تو اسی سے رشتہ پکا کر رہا ہے۔"

"پر دٹہ سٹہ۔" وہ اب بھی متذبذب تھے۔

"کیہڑا وٹہ سٹہ... ندیم بھی چاچے کا جوائی بن رہا ہے اور اویس تائے کا جوائی' سارے اکو خون ہیں' تسی نویں نویں مسئلے نہ اٹھاؤ۔"

☼ ☼ ☼

"پتر! اپنی زنانی کو بھی لے آتے ساتھ۔"

کہیں دوسرے دن جا کے دادی نے دل بڑا کرتے ہوئے یہ سوال کر ڈالا۔ حالانکہ بے چارہ سرفراز کب سے منتظر تھا کہ کوئی تو اس بے چاری کا بھی نام لے' مگر اب رشتوں کا ذکر چھیڑنے کے بعد وہ اس عزت افزائی کے قابل سمجھا گیا کہ اس کی نصف بہتر کے بارے میں استفسار کیا جاتا۔

دادی کے پوچھنے کی دیر تھی۔ سمجھو یگ کا ڈھکن اٹھ گیا۔ سب بڑھ چڑھ کے جوڈی کو یاد کرنے لگے۔

"ہاں سرفراز! وہ کیوں نہیں آئی؟"

"اب تک ناراض ہے کیا؟"

"اس کے تل ختم ہوئے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ اور بھی بڑھ گئے ہیں؟"

"اسی طرح سوکھی سڑی ہے کہ کوئی ماس بوٹی بھی چڑھا ہے اسے؟"

"ہائے ہائے... پچھلی واری اسے کتنا شوق تھا گاں مجاں دیکھنے کا' اور گوبر کے اپلے دیواروں پہ لگے دیکھنے کا۔ اب لے آتے تو کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے دکھا ہی دیتے اسے۔"

"وہ بیمار ہے' آ نہیں سکتی۔"

سرفراز انکل کے آہ بھر کے کہنے پہ پھر سے سوالوں کا تابڑ توڑ سیشن شروع ہو گیا۔

"کیا ہوا اسے؟"

"میری طرح جوڑوں کا درد؟"

"نہیں بھابھی... آپ کے جوڑ تو اتنے وزن کی وجہ سے دب گئے ہیں' وہ تو سوکھی ہوئی تھی' پتلے بندے کو کیا ہونی ہے جوڑوں کی تکلیف۔"

"نی تجھے کیا پتا' ہو سکتا ہے اب وہ پاٹے (پھٹنے) والی ہو گئی ہو' بندے کے موٹا ہونے کا کوئی پتا چلتا ہے۔"

"لگتا ہے' چاچی جی کو بلڈ پریشر ہو گیا ہو گا۔"

"لو یہی ہوا ہو گا' پتلے بندے کا ہائی تو نہیں ہوتا۔"

"ہائے ہائے... فیر وہی بات۔"

تائی امی سے کسی کی اسمارٹ نیس اور دبلاپے کا ذکر ہضم نہیں ہوتا تھا۔

"پتلی تو وہ تب تھی' جب کڑی تھی' اب بال بچوں کے بعد ہورے کتنی موٹی ہو گئی ہو۔"

"فیر تے شوگر ہی ہو گئی ہو گی؟" دادی جی نے قیاس ظاہر کیا۔

"گردے تے نہیں فیل ہوئے شوگر سے؟"

دادا جی دور کی کوڑی لائے' پھر خود ہی حل پیش کر دیا۔

"ڈولسس کرا لینا... ادھر یتیم خانے کے چوک کے پاس جو اسپتال ہے وہاں مفت ہوتے ہیں' بس سفارش لڑانی پڑتی ہے۔"

"ڈولیس؟"

"دادا جی کا مطلب ہے ڈایالسس۔" فریحہ نے سرفراز انکل کا کنفیوژن دور کیا۔

"او... اچھا... اچھا... نہیں... نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے' ڈایالسس کی نوبت..."

مگر اس بے چارے کو بات پوری کرنے کا موقع کس نے دینا تھا۔

"ایسا کر' تو اپنا ایک گردہ زنانی کو دے دے۔"

تاؤ جی اشرف کے مشورے پہ وہ ہکا بکا رہ گیا۔

"جی؟"

"ہاں... تو کیا ہے... بڈھی ہے تیری' ویسے بھی ایک گردہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

"چل چل... کام کر... میرا سرفراز کیوں دے اپنا گردہ۔" دادی کی ممتا جاگ گئی۔

"تو ندیم سے کہہ... ساس کو گردہ دے دے۔"

دادی کے مشورے پہ چاچی تلملا گئیں۔

"یہ ندیم کا نام کیوں لے رہی ہیں آپ۔"

اور بے چارے سرفراز کی سمجھ سے یہ بات باہر تھی کہ ندیم تو ندیم' اس کی ساس کا نام کیوں لیا جا رہا ہے۔

"بتائیں نا انکل' کیا ہوا ہے آنٹی جی کو؟"

ارم نے اس ڈر سے یہ سوال کیا کہ اس سے بھی یہ مطالبہ نہ کر دیا جائے کہ وہ ہونے والی ساس کو اپنا گردہ دے دے۔

"اسے کینسر ہے' برین ٹیومر' اور لاسٹ اسٹیج ہے۔" سب کو سانپ سونگھ گیا۔

اگرچہ دادا اور دادی کو کینسر کے لفظ کے علاوہ اور کچھ سمجھ میں نہ آیا... مگر سرفراز کے چہرے کی ویرانی... اس کے لہجے کی کپکپاہٹ اور آنکھوں کی نمی انہیں بہت کچھ سمجھا گئی۔

سب کی نظروں کے سامنے جوڈی کا ہنستا مسکراتا' پرخلوص اور بے ریا چہرہ گھوم گیا۔

وہ... جس کے نقش اس قدر دلربا نہیں تھے کہ کوئی دیکھتے ہی فدا ہو جائے' مگر اسے دلوں میں گھر بنانے کا فن آتا تھا۔

وہ... جو اپنے صاف ستھرے معطر فضاؤں والے دیس سے... تنگ و تاریک گلیوں میں بنے گھٹن کے مارے گھر اس میں آکے بھی بہت خوش تھی۔ کسی نے اس کے ماتھے پہ بل نہ دیکھے تھے۔

نہ گرمی اور حبس سے گھبرا کے کبھی وہ بے چین ہوئی۔ نہ تالیاں مار مار کے مچھروں کا شکار کرتی' تنگ پڑتی' نہ کھڑکی سے چھلانگ مار کے واش روم جانے والے تردد پہ ناک بھوں چڑھائی۔

بڑے مزے سے چوکی پہ بیٹھ کے کھانا کھا لیتی۔ جو پہنایا جاتا' خوشی خوشی پہن لیتی۔

دن میں اتنی لوگ بھی ملنے آتے تو کبھی ماتھے پہ تیوریاں نہ ڈالتی ہنس ہنس کے سب سے ملتی۔

"ہا... ہا... ہک... ہا۔"

دادی نے سرد آہ بھری اور دوپٹے سے اپنی نم آنکھیں مسلیں۔

سب ہی اداس سے ہو رہے تھے۔

"اس کی بڑی خواہش ہے کہ اس کی زندگی میں ہی اس کے بچوں کی شادی ہو جائے۔"

سرفراز انکل نے بمشکل مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس لیے میں نے سوچا ہے' اس ہفتے سب کچھ فائنل کر لوں۔"

☼ ☼ ☼

"ہائے ہائے' ایک ہفتہ۔" تائی امی کے صحیح ہاتھ پیر پھولے "میری تو کوئی تیاری بھی نہیں۔"

"تیری اکمل' اجمل کی دفعہ کون سی تیاریاں پوری تھیں بھلیے لوکے۔"

تاؤ جی نے پچھلا ریکارڈ یاد دلایا۔

"منگنی والے دن تک انگوٹھی نہیں لی تھی تو نے' بارات نکل گئی تو "بد" لینے کا خیال آیا۔ دلہن گھر لانے کے بعد کمرہ سجانا شروع کیا۔"

"ہاں تو تسی کون سا صحیح تھے۔ نکاح کے ٹیم یاد آیا کہ مولوی کو کسی نے بلایا ہی نہیں۔"

وہ کون سا کم تھیں ماضی کریدنے میں۔

"اب تیاریاں کون سی کرنی ہیں' ارم نے بیاہ کے سرفراز کے ساتھ ولایت ہی جانا ہے' نہ فرنیچر لینا ہے' نہ فریج ٹی وی۔"

"کپڑا لتا تو لینا ہے' زیور تو بنانا ہے۔"

"تو نے کچھ جوڑ نہیں رکھا؟"

"دیتے کیا ہو جو جوڑوں؟"

"اور جو تیرا اپنا زیور ہے؟"

"کپڑا زیور' اکمل' اجمل کو بھی ڈالا تھا بری میں۔"

"صحیح کہتے ہیں سارے' تو نے بیٹوں پہ سارا کچھ لٹایا بیٹی کا نہ سوچا۔"

ان دونوں میں نئے معرکے کا آغاز ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

ادھر حلیمہ' سلیمہ کو پتا چلا بھائی کے رشتے کا... تو ساری ناراضی بھول کے بچے اور سامان اٹھائے میکے بھاگ آئیں۔

"ہائے اللہ... یہ؟ اس سے کرنی ہے ندیم کی شادی؟ یہ تو نرگس لگتی ہے پنجابی فلموں والی۔"

"دند کتنے باہر ہیں۔"

"ناک کتنی پھینی ہے۔"

"بل (ہونٹ) کتنے موٹے ہیں۔"

"بس کرو۔ اچھی بھلی تو ہے۔"

ندیم سے صبا پہ تنقید برداشت نہ ہوئی۔

"باتیں تو ایسے کر رہی ہیں جیسے خود بڑی کوئی حور پریاں ڈھونڈلی ہوں میرے لیے۔"

"دیکھ لو امی... یہ تو شادی سے پہلے ہی پرایا ہو گیا۔" حلیمہ نے ناک سکوڑی۔

"اسی لیے تو میں فریحہ سے پہلے اس کا نہیں کرنا چاہتی تھی۔" چاچی جی ابھی تک تشویش کا شکار تھیں۔

"اچھا چھوڑو ساری باتیں... یہ بھی تو خوشی کی بات ہے کہ ہمارا ویر ولایت جائے گا۔"

"میری کاکیوں کے لیے فرل والے فراک بھیجنا۔"

"اور میرے لیے اونچی ایڑی والی سینڈل۔"

"چلو۔ فرمائشیں بھی شروع۔"

ندیم میں ابھی سے باہر والا نخرہ آگیا تھا۔

"اور بات سن ندیم۔" حلیمہ نے ذرا پاس سرکتے ہوئے اس کے کان میں رازداری سے کہا۔

"چاچی کی۔ یعنی اپنی ساس کی خدمت کرنا۔"

"دفع دور... میرا پتر گھر جوائی ضرور بن رہا ہے مگر نوکر نہیں۔"

چاچی کو یہ خدمت والی صلاح پسند نہیں آئی۔

"سمجھا کرو ناں امی جی۔ چاچی کا آخری وقت آگیا ہے۔ باہر کے ملکوں میں میمیں بڑی سیانی ہوتی ہیں سارا روپیہ' پیسہ' جائیداد مرد کے نہیں' عورت کے نام ہوتا ہے' وہ مرتے وقت ہمارے بھائی سے خوش ہو گی تو اس کے نام بڑا کچھ کر کے جائے گی۔"

بیٹی کے مخلصانہ اور دور اندیش مشورے پہ چاچی جی کے خیالات نے فوراً پلٹا کھایا۔

"آہو... ویسے بھی ساس بھی ماں ہی ہوتی ہے اور بیمار کی خدمت کرنے کا ثواب بھی بڑا ہے۔"

☼ ☼ ☼

"وہ جی۔ آپ کی شرٹ۔"

ارم نے شرماتے لجاتے استری کی ہوئی شرٹ اویس کے سپرد کی۔ جو باپ کے ساتھ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا۔

"تھینکس۔"

اویس نے بڑی مشکور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے خاصی تہذیب سے کہا۔

یہ الگ بات ہے کہ وہ نظریں ارم کو بڑی محبوب اور لہجہ خاصا عاشقانہ لگا۔ وہ خوامخواہ شرما گئی۔

"اور کوئی کام ہے تو بتا دیں۔"

"میرا فون چارجنگ پہ لگا دیں گی پلیز!"

"جی... جی۔"

وہ بڑی مستعدی سے آگے بڑھ کے اس کا فون اٹھا کر اس میں چارجر... گھسیٹرنے لگی۔ منحوس پن ہی اندر ہی نہیں جا رہی تھی۔ اپنے لیے ٹائی میچ کرتے

اویس نے نوٹ کیا کہ کافی دیر سے وہ رخ موڑے کھڑی کچھ کھٹر پٹر کر رہی تھی تو متوجہ ہوا۔

"What's the problem"

"نہیں جی" وہ سٹ پٹا گئی۔

اتنی تھوڑی بہت انگریزی تو آتی تھی مگر سمجھ لینا اور بات ہے' جواب دینا اور بات... وہ گھبرا کے ہاں میں سرہلانے لگی۔

"جی... جی... پرابلم۔"

وہ پاس آیا تو کوفت سے بڑبڑا کے رہ گیا۔ اس نے چارجر کی پن ہیڈ فون والی جگہ میں زبردستی گھسیٹر کے فون کا بھی کباڑا کر دیا تھا اور چارجر کا بھی۔

"What the hell is this"

اویس کے ماتھے پہ پڑی تیوریاں اور ناگوار سی بڑبڑاہٹ بھی ارم کو بڑی رومانٹک لگ رہی تھی... وہ شرما کے دوپٹہ چباتی وہاں سے بھاگ گئی۔

اور اویس فون کو چھوڑ کے اب اس بات پہ غور کرنے لگا کہ کیا ایسٹرن لڑکیاں ڈانٹ کھا کے بھی شرماتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"آیا لاڑیے... نی تیرا... سہرا والا...
ویاہون آیا۔"

صبا الگ حواس باختہ تھی کہ اسے دیکھتے ہی حلیمہ سلیمہ مسکرا کے یہ راگ کیوں الاپنے لگتی تھیں۔

"آپ میرا مذاق بنا رہی ہیں؟"

آخر اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھ ہی لیا۔

"ہائے اللہ... مذاق کیوں... ہم تو شگن کے گیت گا رہے ہیں۔"

"یہ کون سا سنگر ہے؟"

"کون سا؟"

"یہی شگن۔"

"بھئی۔ میرا مطلب ہے۔ خوشی کے گانے' شادی بیاہ کے گیت' تم دلہن بننے والی ہو۔ تمہاری شادی ہونے والی ہے تو ہم ذرا ریہرسل کر رہے ہیں۔"

"اوھ۔ آئی۔۔۔ سی۔"

وہ قدرے ریلیکس ہوئی۔

مگر حلیمہ، سلیمہ اتنی ہی بے آرام۔۔۔

"بھئی کیسی دیدہ ہوائی ہے۔ اپنی شادی کا سن کے نہ شرمائی۔۔۔ نہ گھبرائی۔۔۔ سکون کی سانسیں بھر رہی ہے؟"

حلیمہ نے سلیمہ کے کان میں سرگوشی کی۔

"ہاں تو باہر کی جو ہوئی۔ اب اتنا تو دل مارنا ہی پڑے گا ناں ہمیں۔"

سلیمہ نے اس کا ہاتھ دبا کے مصلحتاً "صبا کی بے حیائی پی جانے کا مشورہ دیا۔ بعد میں دونوں بہنوں نے اس درد مشترک پہ سر جوڑ کے جذباتی سانحہ کیا۔

"ہائے ہائے۔۔۔ کیا کیا سوچا تھا۔ بھابھی آئے گی۔۔۔ خوب دنگل لگیں۔۔۔ میکے آنے کا سواد آیا کرے گا۔ بڑے دند کھٹے کریں گے اس کے۔ روبینہ بھابھی اور مسرت بھابھی ایک تو سگی بھرجائیاں نہیں ہیں، دوسری بڑی تیز ہیں بھئی انہوں نے ہمیں کبھی جیتنے ہی نہیں دینا۔"

✡ ✡ ✡

سارا دن باہر رہنے کے بعد جب سرفراز انکل اور اویس واپس لوٹے تو خوشی سے ان کے چہرے کھلے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں مٹھائی۔۔۔

دادی کمزور تھیں تو کیا ہوا۔ سونگھنے کی حس ابھی تک بہت بے دار تھی۔ انہیں دور ہی سے دیسی گھی کے بنے پتیسے کی خوشبو آگئی۔

"نی۔۔۔ سرفراز مٹھائی لایا ہے۔ بلا ندیم کو۔ فون کر کے اسے کہہ بیو کو لے کے جلدی گھر پہنچے، چاچا اسے شگن دینے والا ہے۔"

انہوں نے چاچی جی کو فون کرنے بٹھایا اور تائی جی نے ارم کو میک اپ کرنے۔

"منہ پہ پوچا مار کے لپ اسٹک شپ ٹک لگالے۔ اویس کے ہاتھ میں ڈبے بھی ہیں، منگنی کا جوڑا اور انگوٹھی لے آیا ہو گا۔"

پورے گھر میں بھگدڑ مچ گئی۔

دادا جی کی شوگر کے باوجود سرفراز نے ان کے منہ میں پتیسہ ٹھونسا۔

"ابا جی۔۔۔ منہ تو میٹھا کریں۔ آپ کے پوتے اور پوتی دونوں کی بات پکی ہو گئی ہے۔"

"لے۔۔۔ پوتی اور پوتا، پوتیاں اور پوتے کہہ! میرے لیے تو چاروں بچوں کی خوشی ایک برابر ہے۔"

"چاروں کی؟"

"آہو۔ اویس کی، صبا کی، ندیم کی، اور ارم کی، اور ارم کے نصیب کھلنے کا تو میں بڑے سالوں سے انتظار کر رہا تھا، چلو اچھا ہے۔ اپنی زندگی میں اس کو ووہٹی بنا دیکھ لوں گا اور ندیم کا بوتھا بھی ہر ویلے بنا رہتا تھا۔ اس کی سیانی بیانی ماں نے ضد جو باندھی ہوئی تھی کہ پہلے فریحہ کی شادی۔۔۔ فیر ندیم کی۔۔۔ چلو اس کی بھی ضد ٹوٹی۔"

"ارے واہ۔ ندیم اور ارم کی شادی کر رہے ہیں آپ لوگ؟"

سرفراز نے چہک کے کہا تو سب مٹھائی منہ میں بھرے کبھی ایک دوسرے کو، تو کبھی سرفراز کو تکنے لگے۔

"مگر ابا جی! ارم تو ندیم سے کچھ سال بڑی نہیں ہے۔"

ان کے دبے لفظوں میں اٹھائے اعتراض کو ان ہی کے سپوت نے مکھی کی طرح اڑا دیا۔

"سو واٹ ڈیڈ۔ اتنا تھوڑا بہت ایج ڈیفرنس تو چلتا ہے کیوں دادی۔ آئی تھنک ارم ندیم کے ساتھ سوٹ کرے گی۔"

دادی کے منہ میں چھم چھم اور آنکھوں سے آنسو چھم چھم۔۔۔

"اوہو امی! اس میں رونے کی کیا بات ہے، ارم رخصت ہو کے بھی کون سا آپ کے پاس سے جانے والی ہے، یہیں تو رہیں گے دونوں بچے۔۔۔"

ارم کا ولایت جانے والا جہاز ٹھس کر کے نیچے گر گیا۔

"یہ بھی اچھا ہے۔ کہ میرے ہوتے ہوئے یہ شادیاں کر دیں آپ لوگ۔۔۔ بلکہ صبا اور اویس کی شادیوں کے ساتھ ہی یہ شادی بھی رکھ دیں۔"

"صبا۔۔۔ اور۔۔۔ اویس کی شادی؟"

سب سے پہلے تاؤ جی نے اپنے حلق میں پھنسے میسو کو آگے نگلا۔۔۔ اف بڑا چھیل کے نکلا تھا کم بخت۔

"ہاں۔ آپ کو بتایا تھا ناں کہ ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ اس لیے اویس کو لے گیا، لڑکی سے ملوانے اسے پسند آئی تو وہیں ہاں کر دی۔"

اب سارے نہ تو مٹھائی نگلنے جوگے نہ اگلنے جوگے۔

دادا جی نے تیسرا راستہ نکالا اور مٹھائی بھرے منہ کے ساتھ ہی پوچھا۔

"اوئے۔۔۔ تو تو کہہ رہا تھا، ادھر صبا کے رشتے کے لیے آ رہا ہے؟"

"جی؟"

"مٹھائی بھرے منہ سے نکلے لفظ۔ حرام ہے، جو پلے پڑے ہوں تو۔۔۔"

دادا جی نے پتیسے کا چبایا ہوا "گتاوا" پرے تھوکا اور پھاڑ کھانے کے انداز میں اپنا سوال دہرایا۔

"ہاں تو رشتہ کرنے ہی تو آیا تھا۔"

"اور روہ وٹہ سٹہ؟"

"ہاں۔۔۔ جہاں صبا کے رشتے کی بات چل رہی ہے، ان کی بھانجی کے لیے اویس کا کہہ رہے تھے وہ۔۔۔"

"کون وہ؟" تاؤ جی نے دانت کچکچا کے پوچھا۔

بس نہ چل رہا تھا "وہ" کو چوک پہ کھڑے کر کے چھینٹی لگوائیں۔

"میرا ایک دوست ہے وہاں میرے ساتھ۔ اس کی فیملی یہیں پاکستان میں رہتی ہے اس کا بیٹا اب میرا ہونے والا داماد ہے۔ انجینئر ہے۔ بہت قابل بہت خوبرو، اور اس کی بھی بھانجی سے اویس کا رشتہ طے کیا ہے ہاؤس جاب کر رہی ہے۔"

دروازے سے اندر داخل ہوتا ندیم وہیں بت بن گیا۔ ہاتھ میں پکڑے امرتسری لڈو ایک ایک کر کے نیچے گر گئے۔

✡ ✡ ✡

"اس ولایتی ٹینڈے نے بڑا برا بدلہ لیا ہے۔" سہیل چاچا جی پریشر ککر بنے پھوں پھوں کرتے پھر رہے تھے، سارے صحن میں۔

سرفراز انکل کی ساری فیملی ان کے ہونے والے سمدھیوں کے ہاں ڈنر پہ انوائٹ تھی۔

"تسی مانو نہ مانو۔ اس نے اتنے سال پہلے ہونے والی اپنی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔ میرے بیٹے کو آس دلا کے توڑی ہے۔"

"کون سی بے عزتی؟"

ندیم کے کان کھڑے ہوئے تو باپ کو اپنی جلد بازی کا احساس ہوا۔

"کوئی نہیں۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ تو ہر بات کی ٹوہ نہ لیا کر۔"

"ہائے۔۔۔ کتنا کہہ رہا تھا سرفراز ساتھ چلنے کو۔"

دادی کو رہ رہ کے بیٹے کے ساتھ نہ جانے کا قلق ہو رہا تھا۔ جو بھی تھا، ان کے لیے تو ساری اولاد ایک جیسی تھی۔ ندیم کے باہر نہ جانے اور ارم کے پھر سے رشتے کے انتظار میں بیٹھ جانے کا افسوس اپنی جگہ مگر اویس اور صبا کی شادی کی خوشی اپنی جگہ۔۔۔ وہ بھی تو پوتا پوتی تھے۔

"تمہارے دشمنوں کے گھر جا کے کھانا کھانے کے بڑے ارمان ہیں آپ کو۔"

تائی جی بلک بلک گئیں۔

اندر ارم کا رو رو کے برا حال تھا۔

ندیم تو خیر بھڑاس نکال چکا تھا۔ غائبانہ طور پہ چاچے کے سارے خاندان کو کوسنے دے کر۔۔۔

اجمل ان کو نماز شکرانہ پڑھنے کے مشورے دے رہا تھا کہ فرنگیوں سے رشتہ گھرا کرنے سے بچ گئے۔

اکمل حسب عادت سارے معاملے کو "مٹی پاؤ" کر کے نظر انداز کرتا الحمرا نکل گیا، دیدار کا شو دیکھنے۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

☼ ☼ ☼

شام کو سرفراز کی واپسی ہوئی تو سب کے منہ پھولے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کو اپنے سلام کا بھی تسلی بخش جواب نہ ملا تھا۔

"آپ لوگ بھی چلتے تو میرے سمدھیوں سے مل لیتے۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"لعنت... دفع دور۔"

سب نے با آواز بلند کہا تو سرفراز انکل حیران رہ گئے۔

"نہیں ... نہیں یقین کریں، بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"ہوں گے تو اپنے گھر ہوں گے۔ ساڈوں کی۔"

"اچھا... میں نے تو سوچا تھا، آپ لوگ ایک بار ان سے مل لیتے۔"

"ساڈی ملتی ہے جوتی۔" تائی جی نے لہجے میں دنیا جہاں کی بے زاری بھر کے کہا۔

"مگر میں تو چاہتا تھا بھابھی۔ آپ ضرور ہی ملیں۔"

"کیوں؟" تیوری چڑھا کے پوچھا گیا۔

"ظاہر ہے۔ آپ لڑکی کی ماں ہیں۔ اس کے بارے میں جو فیصلہ کرنا ہے۔ آپ نے ہی سوچ سمجھ کے کرنا ہے۔"

"ہیں؟" گفتگو کا رخ بدلنے پہ سب ٹھٹکے۔

"دیکھ اوئے سرفراز! پہلے بھی تیریاں گھمن گھیریاں باتوں سے بڑی غلط فہمیاں ہوئی ہیں۔ اب تو باز آجا۔ سیدھی اور صاف بات کر۔"

"سیدھی بات ہی تو کر رہا ہوں۔ صبا کے ہونے والے شوہر کا بڑا بھائی۔ یعنی جیٹھ... وہ اب تک کنوارا ہے۔ کچھ سال پہلے اس کا نکاح ہوا تھا، مگر رخصتی سے پہلے طلاق ہوگئی۔ انہیں ارم جیسی گھریلو اور پیاری بچی چاہیے۔ میں تو چچا بن کے اپنے طور پہ رشتہ "تقریباً" آدھا طے کر آیا تھا اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ..."

"ہیں ارم کے لیے؟"

"رشتہ!"

"کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟"

"وکیل ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ عمر 34 سال ہے مگر دیکھنے میں کم عمر لگتا ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ صاحب جائیداد۔"

"نی مسرت... سرفراز کے لیے کشمیری چائے گرم کر کے لا۔" دادی نے پکارا۔

"نالے گاجر دا حلوہ۔" اب کے تایا جی چلائے۔

"ندیم نظر نہیں آرہا؟"

اویس کے پوچھنے پہ سب بغلیں جھانکنے لگے۔

اب کیا بتاتے کہ ندیم ان کے آنے کا سنتے ہی کمرہ بند کر کے بیٹھ گیا تھا۔

ڈیڈ! آپ نے اسے بتا دیا کہ وہ صبح میرے ساتھ جا رہا ہے۔"

"نہیں، بتانے والا تھا۔ سہیل! ندیم سے کہنا، کل ذرا جلدی جاگ جائے، اویس کے ساتھ ایمبیسی جانا ہے اسے۔"

"ایمبیسی؟"

"ہاں... میں اسے اسپانسر کر رہا ہوں۔ میں نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ اسے باہر جانے کا بہت شوق ہے۔"

اور یہ اندازہ بالکل ٹھیک لگایا تھا انہوں نے... اسے صبا سے زیادہ دلچسپی اس کی نیشنلٹی میں تھی۔ شادی کا کیا ہے، وہ تو باہر جا کے کسی سے بھی ہو جائے گی۔

یوں جسے جو چاہیے تھا، وہ مل گیا، چاہے اس طرح نہ سہی اس طرح سہی، بس غرض کے رشتوں کی غرض پوری ہونی چاہیے۔ غرض پوری ہو جائے تو سب مان جاتے ہیں... نہ پوری ہو تو...

پھر سوال الوداع

صائمہ اکرم چوہدری

زرش کو ایک سو ایک فیصد یقین تھا کہ اس کی "اقبالیات" کے مضمون میں اگر "سپلی" آئی تو وہ اس منحوس لمبی ناک والے سپرنٹنڈنٹ سلجوق جواد کی بیہودہ نگرانی کی وجہ سے آئے گی۔

حالانکہ اس دن موسم کتنا زبردست تھا۔ ہوا عجیب اٹھکیلیاں کررہی تھی۔ جب کہ کالی بدلیاں بھی شرارت کے موڈ میں تھیں۔ لیکن زرش ریاض اس دن بھی اپنی چچا زاد عشاء فیاض کو بلند آواز میں کوستے ہوئے کمرہ امتحان میں داخل ہوئی تھی، حالانکہ اس بے چاری نے اسے اپنی مکمل "مدد" کا بھرپور یقین دلایا تھا۔ مگر اس کی یہ گھٹیا حرکت (جو زرش کے نزدیک گھٹیا ترین تھی) کہ اس نے بی ایس سی کر کے سکون سے ابرارالحق کے گانے سنتی شاہ رخ کی فلمیں دیکھتی اور چٹ پٹے کھانے کھاتی کزن کا چپکے سے ایم اے اردو کا داخلہ بھجوا کر ایک "ناقابل معافی" جرم سرزد کردیا تھا۔ وہ تو اس کی رول نمبر سلپ بھی دادا ابا کے ہاتھ لگ گئی، ورنہ وہ یہ "فتنہ" دبا چکی ہوتی۔ اگرچہ دادا ابا کو بھی اپنے سب سے بڑے بیٹے کی سب سے چھوٹی اولاد سے اس قدر عقل مندی اور پڑھائی سے محبت کی توقع نہیں تھی۔ تب ہی وہ گھر کے ایک ایک بندے سے اس رول نمبر کی "تصدیق" کرواتے پھر رہے تھے۔

حالانکہ زرش ریاض اس وقت چپس کی پلیٹ سے بھرپور انصاف کرتے ہوئے ٹی وی پر کسی مشہور سیلیبرٹی کی علیحدگی کی داستان سننے میں مگن تھی جب اس "سانحے" کی اطلاع اس تک پہنچی مگر اس وقت تک پانی پلوں کے نیچے سے گزر چکا تھا اور اسے طوعاً کرہاً پیپر زدینے پڑے۔

"اقبالیات" کے پیپر میں پورے ہال میں سناٹا تھا۔ تیسری رو کے آٹھویں نمبر پر بیٹھی زرش کا دل کر رہا تھا کہ وہ سپرنٹنڈنٹ کے زیادہ نہیں تو سولہ دانت تو توڑ ہی دے یا پھر اپنی اگلی سیٹ پر بیٹھی اپنی "فتنی" کزن عشاء فیاض کی کمر میں "پرکار" کی زوردار نوک گھسا کر ایک سوراخ تو کر ہی دے، جو اس وقت مکمل محویت سے اپنی شیٹ پر جھکی پیپر حل کرنے میں مصروف تھی حالانکہ

سوال نامہ ہاتھ میں آتے ہی زرش کا رنگ اڑ گیا تھا۔ پہلا معروضی سوال ہی گھما دینے والا تھا اور چونکہ ضروری سوال تھا اس لیے اس پر وہ تین حرف بھی نہیں بھیج سکتی تھی۔

"عشاء بے غیرت! یہ اقبال کی جس غزل کی تشریح کرنی ہے، یہ اس کی کس کتاب میں شامل ہے؟" اس نے تھوڑا سا جھک کر سرگوشی اس طرح کی کہ چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

"یہ ان کی اسی کتاب کی غزل ہے جو میں نے تمہیں اس وقت پڑھنے کو دی تھی جب تم میرا کی بیہودہ فلم دیکھنے میں مگن تھیں۔" عشاء سے اس قدر بے مروتی کی اسے امید نہیں تھی۔ تب ہی اس سنگین صورت حال میں اس کا طعنہ سن کر اسے سکتہ ہی تو ہو گیا۔

"تم باہر نکلو ذرا، تمہاری ایک ٹانگ تو ضرور توڑوں گی اور اب آنا میرا کوئی سوٹ مانگنے، یا پھر لپ اسٹک کا کوئی شیڈ لینے، خود غرض عورت....." وہ سلگ کر بولی۔

"یہ عورت کس کو کہا ہے؟" عشاء کو نفرت تھی اس لفظ سے، وہ پوری کی پوری پیچھے کی طرف مڑ گئی۔

"آپ لوگ کیا اسٹار پلس کے ڈراموں کی طرح سازشوں میں مصروف ہیں، یہ ایم اے کے پیپرز ہیں کوئی مذاق نہیں....." سپرنٹنڈنٹ ان دونوں کے سر پر توپ کے گولے کی طرح برسا تھا۔

"اپنا اپنا، پیپر کریں سب لوگ....." ایک اور نگران چیخا۔

"تو ان کی کی تھی، اپنا اپنا ہی کریں گے اور ویسے بھی اپنا نہیں آتا تو دوسروں کا کیا خاک کریں گے۔" زرش نے دل ہی دل میں جواب دیا۔ ایک گھنٹے میں اس نے صرف ایک سوال کیا تھا، جب کہ چار ابھی باقی تھے۔

ٹانگ جھلاتے ہوئے اس نے ادھر ادھر کا معائنہ کیا۔ دھڑا دھڑ لکھتی لڑکیوں پر اسے رشک سا آیا۔ سپرنٹنڈنٹ اپنی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا جب کہ تین ہٹے کٹے نگران پورے ہال میں گھوم رہے تھے۔

”ویسے سپرنٹنڈنٹ ہے تو اسمارٹ بندہ۔“ اس نے دل ہی دل میں اسے سراہا، دراز قد، صاف رنگ، چمکتی آنکھوں پر سرمئی فریم کا اسٹائلش سا چشمہ، اور ڈریسنگ بھی ٹھیک ٹھاک تھی اور عمر بھی تیس سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔

”ارے! اس کی شرٹ کا سب سے پہلا بٹن تو آدھا ٹوٹا ہوا ہے۔“ اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔

”آپ پیپر کیوں نہیں کر رہیں؟“ ایک خرانٹ سا نگران اسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”میری مرضی.....“ اس نے شان بے نیازی سے جواب دیا۔ اب تو ویسے بھی اس پیپر میں ”سپلی“ کا اسے یقین ہو گیا تھا۔ نگران نے اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو، وہ کچھ دیر گھورتا رہا پھر آگے بڑھ گیا۔

زرش نے ساتھ والی رو میں بیٹھی لڑکی کے اسٹائلش سے سوٹ کو توصیفی نظروں سے دیکھا۔

”کیا زبردست بیل ہے۔ امی سے کہہ کر اپنی شرٹ پر بھی بنواؤں گی۔“ اس نے دل میں ارادہ کیا۔ پھر نمونے کے لیے اس کا ڈیزائن بڑے غور سے سوالیہ پیپر کی بیک سائڈ پر اتارنے لگی۔

”یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟“ وہ ایک دفعہ پھر اس کے سر پر آکر دھاڑا۔

”کیا ہوا؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ تڑاخ کر کے بولا۔

”یہ کیا بیل بوٹے بنا رہی ہیں، پیپر دینے آئی ہیں یا مذاق کرنے۔“

”سر! ڈیزائن اتار رہی ہوں بیل کا۔ مجھے بھول جائے گا۔“ اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

”اس پیپر میں تو ایسا کوئی واہیات سوال نہیں ہے۔“ اس نے طنز کیا۔ جب کہ وہ کچھ توقف کے بعد بولی۔

”اس پیپر میں یہ بھی نہیں لکھا گیا کہ ڈیزائن اتارنا منع ہے.....“

”کمرۂ امتحان میں ہر قسم کی نقل منع ہے، خواہ وہ درسی مواد کی ہو یا سوٹوں کی ڈیزائننگ کی۔“ اس نے سختی سے کہا۔

”کیا بدتمیزی ہے زرش! پیپر کیوں نہیں کر رہیں۔“ عشاء بری طرح ڈسٹرب ہو کر بولی۔ ”سر! اسے عادت ہے فضول بولنے کی۔“ اس نے سر پر سوار بندے کو اطلاع دی جواب دلچسپی سے اس کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

”کوئی عادت نہیں ہے اور تم بدتمیز سارے زمانے کی، گھر سے کہہ کر آئی تھیں کہ سارا پیپر کراؤں گی اور یہاں آتے ہی آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔“ اس کا لہجہ دھیما مگر سلگتا ہوا تھا۔

”تمہیں سارا پیپر آتا ہے۔ ڈرامے بازی مت کرو۔“ عشاء کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس کی گردن توڑ دے۔

”نہیں آتا۔“ اس نے صاف جھٹلایا۔

”یہ علامہ اقبال کی خودی والا سوال میں نے خود تمہیں رات یاد کروایا تھا۔“ کمرہ امتحان کے احترام کے طور پر وہ آہستگی سے بولی۔ جب کہ زرش نے تڑاخ سے اطلاع دی۔ ”بھول گئی میں۔“

”ہاں، خودی ہوتی تو یاد رہتا۔“ عشاء نے طنز کیا۔

”اور یہ اقبال کا شاہین، یہ بھی تو تم رٹے مار رہی تھیں۔“

”ہاں، مگر اب مجھے یاد نہیں آرہا ”اقبال کے شاہین“ اور ”مردِ مومن“ کی سرخیاں آپس میں مکس ہو گئی ہیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔“

”پھر ایسا کرو تم دفع ہو جاؤ یہاں سے، جاہل ہی رہنا سدا۔“ وہ ایک دفعہ پھر اپنے پیپر کی طرف متوجہ ہو گئی۔

”آپ کمرۂ امتحان میں خلل مت ڈالیں اور خاموشی سے پیپر کریں۔“ سپرنٹنڈنٹ نے سختی سے جھاڑا۔ لڑکیاں پیپرز چھوڑ کر سر اٹھائے انہیں دیکھ رہی تھیں۔

”آپ سب اپنے پیپرز کریں.....“ اس نے اب سب کو مخاطب کیا، بہت سارے سر دوبارہ پیپرز پر جھک گئے۔ جب کہ وہ اب بھی ڈھٹائی سے ادھر ادھر دیکھ

رہی تھی۔

”سر! علامہ اقبال نے کتنی شادیاں کی تھیں؟“ اس نے آہستگی سے اب اسے مخاطب کیا جو پورے ہال کا ایک چکر لگا کر پھر اس کے سر پر تھا۔

”اقبال کا تو مجھے پتا نہیں، البتہ میری ایک بھی نہیں ہوئی۔“ وہ اس کے لہجے سے اندازہ نہیں کر سکی کہ وہ مذاق کر رہا ہے یا سنجیدہ ہے۔

اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”آپ کیوں اقبال کی شادیوں پر تحقیق کر رہی ہیں؟“

وہ چڑ کر گویا ہوئی۔ ”سر! یہ سوال معروضی سوالوں میں شامل ہے بھلا اتنے عظیم فلسفی اور شاعر کی ذاتیات میں جانے کی کیا تک بنتی ہے۔ وہ جتنی مرضی شادیاں کریں۔“

”اقبال نے اتنی ہی شادیاں کی تھیں، جتنی تمہارے نانا نے کی تھیں۔“ اگلی کرسی پر بیٹھی عشاء کے کان پیچھے ہی تھے، تب ہی اسے ”خاندانی اشارہ“ دیا جو اسے فٹ سمجھ میں آگیا۔

”اچھا..... تین.....“ اس نے مطمئن ہو کر فوراً لکھا۔

”اور یہ ”عطیہ فیضی“ کون تھی؟ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”آپ اب بولیں تو میں پیپر چھین لوں گا۔“ سپرنٹنڈنٹ سخت لہجے میں وارن کر کے اب کڑے تیوروں سے گھور رہا تھا۔

”چھین لیں۔ مجھے تو ویسے بھی بہانہ چاہیے۔“ اس نے دل ہی دل میں جواب دیا۔

”تم گھر چلو..... دادا ابا کو بتاؤں گی۔ مسینی، گھنی.....“ وہ بڑبڑائی۔

”خلیل! ان کی جگہ تبدیل کر دیں.....“ اس نے مڑ کر ایک نگران سے کہا۔

”جی سر.....!“ فوراً جواب ملا۔

”لان میں بٹھا دیں کتاب دے کر۔“ زرش جل کر بولی۔

”تب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔“ وہ درشتی سے کہہ گیا۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی زرش نے کھا جانے والی نظروں سے عشاء کو دیکھا جو اپنی بتیسی کی نمائش کر رہی تھی۔

”اللہ کرے دانتوں میں کیڑا لگ جائے۔“ اس نے جل کر بددعا دی۔

جیسے تیسے پیپر ختم ہوا اور اس نے اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

سارا پیپر اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی کے پیپر میں جھانک جھانک کر کیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے نوٹ کیا مگر پتا نہیں کیوں خاموش رہا۔

”پیپر کیسا ہوا؟“ باہر نکلتے ہی عشاء نے پوچھا۔

”مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تو منہ توڑ دوں گی۔ سمجھیں؟ حد ہوتی ہے بے مروتی کی، گھر جاتے ہی میرے یہ جوتے شرافت سے اتار کر رکھ دینا اور اگر زیادہ بکواس کی تو میں یہیں اتروا لوں گی۔ پھر ننگے پاؤں گھر جانا.....“ زرش کی جھاڑ نے عشاء کے چھکے چھڑا دیے۔

”میری پیاری بہن نہیں ہو؟“

”خبردار! جو مجھے مسکہ لگایا، میری صرف دو بہنیں ہیں۔ جو شادی شدہ اپنے اپنے گھروں میں ہیں۔“

”اچھا سوری ناں یار.....!“

”کس نے کہا تھا میری رجسٹریشن کروانے کو۔ میرا پچھلا تعلیمی ریکارڈ بڑا شاندار تھا ناں جو مزید صفحات کالے کروانے کے لیے ایم اے میں داخلہ کروا دیا۔“ اس نے چلتے چلتے خفگی سے پوچھا۔ عشاء شرارت بھرے لہجے میں بولی۔

”مجھے معلوم ہے یار کہ میٹرک میں تمہاری ”سپلی“ تھی، پھر ایف ایس سی میں تھرڈ ڈویژن اور بی ایس سی میں بھی دو سپلیاں بمعہ ڈی گریڈ کے، لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ میں ایم اے کے لیے رٹے ماروں اور تم خیر سے گواچی گاں کی طرح پورے گھر میں لڈیاں ڈالتی پھرو، موویز دیکھو، میوزک سنو اور سارے جہاں میں لور لور پھرو..... بس اسی وجہ سے یہ کمینگی مجھے دکھانا

پڑی۔"

"زرش کو سخت صدمہ ہوا اور آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اپنی عم زاد سے اتنی ڈھٹائی اور صاف گوئی کی اسے توقع نہیں تھی۔

"اللہ کرے کسی بھینگے سے تمہاری شادی ہو اور ساری زندگی تمہیں یہ خوش فہمی رہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے' اور حقیقت میں وہ کہیں اور آنکھ مٹکا کر رہا ہو۔" زرش نے بد دعا دی تو عشاء کا قہقہہ پورے کوریڈور میں گونجنے لگا جب کہ اس نے غصے سے فائل زور سے اس کے سر پر دے ماری۔

"محترمہ! یہ تشدد گھر جا کر کیجئے گا۔ یہ جگہ انتہائی نامناسب ہے۔" سپرنٹنڈنٹ کی آواز پر وہ ایک دم اچھلی۔

"سر! آپ یوں کریں کہ پولیس میں بھرتی ہو جائیں۔ حالانکہ "کامیاب" چھاپے مارنا ہماری پولیس کا وطیرہ تو نہیں' لیکن پھر بھی۔۔۔۔" زرش کا بس نہیں چل رہا تھا کہ عشاء کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سر کھول دے۔

سلجوق نے اسے غور سے دیکھا جو خاصی حاضر جواب تھی بلکہ ٹھیک ٹھاک بدلحاظ تھی۔

"اچھا مشورہ ہے۔۔۔۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ وہ لوگ چلتے چلتے گیٹ تک آپہنچے تھے۔ تب ہی عمر کی نظر ان پر پڑی' وہ خاصا تپا ہوا تھا۔

"یہ کیا فضول حرکت ہے' پیپر ختم ہوئے پورا آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے میں پچھلے ایک گھنٹے سے یہاں دھوپ میں سڑ رہا ہوں اور تم لوگ اب ٹہلتی ہوئی آ رہی ہو جیسے شالامار باغ میں سیر کرنے آئی ہو۔" عمر نے آتے ہی دونوں کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی۔

"اگر چشمہ اتار کر دیکھ لو تو شاید تمہیں میں بھی نظر آجاؤں۔" سلجوق کے جملے پر وہ دونوں چونک گئیں۔

"ارے بجی! تو کہاں۔۔۔۔؟" عمر ٹھاہ کر کے اس کے گلے لگ گیا اور اب سب کچھ بھلائے بڑے جوش و خروش سے اللہ جانے کون سے قصے کھول بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پھیلے خوشی کے رنگ اور لہجے میں بے تکلفی سے ان دونوں کو ان کے بہت قریبی تعلقات کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔

"تم اب بھی پچھلے پندرہ منٹ سے دھوپ میں ہی کھڑے ہو۔" زرش کے طنزیہ لہجے پر برا مانے بغیر وہ ایک دم مڑا۔

"یہ سلجوق جواد ہے' ہم دونوں ساتھ اسکول کالج میں پڑھے ہیں اور پھر ایف ایس سی کے بعد میں انجینئرنگ میں چلا گیا جب کہ اس نے کمپیوٹر سائنس لے لیا' پھر سنا تھا کہ ایم ایس سی کے بعد اس کی لیکچرر شپ ہو گئی تھی اسی گورنمنٹ کالج میں۔ ہے ناں؟" عمر کی تفصیل کو عشاء نے بڑی دلچسپی جبکہ زرش نے بڑے اکتائے ہوئے انداز میں سنا' جب کہ مقابل کی خوش مزاجی عروج پر تھی۔

"اور یار! یہ میری بہن ہے زرش اور یہ عشاء ہے میری فرسٹ کزن۔ ان دونوں کے ایم اے کے پیپرز ہو رہے ہیں یہاں مگر تم یہاں کیسے؟"

"میں یہاں بد قسمتی سے ایم اے سینٹر کا سپرنٹنڈنٹ بنا ہوا ہوں۔" اس کی اطلاع پر عمر اچھلا اور بڑے اشتیاق بھرے لہجے میں بولا۔

"اس کا مطلب ہے اس دفعہ میری بہن پہلے ہی چانس میں ایم اے کر کے اپنا سابقہ تعلیمی ریکارڈ توڑ دے گی۔"

"کیا مطلب؟" سلجوق واقعی نہیں سمجھا تھا۔

"تم گھر چلو ایک دفعہ۔۔۔۔" زرش نے سرعام دھمکی دی تو عمر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"تمہاری گاڑی کدھر ہے؟" عمر نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پیپرز بینک جمع کروانے کے لیے لے گیا ہے۔" اس کے جواب پر عمر نے فوراً" اس کا بازو پکڑا۔ "تمہارا گھر ابھی بھی ماڈل ٹاؤن میں ہی ہے ناں۔ آؤ چلو" اس نے سلجوق کے ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

اسے بے تکلفی سے عمر کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے دیکھ کر زرش کا دل چاہا کہ وہ کسی رکشے کو روکے اور گھر چلی جائے۔

"عدنان اور عثمان آج کل کیا کر رہے ہیں؟" اس نے بیٹھتے ہی عشاء کے بھائیوں کا پوچھا۔

"یہ افلاطون ہمارے سارے خاندان کو جانتا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"عدنان کا ہاؤس جاب چل رہا ہے' جب کہ عثمان بینک میں ہوتا ہے۔ تم سناؤ آپی کی پی ایچ ڈی ہو گئی۔" عمر بھی ان دونوں کو بھلائے مکمل اس کی طرف متوجہ تھا۔

"ہاں تقریباً۔۔۔۔" اس نے مختصراً" جواب دیا۔

"پتا ہے زرش! سلجوق کی صرف ایک بہن ہے اور نہایت ذہین' ماشاء اللہ یونیورسٹی کے ریکارڈ توڑے ہیں انہوں نے اور اب میتھس میں پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔"

"لو دماغ کی خرابی۔۔۔۔" زرش کو تو میتھس سے چڑ تھی۔

"سلجوق بھائی' کبھی لے کر آئیے ناں انہیں۔۔۔۔" عشاء نے فوراً" بے تکلفی دکھائی۔

"کیوں تمہیں الجبرا سمجھنا ہے؟" وہ چڑ کر بولی جب کہ عشاء نے صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔

"ہاں' کیوں نہیں ضرور۔۔۔۔" سلجوق نے بھی خوش دلی سے جواب دیا۔

"آئیں تو سہی' اپنے ہاتھ کی کالی اور بدمزا چائے پلاؤں گی انہیں۔" زرش نے دل ہی دل میں منصوبہ بنایا۔ اس کے ہاتھ کی بدمزا چائے پورے خاندان میں مشہور تھی۔

عمر نے گاڑی ایک بڑے سے سفید دروازے کے سامنے روکی۔ تو زرش نے دو کنال پر مشتمل سفید ٹائیلوں والے اسٹائلش سے بنگلے کا جائزہ لیا۔

اس کے گاڑی سے اترتے ہی عشاء بے چینی سے بولی۔

"تم نے اسے کہا کیوں نہیں کہ وہ باقی پیپرز میں ہمارا خیال رکھے۔" عمر نے بیک ویو مرر سے اسے گھورا۔

"میرا خیال ہے کہ تمہیں تو اس کی ضرورت نہیں۔ پہلے ایم اے انگلش کر چکی ہو اور پوزیشن ہولڈر ہو۔۔۔ اور جہاں تک بات زرش ریاض صاحبہ کی ہے تو مجھے ان کے لیے سفارش کروا کر اپنی بے عزتی نہیں کروانی مجھے۔ عثمان' عدنان اور جواد کو وہ بہت اچھی طرح سے جانتا ہے کہ ہم چاروں کزنز ٹاپ کلاس اسٹوڈنٹ رہے ہیں اب اس سارے جہان کی نکمی کی سفارش کا کہہ کر میں اپنے خاندان کے متعلق اس کی رائے خراب نہیں کروانا چاہتا۔"

عمر کی بے مروتی اور بدلحاظی کی تو خاندان بھر میں مثالیں دی جاتی تھیں اب بھی اس کا جواب سن کر زرش کھول اٹھی۔

"تم چاروں اپنے تمغے اور میڈل گلے میں ڈال کر پورے شہر میں دھمال ڈالو اور مت بتاؤ کہ میں تمہاری بہن ہوں۔ مجھے تمہاری سفارشوں کی ضرورت نہیں۔ پہلے میٹرک میں زبردستی سائنس دلوا دی' پھر ایف ایس سی کا ڈھول میرے گلے میں لٹکا دیا اور بی ایس سی کو دادا ابا نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور اب اس چڑیل عشاء نے ایم اے میں پھنسا دیا۔۔۔۔" زرش کا حوصلہ جواب دے گیا تو وہ تن فن کرتی میدان میں اتر آئی۔

"شرم کرو۔۔۔۔ پڑھے لکھے خاندان سے تعلق ہے تمہارا۔ دادا جی آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ' دادی اماں علی گڑھ سے فارغ التحصیل اور تو اور تمہارے والد صاحب کیمیکل انجینئر اور والدہ ایم ایس سی ہوم اکنامکس۔۔۔۔"

"زرش نے تیزی سے بات کاٹی۔

"جی' اور ایک بہن ڈاکٹر' دوسری ایم ایس سی ایگری کلچر۔۔۔۔ بھائی محترم عمر ریاض الیکٹریکل انجینئر۔۔۔۔ مگر زرش ریاض کا ریکارڈ بوجہ خاندانی عزت کے انڈر گراؤنڈ ہے۔"

عمر اور عشاء نے تاسف سے اسے دیکھا جو ساری بھڑاس نکال کر خاصی مطمئن تھی۔

"پھر ڈوب مرو ایسے خاندان کا نام ڈبونے پر۔ سب سے چھوٹی ہو لیکن گز بھر کی زبان اور اوٹ پٹانگ' بے ہودہ قسم کے شوق رکھنے میں سرفہرست ہو' اسٹار پلس کے ڈرامے' فیشن پر تمہاری معلومات ہمیشہ اپ

ٹوڈیٹ ہوتی ہیں بس پڑھتے ہوئے موت آتی ہے۔"
عمر نے بھی اچھی خاصی ڈانٹ پلادی۔

"تو پھانسی چڑھادو مجھے۔" اس نے چڑ کر کہا۔ عمر کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

"گھر جاتے ہی بابا کو بتاؤں گی کہ اسے مت لینے بھیجا کریں، سارے راستے ذلیل کرتا رہتا ہے۔"

عمر کو معلوم تھا کہ وہ بابا کی خاصی لاڈلی ہے۔ تب ہی ڈرائنگ روم میں داخل ہونے تک وہ اس کی منتیں کرتا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اعوان ولا" میں مظہر صاحب اور ان کی بیوی کے بنائے ہوئے اصول و قوانین پر سارا گھر چلتا تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں بنی دو کنال کی کوٹھی کے مکینوں کا اتحاد اور اتفاق قابل مثال تھا۔ ریاض صاحب کی دونوں بیٹیوں کی شادی خاندان سے باہر جب کہ اکلوتے بیٹے عمر کی بات چیت ان کے چھوٹے بھائی فیاض کی سب سے چھوٹی بیٹی عشاء کے ساتھ طے تھی۔

ایاز صاحب کی بیٹی سنبل کے لیے فیاض صاحب کے بیٹے ڈاکٹر عدنان کا انتخاب ہوا تھا جب کہ عثمان اپنی کسی کلاس فیلو کو پسند کرتا تھا ورنہ فیاض صاحب کا ارادہ زرش کے لیے تھا اور ایاز صاحب کے اکلوتے بیٹے جواد کی منگنی تو ان کی ماں کی پسند پر ان کی بھانجی سے طے تھی۔ چونکہ پڑھا لکھا گھرانا تھا، اس لیے باہمی مسائل بات چیت سے طے کرلیے جاتے تھے۔ علم ان کے خاندان کا اوڑھنا بچھونا تھا صرف زرش پڑھائی کے نام سے بھاگتی تھی ورنہ سب حصوں پر مشتمل گھرانے کے تمام افراد ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس دن ٹی وی لاؤنج میں بیٹھی ماڈل کے سوٹ کی امبرائیڈری پر غور و فکر کرنے میں مگن تھی جب دادو اپنی تسبیح سنبھالتی اندر داخل ہوئیں۔

"زرش بیٹا! پرسوں پیپر ہے شاید آپ کا۔۔۔" دادو کے طنز کرنے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھی تو گود میں پڑا فیشن میگزین اچھل کر دور جا پڑا اور رنگین صفحات پر فلمی اداکارہ کے ہوش ربا اسٹائل پر نظر پڑتے ہی دادو نے "استغفراللہ" کہہ کر نظریں پھیریں۔

"کرتی ہوں تمہارا علاج، آج تمہارے بادا کو آفس سے آلینے دو یہ سارے شیطانی رسالے بند کرواتی ہوں، غضب خدا کا نہ دین کی پروا نہ دنیا کی۔ عشاء بھی تو تمہاری ہم عمر ہے مگر کھانے پکانے میں طاق اور سگھڑ ہے۔"

"اور سازش کرنے میں بھی ماہر ہے" وہ بڑبڑائی۔

"بند کرو اس اچھل کود کو اور شرافت سے جاکر عشاء کے ساتھ بیٹھ کر پڑھو۔" دادو کی جھاڑ پر اس نے ٹی وی بند کیا، ویسے بھی ان کا غصہ خاندان بھر میں مشہور تھا اور دادا ابھی کون سا کم تھے۔

"اور تمہاری ماں اور چچی کہاں ہیں؟ کچن میں تو نہیں دیکھا ذرا اوپر چھوٹی بہو کے پورشن میں چیک کرو اور جواد بھی آج آفس نہیں گیا، زکام ہورہا ہے، ذرا زرینہ سے کہہ کر جوشاندہ بنواؤ اس کے لیے، اور تمہارے دادا پوچھ رہے تھے کہ آج کا اخبار ابھی تک ان کو نہیں ملا۔"

"اماں! کیا ہوا؟ کیوں خفا ہورہی ہیں؟" زرش کی امی نے ابھی ابھی ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا تھا۔ ساس کو غصہ دیکھ کر فوراً تشویش سے پوچھا۔

"اے کچھ نہیں، پورے گھر میں مکینوں کو ڈھونڈ رہی ہوں ماشاءاللہ بھرا پرا گھر ہے اور سناٹا ایسے چھایا ہوا ہے جیسے صحراؤں میں آن نکلی ہوں کہاں گئے سارے؟"

ساس کی بات سن کر ان کے چہرے پر بے ساختہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ "آپ کو پتا تو ہے اماں! صبح کا ٹائم ہے، اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں، دفتر، کالج، یونیورسٹی، گھر میں صرف عشاء اور زرش ہیں یا پھر جواد بس۔" بڑی بہو کی تفصیل سے ان کی تسلی ہوئی تو وہ پھر زرش کی طرف متوجہ ہوئیں۔

"تم کیا منکر نکیر کی طرح ابھی تک سر پر کھڑی ہو، سکینہ سے کہہ کر جواد کے لیے جوشاندہ بنواؤ۔" پھر وہ

اپنی بہو سے دھیمے لہجے میں بولیں۔

"بہو! اب اس گھر کے لڑکوں کی بھی فکر کرو، کب تک چھڑے چھانٹ پھریں گے۔ رات ملک صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ عمر اور جواد تو سیٹ ہیں، عید کے بعد ان کے بینڈ باجے بجواؤ۔ پھر عثمان، عدنان اور زرش اور سنبل کی اکٹھی ہی کردیں گے۔ ہمارا تو بوجھ اترے گا۔" دادی نے ہاتھ جھاڑ کر نادیدہ بوجھ سچ مچ ہی جھاڑا تو زرش کو ان کے اسٹائل پر ہنسی آگئی۔

"تم ابھی تک یہیں کھڑی کھی کھی کررہی ہو، اوپر بچے کا زکام سے برا حال ہے۔" دادو نے اپنے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورتے ہوئے کہا جواب دیوار سے ٹیک لگائے سکون سے ان کی طرف متوجہ تھی۔

"اماں! مجھے تو زرش کی فکر ہے۔۔۔ کیا ہے اگر عثمان ۔۔۔یا جواد۔۔۔" امی کے افسردہ اور رنجیدہ لہجے میں چھوڑے گئے ادھورے فقرے کو وہ اچھی طرح سمجھتی تھی۔ انہیں زرش کے لیے خاندان میں کوئی لڑکا دستیاب نہ ہونے کا خاصا دکھ تھا۔ عثمان تو انہیں خاصے پسند تھے زرش نے دل ہی دل میں خدا کا لاکھ شکر ادا کیا وہ خاندان میں شادی کے ویسے ہی سخت خلاف تھی وہ تو شکر ہے کہ عثمان اپنے ساتھ ہی میں جاب کرنے والی کسی کولیگ کے ساتھ وعدہ کرچکا تھا۔

"بس بہو! پریشان نہ ہوا کرو، یہ سب قسمتوں کے فیصلے ہیں یہ تو سب سے چھوٹی ہے اور گھر بھر کی لاڈلی بھی، ہم سب سوچ سمجھ کر ہی اس کا بر ڈھونڈیں گے۔" دادو نے بڑے شستہ لہجے میں انہیں دلاسا دیا، وہ ویسے بھی ان کی بڑی سمجھ دار بہو تھیں۔

"تم گئی نہیں ہو ابھی تک، آئینہ بن کر کھڑی ہو۔" دادو نے کسل مندی سے بکھرے بالوں کو سیمنٹی براؤن کاٹن کے سوٹ پر ریڈ دوپٹہ اوڑھے بے زار کھڑی پوتی کو ڈانٹا تو آخر کار وہ تھکے تھکے قدم گھسیٹتی وہاں سے چل ہی پڑی حالانکہ اس کا دل بالکل بھی نہیں کررہا تھا اور پھر بھی ڈرامے کی قسط بھی دوبارہ آنی تھی۔

اگلے دو دن بعد اس کا "جدید شاعری" کا پیپر تھا۔ شاعری سے تو ویسے بھی اسے چڑ تھی اوپر سے پروین شاکر، فیض احمد فیض، ناصر کاظمی، مجید امجد اور میراجی کی شاعری نے اس کا دماغ بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں کتابوں کا ڈھیر ٹی وی لاؤنج میں پھیلائے مصروف تھیں۔

اس نے کتاب ایک طرف پٹخی اور صوفے کے ساتھ ٹیک لگا کر ٹی وی کا ریموٹ اٹھالیا۔

"پلیز اب تم یہ ٹی وی مت چلانا اور سکینہ! ایک کپ چائے تو بنادو۔" عشاء نے اسے ٹی وی چلاتے ہوئے ٹوکا اور ٹیبل صاف کرتی سکینہ کو چائے کا کہا۔ زرش تن فن کرتی وہاں سے اٹھ کر ہی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

اس دن کمرۂ امتحان میں بلا کی خاموشی تھی۔ سوالیہ پیپر سامنے آتے ہی زرش کو حسب معمول سکتہ ہوگیا تھا۔ جب کہ عشاء حسب عادت مطمئن اور پرسکون تھی۔ اس کے چہرے سے ویسے بھی اس کی دلی جذبات کی عکاسی کم کم ہی ہوتی تھی۔ سوالیہ پرچے میں دو سوالات ن۔م راشد اور ایک میراجی پر دیکھ کر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ پرچہ بنانے والے پر مقدمہ کردیتی، موسم کافی تبدیل ہوچکا تھا۔

اس نے سامنے اسٹیج پر براؤن سوٹ میں کام کرتے ہوئے سلجوق پر ایک نظر ڈالی جو بے نیازی کے تمام ریکارڈ توڑے بیٹھا تھا۔

"یہ عمر کے سارے دوست ہی بے مروت ہیں اس کی طرح۔" زرش کے جملے پر عشاء نے مڑ کر دیکھا اور التجائیہ لہجے میں درخواست کی۔

"اللہ کے واسطے آج خاموشی سے پیپر کرنا اور زبان کو بھی قابو میں ہی رکھنا، صبح عمر نے بھی کہا تھا کہ میری بے عزتی نہ کروا دینا اور اس سے بعید بھی کوئی نہیں، کہیں جا کر ہماری شکایت ہی نہ آج لگا دے عمر سے۔"

"میں تو نہیں ڈرتی عمر سے اور اس کے گھونچو دوستوں سے، میرے منہ جو لگے گا اس کو میں خود ہی ٹھیک کردوں گی، تمہارا مستقبل کا مجازی خدا ہے تم ہی

اس کے فضول احکامات کی پیروی کرو۔" زرش کے تکے سے جواب پر عشاء اسے گھور کر رہ گئی۔

"پتا نہیں، جب عقل بٹ رہی تھی تو تم کہاں رہ گئی تھیں۔"

"تمہیں ڈھونڈنے گئی ہوئی تھی۔" زرش نے پٹ سے جواب دیا۔

"اگر آپ کے مذاکرات ختم ہو گئے ہوں تو ہم پیپر شروع کروادیں۔" ایک نگران طنزیہ لہجے میں بولا تو وہ دونوں خاموش ہو گئیں۔

پیپر کا آغاز ہو گیا تھا اور زرش کے چہرے کی ہوائیاں اس کے دلی جذبات کی عکاسی کر رہی تھیں۔ معروضی کا بیس نمبر کا ضروری سوال ہی خاصا اوکھا تھا، ایک دفعہ تو عشاء نے بھی اسے مخاطب کیا۔

"یار! پروین شاکر نے اپنی کتاب "خوشبو" کا انتساب کس کے نام کیا تھا بھلا؟"

"مجھے کیا پتا، میرے نام تو نہیں کیا اور مجھے تو آج پتا چلا ہے کہ پروین شاکر کی کسی کتاب کا نام خوشبو ہے۔" زرش کے جواب نے عشاء کو اچھا خاصا تپا دیا۔

"چلو بھر پانی میں ڈوب مرو جا کر، جب تم کو پروین شاکر کی کتابوں کا ہی نہیں پتا تو ایم اے اردو تم نے خاک کرنا ہے۔"

"محترمہ! آپ آج پھر شروع ہو گئی ہیں۔" سلجوق نے تنقیدی نظروں سے اس کی جوابی شیٹ کا جائزہ لیا جو ابھی تک صاف، شفاف اور بے داغ تھی۔

"آپ آج پھر تھانے داروں کی طرح ہمارے سر پر کھڑے ہو گئے ہیں؟" اس نے یہ سوچ کر تکا سا جواب دیا کہ عمر کا پکا دوست ہے اور دوستی کا لحاظ کر کے کم از کم کمرۂ امتحان سے تو باہر نہیں نکالے گا۔

"ظاہر ہے، جب آپ غیر قانونی، غیر اخلاقی حرکتیں شروع کریں گی تو ہمیں تھانے دار تو بننا ہی پڑے گا۔"

"ہمارے تھانوں کی کارکردگی اتنی اعلا نہیں ہے، جتنی پھرتیوں کا مظاہرہ آپ کرتے ہیں۔" اس کے پٹر پٹر بولنے پر سلجوق نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر واقعی عمر کا لحاظ کر کے نظر انداز کر کے آگے بڑھ گیا۔

"شکر الحمدللہ۔" وہ آہستگی سے بڑبڑائی اور اسی لمحے اس نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ فوراً اپنے پیپر پر جھک گئی۔ سب کچھ دماغ سے بھک کر کے اڑ گیا۔ اس وقت وہ خود کو دنیا کی مظلوم ترین لڑکی سمجھ رہی تھی۔ تمام نگرانوں کو مصروف دیکھ کر اس نے ہمت نسواں کے تحت ایک دفعہ پھر عشاء کو مخاطب کیا۔

"یار! اپنے "ناصر کاظمی" کو کیا دکھ تھا جو اس کی شاعری میں اتنی مایوسی ہے۔"

سلجوق کو ایک دم اپنے سر پر دیکھ کر اس نے مایوسی سے گہرا سانس لیا۔

"آپ کو اللہ کا خوف نہیں ہے۔" وہ دانت کچکچا کر آہستگی سے بولی۔

"بہت ہے، جب ہی، غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کرنے والوں کو رنگے ہاتھوں پکڑ کر شرمندہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر لگتا ہے کہ بے فائدہ ہے۔" سلجوق کا اطمینان قابل دید تھا۔

"ٹھیک ہے، اب کچھ بھی نہیں پوچھوں گی۔" زرش نے جیسے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھر آپ لکھیں گی کیا؟" سلجوق نے بے ساختہ کہا تو اگلے ہی لمحے وہ اس کی بات سمجھ کر ہنس پڑی وہ کچھ دیر تو حیرانی سے اسے تکتا رہا اور پھر نہ جانے کیا سوچ کر آگے بڑھ گیا اور اس کے بعد عشاء کے پاس رکا اور جھک کر اسے کچھ کہا اور پھر تیزی سے آگے چلا گیا۔

"لو مرو دیکھ لو، میرا پیپر، لیکن اگلے پیپر کی تیاری خود کر کے آنا ورنہ قتل کر دوں گی۔" عشاء کی بات پر اسے جھٹکا ہی تو لگا تھا زیادہ غور و فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ تب ہی اس نے دھڑا دھڑ قلم چلانا شروع کر دیا اور حیرانی کی بات تھی کہ سلجوق نے ایک دو دفعہ دیکھا بھی لیکن کچھ نہیں کہا۔

☼ ☼ ☼

اس کے پیپرز ختم ہوئے تو اس نے شکرانے کے دو نفل باقاعدہ ادا کیے اور اسی دوران عمر اور عشاء کی

شادی اچانک طے پا گئی اور گھر میں ایک ہنگامہ ہی تو کھڑا ہو گیا تھا افراتفری میں بری اور جہیز کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور بازاروں کے چکر پر چکر لگ رہے تھے۔ وہ خاصی خوش تھی اس طرح کے فنکشنز، پارٹیاں اسے بھاتے بھی تو بہت تھے اور اس نے تو شادی سے پورے پندرہ دن پہلے ہی ڈھولک رکھوالی تھی اور باقاعدہ رات کو اس پر گانوں کی پریکٹس ہی کی جاتی تھی۔ اب تو عشاء کا عمر سے مکمل پردہ کروایا جا رہا تھا۔ پندرہ دن تک چلا چلا کر گانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ مہندی والے دن اس کا گلا خاصا خراب ہو چکا تھا۔ اس کے اندر سے برآمد ہونے والی آواز سن کر سارے کزنز کانوں میں انگلیاں ڈال کر بھاگتے پھر رہے تھے۔

عمر اور عشاء کی مہندی کا فنکشن گھر کے لان میں کیا جا رہا تھا سبز رنگ کی فٹنگ والی شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں مکمل ہتھیاروں سے لیس ہو کر وہ کسی کام کے سلسلے میں عشاء کی طرف آئی تو ایک لمحے کو اسے دیکھ کر عشاء ٹھٹک گئی۔ اور شرارتی انداز میں گھوم پھر کر اس کا جائزہ لینے کے بعد وہ انتہائی شوخ لہجے میں گویا ہوئی۔

"اوہو! خیر ہے اتنی زبردست ڈریسنگ؟" عشاء نے سراہا۔

"ویسے زرش قسم سے آج بولنا مت، تمہارا سارا امپریشن خراب ہو جائے گا۔"

"زیادہ ٹر ٹر کرنے کی ضرورت نہیں، کل تمہاری شادی ہے اور گلا تو تمہارا بند ہونا چاہیے تھا۔ اتنی منہ پھٹ اور بدلحاظ دلہن پہلی دفعہ دیکھی ہے اور لو مرو، پکڑ دو گجرے، عمر نے رولا ڈالا ہوا ہے کہ عشاء کے گجرے نہیں آئے اور اب جا کر خود لے کر آیا۔ ابھی نکاح ہوا نہیں اور اشاروں پر ابھی سے ناچ رہا ہے۔"

"پلیز زرش! مت بولو میرے دل کو کچھ ہوتا ہے۔ جس طرح کھڑکھڑکی آوازیں تمہارے گلے سے نکل رہی ہیں لگتا ہے کہ کوئی بغیر سائلنسر کے موٹر سائیکل چل رہا ہے۔"

اس نے بڑھ کر اسے جھانپڑ رسید کیا۔ اور خود واپسی

کے لیے قدم بڑھائے۔ ان کی طرف رسم کا آغاز ہو چکا تھا، پیلے ڈوپٹے کے نیچے عمر اپنے دوستوں کے ساتھ اندر آرہا تھا اور عمر کے دائیں طرف سفید کرتا شلوار میں انتہائی بے فکری سے قہقہے لگاتے سلجوق کو دیکھ کر تو اسے سکتہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں تھا اور پھر پیلے پھولوں سے سجی کرسی پر وہ اس کے ساتھ والی کرسی پر ہی براجمان تھا وہ جب عمر کو مہندی لگانے آگے آئی تو سلجوق نے بڑی خوشگوار حیرت سے اسے بغور دیکھا۔

"پلیز زرش! خدا کے لیے آج گانے مت گانا۔" عمر نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا تو وہ مصنوعی خفگی سے اسے گھور کر رہ گئی۔ بولنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر سلجوق کو بالکل ساتھ جڑے دیکھ کر خاموش ہو گئی اور پھر سارے فنکشن میں وہ خاموش ہی رہی، جب بھی وہ کچھ بولنے کے لیے منہ کھولتی۔ سب فوراً "ہاتھ جوڑ کر اسے چپ رہنے کا واسطہ دے دیتے اور وہ غصے کے گھونٹ پی کر رہ جاتی اور سلجوق کے لیے اس کا نہ بولنا ناقابل یقین بات تھی۔ ولیمہ والے دن گہرے نیلے رنگ میں اس کی گوری رنگت دمک رہی تھی۔ آدھی آستین میں ڈھیروں سلور چوڑیوں میں اس کے سڈول بازو خاصے خوبصورت لگ رہے تھے۔ ہلکے میک اپ اور نازک جیولری میں وہ دل کو چھو لینے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

استقبالیے میں وہ اپنی بہنوں کے ساتھ آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کے لیے کھڑی تھی کہ سرمئی رنگ کی سلک کی ساڑھی میں ایک باوقار خاتون کو سلجوق کے ہمراہ آتے دیکھ کر وہ چونک گئی نازک مگر قیمتی چشمے میں انتہائی سادہ خاتون دیکھنے والوں کے لیے بہت عمدہ تاثر چھوڑ رہی تھیں۔

"واہ بڑھاپا اتنا ہی گریس فل ہونا چاہیے۔" تحسین آپی نے بلند آواز میں سراہا۔

"امی! یہ عمر کی سب سے چھوٹی سسٹر زرش ہیں۔" اس کے اچانک سر پر پہنچ کر تعارف کروانے پر وہ بوکھلا گئی۔

"کامیاب چھاپے مارنے کی عادت پتا نہیں کب جائے گی۔" اس نے دل ہی دل میں اسے خوب کوسا جب کہ وہ خاتون بڑی نرم مسکراہٹ کے ساتھ انتہائی شفیق انداز میں اس کا ماتھا چوم کر بولیں۔ "ماشاء اللہ بڑی پیاری بچی ہے۔"

اس نے سر ہلا کر انہیں سلام کیا گلا تو اب مکمل بند تھا۔ ہزار ٹوٹکے کرنے کے بعد بھی۔

"وعلیکم السلام" انہوں نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما اور جواب دیا اور اسی لمحے تحسین آپی اور بینش آپی بھی انہیں خوش آمدید کہنے کو آگے بڑھ آئیں اور اسے بولنا نہیں پڑا اور بھرم رہ گیا۔ جب کہ سلجوق بڑی گہری نظروں سے اس کا معائنہ کرنے میں مگن تھا۔

پھر کھانے کے بعد وہ بڑی تیزی سے، اسٹیج کی طرف جا رہی تھی کہ اچانک اسے اپنا ایک پاؤں بڑا آزاد محسوس ہوا، جھک کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ سلور کلر کی بہت نازک سی ایک پٹی والی چپل دغا دے گئی ہے اس کا دل دھک کر کے رہ گیا تو یہ نیا "سیاپا" پڑ گیا۔ شادی ہال سے گھر تک کا فاصلہ تقریباً" چالیس منٹ کا تھا اور اتنے رنگا رنگ فنکشن کو چھوڑ کر کوئی بھی اسے گھر لے جانے پر راضی نہ ہو گا اس کا اسے بخوبی اندازہ تھا۔ تب ہی پاؤں کو گھسیٹتی، مہمانوں سے بچتی ہوئی وہ نسبتاً" ایک تاریک کونے میں کھڑی ہو گئی۔

"لگتا ہے کم بخت عشاء کی نظر لگ گئی۔ اس نے کتنی منتیں کی تھیں کہ چپل بری کے سامان میں رکھ دو اور اپنے لیے نئی لے آؤ، لیکن وہ بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھی۔ بالکل نہیں مانی اب گلا خراب، چپل ٹوٹی ہوئی جس کے ساتھ ایک قدم بھی چلنا محال تھا اور اوپر سے بھوک، اسے اپنی بے بسی پر رونا آرہا تھا۔ سب مہمان کھانے میں مگن تھے اور اسی لمحے اسے سلجوق اپنی طرف آتا محسوس ہوا۔

"لو یہ کہاں سے چلے آرہے ہیں موصوف۔" اس نے دل میں کوسا۔

"تھینکس گاڈ! آپ مجھے مل گئیں۔۔۔ میں تو سارے ہال میں آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔" سیاہ پینٹ

کوٹ میں اس کا دراز قد خاصا نمایاں تھا۔

"کیوں اب میں کس کی نقل کر رہی ہوں؟" وہ کہنا چاہتی تھی مگر افسوس گلے نے اس کے ارمانوں کا گلا گھونٹ لیا۔

"دیکھیں زرش! میں بہت سیدھا سادہ اور کھرا بندہ ہوں۔ بات گھما پھرا کر کرنے کا فن مجھے نہیں آتا۔ مجھے آپ اچھی لگی تھیں اور میں نے اپنی والدہ سے تذکرہ کیا اور آج انہوں نے آپ کو بھی دیکھ لیا، کہہ رہی تھیں کہ خاصی "گم گو" اور "پیاری بچی" ہے اور ان کو تو آپ اتنی اچھی لگیں کہ انہوں نے ایک جگہ انکل اور آنٹی کو اکٹھے کھڑا دیکھ کر بات بھی کر لی۔"

"ماں کو بھی کامیاب چھاپے مارنے کی عادت ہے۔" وہ کھول کر رہ گئی۔

"ارے آپ خاموش ہیں، کوئی بات نہیں مشرقی لڑکیاں ایسے موقعوں پر اکثر چپ ہی رہتی ہیں۔" وہ خاصے خوشگوار لہجے میں بولا، آنکھوں میں ستارے دمک رہے تھے اور سارا وجود ایک سرشاری کی کیفیت میں تھا۔

میرا گلا ٹھیک ہوتا تو میں بتاتی کہ میں کتنی مشرقی ہوں، جس طرح "مونیکا" نے "کلنٹن" کو دن میں تارے دکھا دیے تھے، ایسے ہی تارے میں بھی دکھا دیتی۔" وہ طیش کے عالم میں وہاں سے واک آؤٹ کر کے اپنے غصے کا اظہار کرنا چاہتی تھی، لیکن ٹوٹی ہوئی چپل کو نیچے غور سے دیکھنے پر اسے اپنی بے بسی کا مزید احساس ہوا اور وہ وہیں رک گئی۔

"ارے آپ نیچے کیوں دیکھ رہی ہیں۔ اوہ شرما رہی ہیں۔۔۔ گڈ۔۔۔ آپ تو مجھے حیران کر رہی ہیں، ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ خاصی "پٹاخہ" سی ہیں، لیکن مشرقی لڑکیاں خواہ کتنی بھی شوخ اور پٹاخہ کیوں نہ ہوں، ایسے موقعوں پر چپ کر ہی جاتی ہیں۔ اور ویسے بھی لڑکی کی خاموشی اس کی رضامندی ہی ہوتی ہے۔" سلجوق کے اس "انکشاف" پر اس نے دہل کر اسے دیکھا جو اس کی خاموشی کو کئی معنی پہنا کر مستقبل کی وادیوں میں بھی پہنچ گیا تھا۔

"ارے میری بچی یہاں کھڑی ہے، دیکھیں مسز ریاض! ماشاء اللہ کتنی پیاری جوڑی ہے، میں تو آج ہی گھر پہنچ کر صدقہ دیتی ہوں۔" سلجوق کی امی کو اپنی امی کے ہمراہ دیکھ کر اس کے تو ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے جب کہ وہ بڑی پرشوق نظروں سے اس کا جائزہ لینے میں مگن تھیں۔

"ارے مسز علی! آپ تو ہتھیلی پر سرسوں جما رہی ہیں۔" زرش کی امی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ان کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ شاید بیٹی کے لیے اتنے شاندار پرپوزل کی توقع نہیں تھی۔

"ارے میرا اکلوتا بیٹا ہے ماشاء اللہ اچھا خاصا ایجوکیٹڈ اور سلجھا ہوا۔ اور میرے تو بہت ارمان ہیں آپ بس ہاں کریں۔ ریاض صاحب نے تو مجھے تسلی کروا دی ہے وہ تو کہہ رہے تھے کہ مسز علی! سمجھیں زرش آپ کی ہی بیٹی ہے۔۔۔"

"کیوں فالتو ہوں میں۔۔۔؟" وہ غصے سے دل میں سوچ کر رہ گئیں۔

وہ ایک دم اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت اور خوش دلی سے اس سے مخاطب ہوئیں۔ "ارے میری بچی تو

خواتین ڈائجسٹ
کی طرف سے
بہنوں کے لیے ایک اور ناول
تتلیاں پھول اور خوشبو
راحت جبیں
قیمت۔۔۔ -/225 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ: 37- اردو بازار، کراچی۔

if you want to download or read monthly digests,Imran series,novels please visit www.paksociety.com you will find direct link as well as 21 other mirrors. for support or problems contact us at 0336-5557121 or admin@paksociety.com

ماشاء اللہ خاصی شرمیلی اور کم گو واقع ہوئی ہے۔ ورنہ آج کل کی لڑکیاں تو پٹر پٹر بولتی ہیں۔" پھر بڑے مان اور اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "کیوں بیٹا آپ کو یہ فیصلہ منظور ہے ناں؟"

"جی.....!!" اس نے منہ کھولنا چاہا مگر آواز گلے کے اندر ہی دم توڑ گئی۔ وہ چیخ چیخ کر کہنا چاہ رہی تھی کہ اپنے چالاک اور عیار، تھانیدار بیٹے کے لیے ویسی ہی "پڑھاکو" لڑکی ڈھونڈیں مجھے کوئی شوق نہیں ہے پی ایچ ڈی نند، پروفیسر ساس اور سسر اور تعلیم ہی کے شعبے میں وابستہ شوہر کی۔" مگر افسوس.....

اب تو گلے سے غراہٹ بھی نہیں نکل رہی تھی۔ اس نے بے بسی سے امی کو دیکھا اور امی کو بھی اس سے اس قدر "مشرقی" ہونے کی توقع نہیں تھی اس لیے وہ اس کے گلے کی خرابی کو بھولے ہوئے اس کی خاموشی کو شرم پر محمول کرتے ہوئے بولیں۔ "مسز علی اگر آپ کی یہی خواہش ہے تو ان شاء اللہ اللہ بہتر کرے گا اور ویسے بھی عمر تو جانتا ہی ہے سلجوق بیٹے کو۔"

زرش نے کھا جانے والی نظروں سے اسٹیج کی طرف دیکھا جہاں عمر اپنی دلہن کو "واری صدقے" جاؤں نظروں سے دیکھنے میں محو تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ٹوٹی ہوئی چپل سمیت اڑتی ہوئی اسٹیج پر پہنچ کر ان کے رومانس کا ستیاناس کر دے۔ اس نے غصے سے سلجوق کو دیکھا جو بڑی مبہوت نظروں سے اس کو حصار میں لیے ہوئے تھے۔

"بس جی یہ زرش آج سے میری بیٹی ہوئی....." سلجوق کی مما نے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر زبردستی اسے پہنائی تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"اللہ قسمت اچھی کرے میری بیٹی کی۔ میں ابھی ریاض صاحب سے مٹھائی منگواتی ہوں۔" امی کو انتہائی خوش اور مطمئن دیکھ کر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

"بیٹا.....! سلجوق بتا رہا تھا کہ آپ کا ایم اے کا رزلٹ آنے والا ہے ان شاء اللہ میں خود آپ کا ایم فل میں ایڈمیشن کرواؤں گی پھر تم، میں اور سلجوق کے پاپا اکٹھے یونیورسٹی جایا کریں گے۔ میری دلی آرزو ہے کہ میری بیٹی کی طرح میری بہو بھی پی ایچ ڈی ہو۔" سلجوق کی مما کے ارادے سن کر اس کا رنگ ایک دم فق ہوا۔ دل ڈوبنے لگا اور آنکھوں کے آگے ستارے ناچنے لگے اس نے گھبرا کر ساتھ رکھی کرسی کو تھاما اور خود کو گرنے سے بچایا۔

"ماشاء اللہ مبارک ہو....." تحسین آپی نجانے کہاں سے نمودار ہوئی تھیں۔

"اللہ نظر بد سے بچائے مجھے تو بہت خوشی ہو رہی ہے یہ سن کر کہ زرش ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی فیملی میں جا رہی ہے۔"

بینش آپی کا چہرہ بھی کھلا جا رہا تھا وہ بھی اڑتی ہوئی وہاں پہنچی تھیں۔

"ہاں بیٹا! ہمارے گھر کا ماحول خاصا علمی ہے، بلکہ کبھی کبھی تو سلجوق کے پاپا ہنستے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں اتنی چیزیں نہیں جتنی کتابیں ہیں۔" سلجوق کی مما کی اس اطلاع پر زرش کا دل مزید بیٹھ گیا۔

"ارے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں محترمہ! میں خود آپ کو پڑھاؤں گا ان شاء اللہ آپ کو ایم فل میں ہرگز کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

پُرشوق لہجے میں سلجوق کی سرگوشی پر اس نے خالی نظروں سے اسے دیکھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ آنے والے دنوں میں ایک ہینڈسم اور اسمارٹ شریک حیات کے ساتھ کتابوں کے بوجھ کو برداشت کرنا پڑے گا اور اسے نہ جانے کیوں یہ خوش فہمی تھی کہ سلجوق کتنا ہی لائق فائق اور بہترین پڑھانے کا ہنر رکھتا ہو لیکن زرش ریاض جیسی نالائق، لاپروا اور ڈھیٹ اسٹوڈنٹ کو پڑھانا آسان کام نہیں، اور یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کون کس پر کتنا حاوی ہے، کیونکہ اگر اسے پڑھانے کے ایک سو ایک طریقے آتے تھے تو زرش ریاض کو پڑھائی سے بھاگنے کے دو سو دو طریقے آتے تھے۔

☼

نفیسہ بیگم

دل امید سا اک دیا

"سبزیاں ہیں تو ان کی قیمتیں آسمان پر اور اگر دالیں ہیں تو وہ عام انسان کی پہنچ سے دور ہیں۔ غریب آدمی کا زندگی گزارنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ پتا نہیں مہنگائی کا سیلاب کہیں جاکر رکے گا یا نہیں۔"

فریحہ نے بڑبڑاتے ہوئے سبزی کا شاپر لاکر برآمدے میں بچھے تخت پر رکھا اور کچن سے ٹوکری اور چھری لانے چل پڑی۔

امی جاءِ نماز سے اٹھیں اور اپنی تسبیح لے کر اس کے پاس تخت پر آبیٹھیں۔

"بیٹا! اللہ کا شکر ادا کرو، ہم تو بہت سوں سے بہت اچھے ہیں۔ ذرا ان لوگوں کا سوچو جو محنت مزدوری کرتے ہیں۔ گھر بھی کرائے کا ہو، وہ کیسے گزر بسر کرتے ہوں گے۔"

"آپ کی بات بالکل بجا امی جان! لیکن یہ ہی دیکھیں سات، آٹھ سال پہلے جو سبزی ہم دس روپے میں لیتے تھے، اب وہ سو کے قریب ہے۔ بلکہ دس روپے میں پوری سبزی۔ ساتھ دھنیا اور مرچیں بھی مل جاتی تھیں۔ اب دکان دار دس روپے کا سبز دھنیا بھی نہیں دیتا۔ سبزی تو بہت دور کی بات ہے۔" فریحہ کو آج زیادہ ہی تپ چڑھی تھی۔

"آج غصہ کس بات پر ہے؟" امی مسکرائیں۔ وہ اس کی پل میں تولہ پل میں ماشہ طبیعت سے آگاہ تھیں۔

"امی! دیکھیں گوبھی اور بینگن جو سیزن میں دو، چار روپے کلو ہوتے تھے، اب ساٹھ، ستر روپے کلو ہیں۔ آلو ساٹھ روپے سے زیادہ ہیں۔ پہلے بچوں کو چپس بنا دیتی تھی۔ بعض دفعہ اسکول بھی لے جاتے۔ لیکن اب ساٹھ روپے کلو آلو لے کر چپس بنانے کے خیال سے ہی جھرجھری آجاتی ہے۔ بچوں کی فرمائشیں پوری کرنا مشکل ہے۔ انہیں مہنگائی کے جن کا کیا پتا۔" اس کا غصہ کم ہونے میں نہ آرہا تھا۔

"بچوں کو میں بہلالوں گی، تم اٹھ کر ٹھنڈا پانی پی لو۔ خواہ مخواہ طبیعت خراب ہوگئی تو ہم روٹی سے بھی جائیں گے۔"

وہ امی کی بات پر ہنس پڑی کہ غصہ کرنے سے اپنا ہی خون جلنا تھا، حاصل وصول کچھ نہیں۔

"السلام علیکم ماما! السلام علیکم دادو!" حورب، عمر اور ابوبکر نے دروازہ کھولتی ماں کو پہلے اور پھر برآمدے میں دادی پر نظر پڑتے ہی انہیں سلام کیا اور ساتھ ہی بیگ پھینک پھانک کر دادی سے لپٹ گئے۔ انہوں نے بھی باری باری سب کو پیار کیا۔ حورب تو ہمیشہ کی طرح ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔ وہ کمرے سے اس کے کپڑے اٹھانے چلی کہ اب حورب کو کپڑے دادی سے ہی چینج کروانے تھے۔ دونوں بیٹے البتہ کمرے میں گھس گئے تھے۔

بچوں کے کپڑے تبدیل کرکے آنے تک اس نے تین سیب دھو کر کاٹ کر پلیٹ میں رکھے اور تین دودھ کے مگ ٹرے میں رکھ کر امی کے پاس لے آئی۔ کیونکہ اسکول سے آنے کے بعد بچوں کی محفل دادی کے ساتھ لگتی تھی۔ صبح بھرپور ناشتے کے بعد دوپہر میں اسکول کے لیے بچے روٹی لے کے جاتے تھے۔ ہفتہ، دس دن بعد آملیٹ ورنہ سالن کبھی کبھار، رات کے بچے ہوئے سالن کو وہ روٹی کے اندر ڈال کر انہیں بل دار پراٹھے بنادیتی۔

اسکول میں اگرچہ بچے رنگ برنگی چیزیں کھانے کو لاتے، لیکن وہ اللہ کا شکر ادا کرنا نہ بھولتی کہ اس کے بچے بہت صابر تھے۔ ماں جو ٹفن میں باندھ دیتی وہ کھا لیتے۔ ہفتے میں ایک دو بار ناصر گھر میں فروٹ لاتے تو بچے وہ بھی اسکول لے جاتے، یہ تھوڑا چینج انہیں بھی اچھا لگتا۔

دادی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر اس نے برتن سمیٹے اور کچن میں رکھ دیے۔ امی نے باتوں کے دوران سبزی بنادی تھی۔

فریحہ ٹوکری اٹھاکر کچن میں آگئی اور شام کے کھانے کی تیاری شروع کردی۔ جب تک وہ سالن اور روٹیاں بناکر فارغ ہوئی اور کچن سمیٹا، دادی نے بچوں کو ہوم ورک کروا دیا تھا۔ فریحہ نے بچوں کے یونیفارم دھوئے۔ کھانا ناصر کے آنے پر لگتا تھا اور ناصر کو کھانا

کھانے کے بعد بچوں سے سبق سننا تھا۔

عرصے سے تینوں نے اپنی روٹین سیٹ کرلی تھی اور بغیر کسی کے کہے وہ اپنا اپنا کام سرانجام دیتے۔ اگرچہ فریحہ کوشش کرتی کہ امی کم سے کم کام کریں، لیکن ماشاءاللہ وہ اس عمر میں بھی ایکٹیو اور سرگرم تھیں۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ گھرداری میں فریحہ کا ہاتھ بٹا دیتیں۔

"امی! ساتھ والے گھر میں لگتا ہے نئے کرائے دار آگئے ہیں۔" پہلے ٹرک کی آواز، پھر فرنیچر گھسیٹنے کی آوازیں سن کر فریحہ نے اندازہ لگایا۔

"چلو اچھا ہے نا، سونا پن ختم ہوجائے گا، اللہ اچھے لوگوں کا ساتھ نصیب کرے۔" امی نے دعا کی۔

"ناصر بیٹا! تھوڑی دیر بعد پتا کرنا کہ کتنے افراد خانہ ہیں؟ اور انہیں بتا دینا کہ شام کا کھانا ہماری طرف سے ہوگا۔" امی نے ناصر کو مخاطب کیا۔

"کیا بنانا ہے امی؟" فریحہ نے دریافت کیا۔

"بیٹا! پہلے بندوں کا پتا چل جانے دو، پھر دیکھتے ہیں، مرغی بنالو، ساتھ نمکین یا میٹھے چاول کرلو۔ روٹیاں تندور سے لگوالیں گے، مجھے آٹا دو میں گوندھ دیتی ہوں۔"

"امی جی دس افراد ہیں گھر کے، علاوہ بچوں کے۔" ناصر نے بتایا۔

فریحہ نے ساس کی شکل دیکھی۔ "دس افراد کا کھانا ماشاءاللہ ٹھیک ٹھاک بنے گا۔" اس نے سوچا تھا کہ اس ماہ کے آخر میں بل سے دو، چار سوٹ اگلے سیزن کے لیے لے گی۔ تھوڑی بچت ہوجائے گی، ورنہ شروع سیزن میں تو کپڑا ان کی پہنچ سے بہت دور ہوتا ہے۔

"کوئی پریشانی نہیں بیٹا! مرغی میں آلو ڈال لو مناسب سی گریوی کرلو۔ چاولوں کی مقدار بڑھالو، اللہ برکت دے گا۔" انہوں نے اس کی سوچ جیسے پڑھ لی تھی۔

فریحہ دل میں شرمندہ ہوگئی۔ ہمیشہ کسی نہ کسی موقع پر اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے تھے۔ اگر امی نہ ہوتیں اور ان کا حوصلہ نہ ہوتا تو پتا نہیں فریحہ جیسی لڑکی کا کیا بنتا۔ امی کی سمجھ داری اور تدبر کی وہ دل سے قائل تھی۔ ہر ہر موقع پر وہ اس خوبی اور کمال کا رویہ اختیار کرتیں کہ فریحہ وعدہ کرتی کہ آئندہ وہ یہ ہی کام کرے گی۔ لیکن جوں ہی کوئی مشکل آتی۔ اس کا حوصلہ جواب دے دیتا۔

پھر امی کی مدد سے اس نے بروقت ہمسایوں میں کھانا بنا کر بجھوایا۔

ان کے محلے میں رواج تھا یا شاید اقدار کی پاسداری کی جاتی تھی کہ نئے آنے اور پرانے جانے والے کی دعوت تقریباً" محلے کے تمام صاحب حیثیت افراد کرتے تھے۔ سارے محلے میں تقریباً" متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے۔ لیکن تقریباً" کشادہ دل اور وسیع ذہن کے مالک تھے۔

پھر برسوں کا ساتھ تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک، غمی اور خوشی بانٹنے سے بھائی چارہ قائم تھا۔

محلے کے ایک دو گھرانے میں پیسہ آیا تو انہوں نے ماڈل ٹاؤن اور گلبرگ میں رہائش رکھ لی۔ لیکن ان کے آبائی گھر کرائے پر تھے اور اب فریحہ کے ہمسائے میں نئے کرائے دار آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

اگلی رات وقار بھائی اوکاڑہ سے آگئے۔ مہینے کے آخری دن اور اوپر سے نندوئی کی آمد، فریحہ دل ہی دل میں جھنجلائی۔ لیکن کیا کرسکتی تھی، چپ چاپ خاطر مدارات کی تیاریاں کرنے لگی۔ اگرچہ وقار بھائی میں نخرہ نام کو نہ تھا۔ لیکن ظاہر ہے داماد تھے اور پھر ان کا آنا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ اس لیے فریحہ خدمت میں کوئی کسر نہ چھوڑتی۔ پھر دو ہی نندیں تھیں اور دونوں اس کی شادی سے پہلے کی بیاہی ہوئی، بچے ان کے بڑے بڑے تھے اور خوش حالی اور فارغ البالی ان کے گھروں میں تھی۔

فریحہ کے پاس چھٹیوں میں ان کا آنا ہوتا۔ امی کی تربیت، جوائنٹ فیملی سسٹم میں ان کی رہائش، فریحہ کو وہ

نندیں کم اور بہنیں زیادہ لگتیں، وہ کچن میں ہوتی تو دونوں اس کے ساتھ لگ جاتیں۔ جھٹ پٹ چیزیں بنا کے سب اکٹھے بیٹھ کر کھاتے۔ برتن دھو دھلا کے فارغ اور گپیں شروع۔ پھر سیر کے پروگرام بنتے، شاپنگ ہوتی۔ بچے پھوپھیوں پر فدا اور وہ بچوں پہ قربان ہوتی تھیں اور امی تسبیح پڑھ پڑھ کے اپنے سارے بچوں پہ دم کرتی رہتیں کہ نظر بد سے بچے رہیں۔

اگر کوئی انجان گھر میں پہلی دفعہ آتا تو فریحہ اور نندوں کا ہنسی مذاق دیکھ کر بہنیں ہی سمجھتا تھا۔

صبح زبردست سے ناشتے کے بعد وقار بھائی نے واپس جانے کی تیاری شروع کی اور امی کو ایک شاپر دیا کہ میمونہ نے دیا ہے۔ ان کے جانے کے بعد فریحہ نے کچن سمیٹا اور امی کے پاس آگئی۔ امی نے شاپر اس کے آگے کردیا۔ کھولنے پر دو سوٹ فریحہ کے، ایک ایک بچوں کا اور ایک امی کا نکلا۔ سب سوٹ ہزار، پندرہ سو کی مالیت کے، اور خوش نما رنگ اور پرنٹ والے تھے، فریحہ بہت خوش ہوگئی۔

"دیکھ لو فریحہ! اللہ پاک کیسے مدد کرتا ہے۔ اس دن ہمسایوں کے گھر کھانا بجھوانے میں تم تھوڑا تنگ ہو رہی تھیں۔ دیکھو، اللہ نے تمہیں کہاں سے نوازا ہے۔" امی یونہی پیار سے سمجھاتی تھیں۔

وہ تھوڑی شرمندہ ہوگئی۔ "امی! آپ تو دل کا حال جان لیتی ہیں۔"

"بیٹا! ہم انسان بہت ناشکرے ہیں، لیکن دیکھو وہ ہمارا پروردگار ہمارا ادھار کبھی بھی نہیں رکھتا۔ ہمیں دگنا کرکے واپس کرتا ہے۔ اب اتنی چیزوں کے ملنے پر شکرانے کے دو نوافل ضرور ادا کرنا۔"

"جی ضرور امی! اگر میں خود —— خریدنے جاتی تو اتنے مہنگے سوٹ شاید نہ خریدتی" میمونہ نے بہت فراخ دلی سے شاپنگ کی ہے۔" اس نے کھلے دل سے سراہا۔

"اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟" امی نے آیت کے ترجمے کے ساتھ ہی شاپر سمیٹ دیا تھا۔

شام کو اچانک ہمسایوں سے مار پیٹ اور گالی گلوچ کی آواز بلند ہوئی اور فریحہ جو کچن میں مصروف تھی" سب وہیں چھوڑ کر گھبرا کے کچن سے باہر آگئی۔ امی بھی حیران پریشان لگ رہی تھیں۔ ان کے محلے کا ریکارڈ تھا کہ کبھی کوئی لڑائی جھگڑا نہ ہوا تھا۔ مار پیٹ اور گالی گلوچ تو بہت دور کی بات تھی۔ یہ آوازیں یقیناً" نئے ہمسایوں کے گھر سے آرہی تھیں اور مرد نے ایسی ایسی ننگی گالیاں دیں کہ فریحہ اور امی دونوں توبہ استغفار کرنے لگیں اور فریحہ نے شکر کیا کہ بچے قاری صاحب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں تھے۔ ورنہ شاید ان کی شرمندگی میں اور اضافہ ہوجاتا۔

پھر یہ لڑائی جھگڑا اور گالی گلوچ تو روزانہ کا معمول بن گیا۔ بعض اوقات تو ایسی گالیاں ہوا کے دوش پر آتیں کہ انہیں کانوں میں انگلیاں ٹھونسنی پڑتیں۔

فریحہ نے ناصر سے ذکر کیا تو انہوں نے بتایا کہ آدمی چنے چاول کی ریڑھی لگاتا ہے۔ گھر میں ماں، باپ اور بیوی، بچے ہیں، تعلیم کی کمی، اور تربیت کے ناقص ہونے کی عملی گواہی وہ گھرانہ ہر شام اہل محلہ کو دے رہا تھا۔ محلے والوں سے ان کا اتنا میل جول بھی نہ تھا کہ ان کے مسائل کا پتہ چلتا۔ کبھی کبھار تو جھگڑا صبح صبح شروع ہوجاتا کہ ناشتے کی میز پر وہ خواہ مخواہ اونچی آواز میں ناصر صاحب اور امی سے باتیں شروع کردیتی کہ اس کے بچے اس گندی زبان کو نہ سن سکیں۔

☆ ☆ ☆

ناصر نے آتے ہی تنخواہ امی جان کو دی۔ فریحہ ان کے لیے جوتے اور کپڑے نکالنے چلی گئی۔ اسے پتا تھا کہ اب امی تنخواہ کا حساب کتاب کریں گی۔ شادی کے شروع دنوں میں ناصر نے تنخواہ امی کے کہنے پر فریحہ کو دی تھی اور گھر کے اخراجات بھی سمجھائے تھے۔ لیکن دو، تین ماہ میں ہی اس نے توبہ کرلی اور ساس کو پیسے پکڑانے شروع کردیے۔ کبھی اس سے بہت زیادہ خرچ ہوجاتے اور کبھی گھر میں کچھ بھی نہ ہوتا اور جیسے ہی اس کے ابو کو پتا چلا کہ تنخواہ فریحہ لے رہی ہے تو

انہوں نے اسے سمجھایا۔

"بیٹا! تمہاری ساس حیات ہیں۔ کاروبار، گھر ان کے حوالے کرو، اور تم صرف ان کے کہے پر چلو۔ دعائیں بھی ملیں گی اور خوامخواہ کی جوڑ توڑ سے بھی نجات ملے گی۔" اور فریحہ نے اس نسخے پر عمل کر کے گویا سکون خرید لیا تھا۔

امی کا اصول تھا کہ تنخواہ آتے ہی "دسواں حصہ" نکال دیتیں۔ یہ دس فیصد کا اصول پوری تنخواہ پر لاگو تھا۔ جب وہ تین ہزار نکالتیں تو فریحہ کے دل کو کچھ ہوتا۔ وہ سوچتی ان پیسوں سے فلاں فلاں چیز آسکتی تھی۔ فلاں ڈیکوریشن پیس، فلاں کڑھائی کا سوٹ، بچوں کی خریداری، لیکن ساس کے آگے بولنے کی گنجائش نہ تھی۔ وہ یہ دس فیصد کی رقم اہل محلہ یا مستحق رشتہ داروں میں دے دیتیں۔ بعض اوقات راشن کی صورت میں اور بعض دفعہ نقدی سے ان کی امداد کر دیتیں۔ بدلے میں ان لوگوں کی دعائیں انہیں ملتیں۔ فریحہ کو لگتا کہ اس کے گھر اور بچوں بلکہ سب افراد خانہ کو ایک سایۂ عافیت نے اپنی پناہ میں لے رکھا ہے۔

کوئی بڑی پریشانی آنے سے پہلے ہی پریشان کن خواب کی صورت اشارہ ہوتا اور امی فوراً" صدقہ و خیرات کر دیتیں۔ یہ صدقہ و خیرات بہت سی آفتوں اور پریشانیوں کو ٹال دیتا۔ گھر میں واضح طور پر سکون محسوس ہوتا۔

ان ہی دنوں وہ باتھ روم میں سلپ ہو گئیں، جس سے کمر پر شدید چوٹ آئی۔ چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے ادویات اور بیڈ ریسٹ تجویز کیا۔ ناصر نے دفتر سے ہفتے کی چھٹی لے لی۔ لیکن امی کے سنبھلتے ہی آفس جانا شروع کیا۔ فریحہ بچوں کو اسکول بھیج کر گھرداری نمٹا کر امی کی تیمار داری کرتی، دوا دارو، پرہیزی کھانا، مالش وغیرہ۔۔۔ وہ بہت جی جان سے کر رہی تھی، امی بیماری میں بھی باقاعدہ باوضو رہتیں اور لیٹے لیٹے درود شریف اور تسبیحات پڑھتی رہتیں۔ پڑھ پڑھ کے گھر پر فریحہ، ناصر اور بچوں پہ پھونکنا ان کا معمول تھا۔

تمام رشتہ دار اور اہل محلہ ان کی عیادت کو آئے۔ فریحہ حسب حیثیت سب کی میزبانی کرتی۔ اگرچہ کام بہت بڑھ گیا تھا۔ لیکن امی کی دعائیں، ناصر کی سراہتی اور تشکر بھری نظریں اس کی ساری تھکن سمیٹ لیتیں کہ امی کو حوائج ضروریہ سے وہی فارغ کرواتی تھی اور اس کے انداز میں کوئی کراہیت نہ ہوتی۔ باری باری دونوں نندیں بھی آئیں، دو، دو دن رہیں بھی، لیکن بچوں کے امتحانات کی وجہ سے ان کا زیادہ دن رکنا ممکن نہ تھا۔ فریحہ کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھیں اس لیے وہ بے فکر ہو کر اپنے گھروں کو سدھاریں۔

اس دن ریڑھی والے کی بیوی، امی کی عیادت کے لیے آئی اور فریحہ کو ساس کی خدمت میں مصروف دیکھ کر حیران رہ گئی۔ حیران تو وہ اور امی بھی اس کا نیلو نیل وجود دیکھ کر تھیں۔

اس نے بتایا کہ "ساس صاحبہ" بڑے بیٹے کے پاس گئی ہوئی ہیں۔ ورنہ اس کا آنا ممکن نہ تھا۔ اب ماں نے حکم دیا تھا کہ عیادت کر آؤ کہ سارا محلہ عیادت کر چکا ہے تو وہ آئی ہے۔

امی کو دوائی کے بعد غنودگی سی آ گئی تو فریحہ خالدہ کو ساتھ لے کر دوسرے کمرے آ گئی، ادھر ادھر کی باتوں کے دوران وہ اپنے تجسس پر قابو نہ پا سکی اور اس سے مار کٹائی اور گالم گلوچ کی وجہ پوچھی۔

"کیا بتاؤں باجی! میرا بندہ شام کو جیسے ہی گھر آتا ہے، ساس اور نندیں پٹی پڑھانا شروع کر دیتی ہیں۔ گھنٹے آدھ گھنٹے میں اسے اچھی طرح بھر کے جب دیکھتی ہیں کہ میں شام کا تمام کام مکمل کر چکی ہوں تو میاں کو مجھ پر چڑھائی کا اشارہ کر دیتی ہیں۔ پھر اس کے ہاتھ میں جو آتا ہے وہ مجھے مارے جاتا ہے۔ ساس، نندیں آرام سے تماشہ دیکھتی رہتی ہیں۔"

وہ رونے لگی کہ چار، چار دن تک پرانے زخموں کی تکلیف ختم نہ ہوتی تھی کہ نئے لگ جاتے تھے۔

"لیکن ان کے "بھرنے" کی وجہ تو کچھ ہو گی؟" فریحہ حیران پوچھنے لگی۔

"بس باجی! کیا بتاؤں، شروع کے دو، چار سال میں

بھی چپ رہی تھی۔ میرے میکے والے غریب ہیں، پھر میری چار بہنیں اور بھی ہیں۔ لیکن اب میں چپ نہیں رہتی، اب تو میں ٹھیک ٹھیک جواب دیتی ہوں۔ سارا دن کلستی جلتی رہتی ہوں۔ تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے ان کے۔ اب تو میرے بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں۔ وہ بھی میرا ساتھ دیتے ہیں۔ پھر تو انہیں اور آگ لگتی ہے۔" خالدہ کو ہنسی آ گئی۔ فریحہ تاسف سے اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئی۔

"تم اور تمہارا میاں دونوں اپنے بچوں کو خراب کر لو گے۔ ساس، سسر کون سا ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔ نندیں بھی بیاہی جائیں گی۔ لیکن تمہاری اصل دولت اولاد تب تک خراب ہو چکی ہو گی۔ بگڑ چکی ہو گی۔"

"باجی! بچے مجھ اکیلی کی ذمہ داری تو نہیں ہیں۔ اگر کوئی بچہ اچھا کام کرتا ہے تو ساس، نندیں اس کا کریڈٹ خود لے لیتی ہیں۔ اگر کسی سے کوئی غلطی ہو جائے تو وہ سراسر میرے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہے پھر جب مجھے میرا شوہر چار چوٹ کی مار دیتا ہے تو میرا دل کرتا ہے، سب کچھ تہس نہس کر دوں۔ خدا غریب کو بیٹیاں نہ دے۔ بیٹیاں دے تو ان کے نصیب اچھے ہوں۔" اس کے آنسو پھر بہہ نکلے۔

"کبھی کبھی تو میں شوہر اور سسرال کے سلوک سے اتنی اکتا جاتی ہوں کہ دل کرتا ہے میرے بچے ہی مر جائیں۔ پھر بعد میں توبہ استغفار بھی کرتی ہوں۔ لیکن میں بھی انسان ہوں، کیا کروں اتنی ذلت اور تحقیر تو کسی پتھر کی بھی ہوئی ہوتی تو اب تک وہ بھی شق ہو چکا ہوتا۔ لوگوں کو سسرال کو میرا زخم زخم چہرہ تو نظر آتا ہے۔ میرا لیرلیر دل نظر نہیں آتا۔ میرے روم روم سے ان کے لیے بددعائیں نکلتی ہیں، بتائیں کیا کروں۔"

"تمہارے بچے کتنے ہیں؟" فریحہ بھی دکھی ہو گئی۔

"میری دو بیٹیاں بڑی ہیں، بیٹے تینوں چھوٹے ہیں۔" خالدہ نے آنکھیں پونچھیں۔

"خالدہ! میری بات کا برا نہ ماننا، تمہارے حالات میں تمہارا ابھی بہت سارا قصور ہے۔"

"میرا؟ وہ کیسے باجی!؟" وہ ششدر رہ گئی تھی۔

"دیکھو، تم پر سختی آئی، تم نے صبر نہیں کیا، خدا سے مدد نہیں مانگی۔ لوگوں نے تم پر ترس کھایا، تماشا بھی دیکھا، ایک کی دو لگا کر بتائیں، تم نے اپنی بیٹیوں کا بھی نہیں سوچا کہ ان کی کیسی تربیت ہو رہی ہے؟ ان کا مستقبل کیا ہو گا؟ یہ گالی گلوچ، مار کٹائی، ہمارے محلے میں پہلی دفعہ ہوا ہے، ٹھیک ہے گھروں میں اونچ نیچ ہو جاتی ہے، لیکن اسے محلے میں نشر کرنے کا کوئی رواج نہیں ہے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے۔ سچی بات کہوں، تمہارے شوہر کی گندی گندی گالیاں سن کر ہمیں تو شرم آ جاتی ہے تو تمہارے بچوں کو شرم نہ آتی ہو گی؟ اور یہ شرم جب ختم ہو گئی تو تم دونوں کے پاس کچھ نہ بچے گا۔ کچھ اپنے آپ پر بھی کنٹرول کرو۔ زبان بند رکھو، نہ جواب دو۔ وہ کب تک بولیں گے؟ کب تک ماریں گے۔ بس دل میں درود پڑھو، اور خدا سے مدد مانگو۔ اللہ تمہاری سب مرادیں پوری کرے گا۔

میں ناصر صاحب سے کہہ کر تمہارے میاں کو بھی کچھ درست کرواؤں گی۔ لیکن پہلے تم خود اپنے آپ کو بدلو۔ پھر باقی بھی بدلیں گے، ان شاء اللہ۔" فریحہ پُرامید تھی۔

☼ ☼ ☼

ملیحہ کے لیے کچھ رشتے آئے تھے، اور ابو نے بڑی بیٹی اور داماد ہونے کے ناتے اسے گھر بلوایا تھا۔ ہمسائے سے آنٹی زرینہ کو ساس کے پاس چھوڑ کر وہ ابو کی طرف آ گئے، بچے بھی گھر میں ہی تھے۔ اور اسے پتا تھا کہ بچے اگرچہ چھوٹے ہیں، لیکن دادی کی دیکھ بھال لازماً" اچھی طرح کر لیں گے۔

امی اس کی سدا کی بیمار تھیں اور ناصر صاحب کی سمجھ داری کے ابو بہت قائل تھے۔ اب بھی ابو نے دونوں رشتوں کی چھان پھٹک کی ذمہ داری ناصر کے سپرد کی تھی اور انہوں نے حامی بھر لی تھی۔

"ابو جی! ایک بات کا خیال رکھیے گا۔ دین داری کو ترجیح دیجیے گا، روپے پیسے کو تو اہمیت بالکل نہ دیجیے گا۔ آپ کو پتا ہے کہ ہمارے گھر میں کتنا سکون ہے اور یہ سب

نیکی کی وجہ سے ہے۔ بعض اوقات روپے کی تنگی ضرور محسوس ہوتی ہے، لیکن پھر اللہ تعالیٰ ایسا سبب بناتا ہے کہ بندہ حیران رہ جائے۔ دوسرا صبر اور قناعت کی دولت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ جس کی وجہ سے ہوس اور حسرت کی بیماری نہیں لگی ہے۔" فریحہ نے ابو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں بیٹا! اللہ کا شکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ناصر جیسا داماد دیا اور بہن جیسی ساس تمہیں دی۔ ان دونوں نے تو میری بیٹی کو ہیرا بنادیا ہے۔ اسی لیے تو تمہاری چھوٹی بہنوں کے لیے بھی میں دلی طور پر ایسے ہی رشتے کا خواہاں ہوں، اسی لیے تو کوئی پسند نہیں آرہا۔" ابو نے ناصر کو مسکرا کے دیکھا۔

"ابو جی! آپ تسلی رکھیں، ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ بہت اچھے لوگوں سے ملائے گا، میں پوچھ گچھ کرواتا ہوں۔ بعد میں، ہم استخارہ کرلیں گے۔" ناصر صاحب نے ابو جی کو تسلی دی۔ انہوں نے کبھی بھی سسرال والوں کو مایوس نہیں کیا تھا۔ ہر موقع پر بیٹوں کی طرح ساتھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

خالدہ کی ساس، امی کی عیادت کو آئیں تو فریحہ کا ساس کے ساتھ سلوک دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"سچ بتاؤ تم بہو ہو ان کی کہ بیٹی؟" انہوں نے پوچھا۔

"حقیقت میں تو میں ان کی بہو ہی ہوں۔ لیکن یہ میرے لیے ماؤں سے بھی بڑھ کر ہیں۔" عقیدت اور احترام فریحہ کے لہجے میں حد درجہ تھا۔

"حیرت کی بات ہے آج کے دور میں ایسی بہوئیں تو چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ تم یا تو کوئی بہت نیک روح ہو یا پھر تمہارے ماں، باپ نے تمہاری تربیت بہت اچھی کی ہے۔ ورنہ ساسوں کو کون ایسے جی جان سے سنبھالتا ہے۔ آج کل کی لڑکیاں تو تن تنہا لڑکا چاہتی ہیں، تاکہ اکیلی رہیں، نہ ساس، نندوں کا جھنجٹ ہو، نہ دیور، جیٹھ کا ٹنٹا۔"

"خالہ جی! اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے، نہ ہی میرے ماں، باپ نے کوئی انوکھی تربیت کی تھی۔ میری امی تو سدا کی بیمار ہیں۔ ہم نے تو بچپن سے ہی گھر سنبھالا۔ ساتھ امی کو بھی سنبھالا۔ ابو اپنے معاش میں مصروف رہتے۔ اسکول، گھرداری، امی کی تیمار داری کے بعد اتنا ٹائم نہ ہوتا تھا کہ امی کوئی نصیحت کریں اور ہم سن لیں۔ سارے دن کے تھکے ہارے سرشام سوتے اور صبح کی خبر لاتے تھے۔ مجھے پتھر سے ہیرا بنانے میں سارا کمال میری ساس کا ہے۔ آپ حیران ہوں گی، لیکن یہ سچ ہے کہ امی نے آج تک میری کسی خامی پر نکتہ چینی نہیں کی۔ غلطی کی اصلاح بڑے پیار سے کی۔ گھرداری، بچوں کی پرورش و تربیت، ملنا ملانا، سب کاموں میں امی نے مجھے طاق کردیا ہے۔ اب میں اس مقام پر ہوں کہ میرے میکے والے ہر معاملے میں میری رائے کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں، میں بہت سمجھ دار اور عقل مند ہوں۔" فریحہ نے تفصیلاً بتایا۔

"بہت نیک خاتون ہیں بھئی! ہم تو ٹھہرے دنیادار لوگ، کیا کریں اتنی نیکیاں ہم نہیں کر سکتے۔ ہماری ساس نے تو ہمیں سولی پر لٹکایا ہوا تھا۔ سارا دن مشقت، بچوں کی پیدائش، پرورش، گھر کے کام اور اوپر سے سارے ٹبر کی خدمت۔ پھر بھی کبھی پیٹ بھر کر روٹی نصیب نہ ہوئی تھی۔ ساس، نندیں چارپائی پر ہوتیں اور میں ان کی جوتیاں تک سیدھی کرکے دیتی تھی پھر بھی کبھی خوش نہ ہوئیں۔ وہ تو شکر ہے کہ اللہ نے مجھے چار بیٹے دیے اور تینوں نندوں کی بیٹیاں زیادہ ہیں۔ اب وہ چاہتی ہیں کہ میں ان کی بیٹیاں لے آؤں لیکن مجھے ابھی اپنے زخم نہیں بھولے۔ میں نے بھی کہا کہ میں وہی ہوں جسے تم ماں، بیٹیاں کہتی تھیں کہ اسے چاول کے دانے کی شکل نہیں دکھائی تو اب چھوکریاں تمہاری چاولوں سے بھی سستی ہیں کہ میرے بیٹوں کو دے رہی ہو؟" ان کے لہجے میں بیٹوں کی ماں کا غرور بول رہا تھا۔

"جو آپ نے کاٹا، آپ وہی بو رہی ہیں اور آپ شاید اسی کو نسل در نسل منتقل کرتی جائیں۔" فریحہ نے سوچا، لیکن کہنے کی جرات نہ کی کہ ان کی بزرگی مانع

تھی۔

"ارے بہن غصہ مت کرنا، لیکن اس میں تمہارا کمال تب ہوتا، جب تم اپنی بہو کو بالکل مختلف ماحول دیتیں۔ اگر میں کہوں کہ تم سے ملتا جلتا ماحول مجھے بھی سسرال میں ملا تھا تو شاید تم یقین نہ کرو لیکن مردہ لوگوں کی برائی سے بچنا چاہیے۔ میں نے تب ہی سوچ لیا تھا کہ میں اپنی بہو کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز ہرگز نہیں کروں گی۔" امی جان نے بات پکڑی اور فریحہ کچن میں چلی گئی چائے بنانے۔ "بیٹیاں تو پرایا دھن ہوتی ہیں۔ اصل بیٹی تو بہو ہے، جس نے آپ کا گھر سنبھالنا ہے۔ جس نے آپ کی نسل پالنی ہے۔ میں نے اکثر عورتوں کو دیکھا ہے۔ جب نانی، دادی بنتی ہیں تو نواسوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں اور پوتوں سے نہیں۔ پوتوں کو سمجھتی ہیں کہ یہ بہو کے بچے ہیں۔ حالانکہ پوتے ہی ان کی نسل ہوتے ہیں۔ "نواسے" تو اور خاندان کی اولاد ہوتے ہیں۔ اسی طرح بہوئیں ان کی نظر میں "بے گانی" ہوتی ہیں۔ جبکہ بہوؤں کے ساتھ دن رات کا ساتھ ہوتا ہے اور بیٹیاں تو شادی کے بعد کبھی کبھار ہی چکر لگاتی ہیں۔"

"بہوئیں کب اپنی بنتی ہیں، بلکہ بہو آنے پر تو بیٹے بھی اپنے نہیں رہتے۔" خالہ جی نے کہا۔

"دراصل یہ ہم عورتوں کی سوچ کا قصور ہے کہ بیٹا چھن جائے گا یا بدل جائے گا۔ حالانکہ ساس والا رشتہ بنتے ہی ہماری سوچ بدل جاتی ہے اور ہم اسی خیال کے تناظر میں بہو کو جب دیکھتے ہیں تو اس میں ہمیں کیڑے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ ہماری سوچ بدبودار ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ماحول کو بھی متعفن کرتے جاتے ہیں۔"

"آپ دراصل پڑھی لکھی ہیں، اس لیے ایسی باتیں کرتی ہیں۔"

"اسکول میں تو میں نے دو، چار جماعتیں ہی پڑھی ہیں، لیکن عملی زندگی کے اسکول میں زیر تعلیم تو برسوں گزر گئے۔ ہر لمحہ سیکھ بھی رہی ہوں اور سکھا بھی رہی ہوں۔ وہ کہاوت تو آپ نے بھی سنی ہوگی۔ جب میں بہو تھی تو ساس اچھی نہ ملی، جب ساس بنی تو بہو اچھی نہ ملی۔ میں نے تہیہ کیا تھا کہ ساس کو تو میں بدل نہیں سکتی، لیکن جب خود ساس بنی تو اپنے آپ کو اور اپنی بہو کو ضرور بدل لوں گی اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس میں کامیاب رہی ہوں۔ لیکن اس میں بڑا ہاتھ فریحہ بیٹی کا بھی ہے۔ نیک، شریف ماں، باپ کی اولاد ہے۔ اس نے بھی کبھی مجھے مایوس نہیں کیا۔" امی نے بات جاری رکھی۔ "بہن! اصل میں بات تھوڑی سی سمجھنے کی ہے، دیکھو ہم نے بیٹی بیاہی ہے تو کوئی ماں، باپ نہیں چاہتے کہ بیٹی کا خدانخواستہ گھر اجڑے، وہ اپنی بیٹی کو گھر بسانے کی نصیحت ہی کرتے ہیں۔ اب بہو ایک بالکل نئی جگہ، نئے لوگوں میں آتی ہے تو گھر والوں کو بھی اپنے رویوں میں لچک رکھنی چاہیے کہ بہو سیٹ ہو سکے۔ بہت کم لڑکیاں ہوں گی جن کی بد فطرت ہو اور وہ سسرال سے مل کر نہ رہیں، ورنہ اکثریت کو اگر سسرال کا تعاون ملے تو وہ بہت ہی اچھی بہو ثابت ہو سکتی ہیں۔"

"لیں خالہ جی! چائے پئیں۔ امی! آپ بھی لیں، خالہ جی یہ ساتھ میں کباب بھی کھائیں، میں نے ایک نئی ترکیب آزمائی ہے، دیکھیں کیسے بنے ہیں۔" فریحہ نے دونوں کو کپ تھمائے اور کبابوں کی پلیٹ پکڑائی۔

"بہت مزے کے ہیں کباب بیٹی! تم نے خوامخواہ تکلف کیا چائے کا۔" خالہ جی تھوڑی شرمندہ نظر آرہی تھیں۔ پتا نہیں خاطر مدارات کی وجہ سے یا پھر امی جان کی باتوں کی وجہ سے۔

"تکلیف کیا خالہ جان! امی نے اب دوا کھانی تھی تو میں نے سوچا پہلے کچھ ہلکا پھلکا کھلا دوں اور مہمان کی مدارت تو فرض ہے نا۔"

"ارے تم جیسی بہو تو اللہ سب کو دے، کیسے گھر کو جنت بنا رکھا ہے۔ کتنا سکون ہے تمہارے گھر میں۔" خالہ جی متاثر تھیں۔

"بہن! یہ بات تو آپ کو بھی پتا ہوگی کہ "تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے"۔" امی جی نے بہت گہری بات کی تھی اور شاید خالہ جی کی سمجھ میں بھی آگئی تھی کہ وہ

خاموش ہو گئی تھیں۔

"خالہ جی! میرا تو گھر سے نکلنا نہیں ہوتا امی کی وجہ سے۔ آپ خالدہ کو تو کسی دن بھیجیے گا۔ میں چنے بنانے کی ترکیب پوچھوں گی۔ گھر میں جو کچھ بھی کر لیں، لیکن بازار کے بنے چنوں جیسا ذائقہ کبھی نہیں آتا اور بچوں کو تو بازار کی چیزیں ہی پسند آتی ہیں۔ میں اس سے بنوا کر سیکھوں گی۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو؟" فریحہ نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تو مجھے خوامخواہ اعتراض ہوگا" بھیج دوں گی، اس نے کون سا پہاڑ توڑنے ہوتے ہیں۔ میاں بازار، بچے اسکول، سارا دن کون سا کام ہوتا ہے، جس دن تم کہلواؤ گی آجائے گی۔" خالہ جی نے بڑے سیاسی انداز میں اجازت بھی دی اور ساتھ ہی بہو کی فراغت کا ذکر بھی کیا تھا۔

"بہت شکریہ خالہ جی!"

"فریحہ بیٹا! تم تو خود قسما قسم کے کھانے بنا لیتی ہو، تمہیں کون سی ترکیب پوچھنی ہے اور میرے بچے کب سے بازاری کھانے پسند کرنے لگے؟" ان کے جانے کے بعد امی نے حیران ہو کر فریحہ سے دریافت کیا۔

"امی! آپ نے "ساس" کی کلاس لی ہے۔ میں "بہو" کی تربیت کروں گی۔ شاید کچھ عرصے میں ہماری باتیں ان پر اثر انداز ہو جائیں۔ یہ تو میں نے ایک بہانہ بنایا تھا، کیسا؟" فریحہ کھلکھلائی۔

"زبردست۔ میری بہو تو بہت تیز ہو گئی ہے، اب تو مجھے ڈرنا چاہیے اس سے۔" امی بھی اس کی ساس بنیں۔

"اوں ہوں! میں نہیں ہوں بہو وہو، میں تو آپ کی بیٹی ہوں۔" اس نے امی کے کندھے پر لاڈ سے سر رکھا۔

"بالکل بالکل۔ تم ہی تو میری اصلی بیٹی ہو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے بیٹا! اولاد کا سکھ دے۔ سہاگ سلامت رکھے۔" امی نے ہنس کر دعا دی۔

"امی جی! اس میں صرف ایک دعا میرے لیے ہے۔ باقی دونوں دعائیں آپ نے اپنے بیٹے اور پوتوں کو دی ہیں۔ کہیں خالہ جی کے زیر اثر آپ بھی تو ساس نہیں بننے لگیں؟" فریحہ نے شرارتاً کہا۔

"ارے، میری بلی اور مجھ ہی سے میاؤں۔ اب میری بات پکڑو گی تم۔ خبردار! میرا بیٹا آنے والا ہے، ابھی تمہیں ٹھیک کرواتی ہوں۔"

ان کی بات ختم ہوتے ہی دونوں ساس، بہو ہنس پڑیں۔

✵ ✵ ✵

دن گزرتے پتا نہیں چلا اور امی جی ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک ہو گئیں۔ دو مہینے پلک جھپکتے گزرے تھے۔ اس دن پہلی تاریخ تھی، جب ناصر فروٹ اور مٹھائی کے شاپر سمیت گھر آئے۔

"امی جی! مبارک ہو، آپ کے بیٹے کی پروموشن ہو گئی ہے، اور تنخواہ میں پورے دس ہزار کا اضافہ ہوا ہے۔" انہوں نے فریحہ کو شاپر پکڑائے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر انہیں خوشخبری سنائی۔

"تمہیں بھی مبارک ہو بیٹا! اور فریحہ کو بھی۔" امی نے خوش ہو کر ناصر کی پیشانی چوم لی۔ فریحہ کا چہرہ بھی کھل اٹھا تھا۔

"یہ سب میری بیٹی کی خدمتوں کا صلہ اللہ تعالیٰ نے اسے دیا ہے۔ اب اسے جی بھر کر شاپنگ کروا دینا۔" امی نے فریحہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں۔ یہ سب میری امی کی دعاؤں کا صلہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا ہے اور مجھے کوئی شاپنگ نہیں کرنی، اللہ کا شکر ہے سب کچھ ہے میرے پاس۔" فریحہ کے برجستہ جواب پر امی اور ناصر ہنس پڑے۔

"امی کا منہ میٹھا کرواؤ بھئی۔" ناصر نے فریحہ سے کہا۔

"نہیں، بچے اسکول سے آئیں گے تو اسی وقت ڈبہ کھولیں گے اور مل کر کھائیں گے۔" امی نے فوراً منع کر دیا کہ پوتوں کے بغیر تو کوئی چیز ان کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔

"ویسے امی! ہمسایوں کی طرف اب راوی چین ہی چین نہیں لکھ رہا، کافی دنوں سے سیز فائر ہے، کوئی گالم گلوچ، تو تڑاخ، اور ڈائنگ سوٹے نہیں چلے۔" ناصر صاحب نے بھی اس خاموشی کو محسوس کیا اور وہ دونوں تو کافی دنوں سے اس سکون کو محسوس کر رہی تھیں۔

"جناب! یہ ہم دونوں کا کمال ہے، میں نے بہو کی برین واشنگ کی ہے اور امی نے ساس کی جھاڑ پونچھ۔ اب تو کئی دن ہو گئے جنگ عظیم برپا نہیں ہوئی۔" فریحہ نے فرضی کالر کھڑے کیے۔

اور حقیقتاً "دونوں کی وقتاً فوقتاً" لی گئی کلاسز کا کمال تھا کہ ہمسایوں میں امن چین تھا اور جب سے امی ٹھیک ہوئی تھیں، وہ ان کے گھر جا کر نندوں کی تھوڑی سی دھلائی بھی کر آئی تھیں۔

"بہر حال میں اپنی گنتی کر شہیدوں میں شامل ہونے کے اعزاز کا مستحق ہوں کہ شوہر کو مسجد جاتے اور محلے میں دو، چار بار ملاقات ہونے پر میں نے بھی تھوڑا سا گائیڈ کیا ہے۔" ناصر نے انکشاف کیا۔

"واہ، واہ آپ تو چھپے رستم نکلے بھئی۔ میں بھی سوچتی تھی کہ آپ کی نمازیں اتنی لمبی کیوں ہو گئی ہیں، تو آپ مسجد میں مصروف رہتے ہوں گے۔" ناصر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا امی! کیا خیال ہے ان پیسوں سے کوئی پلاٹ دیکھ کر قسطیں بھرنی نہ شروع کر دوں، دو، چار سال میں پلاٹ اپنا ہو جائے گا اور آئندہ بچوں کے کام آئے گا۔" ناصر نے خیال ظاہر کیا۔

"جیسے تمہاری مرضی بیٹا!" امی کو کوئی اعتراض نہ تھا۔

"جی نہیں۔ ابھی ہمیں کوئی پلاٹ نہیں لینا۔ یہ سارے پیسے آپ مجھے دیں گے، میں کوئی کمیٹی ڈالتی ہوں اور جیسے ہی ہمارا نمبر نکلا، آپ اور امی جی دونوں عمرہ کر کے آئیں۔" فریحہ کی بات سن کر امی کا چہرہ چمک اٹھا، لیکن بولیں کچھ نہیں۔

"یہ خیال تو سب سے بہترین ہے، کیوں امی جی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے امی کو دیکھا۔

"بیٹا! اللہ کے گھر اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کی حاضری سے بڑی سعادت اور کیا ہو گی ایک مسلمان کے لیے، اللہ میری بیٹی کی زبان مبارک کرے اور ہم جلد از جلد اس گھر میں حاضری دیں، مجھے اور کیا چاہیے؟" امی کی زبان بھرا گئی اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"بس ٹھیک ہے، آپ دونوں ان شاء اللہ اگلے سال عمرے کے لیے جائیں گے اور ہمارے لیے دعا مانگ کر آئیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اتنے وسائل دے کہ ہم سب بچوں سمیت دوبارہ جلد از جلد اللہ تعالیٰ کے گھر حج کی سعادت حاصل کرنے جائیں۔" فریحہ نے کہا۔ ان دونوں کے آمین کی آوازوں میں چمکتا چہرہ لیے امی کی آواز بھی شامل تھی۔

✵

دلشاد نسیم

پورے گاؤں میں شیرو کے نام کے چرچے تھے۔ ڑیل جوان، خوبرو، بڑی بڑی مونچھیں۔ جب چلتا تو کھسے کی چرچراہٹ آس پاس سب کو متوجہ کرتی۔

لڑکیاں سر کا دوپٹہ اور بھی زیادہ ماتھے تک لے آتیں اور مرد رک جاتے۔

اگر اس میں کوئی قباحت تھی۔ تو صرف یہ کہ نڈر بہت تھا۔ غصے پر ذرا سا بھی قابو نہیں تھا اس پر اتنا کہ آنکھوں میں خون اتر آتا۔ لڑنے لگتا تو اگلے کو آخری دموں پر چھوڑتا۔

پھر کیا ہوا؟ شیرو گھر میں بند ہو کر کیوں پڑا رہ گیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا رہتا۔

گاؤں میں ریشم کی شادی کے شادیانے بج رہے تھے۔ دلہن بنی ریشم ہیر جیسی خوب صورت لگ رہی تھی۔ کوثر نے ریشم کو دیکھا۔ ریشم نے نظریں جھکا لیں۔ کوثر کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اتنی خوب صورت دلہن اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

ہر بات سے بے نیاز وہ بھاگتی ہوئی گھر آگئی۔ شیرو برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ کوثر کھلے دروازے سے بھاگتی اندر جانے لگی، شیرو نے آواز دی۔

”کوثر؟“ کوثر نے مڑ کر دیکھا اور پھولے سانسوں کے ساتھ بولی۔

”بھائی! ریشم باجی تو اتنی خوب صورت لگ رہی ہیں کہ کیا بتاؤں۔“

شیرو کے دل پر قیامت گزر گئی۔ ”میرا پیغام دیا تھا؟“

کوثر نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”میں نے اسے بتایا تھا۔ بھائی تیرا پوچھ رہے ہیں تو کہنے لگی۔ بھائی سے کہنا۔ اب میں کسی اور کی امانت ہوں۔“ اس نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ ”بھائی! امانت کا کیا مطلب ہے۔ وہ کوئی روپیہ پیسہ ہیں جو...“

شیرو نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اور، اور کیا دیکھا تم نے؟“

”میں تو دلہن ہی دیکھتی رہی .... اس نے اتنے سارے گہنے پہنے ہوئے تھے۔ پورے ہاتھ پہ مہندی اور بھائی جھومر بھی۔“

شیرو نے ضبط سے مٹھیاں بھینچیں۔

”کون کون تھا وہاں۔“ اس نے پوچھا۔

”سب۔“ کوثر بولی۔ ”چاچی، پھوپھی، تیلی رحمت کی بیوی، بھٹی والی....“

”اور؟“ شیرو نے بے تابی سے پوچھا۔ ”اور.... ماسٹر جمشید کے سارے گھر والے....“

شیرو کی کنپٹی کی رگیں پھڑپھڑانے لگیں۔ نتھنے پھول گئے۔

کوثر نے ایک لمحہ بھائی کو دیکھا اور پھر باہر جانے لگی۔ شیرو نے وہیں اس رخ پر کھڑے کھڑے آواز دی

”کوثر.... !“ کوثر آواز کی گرج سے ٹھٹک گئی۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گی۔“

”مم.... مگر۔“

”دوپٹہ سنبھالو۔ زمین پر گرا ہوا ہے۔“

کوثر نے جلدی سے دوپٹہ اٹھا کر سامنے سے سر پہ جمایا۔

”اب جاؤں....؟“

شیرو خاموش رہا.... اور اندر چولہے کے پاس بیٹھی ماں کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ ماں نے بیٹے کی شکل دیکھی۔ ساری ہیکڑی نکلی ہوئی تھی۔ شیرو، شیر سے بکری بنا ہوا تھا۔

شیرو کو بار بار ریشم کا چہرہ یاد آرہا تھا۔ حسین.... سرخ و سفید، سیاہ بالوں کے درمیان چمکتا چاند جیسا....

اس نے چمٹے سے لکڑی کے بنے چولہے میں سے راکھ کریدی۔ انگارے فضا میں تارے بنانے لگے۔

ماں اس کو دیکھ رہی تھی۔ بے ساختہ بولی۔

”اب جلنے سے کیا فائدہ شیرو۔“

شیرو نے ماں کو دیکھا۔ ماں کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ ”ساری برادری کے سامنے گردن جھک گئی میری.... تیرے لچھن اچھے ہوتے تو آج شہنائی اس گھر میں بج رہی ہوتی ماسٹر جمشید کے ہاں نہیں۔“

شیرو کو تو لگا جیسے کسی نے تیلی لگا دی ہو آگ بگولا ہو کر بولا۔ ”میرے لچھن برے ہیں، میرے، شیر محمد کے؟ اور اس دو ٹکے کے پرائمری ماسٹر کے بہت اچھے جو کسی کی بچپن کی منگ کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔“

”اس کی کیا اوقات ہے میرے سامنے۔ کلہاڑی کا ایک وار ہی کافی ہے اس کے لیے۔“

ماں نے سر پیٹ لیا۔ ”تیری ان ہی باتوں سے گھبرا کر مقبول نے اپنی دھی کا رشتہ جمشید سے کیا ہے۔“

برآمدے سے آتے ہوئے فضل محمد نے بیوی کی بات سن لی اور گرہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”تو بس سارا دن مونچھوں کو تاؤ دے کر گاؤں بھر میں رعب گانٹھتا پھر۔ ذلیل کر ہمیں۔ ارے تجھ سے ہم تو کیا.... ہمارے پرکھوں کی ہڈیاں بھی شرمندہ ہیں پر تجھے اس سے کیا۔ غنڈہ گردی کر۔ مزے اڑا۔“

ماں نے چادر کے کونے سے ناک اور آنکھیں صاف کیں ”کتنے خواب دیکھے تھے میں نے۔ بڑا تو قبر کا ہو گیا۔ سوچا تھا تیرا بیاہ۔“ شیرو غصے میں آگیا بات کاٹ کر بولا۔

”صرف خواب ہی دیکھے تھے۔ ہونہہ! ریشم کی شادی تک تو رکوا نہیں سکے۔ یہ جھوٹ موٹ کے آنسو بند کرو ماں! جو تم دونوں نے میرے ساتھ کیا۔ وہ تو کوئی میرا دشمن بھی میرے ساتھ نہ کرتا۔“

فضل محمد کا غصہ شدید ہو گیا۔ اس کے نتھنے پھڑپھڑانے لگے۔ ”ہم نے کرائی ریشم کی شادی۔ لوفر نہ ہو تو۔ غنڈہ، بدمعاش، ہماری برسوں کی کمائی عزت کو داغ لگا دیا۔ ایسی اولاد سے تو بے اولاد ہونا اچھا۔“ ماں کے دل کو ٹھیس لگی۔

”اب جانے بھی دو، ریشم کی جدائی کا غم کیا کم ہے جو تم بھی۔“

شیرو آپے سے باہر ہو گیا۔ اٹھتے اٹھتے سلیقے سے پتیلی پہ پتیلی رکھی اونچی لائن کو ٹھوکر ماری۔ ساری پتیلیاں شور کے ساتھ گر گئیں۔ ماں نے دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ لیا۔

فضل کو جو غصہ تھا.... سو تھا مگر شیرو کو نظر انداز کر کے کڑوے لہجے میں بولا۔

”ایک تو چوری اس پر سینہ زوری۔ شیرو کی ماں! کھانا دے۔“ اس نے بات پلٹی۔

شیرو کی ماں جاتے ہوئے غم زدہ بیٹے کا دو گھڑی بیٹھ کر سوگ بھی نہ منا سکی۔

بینڈ کی آواز تھم چکی تھی۔ سب گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ کوثر بھی آکر سو چکی تھی۔ ماں اور ابا سارا دن کی محنت اور جنجل خرابی کے بعد اپنی تھکن اتارنے کے

لیے اونچے اونچے خراٹے بھر رہے تھے۔ پورے چاند کی رات تھی۔ صحن میں لیٹے کروٹیں بدلتے بدلتے شیرو کی کمر تھکنے لگی۔۔۔ مگر اس کی سوچیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا۔ اس کا پورا جسم انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا۔

دلہن بنی ریشم کے پاس جمشید آیا ہو گا۔

ریشم شرم سے سمٹ گئی ہو گی۔

جمشید نے اپنا کلاہ اتار کے رکھا ہو گا۔

اس کا سر اپنے سینے پہ رکھا ہو گا۔

ریشم شرمائی لجائی اس کی بانہوں میں۔۔۔

شیرو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پسینے سے بھرے ماتھے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور خشک حلق کو تھوک سے تر کرنا چاہا مگر سر کی دکھن کا کیا علاج کرتا۔ ساری رات آنکھوں میں کٹی۔ یہاں تک کہ مولوی کی آواز آنے لگی۔

"اگر اس روز میں شہر نہ گیا ہوتا تو میرے پیچھے ریشم کا ہاتھ کسی اور کے ہاتھ میں کون مائی کا لال دے سکتا تھا۔"

شیرو کا تو جیسے سر ہی جھک گیا۔ وہ لوگ جو اس کے دبدبے سے کانپتے تھے۔ اب اس کو دیکھ کر ہنستے۔ ماسی سعیدہ نے تو یہاں تک کہہ دیا۔

"بڑا بدمعاش بنا پھرتا تھا۔ کچھ بھی نہیں کر سکا۔ مرد ایسے ہوتے ہیں۔"

اس نے سنا اور ماسی کو گھورا۔ ماسی نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ مارے غصے کے اس نے جیب میں رکھی پستول پر گرفت مضبوط کی مگر پستول نکال نہیں سکا۔

بازار میں گزرتے ہوئے کوئی اس سے سہما نہیں۔ حلوائی نے اس کو دیکھ کر جان بوجھ کر نگاہ نیچی کر لی۔ اب سے پہلے شیرو پر نگاہ پڑتے ہی چھکو حلوائی آواز دیتا۔

"شیر محمد صاحب! برفی تو کھاتے جاؤ بڑی ودیا تے سوادی اے۔"

شیرو اس کے ہاتھ سے خاکی لفافہ اس طرح لیتا جیسے چھین رہا ہو اور واقعی اس نے کبھی کچھ لیا ہی کب تھا۔ ہمیشہ چھینا ہی تھا اور آج اس سے اس کی بچپن کی منگ چھین لی گئی۔

نہر کے پاس بیٹھ کر اس نے پوری طاقت سے کنکر نہر میں پھینکا۔ بھلا غنڈہ گردی کرنا بھی کوئی جرم ہے۔۔۔ یہ تو دھندا ہے' دھندا جس طرح سے کمائی کسی کے مقدر میں لکھی ہو۔ یہ تو سب اللہ کے فیصلے ہیں۔"

"مجھے پتا تھا تو یہاں ہی ہو گا۔"

جیدے نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کہا اور پاس ہی بیٹھ گیا۔ شیرو اسی طرح بیٹھا رہا۔ اسے بھی نہیں دیکھا۔

"یار! دلداروں سے کیوں ناراض ہوتے ہو۔ شادی ریشم نے کی اور۔۔۔"

"نام نہ لے اس کا۔" شیرو نے دانت پہ دانت جمائے اور غصے سے کہا۔ "میرا خون کھولنے لگتا ہے۔"

"سچ پوچھے ناں' خون تو میرا بھی بڑا کھولتا ہے۔ جی کرتا ہے اپنے ہتھی اس پرائمری ٹیچر کو پھڑکا دوں اور تیری ریشم کو تیرے قدموں میں لا کر پھینک دوں۔" اس کے جبڑے بھی بھنچ گئے۔

شیرو نے اس کو دیکھا اور مرے مرے لہجے میں بولا۔ "تیری یاری کا پتا ہے جیدے! پر یہ کام تیرے کرنے کا نہیں۔ میری غیرت کا سوال ہے۔"

"تو دے ناں جواب۔" جیدے نے جلتی پہ تیل ڈالا۔ "کب تک یونہی ہاتھ دھر کے بیٹھا رہے گا۔ بچہ ہو گیا تو سارا گاؤں تجھے 'ماما' کہہ کے چھیڑے گا کیا سمجھا۔"

شیرو کا غصہ دوچند ہو گیا۔ "میں آگ لگا دوں گا سارے گاؤں کو۔"

"اس کا کچھ فائدہ ہو گا؟" جیدے نے سمجھایا۔ "یا تو اپنی ریشم کو ماسٹر کی سیج سے اٹھا لے۔ یا پھر بھول جا اسے۔۔۔ ہمیشہ کے لیے۔ سمجھ لے وہ تیرے لیے

نامحرم ہے۔ کسی اور کی بیوی ہے۔"

"جیدے!" اس نے للکار کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔ جیدا بھی کھڑا ہو گیا "اوئے کیسا یار ہے تو۔۔۔؟" اس نے جیدے کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ "یار ہو کے بے غیرتی کا سبق دے رہا ہے۔" اس کی آواز میں لرزش سی آ گئی۔ "یار! میں نے تو ریشم سے بڑا پیار کیا تھا۔ جو پراندہ' سرمہ' سرخی سمجھ آئی شہر سے لا لا کر اسے دیتا رہا۔"

جیدے نے افسوس سے کہا۔ "اور اس نے کھائی کرڈکار بھی نہیں ماری۔ سوچتا کیا ہے۔ حساب لے جا کر اپنے سرخی پاؤڈر کا۔ پوچھ اس سے جا کر۔ اس نے ایسا کیوں کیا۔"

"اس نے نہیں کیا۔ سارا کیا دھرا اس کے باپ کا ہے۔"

"باپ کا ہے۔" جیدے نے دہرایا۔ "اس نے کہا ہو گا اور تم نے مان لیا۔۔۔ او بے وقوفا! ماسٹر نے چار چیزیں ودھ (زیادہ) دے دی ہوں گی۔"

"تو زیادہ بکواس نہ کر۔" شیرو نے کہا۔ "پیار کرتی تھی وہ مجھ سے۔"

"تو پھر جا ناں کیوں نہیں اپنے پیار کا حساب لینے۔ تیرا حق ہے اس پر' پوری برادری کے سامنے اس نے تیرے نام کی مندری (انگوٹھی) پہنی تھی۔" جیدے نے اکسایا۔ شیرو کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"کل رات میاں صاحب نے بلا کر مجھے بڑا مہنہ (طعنہ) دیا ہے۔ کہنے لگے اگر شیر محمد کی درانتی کو زنگ لگ گیا ہے' تو ہم مر گئے ہیں کیا۔ تجھے یاد ہے ناں۔ تاجی اور جھلے کو۔ میاں صاحب نے دونوں کو ملوانے کے لیے کیسے سارے گناہ اپنے سر لیے تھے۔ جھلے کو صرف سال کی قید ہوئی اور میاں صاحب نے سال بھر اس کے گھر سے گندم مکنے (ختم) نہیں دی۔ کیسا گج وج کے باہر آیا تھا اور سارا گاؤں اس کے ویاہ میں شریک ہوا تھا۔ تم نے دیکھا ہے ناں۔ بھلا کیسے سینہ چوڑا کر کے گلیوں سے گزرتا ہے۔ غیرت یہ ہوتی ہے۔"

"اب بس کر دے جیدے۔ بس کر دے۔ تو نہیں جانتا' میں کس آگ میں جل رہا ہوں۔ مگر میں یہ سوچ رہا ہوں۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

"تو بس پھر اس کا ایک ہی حل ہے' حویلی چل اور۔۔۔ میاں صاحب کے پیری پڑ جا۔۔۔ اب فیصلہ تیرے ہاتھ میں ہے۔ ماما کہلوانا ہے۔ یا غیرت مند۔"

جیدا چلا گیا' مگر دو لفظ اس کے آگے پیچھے ناچنے لگے ماما یا غیرت مند۔

شیرو نے پستول نکالی اور چیمبر گھما کے دیکھا۔

اس کا جی چاہا' جمشید سامنے ہو تو ساری کی ساری گولیاں اس کے سینے پہ داغ دے۔۔۔ لیکن اس کے بعد خود اسے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ جیل کی سلاخیں اور ریشم سے جدائی۔ اسے دونوں باتیں منظور نہیں تھیں اس نے پستول جیب میں رکھ لی اور بے مقصد ہی چل پڑا۔

کھی کھی کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ پانچ چھ لڑکیاں ایک ساتھ چلتی ہوئی آ رہی تھیں۔ ریشم شرمائی لجائی درمیان میں رانیوں کی طرح چل رہی تھی۔ شیرو کو دیکھا تو سب لڑکیوں کی رفتار دھیمی پڑ گئی مگر شیرو نے پروا نہیں کی اور جا کر ریشم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سب لڑکیوں کی سٹی گم ہو گئی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" ریشم نے غصے سے کہا۔

"یہ بدتمیزی نہیں۔۔۔ میرا حق ہے۔" شیرو نے ڈپٹ کے کہا۔

"میں اب۔۔۔ جمشید کی بیوی ہوں۔"

"اگر تو جمشید کی بیوی نہ رہے تو۔"

"بکواس بند کر۔"

شیرو نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ چھوڑا۔ لڑکیاں تقریباً بھاگتی ہوئی واپس چلی گئیں۔ ریشم بھی لوٹ گئی مگر شیرو ڈٹا رہا۔

سر پہ گوٹے والا گلابی دوپٹہ جمائے ریشم' ریشم جیسی چمک دار لگ رہی تھی۔ کوکے پہ جھولتا شیشے والا پراندہ اس کی چال کے ساتھ ساتھ ٹھمک رہا تھا۔ شیرو نے

کھڑے کھڑے فیصلہ کیا اور میاں صاحب کی حویلی چل دیا۔

میاں صاحب اس کو دیکھتے ہی قہقہہ لگا کر ہنسے۔

"آؤ آؤ شیر محمد..... او جیلے جا' جا کر لسی پانی لے کر آ..... شیر محمد آیا ہے..... اپنی منگ کو رخصت کر کے۔ جی بڑا ہولا ہولا ہوئے گا بے چارے کا۔"

"مذاق نہ کریں میاں صاحب!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں پہلے ہی بڑا پریشان ہوں۔"

"اس سے تو اچھا تھا، تو جا کر جمشید کے دو ٹوٹے کر دیتا او ہم..... سنبھال لیتے..... نا تو نامردی کا طعنہ سنتا' نہ پریشان ہوتا۔"

"میاں صاحب! میں سوچ رہا تھا۔"

میاں صاحب یکدم غصے میں آ گئے۔ "اوئے چل اٹھ - یہاں سوچنے والوں کی کوئی جگہ نہیں جیلے! رہن دے لسی۔"

شیرو پریشان ہو گیا۔ "میاں صاحب۔"

میاں صاحب نے حقے کی نے ایک طرف کی اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگالی۔

"دیکھ شیرے..... تو ہمیشہ میرے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلا ہے۔ آج اگر تو پریشان ہے تو میرا کوئی فرض نہیں بنتا؟ تو کر جو کرنا ہے۔ تیرے سر پر میرا ہاتھ ہے۔ شہر سے چار جماعتیں پڑھ کر آ گیا ہے حرام خور کل تک اس کا باپ میری جوتیاں اٹھاتا تھا۔ آج اس نے تیری غیرت پہ ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی یہ مجال..... تم دیکھنا اگر آج اس کو کسی نے نہ سمجھایا..... تو کل..... ہماری ورانتیاں' بندوقیں..... عجائب گھر والے اپنے شوکیسوں میں سجانے کے لیے لے جائیں گے۔ غیرت کا بس لفظ ہی رہ جائے گا۔ کسی کے سینے میں جوالا مکھی نہیں دہکے گی۔ ماسٹر پڑھائے گا اور..... بچے بچیاں بزدل کرتا جائے گا۔ فیر نہ تیری سنی جائے گی..... نہ میری اس سنیولیے کو..... سانپ بننے سے پہلے کچل دے شیر محمد..... اور یہ تیرا حق بھی ہے۔"

"پر میاں صاحب! سال دو سال کی جیل تو ہو گی ناں؟"

میاں صاحب نے پھر اٹھ کر حقہ گڑگڑایا۔ "اوئے بزدلا! فکر کیوں کرتا ہے۔ سال دو سال سے زیادہ سزا نہیں ہونے دوں گا۔ کمبختوں نے اپنے رجسٹر بھی تو کالے کرنے ہیں ناں اور تجھے یاد ہے ناں۔ محمد بخش نے ایک ساتھ دو قتل کیے تھے ایک اپنی ماں کا دوسرا اس کے یار کا۔"

شیرو کو یاد تھا۔ اس وقت محمد بخش ہیرو بن گیا تھا۔ پیشی پہ جانے سے پہلے پورے گاؤں سے ایسے وصولی کرتا جیسے جہاد پر جا رہا ہو۔

"اوئے کیا سوچ رہا ہے۔ میاں صاحب نے مداخلت کی۔ "اس کا سارا خرچا پانی میری ذمے داری تھی۔ میاں صاحب کے خاندان والے سب کچھ برداشت کر سکتے ہیں، لیکن ان کی حویلی میں بزدل اور ..... بے غیرت کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ دیکھو یہ گاؤں ہے..... یہاں عزت کا مطلب غیرت ہے' مردانگی ہے ..... اگر سب تیری طرح ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں گے۔ اور سوچنے لگیں گے' تو گاؤں اور شہر والوں میں کیا فرق رہ جائے گا۔ اللہ کی مرضی کہہ کر شہر والوں کی طرح بے حیا ہو جائیں کیا؟"

لمبا ہنکارا بھر کے شیرو کو دیکھا۔ "اب وہ لوگ کہاں ہیں جو اپنی منگ پہ حرف آتے ہی گردنوں کا میلہ لگا دیتے تھے۔ کوئی جرات نہیں کرتا تھا کسی کی منگیتر کو کانی آنکھ سے دیکھنے کی۔ اب تو یہاں بس سوچنے والے رہ گئے۔ بزدل کمزور..... نامرد۔"

بیٹھے ہوئے سارے لوگ ہنسنے لگے۔ شیرو کی غیرت پر طمانچہ پڑا۔ وہ سر جھکا کر کھڑا تھا۔ یکدم چارپائی کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

"فیصلہ ہو گیا میاں صاحب! میں اپنے بزرگوں کی عزت پر بٹہ نہیں لگنے دوں گا۔

"کون کون ہے تیرے گھر میں؟" میاں صاحب نے پوچھا۔

"ابا ہے' اماں - چھوٹی بہن اور....." وہ چپ ہو گیا۔

"اور....." میاں صاحب نے دہرایا۔

"بھائی اور بھابھی..... شہر میں ہوتے ہیں۔"

"ہوں۔" میاں صاحب نے ہنکارا بھرا۔ "کسی طرح اپنی بھاوج کو گاؤں بلا لے۔ تیرا کام آسان ہو جائے گا اور اس کے بدلے میں بھائی کا قرضہ..... معاف کر دوں گا میں جس کی وجہ سے وہ شہر میں دھکے کھا رہا ہے۔"

شیرو پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ میاں صاحب کو غصہ آ گیا۔

"تو سوچ لے پہلے..... پھر دیکھیں گے' کیا کرنا ہے۔"

"نن' نہیں میاں صاحب فیصلہ تو ہو گیا۔ بھائی ہی نہیں..... میں بھی ساری عمر آپ کی غلامی کروں گا جی۔"

اس نے اٹھتے اٹھتے میاں صاحب کی قدم بوسی کی اور واپس آ گیا۔

"اوئے او بندہ ہی کیا..... جس میں غیرت ہی نہ ہو۔" سب نے سر ہلایا۔ شیرو کو مگر صرف میاں صاحب کی آواز سنائی دی۔

☼ ☼ ☼

شیرو کے پاس انتظار کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے بھائی بھابھی کو لکھ بھیجا کہ اس بار عید وہ ہمارے ساتھ کریں۔ بھائی نے بھی ہاں کر دی۔ روز انگلی پر حساب کرتا۔ مخصوص وقت پر ٹیوب ویل کے پاس آ کر تھڑے پر بیٹھ جاتا۔ دور سے کانچ کی چوڑیوں کا شور ایسے سنتا جیسے ریشم اس کے کان کے پاس آ کر دونوں کلائیوں کو ایک ساتھ بجا کر کھنکھنا رہی ہو۔

جب وہ مسکرا کے' شرما کے ریشمی دوپٹے کو دانتوں میں دباتی۔ شیرو کا جی چاہتا۔ اس کو اٹھا کر لے جائے۔

اس دن بھی بہت بوجھل دل کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوا۔ ابھی ابھی اس کی راستے میں ریشم سے نظریں ملی تھیں — رتجگوں کے خمار میں ڈوبی آنکھیں اور دنداسہ سے سرخ ہونٹ۔ شادی کے تین ماہ بعد بھی وہ نئی نویلی لگ رہی تھی۔

گھر میں چھوٹی چھوٹی بچیوں کو جمع کر کے کوثر اپنے گڈے کا بیاہ کر رہی تھی۔ میز پر بسکٹوں اور نمک پاروں سے بھری پلیٹیں تھیں۔ مٹھائی اس کی پہنچ سے دور تھی' اس لیے اس نے شیرو کو دیکھا تو بولی۔

"بھائی۔" اس نے ایڑیوں کو اونچا کر کے ہاتھ اوپر کیے۔ دوپٹہ کھسک کر آدھا کندھے اور آدھا زمین پر آ گیا۔

"مٹھائی اتار دیں بھائی۔" اس کا انداز ملتجی تھا۔ شیرو کی آنکھوں میں سرخ ڈوروں والی ریشم تھی ایک جھٹکے سے اٹھا۔ ایڑیوں کے بل کھڑی کوثر کو دیکھا اور حیران رہ گیا۔

ماں کی آواز اس نے سنی۔ "جوان ہو گئی ہے' مگر گڈے گڈیوں سے باہر نہ نکلی..... کوثر اب رہن بھی دے۔ کل جب تیری اپنی شادی ہو گی تو۔"

شیرو کے بالکل پاس کوثر کھڑی تھی۔ اس پر کم عمری کا نکھار تھا۔ شیرو نے اس سے نگاہ چرائی اور پلیٹ اتار کے اس کے ہاتھ پہ رکھی۔

"جب ہو گی۔ تب دیکھا جائے گا۔ ابھی تو میں اپنے گڈے کی گڑیا لینے جا رہی ہوں۔ ذرا سہرا بندی ہو جائے۔"

شیرو کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سوچا۔ بھابھی کو آنے میں تو..... ابھی بہت دیر ہے۔

لڑکیاں سہرے کے گیت گانے لگیں۔

"آیا لاڈیے نی تیرا سہرا والا آیا نی
آیا تے....."

"جیوے بنڑا۔ عمراں ساریاں جیوے بنڑا
تیرے سہرے تو میں واریاں
دے سہرے والے' عمراں ساریاں
جیوے بنڑا"

فائر کی آواز آئی۔ ساری لڑکیاں یکدم چپ ہو گئیں ایک دو' تین۔

ماں کے ہاتھ سے شربت کا گلاس چھوٹ گیا۔ سرخ شربت زمین پر بکھرا بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ کمزور دل ماں کے دل میں سو وسوسے سانپ بن کر سر اٹھانے

لگے۔ تب ہی شور کے ساتھ شیرو گھر میں داخل ہوا۔ سراگاتی لڑکیوں کو چپ لگ چکی تھی۔

شیرو کے ہاتھ خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ ماں کی آنکھوں میں وحشت ناچنے لگی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتی۔ شیرو نے کوثر کے ہاتھ سے گڈے کو کھینچا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کے پاس پھینکا۔

ناسمجھ کوثر بھائی کو دیکھتی رہ گئی اور اس کھلی آنکھ نے آخری بار اپنے ہی بھائی کو فائر کرتے دیکھا خود اس پر۔ ایک چیخ نکلی مگر تیسری اور آخری گولی تک وہ مر چکی تھی اور ماں بے ہوش ہو کر وہیں زمین پر سرخ شربت کے پاس گر چکی تھی۔ سب کچھ لمحہ بھر میں ہو گیا۔

شیرو نے کھلی آنکھوں والی معصوم کوثر کو ہاتھ سے پکڑ کر کھینچا اور باہر پڑی ماسٹر کی لاش کے برابر رکھ کر آس پاس کھڑے لوگوں پر غرور بھری نگاہ ڈالی۔

جیدے نے بڑھ کر شانہ تھپتھپایا۔ "واہ میرے شیر واہ۔۔۔ اس کو کہتے ہیں غیرت مند۔"

گھروں کی عورتوں نے آپس میں چہ مگوئیاں کرنا شروع کر دیں۔

"شیرو غیرت مند نکلا۔"

"اسے کہتے ہیں بہادری۔ دیرا قتل کیا ہے اس نے اپنی عزت پر مان دینا اس کو۔ پولیس آگئی۔ دونوں لاشوں کے آس پاس دائرہ بنا دیا گیا۔

"کوئی پرانی دشمنی؟" پولیس والوں نے سوال کیا۔

"نہیں جی۔۔۔ ان دونوں کو ساتھ دیکھا تو۔۔۔ میری غیرت کو جوش آگیا۔ رہا نہیں گیا مجھ سے۔"

"کیا عمر ہے لڑکی کی؟"

"پندرہ سال۔۔۔" جیدے نے کہا۔

پولیس کے ایک رکن نے دونوں لاشوں پر چادر ڈال دی اور پوسٹ مارٹم ____________ کے لیے کہا اور شیرو کو لے کر تھانے چل دیے۔

عدالتی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ پیشی ہوتی، مگر پھر فیصلہ اگلی تاریخ تک ٹل جاتا۔

دس ماہ ہو چکے تھے، اسے جیل میں آئے اس روز بھی وہ پریشان بیٹھا تھا کہ جیدے کی آمد کی خبر ملی۔

"جیدے اور کتنے دن رہوں گا یہاں۔ میں تو تنگ آ گیا ہوں۔"

جیدے نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔ "فکر کیوں کرتا ہے۔ ایسے کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے ناں۔"

"یہ میاں صاحب کیا کر رہے ہیں آخر؟" اس نے غصے سے پوچھا۔

"وہی تو سب کچھ کرا رہے ہیں۔۔۔ تیرا باپ تو اس دن سے چارپائی پر پڑا ہے جس دن سے تو جیل ہی ہے۔ ماں تیری زندہ لاش بنی ہوئی ہے۔ بھائی بھابھی تو جیسے دنیا میں نہ ہوں۔

تو سوچ گھر کا دال دلیہ کون دیکھ رہا ہے، میاں صاحب ناں۔"

"اور۔۔۔ ریشم۔۔۔ وہ کیسی ہے؟" شیرو نے پوچھا۔

"تو اس کی بھی فکر نہ کر میاں صاحب نے صاف کہہ دیا ہے جب تک تو جیل سے رہا ہو کر نہیں آجاتا۔۔۔ وہ ان کے پاس ہی رہے گی۔ ان کی حویلی میں۔"

شیرو نے تڑپ کر جیدے کو دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"وہ کہتے ہیں۔ میں نے شیر محمد کو زبان دی ہے۔ جب تک وہ آ نہیں جاتا۔۔۔ ریشم ان کے پاس شیر محمد کی امانت ہے۔"

شیر محمد سر پکڑ کے زمین پر بیٹھ گیا۔ جیدے نے پریشان ہو کر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

"کیا ہوا۔۔۔؟"

شیرو نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر سختی تھی۔

"اوئے تو نہیں جانتا؟ میاں صاحب کسی کی امانت کو امانت نہیں، اپنا مال سمجھتے ہیں۔ یاد کر کسی کا ڈھور ڈنگر کسی کی زمین جائیداد کوئی زیور رہن رکھا ہوا کبھی واپس کیا ہے؟ نہیں ناں۔

تو تو کیسے کہتا ہے میری امانت کا وہ خیال رکھیں گے؟" (...)

عائشہ غلام نبی

تبدیلی،

عالیہ بن ٹھن کر سینما دیکھنے جا رہی تھی کہ اس کی سہیلی ملنے آگئی۔ اس کو نئے روپ میں دیکھ کر بول اٹھی۔

"آہا عالیہ! تم کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہو۔ ہاتھوں میں ہیرے جڑی چوڑیاں، کانوں میں ہیرے کے ٹاپس لگے ہیں جڑاؤ ہار اور یہ بیش قیمت ساڑھی تمہارے جسم پر کتنی سج رہی ہے۔ کیا تمہارے شوہر جمال نے کاروبار بدل لیا ہے جس کی وجہ سے تمہاری حالت سدھر گئی ہے۔"

"نہیں۔۔۔! جمال نے تو کاروبار نہیں بدلا۔ میں نے شوہر بدل لیا ہے۔" عالیہ نے اٹھلا کر جواب دیا۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

بے چارگی،

شکیل کے منہ پر نیل اور ورم دیکھ کر ہاشم نے پوچھا۔

"یہ تمہارے چہرے کو کیا ہوا؟ یہ زخم کیسے ہیں؟"

ٹریفک کے ایک حادثے کے سلسلے میں میرا ایک آدمی سے جھگڑا ہو گیا تھا۔" شکیل نے بتایا۔

"تو تم نے کسی پولیس والے کو کیوں نہیں بتایا۔" ہاشم نے دریافت کیا۔

وہ پولیس والا ہی تھا۔" شکیل نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عائشہ۔ گوجرہ

پریکٹس،

پانچویں جماعت کے مذہبی پیریڈ میں پادری معجزے کی وضاحت کر رہا تھا کہ معجزہ کیا ہوتا ہے۔

"عزیز طلبا و طالبات!" پادری نے سنجیدگی سے کہا۔ "فرض کیجیے میں ایک دس منزلہ عمارت کی چھت سے توازن کھو کر نیچے گروں اور دفعتاً ہوا کا ایک بگولا مجھے صحیح سلامت زمین پر اتار دے تو اسے آپ کیا کہیں گے؟ اس صورت حال کی عکاسی کے لیے آپ کون سا لفظ استعمال کریں گے؟"

چند لمحے کلاس میں خاموشی طاری رہی پھر ایک لڑکے نے اٹھ کر کہا۔ "خوش بختی۔"

"جواب تو کسی حد تک درست ہے۔" پادری نے کہا۔ "آپ اسے خوش بختی بھی کہہ سکتے ہیں مگر میں یہ لفظ نہیں چاہتا۔ فرض کیجیے یہی بات دوبارہ ہو گئی ہے اور میں صحیح سلامت دس منزلہ عمارت کی چھت سے زمین پر اتر جاتا ہوں پھر آپ اس کے لیے کون سا لفظ استعمال کریں گے؟"

"حادثہ۔۔۔" ایک لڑکی نے بے ساختہ چلا کر کہا۔

"نہیں بھئی۔" پادری جھلا گیا۔ اس نے پھر اپنی کہانی دہرائی اور بولا۔

"میں تیسری مرتبہ دس منزلہ عمارت کی چھت سے گر کر زمین پر صحیح سلامت پہنچ جاتا ہوں تو آپ اس کے لیے کون سا لفظ استعمال کریں گے؟"

لڑکوں اور لڑکیوں نے کورس کے انداز میں جواب دیا۔ "پریکٹس۔"

عذرا ناصر۔ کراچی

گھر کا بھیدی،

ایک صاحب نے ناراضی سے اپنی بیوی سے کہا۔ "تم تو کہتی تھیں کہ یہ چیزیں مارکیٹ سے خرید کر لائی ہو مگر تم نے یہ چیزیں گلی میں پھیری والے سے خریدی ہیں۔ آخر جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟"

بیوی نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ بھی تو مچھلیاں بازار سے خرید کر لاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شکار کر کے لایا ہوں۔ میں نے کبھی اعتراض کیا؟“

کرن شفیق۔ دبئی

خیر خواہ

ایک شخص دُعا کروانے کے لیے مولوی صاحب کے پاس گیا۔ اس نے دیکھا کہ ان کے پاس پارلیمنٹ کے ممبران بیٹھے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ چلے گئے تو اس نے مولوی صاحب سے پوچھا۔

”کیا آپ کے پاس صرف پارلیمنٹ اور سینٹ کے اراکین دُعا کرانے آتے ہیں؟“

”نہیں... !“ مولوی صاحب نے روہانسا ہو کر جواب دیا۔ ”ان اراکین کو دیکھ کر تو میں ملک و قوم کے لیے دُعا کرتا ہوں۔“

ندا، فضہ۔ کراچی

امتحان کیسے کیسے

ریسٹورنٹ میں ایک صاحب نے کھانا منگوا کر شروع کیا تو کچھ دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ اردگرد کی میزوں پر بیٹھی ہوئی بہت سی لڑکیاں ان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ انہوں نے ذرا پریشان ہو کر ویٹر کو بلایا اور ان کے بارے میں پوچھا۔

ویٹر کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”سر! بات دراصل یہ ہے کہ اس ریسٹورنٹ کے برابر میں ہی ایک کمیونٹی ہال ہے جہاں کھانا پکانے کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ یہ کھانا وہیں سے آیا ہے۔ اگر آپ نے کھانا پورا ختم نہیں کیا اور آپ کھانا کھا کر لیٹ گئے تو یہ بےچاری لڑکیاں امتحان میں فیل ہو جائیں گی۔“

فوزیہ بٹ۔ گجرات

لُوٹ مار

دو نقب زن رات کو ریڈی میڈ گارمنٹس کی ایک دُکان میں داخل ہوئے اور کپڑے سمیٹنے لگے۔ ایک قمیص پر دو ہزار روپے کا ٹیگ لگا ہوا تھا۔ ایک نقب زن نے اپنے ساتھی کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے کہا۔

”غضب خدا کا۔ کاٹن کی ایک معمولی سی قمیص کی قیمت دو ہزار روپے۔ اسے کہتے ہیں دن دہاڑے لوٹنا۔“

طوبیٰ۔ ڈنگہ

ڈراپ سین

پولیس موبائل بہت تیزی سے مجرموں کے تعاقب میں روانہ ہوئی۔ کافی دیر بعد جب موبائل واپس آئی تو اس میں کوئی مجرم نہیں تھا۔ ایس ایچ او نے غصے سے موبائل انچارج سے پوچھا۔

”مجرم کیوں نہیں پکڑے گئے؟“

”سر جی! ہم تو بڑی کامیابی سے مجرموں کا پیچھا کر رہے تھے لیکن ایک جگہ ہمیں مجبوراً رکنا پڑا۔“ موبائل انچارج نے جواب دیا۔

”کیوں...؟ کیا موبائل ٹریفک جام میں پھنس گئی تھی؟“ ایس ایچ او نے ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔

”نہیں سر جی... ! سڑک تو بالکل سنسان پڑی تھی اور ہم مجرموں کے قریب بھی پہنچ گئے تھے۔“ موبائل انچارج نے وضاحت کی۔

”تو پھر کیا ٹائر برسٹ ہو گیا تھا؟“ ایس ایچ او نے بےتابی سے پوچھا۔

”نہیں سر جی ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ دراصل پچھلی مرتبہ جب ہم نے موبائل مرمت ہونے کے لیے دی تھی تو مکینک نے زور دے کر کہا تھا کہ ہر پانچ سو کلومیٹر کے بعد گاڑی کا موبل آئل ضرور بدلی کرتے رہنا۔ تو سر جی۔ جب ہماری گاڑی مجرموں کی گاڑی کے پاس پہنچی تو اس کے پانچ سو کلومیٹر پورے ہو گئے تھے اور ہمیں آئل بدلوانے کے لیے رُکنا پڑا۔ مجبوری تھی سر جی...“ موبائل انچارج نے مؤدبانہ جواب دیا۔

تحریم۔ محراب پور

ثبوت

پورٹریٹ کے لیے ماڈل ضروری ہوتا ہے۔ ہمارا ایک دوست جو صرف جانوروں کے پورٹریٹ بناتا ہے۔ اس نے ایک سیاست دان سے کہا۔

”میری خواہش ہے کہ میں آپ کا پورٹریٹ بناؤں۔“

سیاست دان نے کہا۔ ”مگر آپ تو کہتے تھے کہ مجھے کوئی لاکھ روپے بھی دے تو میں جانوروں کے علاوہ کسی اور کی تصویر نہیں بناؤں گا۔ اب آپ کا دعوا کہاں گیا؟“

مصور نے کہا۔ ”آج کل میں اپنے دعوے کے ثبوت اکٹھے کر رہا ہوں۔“

انعم عنبر۔ فیصل آباد

سرکشی

پہاڑی علاقے کی سیر کرنے والے ایک شہری بابو کو ایک گھوڑے پر سواری کا شوق ہوا۔ گھوڑے کے مالک نے انہیں سمجھایا کہ وہ گھوڑا بہت سرکش ہے۔ اس پر سواری کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ وہ کوئی اور گھوڑا تلاش کر لیں مگر شہری بابو شیخی میں آ گئے اور انہوں نے اس بات کو انا کا مسئلہ بنا لیا۔ انہوں نے گھوڑے کے مالک کو بتایا کہ

انہوں نے بڑے بڑے سرکش گھوڑوں پر سواری کی ہے اور انہیں ایک منٹ میں قابو کر لیا ہے۔ وہ اس گھوڑے کو بھی سیدھا کر دیں گے۔

وہ گھوڑے پر چڑھے مگر دوسرے ہی لمحے وہ زمین پر مٹی میں لتھڑے پڑے تھے۔ چند لمحوں بعد وہ چوٹیں سہلاتے اور کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھے۔

”واقعی بڑا سرکش گھوڑا ہے۔“ انہوں نے کراہتے ہوئے تسلیم کیا۔ ”کم بخت نے اچھل کود کی انتہا کر دی۔“

”اُچھل کود...؟“ گھوڑے کے مالک نے حیرت سے دُہرایا۔ ”ارے صاحب! ابھی تو وہ صرف ہنہنایا ہے۔“

مسرت الطاف۔ کراچی

تعلیمی جائزہ

٭ پرائیویٹ میڈیکل کالج میں جب تک بچے ہڈی اور کھال کے بارے میں پڑھ کر فارغ ہوتے ہیں تب تک ان کے والدین کی کھال اُتر چکی ہوتی ہے۔

٭ بھئی... یونیورسٹی کے ہوسٹل سے میرے بیٹے کا خط آتا ہے تو بہت سے الفاظ کے معنی جاننے کے لیے مجھے ڈکشنری دیکھنا پڑتی ہے۔“

”تم خوش نصیب ہو۔ میرے بیٹے کا خط آتا ہے تو مجھے اپنا بینک اکاؤنٹ دیکھنا پڑتا ہے۔“

٭ ”حامد شادی کیوں نہیں کرتا؟“

”اس نے بیچلرز ڈگری لے رکھی ہے۔“

٭ ”بیٹا! تم یونیورسٹی سے فارغ ہو گئے ہو... اب تمہارا کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“

”ڈیڈی! میں اب آپ کے ساتھ بیٹھ کر خوبصورت ماضی کی یادیں تازہ کیا کروں گا۔“

آمنہ اُجالا۔ ڈہرکی

تلاش گمشدہ

ایک لڑکی اپنی سہیلی کو اپنے محبوب اور ہونے والے شوہر کا خط پڑھ کر سُنا رہی تھی۔

”انہوں نے لکھا ہے۔ ”میں ہر وقت تمہارے پانچ فٹ تین انچ قد... تمہاری ڈیڑھ فٹ لمبی زلفوں تمہاری اٹھائیس انچ کمر... تمہاری بادامی آنکھوں اور تمہارے بائیں پاؤں کی ہلکی سی لنگڑاہٹ کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں...“

”یہ کچھ عجیب سا محبت نامہ نہیں ہے؟“ سہیلی نے قدرے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

نہیں دراصل میرے منگیتر تھانے میں ہوتے ہیں نا... اور تلاش گمشدہ کی اکثر رپورٹیں وہی لکھتے ہیں۔“ لڑکی نے بتایا۔

ندا، فضہ۔ کراچی

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی ستر سال تک نیک لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے پھر جب (مرتے وقت) وصیت کرتا ہے تو وصیت میں ناانصافی کرتا ہے۔ اسی طرح اس کا انجام بُرے کام پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جہنم میں چلا جاتا ہے اور ایک آدمی ستر سال تک بُرے لوگوں والے کام کرتا رہتا ہے۔ پھر (مرتے وقت) وصیت میں انصاف سے کام لیتا ہے تو اسی طرح اس کا انجام نیک لوگوں پر ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جنّت میں چلا جاتا ہے۔"

(سنن ابن ماجہ)

صدقہ کی فضیلت،

ایک شرابی کے ہاں ہر وقت شراب کا دور رہتا تھا۔ ایک مرتبہ اس کے دوست احباب جمع تھے۔ شراب تیار تھی۔ اس نے اپنے غلام کو چار درہم دیے کہ شراب پینے سے پہلے دوستوں کو کھلانے کے لیے کچھ پھل خرید کر لائے۔ وہ غلام بازار جا رہا تھا کہ راستے میں حضرت منصور بن عمار بصریؒ کی مجلس پر گزر ہوا۔ وہ کسی فقیر کے واسطے لوگوں سے کچھ مانگ رہے تھے اور یہ فرما رہے تھے۔

"جو شخص اس فقیر کو چار درہم دے، میں اس کے لیے چار دعائیں کروں گا۔"

اس غلام نے وہ چاروں درہم اس فقیر کو دے دیے۔

حضرت منصورؒ نے فرمایا۔ "بتا کیا دعائیں چاہتا ہے؟"

غلام نے کہا۔ "میرا ایک آقا ہے، میں اس سے خلاصی چاہتا ہوں۔"

حضرت منصورؒ نے اس کی دُعا کی پھر پوچھا۔ دوسری دُعا کیا چاہتا ہے؟"

غلام نے کہا۔ "مجھے ان درہم کا بدل مل جائے۔" منصورؒ نے اس کی بھی دُعا کی پھر پوچھا۔ "تیسری دُعا کیا ہے؟"

غلام نے کہا۔ "حق تعالیٰ شانہٗ، میرے سردار کو توبہ کی توفیق دے اور اس کی توبہ قبول کرے۔"

آپ نے اس کی بھی دُعا کی پھر پوچھا۔ "چوتھی دُعا کیا ہے؟"

غلام نے کہا۔ "حق تعالیٰ شانہٗ میری اور میرے سردار کی اور تمہاری اور اس مجمع کی جو یہاں حاضر ہیں، سب کی مغفرت فرما دے۔"

حضرت منصورؒ نے اس کی یہ دُعا بھی کی۔ اس کے بعد وہ غلام (خالی ہاتھ) اپنے سردار کے پاس واپس چلا گیا۔ سردار اسی کے انتظار میں تھا۔ دیکھ کر کہنے لگا۔

"اتنی دیر لگا دی؟"

غلام نے قصہ سنایا۔ سردار نے ان دُعاؤں کی برکت سے (بجائے خفا ہونے اور مارنے کے) یہ پوچھا کہ کیا کیا دُعائیں کرائیں؟"

غلام نے کہا۔ "پہلی تو یہ کہ میں غلامی سے آزاد ہو جاؤں۔"

سردار نے کہا۔ "میں نے تجھے آزاد کر دیا۔ دوسری کیا تھی؟"

غلام نے کہا۔ "مجھے ان درہموں کا بدلہ مل جائے۔"

سردار نے کہا۔ "میری طرف سے تجھے چار ہزار درہم نذر ہیں۔ تیسری کیا تھی؟"

غلام نے کہا۔ "حق تعالیٰ شانہٗ، تمہیں (شراب وغیرہ فسق و فجور سے) توبہ کی توفیق دے۔"

سردار نے کہا۔ "میں نے اپنے سب گناہوں سے توبہ کر لی۔ چوتھی کیا تھی؟"

غلام نے کہا۔ "حق تعالیٰ شانہٗ، میری اور آپ کی اور ان بزرگ کی اور سارے مجمع کی مغفرت فرما دے۔"

سردار نے کہا۔ "یہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔"

رات کو سردار نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اسے کہہ رہا ہے کہ جب تو نے وہ تینوں کام کر دیے جو تیرے اختیار میں تھے تو کیا تیرا یہ خیال ہے کہ میں وہ کام نہیں کروں گا جو میرے اختیار میں ہے۔ میں نے تیری اور اس غلام کی اور منصور کی اور اس سارے مجمعے کی مغفرت کر دی۔"

(فضائل صدقات۔ حکایت نمبر 44)

تہمینہ ناز۔ عارف والا

حضرت علیؓ نے فرمایا،

، کسی پر مصیبت نازل ہوتی ہے تو انتہا تک مزید جاتی ہے اس لیے عقل مند کو چاہیے کہ جب اس پر مصیبت نازل ہو تو اس کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرے یہاں تک کہ وہ اپنا وقت پورا کر لے ورنہ مدّت ختم ہونے سے پہلے ختم کرنے کی کوشش اور زیادہ مصیبتیں لے کر آتی ہے۔

، ذیل کی سات باتیں شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔

1۔ بہت زیادہ غصّہ آنا۔
2۔ دوسری زیادہ پیاس۔
3۔ قے آنا۔
4۔ جلد جلد جماہی کا آنا۔
5۔ نکسیر پھوٹنا۔
6۔ بول و براز۔
7۔ یادِ الٰہی میں نیند کا غالب ہونا۔

ایس عطاریہ۔ بارہ قطعہ

امیدیں اور خواہشیں،

فقیہہ ابوالليث سمرقندیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص امیدوں کو مختصر رکھے۔ حق تعالیٰ شانہٗ، چار قسم کے اکرام اس پر کرتے ہیں۔

1۔ اپنی اطاعت پر اس کو قوّت عطا فرماتے ہیں اور جب اس کو عنقریب موت کا یقین ہوتا ہے تو عمل میں خوب کوشش کرتا ہے اور ناگوار چیزوں سے متاثر نہیں ہوتا۔
2۔ اس کا غم کم ہو جاتا ہے۔
3۔ روزی کی تھوڑی مقدار پر راضی ہو جاتا ہے۔
4۔ اس کے دل کو منوّر کر دیتے ہیں۔

اور جس شخص کی امیدیں لمبی لمبی ہوتی ہیں، اس کو حق تعالیٰ شانہٗ، چار قسم کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

1۔ عبادت میں کاہلی پیدا ہو جاتی ہے۔
2۔ دُنیا کا غم زیادہ سوار ہو جاتا ہے۔
3۔ مال کو جمع کرنے اور بڑھانے کی فکر ہر وقت مسلط رہتی ہے۔
4۔ دل سخت ہو جاتا ہے۔

علما نے کہا ہے کہ دل کا نور چار چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔

1۔ خالی پیٹ رہنے سے
2۔ نیک آدمی کے پاس رہنے سے۔
3۔ گزرے ہوئے گناہوں کو یاد کرنے سے اور ان پر ندامت سے۔
4۔ اور امیدوں کو مختصر کرنے سے۔

دل کی سختی چار چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

1۔ زیادہ شکم سیری سے۔
2۔ بُری صحبت سے۔
3۔ گناہوں کو یاد نہ کرنے سے۔
4۔ امیدوں کے لمبی ہونے سے۔

تہمینہ ناز۔ عارف والا

فرق،

عزتِ نفس اور انا میں وہی فرق ہے جو فخر اور

عزود میں ہوتا ہے۔ عزتِ نفس اور فخر کہتا ہے کہ "میں بھی ہوں"۔ لیکن عزود اور انا کہتی ہے کہ "صرف میں ہی ہوں"۔ اور محبت اس باریک فرق کو ماپنے کا پیمانہ ہے۔

انعم عنبر۔ فیصل آباد

گوہرِ آبدار

- وہ محبت یقیناً عظیم ہوتی ہے جو ایک دوسرے کی عزت پر مبنی ہو۔
- ہم ایک دوسرے کے ساتھ تو رہتے ہیں لیکن ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ (اسٹیفن میکاک)
- بے موقع گفتگو انسان کو لے ڈوبتی ہے۔ (ایڈورڈ ڈیوہری)
- بعض لوگ انڈوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان میں اپنے علاوہ کسی دوسرے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ (بلنگز)
- محبت میں یہ قباحت ہوتی ہے کہ جس سے محبت کی جائے۔ اسے خود سے جدا کرتے تکلیف ہوتی ہے۔ (خلیل جبران)

انعم عنبر۔ فیصل آباد

اقوالِ حضرت علیؓ

- دنیا میں بہترین انسان وہ ہے جس کے لیے کوئی روئے اور بدترین انسان وہ ہے جس کی وجہ سے کوئی روئے۔
- انسان خود انمول نہیں ہوتا بلکہ اس کا کردار اسے انمول بناتا ہے۔
- جس طرح شبنم کے قطرے مرجھائے ہوئے پھول کو تازگی دیتے ہیں اسی طرح اچھے الفاظ مایوس دلوں کو روشنی دیتے ہیں۔

اپنے آپ کو اچھی صفات اپنانے پر مجبور کرو کیونکہ بری صفات تمہاری فطرت میں شامل ہی تھیں۔

رفیعہ بلوچ

موتی مالا

- جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ خطرناک ذہنی اذیت ہوتی ہے جو انسانی ذہن کو مفلوج بنا کر رکھ دیتی ہے۔
- اپنی رائے ضرور دیں مگر رائے کو دوسروں پر مسلط کرنے سے گریز کریں۔
- جذباتی لوگ نہ تو خود خوش رہ سکتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو خوش رکھ سکتے ہیں۔
- تمام وقت بولنے والے اور تمام وقت خاموش رہنے والے دونوں گروہ انسان کہلانے کے روادار نہیں۔
- ساتھ رستوں کا ہو یا منزلوں کا، ہمسفر اسے چنیے، جس سے آپ کی مکمل ذہنی ہم آہنگی ہو۔ بصورتِ دیگر آپ کی دنیا تو خراب ہی ہو گی۔ اپنی آخرت کو بھی خراب ہونے سے بچا نہیں سکیں گے۔
- پہلی ملاقات میں کسی شخصیت کے متعلق رائے قائم مت کریں۔ کیا معلوم اس وقت اس کا آپ کے ساتھ اچھا یا برا پیش آنا وقت اور حالات کا تقاضا ہو۔
- اپنی زندگی کا اصول بنا لیجیے کہ کسی سے برا کرنے میں کبھی آپ پہل نہیں کریں گے۔ یقین مانیے آپ ہمیشہ سرخرو رہیں گے۔
- کچھ لوگوں کی خوشیاں پیڑ پر بیٹھے پرندوں کی مانند ہوتی ہیں۔ معلوم نہیں پرندہ کب اڑ جائے اور پیڑ کو داغِ جدائی دے جائے۔
- دیوار خواہ کتنی ہی بڑی اور چوڑی کیوں نہ ہو۔ اس کے پار دیکھنے کے لیے ایک چھوٹا سا سوراخ ہی کافی ہوتا ہے۔

صبا طارق۔ گوجرانوالہ

خوشیاں اور غم

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدمؑ کا پتلا بنایا تو اس کو بنانے کے بعد اس پتلے پر اتنالیس دن رنج، غم اور پریشانی کی ہوائیں چلائیں اور صرف ایک دن خوشی اور بے فکری کی ہوا چلائی۔ یہی وجہ ہے کہ انسان غمگین زیادہ اور خوش کم رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی اور دل اداس ہو جاتا ہے۔ دولت، عزت شہرت ہونے کے باوجود تفکرات اور پریشانیاں انسانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔"

ثمرہ، اقراء۔ کراچی

توکل

حضرت شاہ شجاع کرمانی کی ایک بیٹی تھیں جن کا رشتہ ایک بادشاہ نے مانگا مگر انہوں نے منظور نہیں کیا۔ پھر ایک غریب نیک بخت لڑکے کو اچھی طرح نماز پڑھتے دیکھ کر اس سے نکاح کر دیا۔ صاحبزادی رخصت ہو کر شوہر کے گھر آئیں تو ایک سوکھی روٹی رکھی ہوئی دیکھ کر پوچھا۔

"یہ کیا ہے؟"

لڑکے نے کہا۔ "رات کو بچ گئی تھی۔ روزہ کھولنے کے لیے رکھ لی ہے۔"

یہ سن کر وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹیں۔

لڑکا بولا۔ "میں پہلے ہی جانتا تھا۔ بھلا بادشاہ کی بیٹی میری غریبی پر کیوں راضی ہو گی؟"

وہ بولیں۔ "بادشاہ کی بیٹی غریبی پر ناراض نہیں بلکہ اس لیے ناراض ہے کہ تم کو خدا پر بھروسا نہیں ہے اور مجھے اپنے والد پر بھی تعجب ہے کہ مجھ سے تمہارے متعلق یہ کہا کہ بڑے نیک اور پارسا انسان ہو۔ بھلا جس کو اللہ پر بھروسا نہ ہو وہ نیک اور پارسا کیسے ہو سکتا ہے؟"

نوجوان عذر کرنے لگا تو وہ کہنے لگیں۔

"عذر تو میں جانتی نہیں۔ یا تو گھر میں میں رہوں گی یا یہ روٹی رہے گی۔"

اس نوجوان نے فوراً وہ روٹی خیرات کر دی تب کہیں جا کر وہ چین سے گھر میں بیٹھیں۔

سمیرا ذکریا۔ منصور آباد

علم کا راستہ

ارسطو، سکندرِ اعظم کو پڑھانے لگا تو سکندرِ اعظم اکتا گیا۔ اس نے ارسطو سے پوچھا۔

"علم کے حصول کا کوئی آسان راستہ نہیں؟"

"ہمارے ملک میں دو قسم کے راستے ہیں۔" ارسطو نے کہا۔ "ایک قسم کچے اور دشوار راستوں کی ہے جس پر کسان، مزدور اور عام لوگ چلتے ہیں۔ دوسری قسم کے راستے شاہی خاندان کے لیے مخصوص ہیں۔ یہ راستے پکے اور خوبصورت ہیں۔"

لیکن علم کی منزل تک ایک ہی راستہ جاتا ہے جس پر شاہ و گدا اکٹھے چلتے ہیں۔

شاہدہ شبیر۔ رحمان گڑھ

خوشیاں اور غم

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کا پتلا بنایا تو اس کے بنانے کے بعد اس پتلے پر اتنالیس دن رنج، غم اور پریشانی کی ہوائیں چلائیں اور صرف ایک دن خوشی اور بے فکری کی ہوا چلائی۔

یہی وجہ ہے کہ انسان غمگین زیادہ اور خوش کم رہتا ہے۔ کبھی کبھی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی اور دل اداس ہو جاتا ہے۔ دولت، عزت، شہرت ہونے کے باوجود تفکرات اور پریشانیاں انسانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

صبا افضل بٹ۔ رینالہ خورد

حاسد

حاسد تمہاری خوشی سے غمگین ہوتا ہے۔ یہ اس کے لیے کافی ہے۔ تمہیں انتقام لینے کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی آگ میں جل رہا ہے۔

عظمیٰ، نادیہ۔ کراچی

ایک مدت سے وہ ملا بھی نہیں
مرے دل سے مگر جدا بھی نہیں

ہر طرف گونجتا ہے سناٹا
کوئی آہٹ کوئی صدا بھی نہیں

اس تعلق کو کیا کہے کوئی
خوش بھی ہم سے نہیں، خفا بھی نہیں

اُس کی یادوں سے دل بہلتا تھا
اب تو یادوں کا سلسلہ بھی نہیں

حالِ دل اور کیا کہیں تسنیم
اب تو کہنے کو کچھ بچا ہی نہیں

تسنیم پرویز

بے خبر مجھ سے مرے دل میں ہمیشہ ہنستا
پھول نرگس کا صراحی میں اکیلا ہنستا

جانے کس سوچ میں آتا ہے گزر جاتا ہے
روز اک روز مری عمر میں ہنستا ہنستا

چلتے چلتے کہیں رُک جاتی یہ دُنیا اک پل
چاند ہنستا، یہ ہوا ہنستی، یہ صحرا ہنستا

پھڑپھڑاتے ہوئے خوابوں کے کبوتر اُڑتے
دیر تک پھر میرے کمرے میں اندھیرا ہنستا

میں نے تنہائی میں جو اس کو مخاطب کر کے
کی ہیں باتیں، انہیں سُنتا تو وہ کتنا ہنستا

افتخار بخاری

ریکویسٹ

سُنو!
ابھی جذبوں میں محبت
کی رمق باقی ہے
ابھی عمرِ رواں کا سورج ڈھلا نہیں
ابھی دل ہمارا محبت کے
نام سے آشنا ہے
ابھی اتنا وقت نہیں گزرا
کہ چہرے یاد بن کر دُھندلے ہو جائیں
محبت کے حسین منظر اس دُھند میں کھو جائیں
سُنو...! آجاؤ لوٹ کر تم
کہ تمہارے لوٹ آنے کی آس لیے
میں آج بھی محبت کے دیے
دل میں جلاتی ہوں

نوشین اقبال نوشی

ابھی دسمبر گزرا نہیں ہے
ابھی تو مارچ بھی آیا نہیں ہے
اب کے برس بھی اس کی یادیں
ابھی سے دل کو
نوچ رہی ہیں
مل جائے اگر وہ رستے میں
کس شان سے اس کا
کریں سواگت
ابھی سے آنکھیں سوچ رہی ہیں

غلام شبیر عاصم

شاعری سچ بولتی ہے

کرن شبیر

بات اگر شاعری کی ہو تو کسی نے سچ کہا ہے کہ

؎ پلکوں پہ لیے اشکوں کے دیے راتوں کو اجالا کرتے ہیں
فرقت کے سسکتے لمحوں کو الفاظ میں ڈھالا کرتے ہیں

میں اپنی بات کا آغاز دو بہت عظیم شعراء کے ناموں سے کرنا چاہوں گی۔ حضرت خنساء بنت عمرو رضی اللہ عنہا اپنے دور کی سب سے بڑی مرثیہ گو تھیں۔ کوئی بھی عورت شعر گوئی میں ان کے برابر نہیں ہوئی۔ نہ ان سے پہلے اور نہ ان کے بعد۔

اور حضرت حسان بن ثابت جنہیں مداح رسول ﷺ اور شاعرِ دربارِ نبوت کی حیثیت سے جو فضیلت حاصل ہوئی، وہ محتاجِ بیان نہیں اور یہ دونوں وہ عظیم المرتبت شعراء ہیں جن کے حسنِ کلام کی خود رحمتِ عالم ﷺ نے تعریف فرمائی۔

سب سے پہلے پروفیسر عنایت علی خان کی نعتیہ غزل حاضرِ خدمت ہے۔

؎ کسی غم گسار کی محنتوں کا یہ خوب میں نے صلہ دیا
کہ جو میرے غم میں گھلا کیا، اسے میں نے دل سے بھلا دیا

تیرا نقش پا تھا جو راہنما تھا تو غبارِ راہ تھی کہکشاں
اسے کھو دیا تو زمانے بھر نے ہمیں نظر سے گرا دیا

یہ میری عقیدت بے صبر، یہ میری ارادت بے ثمر
مجھے میرے دعویٰ عشق نے نہ صنم دیا نہ خدا دیا

میرے راہنما تیرا شکریہ کروں کس زباں سے بھلا ادا
میری زندگی کی اندھیری شب میں چراغِ فکر جلا دیا

علامہ اقبال کی شاعری ہمیں اپنی کھوئی ہوئی ہستی کا سراغ دیتی ہے، ہم کیا تھے کیا ہو گئے۔ جب خود کو پہچان لو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔

؎ زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدارِ یار ہوگا!
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

سُنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائیدار ہوگا

اور

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

جو میں سر بہ سجدہ کبھی ہوا تو زمیں سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

نعیم صدیقی (مرحوم) جنہوں نے قلم سے جہاد کرنے کا حق صحیح معنوں میں ادا کر دیا۔ ان کی شاعری تپتے صحرا میں بارش کے قطروں کی مانند ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "پھر اک کارواں لٹا" میں موجود آزاد نظم "نقش" جب بھی نظروں سے گزرتی ہے، کشمیر، عراق اور فلسطین کے شہداء کی یاد آنکھ کو نم کر دیتی ہے۔

شہید سارے
دِلوں میں آباد ہو گئے
جہاں کہیں ہے ضمیر زندہ، ضمیر زندہ میں بس رہے ہیں
فنا سے آزاد ہو گئے ہیں
تمام صیاد ختم ہوں گے
تمام شداد ختم ہوں گے
یہ سارے جنگلے، یہ کل فصیلیں اور یہ سب صلیبیں، یہ سب سلاسل
یہ تخت و تاج و نشان و پرچم
یہ قصر و بام اور مہر و خاتم
تغیرِ وقت کا دھارا
بہائے لے جا رہا ہے ان کو
جدھر مشیت کا ہے اشارا
کسے خبر کب ہو شہر یارو! حساب جور و جفا تمہارا
کبھی تو سوچو کہ کیا ہے آخر تمام جور و جفا کا حاصل
پکارتی ہیں یہ تازہ لاشیں، یہ سب کا سب ہے طلسمِ باطل
نصیب میں تخت ہو کہ تختہ
گرے گا ہر کوئی لاش بن کر! قتیل کے ساتھ ساتھ قاتل
ہے قبر سارے سفر کی منزل
پکارتی ہیں یہ تازہ لاشیں

منیر نیازی قلم قبیلے کا ایسا عظیم شاعر جو اس وقت ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کی شاعری کے حوالے سے ان کا نام کبھی بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی کتاب "ایک دُعا جو میں بھول گیا" میں سے چند حصے۔ خرابی میں خوبی۔

رابطوں، رشتوں میں اُلجھن تھی بہت
اس نظامِ شہر میں رہنے کی ہمت ہی نہ کی
لفظ یہ لوگوں میں رائج تھا بہت
اس لیے اس شہر میں ہم نے محبت ہی نہ کی

اور

کیسے خواب میں آنکھیں کھولیں
کیسے بَن کو دیکھا
من میں اوجھل کوئل بولی
کیسے تن کو دیکھا
کسی شام پہ بوندیں برسیں
کسی ساون کو دیکھا
سب سے چھپ کر آنکھیں روئیں
کسی درپن کو دیکھا

شاعری کے آسمان پر چمکنے والا ایک اور ستارہ صائمہ اسما بدر جن کا کلام پڑھتے وقت کسی بھی مقام پر اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری ہمیں ایک نئے جہان معانی میں لے جاتی ہے۔ صائمہ کی کتاب "گلِ دوپہر" سے ایک بے حد خوبصورت نظم۔

چپکے سے اُٹھائے ایڑیوں کو
ہولے سے ورق اُلٹ کے دیکھوں
اس وقت میں جو ہے آنے والا
جان لیوا مسافتوں کے رستوں ...
ہر کون کہاں تلک چلے گا

کامیاب غزل گو۔ وہی ہے جو خیالات کو اچھوتے انداز میں پیش کرے اور زبان و بیان پر اتنی قدرت رکھتا ہو کہ اپنا مافی الضمیر سہل و شگفتہ پیرائے میں پیش کر سکے۔ فنا کانپوری کی یہ غزل ایسی ہی ہے کہ اس کا ہر شعر سماعت سے ٹکراتے ہی دل کے تاروں سے ہم آہنگ ہو جائے۔

دو گھونٹ کا اے ساقی الزام نہیں لوں گا
میں تشنہ لبی دے کر اک جام نہیں لوں گا

اظہار تمنا ہی توہین تمنا ہے
تم خود ہی سمجھ جاؤ میں نام نہیں لوں گا

جو شام جگاتی ہو، جو صبح سلاتی ہو
وہ صبح نہیں لوں گا وہ شام نہیں لوں گا

اے اہل چمن! رکھ لو یہ تحفۂ گل اپنا
مجھ کو مرا حق دے دو انعام نہیں لوں گا

میں راہ کے سایوں سے خیرات سکوں کیا لوں
منزل سے بھی مانگے کا آرام نہیں لوں گا

اک سجدۂ مستی کی توفیق عطا کر دے
پھر اپنی جبیں سے میں کچھ کام نہیں لوں گا

لکھوں گا فنا جب میں افسانہ محبت کا
آغاز تو لے لوں گا انجام نہیں لوں گا

احمد ندیم قاسمی، جن کی شاعری پڑھنے کے لیے حساس دل کی ضرورت ہے۔

طے کروں گا میں یہ اندھیرا اکیلا کیسے
میرے ہمراہ چلے گا میرا سایہ کیسے

میری آنکھوں کی چکا چوند بتا سکتی ہے
جس کو دیکھا ہی نہ جائے، اسے دیکھے کیسے

چاندنی اس سے لپٹ جائے، ہوائیں چھیڑیں
کوئی رہ سکتا ہے دنیا میں اچھوتا کیسے

میں تو اس وقت سے ڈرتا ہوں کہ وہ پوچھ نہ لے
یہ اگر ضبط کا آنسو ہے تو ٹپکا کیسے

اس لیے صرف خدا سے ہے تخاطب میرا
میرے جذبات کو سمجھے گا فرشتہ کیسے

گر سمندر ہی سے دریاؤں کا رزق آتا ہے
اس کے سینے میں اُترتے جاتے ہیں دریا کیسے

ڈوبتی رات نے سورج سے یہ سرگوشی کی
میں نہ ہوتی تو تیرا اندر برستا کیسے

اور اب چلتے چلتے اپنا مختصر سا تعارف بھی کروا دوں۔ میرا نام کرن شبیر ہے۔ بی اے پارٹ ون کی اسٹوڈنٹ ہوں ساتھ ہی ہومیوپیتھک ڈاکٹر بننے کے مراحل بھی طے کر رہی ہوں۔ شاعری فارغ وقت کا مشغلہ ہے۔ کراچی شہر سے تعلق ہے۔ انتخاب آپ کے سامنے ہے۔ اور اس میں کس حد تک کامیاب ہوئی ہوں، اس کے متعلق تو باذوق قارئین ہی رائے دے سکتے ہیں۔ اب اجازت چاہتی ہوں اس شعر کے ساتھ کہ۔

چھلک چھلک گئیں یہ آنکھیں سوچ کر اکثر
کہ میرے رب کی ہیں عنایتیں مجھ پر کیا کیا

غزل ثوبان

آئینہ خانے میں

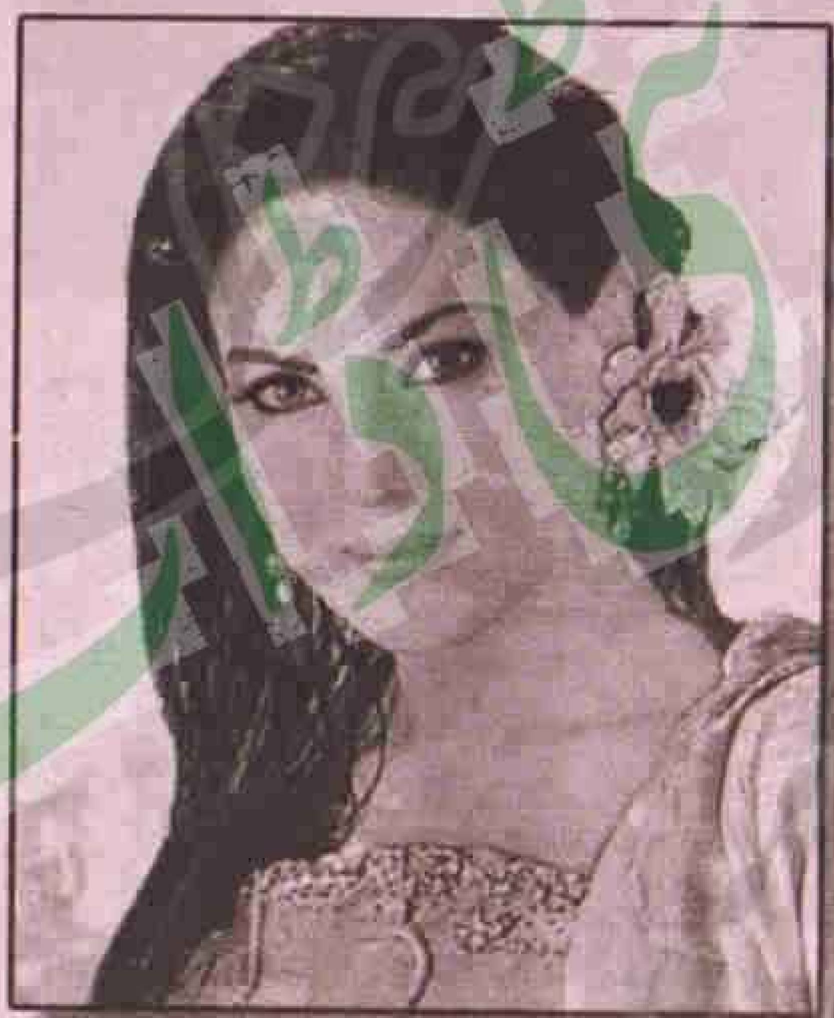

آئٹم نمبر

وینا ملک آئے دن کوئی نہ کوئی نیا شوشا چھوڑتی رہتی ہیں گویا شوشا چھوڑنا انہوں نے اپنی عادت ہی بنا لی ہے (کیوں نا اب انہیں "شوشا ملک" کہا کریں!) وینا کے متعلق تازہ خبر یہ آئی ہے کہ انہوں نے ایک بھارتی فلم "تیرے نال لو ہو گیا" کے لیے ایک آئٹم نمبر کیا ہے۔ وینا کا کہنا ہے کہ مجھے اس سے پہلے بھی آئٹم نمبرز کی آفرز ہوتی رہتی تھیں، مگر مجھے یہ اپنی شخصیت کے مطابق لگا، کیونکہ یہ آئٹم خاصا مسالے دار ہے (ماشاءاللہ ... مگر دیکھنا! مسالے میں "مرچیں" کچھ زیادہ نہ ہو جائیں!)۔

وینا اس آئٹم نمبر کے لیے بہت پرجوش ہیں اور انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ پاکستان میں بھی اس طرح کے آئٹم نمبرز کا رواج پڑے اور وہ اس میں کام کریں (اللہ نہ کرے)۔

پیسہ بولتا ہے بھائی!

اپنی مٹی کی سوندھی خوشبو ہیں
رگوں میں یہ بسی ہیں
چومیں گے اسے شان سے
ہم کو تو پیارا ہے وطن اپنی جان سے

یہ بول ہیں اس ملی نغمے کے جو عنقریب معروف گلوکار غلام علی کی آواز میں منظر عام پر آنے والا ہے۔

تاہم غلام علی یہ ملی نغمہ بھارتی فلم "A-498 دی ویڈنگ گفٹ" کے لیے ریکارڈ کرا رہے ہیں۔ (ہمیں ان کا کوئی پاکستانی ملی نغمہ تو یاد نہیں آرہا) غلام علی اس نغمے کے لیے بہت پرجوش ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ہندوستانی عوام میں یہ نغمہ بہت مقبول ہوگا۔ (کیوں نہ ہو بھئی..... ایک پاکستانی کی زبان سے ہندوستان کی شان میں کلمات سننا ان کی دیرینہ آرزو بھی تو ہے)۔
غلام علی کا کہنا ہے کہ "ہندوستان اور پاکستان دونوں ایک تھے' مگر 1947ء میں ایک "سیاسی سرحد" کھینچ دی گئی۔ (بلے بھئی بلے..... پیسہ بولتا ہے)۔

غلام علی کا مزید کہنا ہے کہ پاکستان اور ہندوستان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ بھائیوں میں اختلافات ہو سکتے ہیں' مگر رہتے وہ پھر بھی بھائی ہی ہیں۔ (ہم نے تو سنا تھا کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔)

نوسو چوہے.....

بزرگوں سے سنا تھا کہ "جس قدر محنت کرو گے' اتنا ہی صلہ ملے گا۔" مگر ہماری معروف اداکارہ زارا اکبر کو گلہ ہے کہ پاکستان میں ہم جتنی محنت کرتے ہیں' ہمیں

اتنا معاوضہ نہیں ملتا۔
(لیکن جناب! دیگر لوگ تو اب کچھ اور ہی کہتے ہیں۔)

زارا کا کہنا ہے کہ یورپ کے ایک ماہ کے دورے کی کمائی پاکستان کی ایک سال کی کمائی کے برابر ہے۔
زارا کو یہ بھی شکوہ ہے کہ انڈین فلمیں پاکستانی سینماؤں کی زینت بننے سے پاکستانی فلمی صنعت تباہ ہو رہی ہے' مگر ارباب اختیار ذرا توجہ نہیں دیتے جبکہ ملک بجلی' گیس سے محروم ہے اور یہاں لوگ ڈینگی سے بھی مر رہے ہیں۔
(تو کیا بھارتی فلمیں ڈینگی بھی پھیلاتی ہیں؟)
زارا نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ جب حج پر جاؤں گی تو تھیٹر اور فلم میں کام کرنا چھوڑ دوں گی۔ (حج پر جانے کے لیے تو سو پورے ہونے کا انتظار کر رہی ہیں کیا؟)

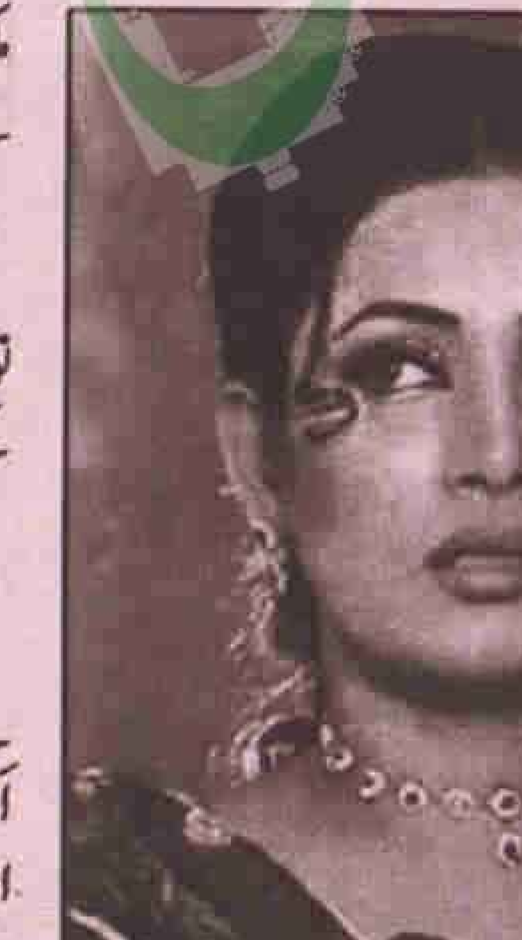

جاوید شیخ کا برقعہ

کہتے ہیں بچپن زندگی کا سب سے حسین دور ہوتا ہے۔ بچے بے حد معصوم اور ریا سے پاک ہوتے ہیں۔ اکثر لوگ بچپن میں کسی نہ کسی شخص سے متاثر ہو کر اس جیسا بننے کی آرزو پالتے ہیں۔
معروف اداکار جاوید شیخ کا کہنا ہے کہ وہ بچپن ہی سے اداکار محمد علی سے متاثر تھے۔ (کس کے بچپن سے؟)

جاوید انہیں اس قدر پسند کرتے تھے کہ اگر کوئی ان کے سامنے محمد علی کی برائی کرتا تو وہ اس سے لڑ پڑتے تھے۔ وہ بڑے ہو کر "محمد علی" بننا چاہتے تھے۔
جب اداکار محمد علی اپنی فلم "جاگ اٹھا انسان" کی شوٹنگ کے لیے کراچی آئے تو جاوید اپنے اسکول سے چھٹی کر کے شوٹنگ دیکھنے چلے گئے۔ محمد علی نے انہیں دیکھا تو اپنے پاس بلا کر آنے کی وجہ پوچھی۔ جاوید نے کہا کہ
"میں آپ سے بہت متاثر ہوں اور آپ کی طرح اداکار بننا چاہتا ہوں۔"
محمد علی نے انہیں بڑے پیار سے نصیحت کی کہ "بیٹا! پہلے تعلیم مکمل کرو۔ پھر شوق سے اداکاری کرنا۔" تاہم ان کا شوق دیکھتے ہوئے محمد علی نے انہیں ایک سین میں شامل کرا دیا۔
فلم کے ایک منظر میں خواتین کا ایک قافلہ اونٹوں پر سوار گزرتے ہوئے دکھانا تھا۔ جاوید شیخ کو برقعہ پہنا کر اونٹ پر بٹھا دیا گیا۔ فلم ریلیز ہونے پر جاوید اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے گئے۔ انہوں نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ اس فلم میں انہوں نے بھی کام کیا ہے۔ دوستوں نے ان کی بات کا یقین نہیں کیا اور ان کا خاصا مذاق اڑایا' کیونکہ وہ برقعے میں ملبوس ہونے کی وجہ سے جاوید کو پہچان نہیں سکے تھے۔ (تمام عمر برقعہ پہن کر ہی اداکاری کرنا تھا ناں!)

کچھ ادھر اُدھر سے

☆ صدر کو مشکلات سے میں نے بچایا۔ نومبر میں حکومت جانے کی پیر پگارا کی پیش گوئی چلّہ کاٹ کر ناکام بنا دوں گا۔ گیلانی بھی اپنی بدانتظامی پر قابو پائیں۔ اب ہر کام تو میں نہیں کر سکتا۔ (صدر زرداری کے پیر محمد اعجاز کا دعوا)
☆ ایم ایم ایس اور انٹرنیٹ کے اس تیز رفتار دور میں بھارتی اداکارہ سونم کپور کو ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوط پسند ہیں۔ اس کے علاوہ وہ پرانے انداز کے کپڑے جمع کرنے کی بھی شوقین ہیں۔ ان کے پاس تقریباً" بیس سال پرانا ایک لباس موجود ہے' جس کی قیمت اس وقت تیس پاؤنڈ تھی' تاہم اب اس لباس کی قیمت نو ہزار پاؤنڈ ہے۔
☆ بھارتی اداکار راجیش کھنہ کو ماضی میں لڑکی بننے کا شوق چرایا تھا لہٰذا وہ آدھی رات کے وقت لڑکی کا روپ دھار کر اپنے شوق کو تسکین پہنچاتے تھے۔
☆ معروف بھارتی اداکارہ ریکھا کا بیڈ روم انتہائی خوب صورت اور آرام دہ ہے' مگر وہ اپنے بیڈ روم میں نہیں سوتیں۔ وہ ایک چھوٹے سے سادہ بستر پر رات بسر کرتی ہیں۔ ریکھا کو صفائی کا بھی خبط ہے۔ وہ فرش' الماریاں اور آئینے وغیرہ ہر وقت چمکائے رکھتی ہیں۔

☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف
سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول
خواب خواہش اور زندگی

رابعہ رزاق
قیمت -/500 روپے
منگوانے کا پتہ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37، اردو بازار، کراچی

دستک دستک دستک

شاہین رشید

حسن سومرو

"کیسے ہیں آپ؟ آج کل آپ کی پروڈکشن میں "کچھ کمی سی ہے" بہت اچھا جارہا ہے' آپ کو کیا رسپانس مل رہا ہے؟"

"میں ٹھیک ہوں اور بہت شکریہ پسند کرنے کا۔ رسپانس بہت اچھا مل رہا ہے' بہت پسند کررہے ہیں ناظرین اس سوپ کو۔"

"آپ کے پروڈکشن ہاؤس کا نام کیا ہے اور جو بہت نمایاں کام ہیں ان کے بارے میں بتائیں۔"

"پروڈکشن ہاؤس کا نام "این زیڈ فلمز" ہے۔ میں کافی کام کرچکا ہوں۔ آپ "کچھ کمی سی ہے" تو دیکھ ہی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ دبئی میں ایک ٹیلی فلم بنائی ہے جس کا نام "Twin" ہے۔ اس کو ڈائریکٹ بھی میں نے ہی کیا ہے۔ ڈرامہ "ایک عورت" میں' میں روحی بانو کو اٹھارہ سال بعد دوبارہ اسکرین پہ لے کر آیا۔ میری ٹیلی فلم "بدل کے بھیس فقیروں کا" بھی بہت کامیاب ہوئی تھی۔"

"جس دور میں آپ آئے اس وقت اس فیلڈ میں لوگ بہت کم آتے تھے۔ سب کام آسانی سے ہوگئے یا کچھ مسائل بھی درپیش ہوئے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' اس وقت لوگ اس طرف آنے کے خواہش مند تو ضرور ہوتے تھے' مگر آتے نہیں تھے' کیونکہ ایک تو آمدنی اچھی نہیں تھی' پھر ٹائم بھی کافی لگ جاتا تھا' کیونکہ پی ٹی وی کے کام کرانے کا اپنا ایک طریقہ کار تھا۔ کئی کئی دن تک ریہرسل' پھر ریکارڈنگ' تو ہر کام آسانی سے تو نہیں ہوا۔ کافی محنت کی تب ہی ایک مقام ملا ہے۔"

"لیکن یہ بات آپ نے محسوس کی ہوگی کہ پہلے راتوں رات شہرت مل جاتی تھی' اب ایسا نہیں ہے' کیوں؟"

"یہ بات تو سوفیصد درست ہے کہ اب کئی کئی ڈراموں میں کام کرنے کے بعد بندہ مشہور ہوتا ہے اور شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اب چینلز بہت آگئے ہیں۔ پہلے صرف ایک ہی چینل پہ لوگ فوکس رہتے تھے' اس لیے پہچان جلدی ہوجاتی تھی' اب ایسا نہیں ہے۔"

"اپنے ابتدائی دنوں کے بارے میں کچھ بتائیے؟"

"ابتدائی دنوں کی کہانی کچھ یوں ہے کہ 1993ء میں' میں شوبز کی طرف آیا۔ اس وقت پی ٹی وی تھا یا ایک پرائیویٹ چینل "این ٹی ایم"۔ ابتدا سے ہی اچھے ڈائریکٹرز کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملتا رہا۔ ان دنوں این ٹی ایم سے ڈرامہ سیریز "پس آئینہ" مقبول ترین ڈرامہ سیریز تھا میں نے اس کی 46 اقساط میں کام کیا تھا۔ اس سیریز سے بھی مجھے بہت پہچان ملی۔ اس کے علاوہ "ساحل سے دور" جو کہ میرا پہلا ڈرامہ سیریل تھا' "امیدوں کے سائے" اور "الجھن" بہت مقبول ہوئے۔"

"اس فیلڈ میں آئے تو پڑھائی متاثر ہوئی؟"

"نہیں۔۔۔ اللہ کا شکر ہے کہ پڑھائی متاثر نہیں ہوئی۔ میں ایک اچھا طالب علم تھا۔ میں نے کامرس میں ماسٹرز ڈگری حاصل کی۔"

"آپ تو ہاکی کے بھی بہت اچھے کھلاڑی تھے۔ وہ کیوں چھوڑ دی؟"

"ہاکی پلیئر بننا میرا خواب تھا' نیشنل' انٹرنیشنل کی سطح پر کافی کھیلی' مگر میں اس کھیل میں سیاست کا شکار ہوگیا' پھر دل برداشتہ ہوکر ملک سے باہر چلا گیا۔ اگر سیاست کی نذر نہ ہوتا تو شاید آج میرا بحیثیت ہاکی پلیئر ایک بڑا نام ہوتا۔"

"گویا مشہور آدمی بننا چاہتے تھے؟"

"مشہور اور بڑا کھلاڑی مگر میرا رزق اور میری شہرت اسی فیلڈ میں لکھی تھی' سو اللہ نے اس میں میرے قدم جمادیے اور آج میں اپنی لائف میں بہت خوش ہوں۔"

"آپ کافی ممالک کی سیر کرچکے ہیں۔ اگر مستقل طور پر رہنا چاہیں تو کون سا ملک آپ کا انتخاب ہوگا؟"

"نہیں' نہیں۔۔۔ میں نے تو ایسا کبھی سوچا بھی نہیں۔ جو سکون اور عزت اپنے ملک میں ہے وہ کہیں نہیں ہے۔ آج ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے ملک کی بدولت ہی تو ہیں۔"

"گھریلو لائف کیسی گزر رہی ہے؟"

"گھریلو زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔ 1995ء میں نازلی سے شادی ہوئی۔ ہمارے دو بچے ہیں۔ زوہیب اور زویا ہم دونوں اس فیلڈ میں اچھا کام کررہے ہیں۔"

"ملک کے حالات کے بارے میں کیا کہیں گے؟ کبھی دل چاہا ہے کہ اس فیلڈ میں آکر کوئی انقلاب برپا کردوں؟"

"ملک کے حالات کے بارے میں بہت فکر مند ہوتا ہوں' مگر سیاست سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ میرے والد صاحب کا کہنا ہے کہ پاکستان کی سیاست میں کبھی حصہ نہ لینا' سو ان ہی کی بات پر عمل کررہا ہوں۔"

"والد نے تو نصیحت کی کہ سیاست میں نہ آنا' آپ کسی کو کوئی نصیحت کرنا چاہیں گے؟"

"ہاں کیوں نہیں' لیکن میری نصیحت سیاست پر نہیں ہے' بلکہ اس فیلڈ میں آنے والے نوجوانوں کے لیے ہے کہ وہ اس فیلڈ کو بطور پروفیشن اپنائیں' کیونکہ اس فیلڈ میں اب کافی اسکوپ ہے۔ اب اس کے لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میں تو شوقیہ اس فیلڈ میں آئی ہوں یا آیا ہوں۔"

"قسمت پہ کتنا یقین ہے؟"

"سوفیصد یقین ہے' کیونکہ میرا ایمان ہے کہ نصیب کے بغیر اور وقت سے پہلے انسان کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"بہت خوب۔۔۔ خوش رہیں۔"

سعدیہ خان

"کیسی ہیں سعدیہ؟"

"الحمدللہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"ہاتھ نہیں آتیں آپ۔ کیا بہت مصروف رہتی ہیں؟"

"جی بس ایسی ہی کچھ بات ہے' ابھی بھی میں شوٹ پر ہوں۔"

"لیکن مجھے تو تھوڑی بات کرنی ہے' آپ کے

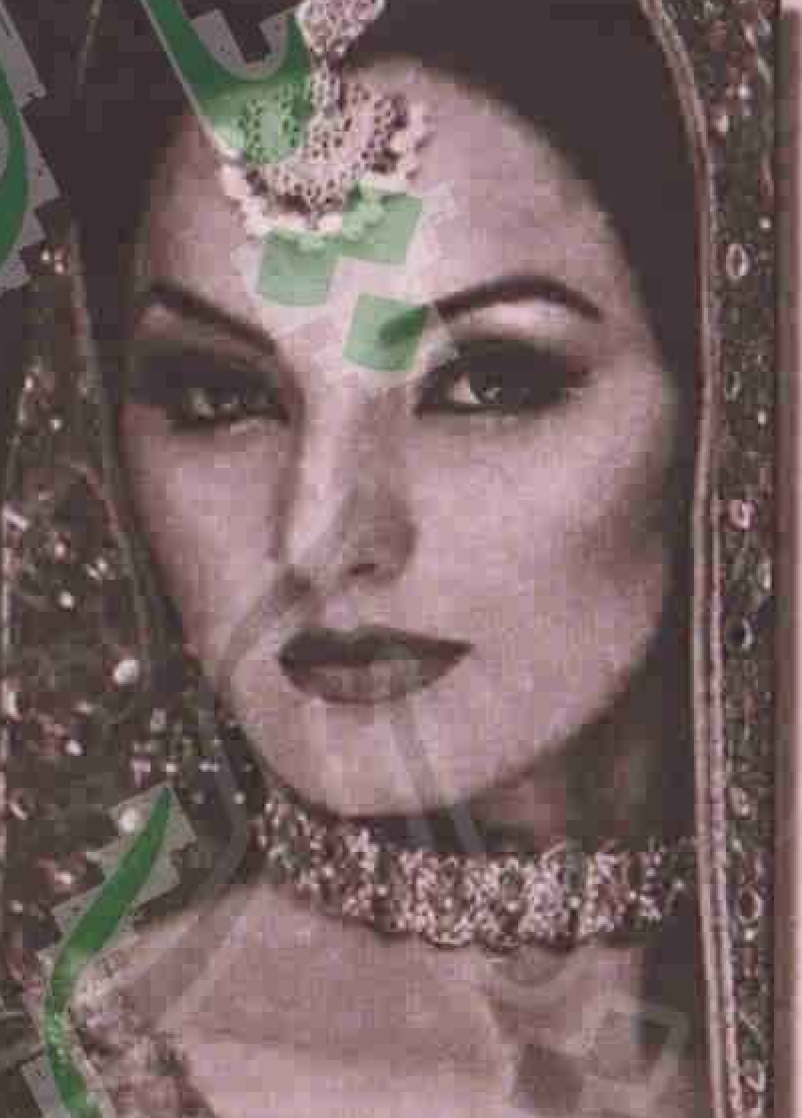

سیریل "یاریاں" اور "خدا اور محبت" کے بارے میں۔"

"ضرور.... مگر زیادہ ٹائم نہیں دے پاؤں گی۔"

"اوکے.... "یاریاں" میں نہ صرف آپ بہت خوب صورت نظر آئیں بلکہ اپنے رومانٹک رول کو بھی بہت عمدگی سے نبھایا۔ آپ کو کیا رسپانس ملا تھا؟"

"اگر میں یہ کہوں کہ یہ ہی سیریل ناظرین میں میری پہچان بنا تو غلط نہ ہوگا۔ مجھے بہت اچھا رسپانس ملا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں ایک مشہور شخصیت بن گئی۔"

"اس سیریل کے لیے۔ آپ کا انتخاب کیسے ہوا تھا؟"

"اس سیریل کے لیے میرا انتخاب کچھ یوں ہوا کہ جن دنوں "یاریاں" کے لیے کام ہو رہا تھا ان دنوں میرا ایک کمرشل کافی ہٹ جا رہا تھا۔ اس سیریل کے ڈائریکٹر نے وہ کمرشل دیکھ کر مجھ سے رابطہ کیا "آپ کو کمرشل میں دیکھا ہے۔ کیا آپ کو اداکاری کا شوق ہے؟" میں نے کہا بالکل ہے، تب انہوں نے مجھے اپنے سیریل کے لیے بک کرلیا۔"

"وہ کردار کرتے ہوئے کچھ مشکل پیش آئی؟"

"مشکل تو ہوئی، کیونکہ میری اردو اچھی نہیں ہے، پھر میرا لہجہ کچھ پٹھانوں جیسا ہے، جبکہ ڈرامے میں خالصتاً" اردو بولنا تھی۔ بہرحال پھر ڈائریکٹر اور سینئر فنکاروں کی مدد سے سب کچھ سیٹ ہوگیا۔"

"پھر "خدا اور محبت" کے لیے انتخاب کیسے ہوا؟"

"یاریاں" میں میری پرفارمنس کو پسند کیا گیا تو اس سیریل کے ڈائریکٹر نے مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے اس کردار کی پیش کش کی۔ جسے میں نے قبول کرلیا۔"

"ناول یا اسکرپٹ کا مطالعہ نہیں کیا تھا کیا؟"

"ارے نہیں! ایسی بات نہیں۔ مجھے ڈائریکٹر نے ناول بھیجا تھا۔ میں نے بہت شوق سے پورا ناول پڑھا۔ بعض جگہوں پہ مجھے لگا کہ شاید میں یہ رول نہیں کرپاؤں گی، لیکن پھر وہی بات کہ سب نے میرا ساتھ دیا اور بہت کچھ سکھایا، جس کی وجہ سے میں کامیاب ہوئی۔"

"اب مزید کیا کر رہی ہیں؟"

"کافی کام ہیں۔ لیکن ابھی نہیں بتاؤں گی، جب آن ایر آئیں گے تو آپ خود دیکھ لیجئے گا۔ پھر بتایئے گا کہ میرا کام کیسا ہے۔"

"کام تو آپ بہت اچھا کرتی ہیں۔ اس لیے تو انٹرویو کے لیے منتیں کرنا پڑتی ہیں۔"

"نہیں نہیں.... ایسی بات نہیں، بس مصروف تھی اس لیے۔"

"کچھ اپنے بارے میں بتائیں؟"

"میرا تعلق ہے سیالکوٹ سے، نفسیات میں گریجویٹ ہوں، جبکہ ایم بی اے کی ڈگری لندن سے حاصل کی۔ ہماری فیملی مختصر سی ہے۔ والدہ صاحبہ کا انتقال ہوچکا ہے۔ والد حیات ہیں۔ ایک بھائی اور ایک بہن ہے۔ میں گھر میں چھوٹی ہوں۔"

"اور کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس کچھ زیادہ نہیں، کمرشلز، ڈرامے اور میوزک۔"

"میوزک میں کس کو سنتی ہیں؟"

"مجھے عاطف اسلم، نصرت فتح علی خان اور راحت فتح علی بہت پسند ہیں۔ میں خود بھی گاتی ہوں اور بہت جلد میں اس سلسلے میں سب کو حیران کردوں گی۔"

"اوکے.... سعدیہ آپ سے تفصیلی انٹرویو بھی کروں گی۔"

شہزاد رضا

"کیسے ہیں شہزاد بھائی.... آپ کے ڈرامے دیکھتے رہتے ہیں، کتنے سال ہوگئے اس دشت کی سیاحی میں؟"

"ٹھیک، آپ سنائیں، اور اس دشت کی سیاحی میں مجھے بیالیس سال ہوگئے ہیں۔"

"اچھا.... گڈ.... کیا سوچ کر آئے تھے؟"

"بس! ریڈیو، ٹی وی کی دنیا مجھے اچھی لگتی تھی۔ ایک عجیب سی کشش محسوس ہوتی تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں بھی اس فیلڈ کا حصہ بن جاؤں۔"

"پہلے ٹی وی پہ آئے یا ریڈیو سے آغاز کیا؟"

"اپنے فنی سفر کا آغاز میں نے ریڈیو سے کیا۔ مجھے ریڈیو پہ اصغر مہدی صاحب نے متعارف کرایا۔ اسٹیج ڈراموں میں بھی مجھے اصغر مہدی صاحب ہی لے کر آئے، جبکہ ٹی وی پہ میں کاظم پاشا کے تعاون سے آیا۔ انہوں نے قاسم جلالی سے میری ملاقات کروائی اور انہوں نے مجھے اپنے ڈرامے "تنکے کا سہارا" میں بک کیا وہ میرا پہلا ڈرامہ تھا۔"

"جب آپ آئے تھے تو اس وقت ٹی وی اور ریڈیو کا ایک چینل تھا اب بے شمار چینلز آجانے سے کیا فرق پڑا ہے۔"

"بہت فرق پڑا ہے، پہلے لوگ اس فیلڈ کو ذریعہ معاش نہیں بناتے تھے، مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب اسے ذریعہ معاش بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دنیا بہت آگے نکل گئی ہے، ہمیں بھی آگے جانا چاہیے۔"

"پہلے جب فنکاروں سے ان کی آمدنی کے بارے میں پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ "جی پیٹرول یا پان، سگریٹ کا خرچ بھی نکل آئے تو بڑی بات ہے۔" اب کیا صورت حال ہے۔"

"آج کی صورت حال بہت اچھی ہے۔ اب فنکار کافی خوش حال ہوگئے ہیں اب بہت اچھا معاوضہ ملتا ہے۔"

"آپ کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہیں، لیکن آپ کے خلوص، محبت اور اپنائیت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ شہرت نے آپ کا دماغ خراب نہیں کیا؟"

"آپ نے یہ بہت اچھا سوال پوچھا۔ بات ساری تربیت کی ہے۔ ہمارے والدین نے جیسی ہماری تربیت کی، ہم ان ہی کا عکس ہیں۔ میں آج کل کے فنکاروں کو دیکھتا ہوں کہ تھوڑی سی شہرت ملتے ہی دماغ خراب ہوجاتا ہے، غرور آجاتا ہے، اور یہ ہی بات انسان کے زوال کا سبب بنتی ہے۔"

"گھریلو زندگی کیسی گزر رہی ہے۔"

"ماشاء اللہ سے بہت خوش گوار زندگی گزار رہا ہوں۔"

"آپ کتنے بہن بھائی ہیں؟"

"ہم ماشاء اللہ دس بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑا.... ہوں۔ ایک بھائی، عمران رضا بھی اس فیلڈ میں ہے۔ وہ پروڈیوسر، ڈائریکٹر اور ڈرامارائٹر بھی ہے۔"

"شوبز کے لوگ اپنی پسند سے شادی کرتے ہیں، آپ اپنے بارے میں بتایئے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے، لیکن میں نے آپ کو بتایا نا کہ تربیت ہی ایسی تھی کہ فرماں برداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، چنانچہ شادی کے لیے والدین کی پسند کو ہی ترجیح دی۔ میں سمجھتا ہوں کہ والدین کی پسند سے ہی شادی کرنا چاہیے۔ وہ اپنے تجربے کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے جو سوچتے ہیں، وہ ہی بہتر ہوتا ہے۔"

تاریخ کے جھروکوں سے

امت الصبور

امام الحدیث و تاریخ ابن کثیر نے اصحاب الفیل کا واقعہ اس طرح نقل کیا ہے۔

"ملک یمن پر خاندان حمیر کا قبضہ تھا۔ یہ لوگ مذہباً "مشرک تھے۔ ان کا آخری بادشاہ یوسف ذونواس تھا۔ جس نے یمن کے اہل حق نصاریٰ پر شدید مظالم کیے تھے اور توحید پرست عیسائیوں کو خندقوں میں زندہ جلا دیا تھا۔ اصحاب الاخدود کا مشہور واقعہ اسی بادشاہ سے منسوب ہے۔ جس کا تذکرہ قرآن حکیم کی سورۃ البروج میں آچکا ہے۔ خندق کے عذاب سے بچ کر کسی طرح دو آدمی نکل بھاگے تھے اور انہوں نے ملک شام کے بادشاہ سے فریادرسی کی کہ یوسف ذونواس نے اہل ایمان پر ایسا ظلم کیا ہے۔

شام کے بادشاہ نے اپنے حلیف بادشاہ حبشہ کو خط لکھا کہ وہ اس کا انتقام لے اور ساتھ ہی ایک بہت بڑے لشکر کو دو کمانڈر ارباط اور ابرہہ کی قیادت میں یمن کے اس ظالم بادشاہ کے مقابلہ پر روانہ کردیا۔ یہ عظیم الشان لشکر یمن پر ٹوٹ پڑا اور پورے یمن کو حمیر خاندان کے اثر سے آزاد کرالیا۔ ذونواس بھاگ نکلا اور ایک دریا پار کرتے ہوئے غرق ہوگیا۔

اس طرح ارباط اور ابرہہ کے ذریعہ یمن پر حبشہ کے بادشاہ کا قبضہ ہوگیا جو خود نصرانی مذہب تھا۔

یہ واقعہ 525ء میں پیش آیا تھا، جس نے حمیری خاندان کا خاتمہ کردیا۔ کچھ عرصہ بعد ان دونوں کمانڈروں ارباط اور ابرہہ کے درمیان تنازع پیدا ہوگیا اور باہمی جنگ میں ارباط مارا گیا اور ابراہہ غالب آگیا، پھر وہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی کی جانب سے ملک یمن کا حاکم (گورنر) مقرر ہوگیا۔

ابراہہ ذاتی طور پر کٹر عیسائی تھا۔ اس کے عزائم میں یہ بات بھی شامل تھی کہ سارے عرب کو عیسائیت میں تبدیل کردیا جائے۔ اس طرح کہ مکہ مکرمہ کی عالمی مرکزی حیثیت بھی ختم ہوجائے۔ مذہبی جنون میں اس نے یمن کے شہر صنعاء میں ایک ایسا شان دار کنیسہ (گرجا گھر) بنایا جس کی نظیر اس وقت دنیا بھر میں نہ تھی۔

مورخ سُہیلی لکھتے ہیں کہ ابراہہ نے اس کی تعمیر پر یمن کی بے اندازہ دولت اور بیش بہا زرو جواہرات صرف کیے، یہ قیمتی پتھروں کی بہت ہی خوب صورت طویل و عریض عمارت تھی۔ عجیب و غریب زرکار نقوش سے منقش، جواہر ریزوں سے مزین، ہاتھ دانت کی نفیس جالیاں، سونے چاندی کے اوراق سے درو دیوار کو سجایا گیا تھا۔ اس سے ابراہہ کا یہ مقصد تھا کہ یمن کے عرب لوگ جو ہر سال حج کرنے مکہ مکرمہ جاتے ہیں اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس کنیسہ کی شان و شوکت سے مرعوب ہوکر کعبتہ اللہ کی بجائے اس کا طواف اور حج کریں۔ کچھ عرصہ بعد اس نے پوری مملکت میں اعلان کروادیا کہ اب یمن سے کوئی شخص بھی حج کرنے کے لیے مکہ مکرمہ نہ جائے گا۔ ہر شخص اسی کنیسہ میں آئے اور طواف کرے۔

عرب میں اگرچہ بت پرستی غالب آگئی تھی مگر دین ابراہیمی اور کعبتہ اللہ کی عظمت و محبت ان کے دلوں میں پیوست تھی۔ اس لیے عدنان، قحطان اور قریش کے قبائل میں اس اعلان سے سخت غم و غصہ کی لہر پیدا ہوگئی۔ اگرچہ اس وقت خانہ کعبہ کے اندر تین سو

ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ لوگ اس کو اللہ کا گھر، مقدس اور عبادت کا مرکز خیال کرتے تھے۔

مورخ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ ابراہہ کے اس اعلان پر غضب ناک ہوکر ایک عرب تاجر نے کسی نہ کسی طرح کلیسا میں گھس کر رفع حاجت کرڈالی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ایسا کوئی بھی واقعہ پیش آیا ہو تو کوئی تعجب خیز نہیں، کیونکہ ابرہہ کا یہ اعلان یقیناً" سخت اشتعال انگیز اور مفسدانہ تھا اور قدیم جاہلیت کے دور میں کسی عربی یا قریشی یا نوجوانوں کا مشتعل ہوکر کلیسا کو گندا کردینا یا اس میں آگ لگادینا" ناقابل فہم بات نہیں ہے۔

ابراہہ کو جب یہ اطلاع ملی کہ خانہ کعبہ کے معتقدین نے یہ حرکت کی ہے تو غیظ و غضب میں عہد کیا کہ اس وقت تک چین نہ لوں گا جب تک خانہ کعبہ کو ڈھا نہ دوں۔

اس کے بعد اس نے 570ء یا 571ء میں اپنے بادشاہ نجاشی سے اجازت طلب کی کہ وہ انہدام کعبہ کی مہم کے لیے حجاز جانا چاہتا ہے۔ نجاشی نے اس کو اجازت دی اور خصوصی تعاون کے طور پر اپنی فوج کا سب سے طاقت ور اور بلند و بالا ہاتھی جس کا نام محمود تھا، ابراہہ کی مدد کے لیے روانہ کردیا اور اس ہاتھی کے تعاون کے لیے مزید سات، آٹھ ہاتھی اور دیے، ابرہہ ساٹھ ہزار فوج لے کر مکہ روانہ ہوا۔

عرب میں جب اس حملے کی خبر پھیلی تو سارا عرب مقابلہ کے لیے تیار ہوگیا۔ ابراہہ راستے میں تمام عربوں کو شکست دیتے ہوئے جب طائف کے مقام پر پہنچا تو اس نے قبیلہ خثعم کے سردار نفیل بن حبیب خثعمی کو بھی گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے لیا تھا، تاکہ وہ مکہ کے اہم راستے بتائے۔

طائف کے باشندے ابرہہ کی فتح کے واقعات سن چکے تھے۔ انہوں نے اپنی خیر منانے کا فیصلہ کیا اور ابراہہ سے گزارش کی کہ وہ ان کے مشہور معبود (لات) کا مندر تباہ نہ کرے۔ ہم مکہ کا راستہ بتانے کے لیے ایک آدمی کو آپ کے ساتھ کردیتے ہیں۔ ابراہہ نے یہ بات قبول کرلی اور بنو ثقیف نے ابو رغال نامی شخص کو اس کے ساتھ کردیا۔

جب مکہ مکرمہ تین کوس کے فاصلہ پر رہ گیا تو المغمس نامی مقام پر پہنچ کر ابو رغال فوت ہوگیا۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں مدتوں اس کی قبر پر سنگ باری کرتے رہے ہیں اور بنو ثقیف کو بھی وہ عرصہ دراز تک طعنہ دیتے رہے۔۔۔ کہ انہوں نے لات کے مندر کو بچانے کے لیے بیت اللہ پر حملہ کرنے والوں کا تعاون کیا تھا۔

محمد بن اسحاق سے روایت ہے کہ المغمس سے ابراہہ نے اپنے مقدمتہ الجیش کو آگے بڑھایا، جہاں قریش مکہ کے اونٹ چر رہے تھے۔ ابرہہ کے لشکر نے ان پر چھاپہ مارا اور سب اونٹ ہانک کرلے گئے۔ ان میں حضرت عبدالمطلب کے بھی دو سو اونٹ شامل تھے۔ اس کے بعد ابرہہ نے اپنے ایک سفیر حناطہ حمیری کو شہر مکہ روانہ کیا اور اس کے ذریعہ اہل مکہ کو یہ پیغام دیا کہ۔

"میں تم سے لڑنے نہیں آیا ہوں، بلکہ اس گھر (کعبہ) کو ڈھانے آیا ہوں، اگر تم لوگ جنگ نہ کرو تو میں تمہاری جان و مال سے کوئی تعرض نہ کروں گا۔" نیز اس سفیر نے یہ بھی ہدایت دی کہ اہل مکہ اگر بات کرنا چاہیں تو ان کا سردار میرے پاس آجائے۔

اس وقت مکہ کے سب سے بڑے سردار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب تھے۔ سفیر نے ان سے مل کر ابراہہ کا پیغام پہنچایا۔ عبدالمطلب اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہوگئے۔ حضرت عبدالمطلب اس قدر وجیہہ اور باوقار آدمی تھے کہ ابرہہ ان کو دیکھ کر متاثر ہوگیا اور اپنی جگہ سے اتر کر ان کو اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا۔ "کہ آپ کیا چاہتے ہیں؟؟"

انہوں نے کہا "میرے جو اونٹ پکڑ لیے گئے" وہ

مجھے واپس دے دیے جائیں۔"

ابرہہ نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر تو میں بہت متاثر ہوا تھا، مگر آپ کی بات نے آپ کو میری نظر سے گرا دیا ہے۔ آپ اپنے اونٹوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور یہ گھر (کعبہ) جو آپ کے آبائی دین کا قبلہ ہے، اس کے بارے میں کچھ نہیں کہتے؟"

عبدالمطلب نے کہا "میں تو صرف اپنے اونٹوں کا مالک ہوں، ان ہی کے بارے میں آپ سے درخواست کرنے آیا ہوں، رہا یہ گھر (کعبہ) تو اس کا مالک رب ہے، وہ خود اس کی حفاظت کرے گا۔"

ابرہہ کو عبدالمطلب کی یہ بات معمولی سی محسوس ہوئی، اس نے کہا۔

"تمہارا رب اس کو میرے ہاتھ سے نہ بچا سکے گا۔"

انہوں نے کہا۔ "پھر تمہیں اختیار ہے، جو چاہو کرو۔"

اور بعض روایات میں ہے کہ عبدالمطلب کے ساتھ قریش کے چند سردار بھی تھے انہوں نے ابراہہ کے آگے یہ تجویز پیش کی کہ اگر وہ بیت اللہ پر دست اندازی کیے بغیر لوٹ جائے تو ہم پورے تہامہ (حجاز) کی ایک تہائی پیداوار آپ کو بطور خراج ادا کرتے رہیں گے۔ مگر ابرہہ نے اس بات کو قبول نہ کیا۔ عبدالمطلب اپنے اونٹ واپس لے کر چلے آئے اور سیدھے بیت اللہ میں داخل ہوئے اور چوکھٹ کا حلقہ پکڑ کر دعا میں مشغول ہو گئے۔ قریش کی ایک بڑی جماعت بھی ساتھ تھی۔

محمد بن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ ابرہہ کے لشکر گاہ سے واپس آکر عبدالمطلب نے اہل قریش سے کہا۔

"اپنے بال بچے لے کر پہاڑوں پر چلے جائیں، تاکہ ان کا قتل عام نہ ہو جائے۔" پھر وہ اور قریش کے چند سردار حرم پاک میں حاضر ہوئے اور کعبہ کا دروازہ پکڑ کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ وہ اپنے گھر اور اس کے خادموں کی حفاظت فرمائے۔

اس وقت خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت موجود تھے مگر یہ لوگ اس نازک گھڑی میں ان سب کو بھول گئے اور صرف اللہ واحد کے آگے دست سوال پھیلایا۔

ان کی جو دعائیں تاریخ کی کتب میں منقول ہیں ان میں اللہ واحد کے سوا کسی دوسرے کا نام تک نہیں پایا جاتا۔

دوسرے روز ابراہہ مکہ میں داخل ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اس کا وہ خاص ہاتھی محمود جو آگے آگے تھا، یکایک بیٹھ گیا اور تیر مارنے، کچوکے لگانے اور یہاں تک کہ زخمی کرنے کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ اس کو جنوب، شمال اور مشرق کی طرف موڑ کر چلاتے تو دوڑنے لگتا، مگر مکہ کی طرف منہ کرنے پر فوراً "بیٹھ جاتا اور آگے بڑھنے کو کسی طور تیار نہ ہوتا۔

اتنے میں پرندوں کی قطاریں آتی نظر آئیں، جن میں سے ہر ایک کے پاس تین کنکریاں چنے یا مسور کی دال کے برابر تھیں، ایک چونچ میں اور دو کنکریاں پنجوں میں۔

واقدی کہتے ہیں کہ یہ پرندے عجیب طرح کے تھے، جو اس سے پہلے کہیں نہیں دیکھے گئے۔ بدن کبوتر سے کچھ چھوٹے تھے اور پنجے سرخ قسم کے تھے۔ ان کی آواز بھی کچھ ارتعاش انگیز تھی کہ دل کپکپائے جاتے تھے۔ پرندوں کے یہ جھنڈ ابرہہ کے لشکر پر سنگریزوں کی بارش کرنے لگے۔ جس پر بھی یہ کنکر گرتے جسم سے پار ہو جاتے اور جسم گلنا شروع ہو جاتا۔

حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ کنکری کے لگتے ہی گوشت اور خون پانی کی طرح بہنے لگتا اور ہڈیاں نکل آتی تھیں۔ خود ابرہہ کے ساتھ بھی یہ ہی ہوا۔ اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر رہا تھا۔

پورے لشکر میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ لشکر کے لوگ یمن کی طرف بھاگنا شروع ہو گئے۔ ابرہہ نفیل بن خثعمی۔ (جس کو ابراہہ رہنما کے طور پر ساتھ لے آیا تھا۔) کو تلاش کر کے درخواست کرنے لگا کہ واپسی کا راستہ بتاؤ، مگر اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا۔

"اب بھاگنے کی جگہ کہاں ہے، جبکہ اللہ تعاقب

کر رہا ہے اور نکٹا (ابرہہ) مغلوب ہے، غالب نہیں ہے۔"

اس بھگدڑ میں یہ لوگ گر گر کر مرتے گئے اور مر مر کر گرتے جاتے تھے۔ عطا بن یسار سے روایت ہے کہ سب کے سب اسی وقت ہلاک نہیں ہوئے۔ ایک بڑی تعداد تو وہیں ہلاک ہو گئی اور کچھ واپس بھاگتے ہوئے ہلاک ہوئے۔ ابرہہ بھی انتہائی بری حالت میں بلاد خثعم پہنچ کر مرا۔ ابرہہ کے ہاتھی محمود کے ساتھ دو ہاتھی بان مکہ مکرمہ میں رہ گئے تھے، مگر اس طرح کہ دونوں اندھے اور اپاہج ہو گئے تھے۔

محمد بن اسحاق نے حضرت عائشہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتی تھیں کہ "میں نے ان دونوں کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ وہ اندھے، اپاہج تھے اور بھیک مانگتے پھرتے تھے۔"

اصحاب الفیل کا یہ واقعہ مزدلفہ اور منیٰ کے درمیان وادی محصب کے قریب مقام محشر پر پیش آیا تھا۔

یہ عبرت ناک واقعہ ماہ محرم میں پیش آیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت اس واقعہ کے چالیس یا پچاس دن بعد ہوئی۔

اہل عرب میں یہ واقعہ اس درجہ مشہور و معروف تھا کہ انہوں نے اس سال کا نام عام الفیل (ہاتھیوں والا سال) رکھ دیا۔ قرآن کریم نے واقعہ کو اپنے اس معجزانہ کلام میں سورۂ فیل میں اس طرح بیان کیا ہے۔

ترجمہ "کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا، کیا اس نے ان کی تدبیر کا اکارت نہیں کر دیا؟ اور ان پر پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ بھیج دیے۔ جو ان پر پکی ہوئی مٹی کے پتھر پھینک رہے تھے، پھر ان کا یہ حال کر دیا جیسے جانوروں کا کھایا ہوا بھوسا۔" (سورۃ الفیل)

✡

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

کریمی میتھی چکن

اجزا :

چکن	آدھا کلو
کریم	1کپ
سوکھی میتھی	2چائے کے چمچے
لال مرچ پاؤڈر	2چائے کے چمچے
گرم مسالا پاؤڈر	1چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	4عدد
لہسن پیسٹ	1چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

پتیلی میں تیل گرم کریں۔ لہسن پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر اور نمک بھی ڈال دیں۔ گوشت شامل کرکے بھون لیں، آنچ کم کر دیں۔ ایک پیالے میں تازہ کریم اور گرم مسالا پاؤڈر مکس کریں اور گوشت میں ڈال کر اتنا بھونیں کہ تیل اوپر آجائے۔ آخر میں میتھی اور ہری مرچیں ڈال دیں۔ پانچ منٹ دم پر رکھ دیں۔ گرم چپاتی کے ساتھ پیش کریں۔

مکس سبزیوں کے ساتھ چاول

اجزا :

آلو	2عدد
ٹماٹر	3عدد
گوبھی	1کپ
کٹی لال مرچ	1چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	1کھانے کا چمچہ
مٹر	1کپ
گاجر	1عدد
شملہ مرچ	1عدد
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	1عدد (بڑی)
ہرا دھنیا، ہری مرچ	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	آدھا کپ

ترکیب :

ایک پتیلی میں تیل گرم کریں، پھر اس میں پیاز ڈال کر فرائی کریں۔ اس کے بعد اس میں ادرک لہسن پیسٹ، نمک، کٹی ہوئی لال مرچیں، ہلدی ڈال کر بھونیں۔ آلو، ٹماٹر، گوبھی، مٹر، گاجر، شملہ مرچ کیوبز میں کاٹ کر شامل کریں پھر آدھا کپ پانی ڈالیں اور ڈھکن ڈھک کر پکنے دیں۔ سبزیاں گل جائیں تو ہرا دھنیا، ہری مرچ ڈال دیں۔ سادے چاولوں کے ساتھ پیش کریں۔

شنگھائی نوڈلز

اجزا :

چکن	آدھا کلو
نوڈلز	آدھا کلو
لہسن کے جوے	4عدد
ہری پیاز	1عدد
بند گوبھی	2کپ
کارن فلور	2چائے کے چمچے
مرغی کی یخنی	آدھا کپ
سویا سوس	ایک چوتھائی کپ
چینی	1کھانے کا چمچہ
ادرک پیسٹ	2چائے کے چمچے
نمک، سفید مرچ پاؤڈر	حسبِ ذائقہ
تیل	3کھانے کے چمچے

ترکیب :

گوشت کے باریک باریک ٹکڑے کاٹ لیں۔ ہڈیاں نکال دیں۔ ایک پیالے میں سویا سوس، چینی اور ادرک پیسٹ ڈال کر مکس کریں۔ چینی گھل جائے تو اس میں گوشت شامل کرکے اچھی طرح مکس کرکے تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔

نوڈلز ابال لیں۔ کڑاہی میں تیل ڈال کر گرم کریں۔ پھر گوشت ڈال کر تھوڑی دیر تک چمچہ ہلائیں۔ گوشت نرم ہو جائے تو الگ ڈش میں نکال لیں۔ آنچ دھیمی کرکے کڑاہی میں لہسن باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ لہسن کی خوشبو آنے لگے تو ہری پیاز اور بند گوبھی (باریک کٹی ہوئی) ڈال دیں۔ گوشت اور پیالے میں بقیہ بچا ہوا آمیزہ شامل کر دیں۔ مرغی کی یخنی میں کارن فلور گھول کر کڑاہی میں ڈال دیں۔

نوڈلز ڈال کر چمچہ چلائیں تاکہ مسالا اچھی طرح نوڈلز کو لگ جائے۔ نمک اور سفید مرچ پاؤڈر چھڑک کر ڈش میں نکال لیں۔

چکن کارن سوپ

اجزا :

چکن	آدھا کلو
لہسن ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
انڈا	1 عدد
پیاز درمیانی	1 عدد
کارن فلور	2 کھانے کے چمچے
پسی سیاہ مرچ	1 چائے کا چمچہ
ثابت سیاہ مرچ	چند دانے
سویا سوس	4 کھانے کے چمچے
زردے کا رنگ	1 چٹکی
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

چھ گلاس پانی میں چکن ابال لیں۔ ساتھ ہی ثابت کالی مرچ، نمک، پیاز (چار ٹکڑے کرکے) لہسن ادرک پیسٹ بھی ڈال دیں۔ جب اچھی طرح یخنی بن جائے تو چھان لیں۔ چکن کے باریک باریک ریشے کر لیں، پھر یخنی میں ڈال کر یخنی دوبارہ چولہے پر چڑھا دیں۔ کارن فلور کو آدھا کپ پانی میں اچھی طرح گھول لیں تاکہ گٹھلی نہ رہ جائے، پھر اسے دھیرے دھیرے یخنی میں شامل کردیں۔ ساتھ ہی ایک چٹکی زردے کا رنگ بھی ڈال دیں۔ انڈے کو اچھی طرح پھینٹ کر پکتی ہوئی یخنی میں ڈال دیں۔ حسب مرضی گاڑھا ہو جائے تو اتار لیں۔ پیش کرتے وقت سویا ساس ڈال کر پیش کریں۔

(اگر چاہیں تو انڈے ابال کر باریک سلائس میں کاٹ کر بھی سوپ میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔)

✡

خوبصورتی کے لیے

ادارہ

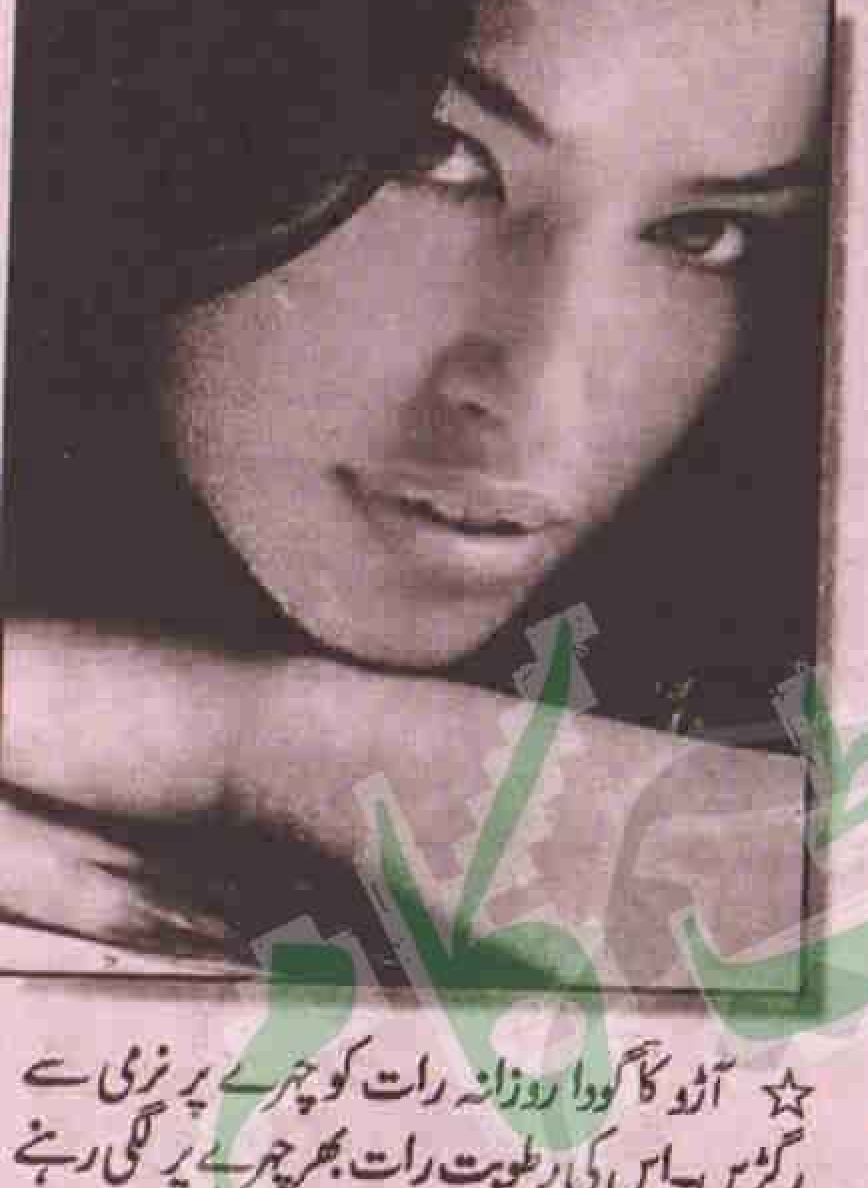

موسم سرما اپنا جوبن دکھانے کو ہے۔ اکثر لوگوں کا چہیتا، یہ موسم اپنے ساتھ خشک ہواؤں کا قافلہ بھی لاتا ہے۔ ایسے میں اگر چہرے اور ہاتھوں کی مناسب دیکھ بھال نہ کی جائے تو جلد خشک اور بے رونق ہو جاتی ہے۔ تاہم تھوڑی سی توجہ اور محنت سے جلد کی رونق بحال کی جاسکتی ہے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ سرد موسم میں خواتین پانی پینا کم کرکے چائے اور کافی کی مقدار بڑھا دیتی ہیں۔ اس سے بھی جلد کو نقصان پہنچتا ہے۔ گرمی ہو یا سردی، روزانہ آٹھ سے دس گلاس پانی ضرور پئیں۔ نیز روزانہ ایک گلاس دودھ میں دو چمچے شہد ملا کر پینے سے جلد خشک اور سرد موسم کے اثرات سے محفوظ رہتی ہے۔

ہم آپ کو چند آسان اور گھریلو ٹوٹکے بتا رہے ہیں جن کی مدد سے گلابی جاڑوں میں بھی آپ کی جلد گلاب کی مانند کھل اٹھے گی۔

☆ تازہ یا خشک خوبانی کا گودا اور نیم گرم روغن زیتون ملا کر خوب گھوٹ لیں۔ اس آمیزے کو چہرے پر لگا لیں۔ پندرہ منٹ بعد سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے چہرے کی خشکی اور جھریاں دور ہوتی ہیں۔

☆ بادام پیس کر اس میں تھوڑا سا دودھ اور شہد شامل کرلیں۔ اچھی طرح ملا کر چہرے پر لیپ لیں۔ دس سے پندرہ منٹ تک لگا رہنے دیں، پھر ہاتھ گیلے کرکے اسے نرمی سے رگڑتے ہوئے چہرہ صاف کرلیں۔ آخر میں سادہ پانی سے منہ دھوئیں۔ ہفتے میں ایک مرتبہ ایسا کرنے سے آپ کی جلد دمک اٹھے گی۔

☆ زیتون کا تیل، شہد، ہلدی اور صندل ملا کر چہرے پر لگائیں، پندرہ منٹ بعد دھولیں۔ یہ عمل خشک اور مرجھائی ہوئی جلد کو تروتازہ کردیتا ہے۔

☆ آڑو کا گودا روزانہ رات کو چہرے پر نرمی سے رگڑیں۔ اس کی رطوبت رات بھر چہرے پر لگی رہنے دیں۔ اس سے چہرے کی جلد تروتازہ دکھائی دیتی ہے۔

☆ بادام اور گلاب کی تازہ کلیوں کو پیس کر چہرے پر روزانہ لگانے سے جلد خشکی اور جھریوں سے محفوظ رہتی ہے۔

☆ مسور کی دال پیس کر دہی میں ملالیں، اچھی طرح پھینٹ کر چہرے پر لگائیں۔ سوکھنے پر گیلے ہاتھوں کے ساتھ نرمی سے رگڑ کر اتار لیں۔ پھر سادہ پانی سے منہ دھولیں۔ جلد صاف اور چمک دار ہو جاتی ہے۔

☆ چولائی کے ساگ کا عرق لے کر اس میں ایک چٹکی ہلدی، تھوڑا سا دودھ اور لیموں کے چند قطرے شامل کرلیں۔ چہرے پر اس کا مساج کریں۔ آدھے گھنٹے بعد نیم گرم پانی سے منہ دھولیں۔ اس سے چہرہ تروتاز

دکھائی دیتا ہے' تیز جھریاں بھی نہیں پڑتیں۔

☆ ہاتھوں کی جلد بھی اسی قدر توجہ کی متقاضی ہے جس طرح چہرے کی جلد۔ ہاتھوں کی خشک اور کھردری جلد کو ملائم بنانے کے لیے کھلے منہ کے ایک برتن میں دو کپ نیم گرم دودھ لیں۔ اس میں ایک چمچہ نمک ملا کر ہاتھ ڈبو لیں' پھر دس سے پندرہ منٹ مساج کے بعد ہاتھ سادہ پانی سے دھولیں۔

☆ دو کپ عرق گلاب میں ایک کپ گلیسرین ملا کر ایک بوتل میں بھر کر رکھ لیں۔ دن میں کئی مرتبہ' خصوصاً" رات میں سوتے وقت اس لوشن کو ہاتھوں پر لگائیں۔ یہ لوشن ہاتھوں کی جلد کی نمی برقرار رکھے گا اور ہاتھ نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

☆ آدھی پیالی سنگترے کے جوس میں ایک کھانے کا چمچہ شہد ملا کر ہاتھوں پر لگائیں۔ تھوڑی دیر ملیں' پھر دس منٹ بعد دھولیں۔ یہ عمل ناخنوں کو چمک دار کرنے کے ساتھ ساتھ خشک اور پھٹی ہوئی جلد کی رونق بحال کرتا ہے۔

☆ ایک عدد کیلا مسل کر اس میں ایک چائے کا چمچہ شہد' ایک عدد لیموں کا رس اور ایک کھانے کا چمچہ مکھن ملا کر خوب پھینٹ لیں۔ ہاتھوں پر اس کا مساج کریں۔ دو گھنٹے بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ ہاتھ نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

☆ ڈیڑھ کپ دہی میں ایک عدد لیموں نچوڑ کر خوب پھینٹیں۔ اس سے ہاتھوں اور پیروں کا اچھی طرح مساج کریں۔ پندرہ منٹ مساج کرنے کے بعد سادہ پانی سے دھوئیں۔ صابن اور ڈٹرجنٹ کے زیادہ استعمال سے بے رونق ہو جانے والے ہاتھ اور پیر نرم و ملائم ہو جائیں گے۔

☆ ایک انڈے میں کھانے کے دو چمچے روغن بادام اور کھانے کا ایک چمچہ عرق گلاب ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں' پھر اس میں چائے کا آدھا چمچہ ٹنکچر بینزوین بھی قطرہ قطرہ کر کے شامل کرلیں۔ ہاتھوں اور پیروں پر اچھی طرح ملیں۔ دو گھنٹے بعد دھولیں۔ جلد نرم و ملائم ہو جائے گی۔

☆ ہاتھ اور منہ دھونے کے لیے صابن کے بجائے مونگ کی دال کا آٹا یا بیسن استعمال کریں۔ تھوڑے سے پانی میں گھول کر چہرے اور ہاتھوں پر لگالیں۔ تھوڑی دیر بعد سادہ پانی سے دھولیں۔ یہ عمل جلد کے مساموں سے دھول اور مٹی صاف کرتا ہے' جس سے جلد تروتازہ اور رنگت نکھر جاتی ہے۔

☆ ٹماٹر کا گودا چہرے' ہاتھوں اور پیروں پر اچھی طرح ملیں۔ آدھ گھنٹے بعد نیم گرم پانی سے دھوئیں۔ اس کا روزانہ استعمال رنگت کو نکھارتا ہے۔

☆ رات کو سوتے وقت نیم گرم زیتون کے تیل میں پگھلی ہوئی موم ملا کر ہاتھوں اور پیروں پر ملیں۔ ہاتھوں میں سوتی دستانے اور پیروں میں موزے پہن لیں تاکہ آپ کا بستر تیل کے دھبوں سے محفوظ رہے۔ صبح معمول کے مطابق منہ ہاتھ دھولیں۔ جلد نرم و ملائم اور شگفتہ ہو جائے گی۔